ناصرہ شرما

بہشتِ زہرا

ناصرہ شرما

بہشتِ زہرا

(ناول)

بہشتِ زہرا

(ناول)

ناصرہ شرما

ناشر:

تخلیق کار پبلشرز

C-54، گلی نمبر۔۵، بے۔۱ ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

جملہ حقوق بحق مصنفہ محفوظ

نام کتاب : **بہشتِ زہرا** (ناول)
مصنّفہ : ناصرہ شرما
رابطہ : D-37/754، چھترپور پہاڑی، نئی دہلی ـ ۱۱۰۰۳۰ (Ph: 9811119489)
تعداد : ۶۰۰

ناشر : انیس امروہوی
○ **تخلیق کار پبلشرز**
C-54، گلی نمبر ـ ۵، جے ـ ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی ـ ۱۱۰۰۹۲

سرورق : مسعود التمش
کمپوزنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی ـ ۱۱۰۰۹۲
مطبع : کلاسک آرٹ پرنٹرس، چاندنی محل، دریا گنج، نئی دہلی ـ ۱۱۰۰۰۲

ملنے کے پتے:

- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ـ ۱۱۰۰۰۶
- کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ، جامع مسجد، دہلی ـ ۱۱۰۰۰۶
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی ـ ۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل بک ہاؤس، مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ـ ۲۰۲۰۰۱ (یو ـ پی)
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی ـ ۱۱۰۰۰۶
- کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، نزد جے ـ جے ـ اسپتال، ممبئی ـ ۴۰۰۰۰۸
- ہورائزن ڈسٹری بیوٹرس، گوراچاند روڈ، اینٹالی، کولکاتہ ـ ۷۰۰۰۱۴ (مغربی بنگال)

ISBN-978-93-80182-57-5
2012
₹ 360.00

T.P.: 0241
BAHISHT-E-ZEHRA *(Novel)*
By NASERA SHARMA
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
54-C, ST. NO. 5, J-EXTENSTION., LAXMI NAGAR, DELHI-110092
Ph.:011-22442572, 9811612373 E-mail:qissey@rediffmail.com

○

شہدائے اِنقلابِ ایران

کے نام

○○

پیش لفظ

ایران کے انقلاب پر لکھا گیا میرا یہ ناول ان تجربات کا تحریری دستاویز ہے جو مجھے ایران کے دوران قیام انقلاب سے پہلے اور بعد کے کئی برسوں میں ہوئے۔

سیاست آج انسانی خون میں رواں دواں ہے، جس کے ستم سے انسانیت بیمار ہو چکی ہے اور دم توڑتی نظر آتی ہے۔ سیاست صرف پاور گیم ہے، یہ سیاست ہی ہے جو آج کے ماحول میں کسی کی خوبی اور بدی کو طے کرتی ہے۔ زندگی سیاسی زندان میں قید ہے۔ اس قیدی کو کون آزاد کرائے گا؟

سیاستداں یا پھر ادیب......؟

موجودہ دور میں ادیب کا فرض کیا ہے؟ کیا وہ اپنا قلم سیاست کے بے ضمیر ہاتھوں فروخت کر دے یا پھر اسے سیاست کی مار سے زخمی زندگیوں کی پردہ کشائی کے لیے وقف کر دے؟ بین الملکی سطح پر اس وقت انسانیت سیاست کے بھاری قدموں تلے پس رہی ہے۔ سیاسی چکی سے اُٹھتی آوازوں کو، جو ہجر کے نغمے نہیں بلکہ انسانی فریادیں ہیں اور جن کی بازگشت اس ناول کی سطروں میں گونجتی ہوئی ہر پڑھنے والے کو محسوس ہوگی۔

اس ناول کے سارے اہم کردار عورتیں ہیں۔ عورتوں کے حالات کو لے کر میں نے قلم اُٹھایا ہے۔ بقول امام خمینی، ''اگر عورتیں گھر سے باہر نہ نکلتیں تو یہ

انقلاب وجود میں نہ آتا...... مگر وقت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ جو عورت کل کی شاہی حکومت میں صرف سجاوٹ کا سامان سمجھی جاتی تھی، وہ آج پردے کے پیچھے کر دی گئی ہے، جس کی وجہ سے آج پھر وہ اپنی آزادی کے لیے کوشاں ہے۔ انجام............؟؟

زمانہ بدلے گا......!!

اس ناول کے تمام کردار آج زندہ نہیں ہیں، جن کا میں شکریہ ادا کروں۔ وہ سب بہشت زہرا قبرستان کے دامن میں زمین کی آغوش میں قبروں کے اندھرے میں محو خواب ہیں۔ میرے اندر انہیں کی یادوں کا ایک قبرستان آباد ہے جس کی زندہ تصویر یہ ناول ہے۔

— ناصرہ شرما

اچانک فال گیرن نے پری کے سامنے رکھی اس کی جوٹھی پیالی اور طشتری اپنی طرف کھینچی۔ پری کے چہرے پر تجسس کا تاثر اُبھرا۔ اس نے اپنی بے چین نظریں مستقبل کا حال بتانے والی اس فال گیرن پر گاڑ دیں۔

''دیکھو! ادھر ایک پرندہ، اپنے بڑے بڑ۔۔ے ڈینے پھیلائے بیٹھا ہوا ہے۔ اس کے نیچے دو لوگ ہیں، آمنے سامنے۔ اِدھر ایک پہاڑ ہے اور......''

فال گیرن نے پہلو بدلا۔ لبوں کو سکوڑا، پیشانی پر بل ڈالے، ابروؤں کو تانا پھر پریشان سی نظروں سے پری کو دیکھا۔ جوٹھی پیالی میں بچا قہوہ، گاڑھا ہونے کے سبب، پیالی کی نچلی سطح سے بہہ کر اُلٹی سیدھی مختلف شکلوں اور لکیروں میں بٹ گیا تھا، جسے دیکھ کر فال گیرن پری کا مستقبل بتا رہی تھی۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد وہ پھر بولی۔

''یہ پرندہ خوشی کا پرندہ ہے۔ یہ دو لوگ، جو آمنے سامنے بیٹھے ہیں، تمہاری زندگی کا فیصلہ کریں گے۔ دونوں تمہارے عاشق ہیں۔ تم پر جاں نثار کریں گے۔ مگر تم دونوں کو ناپسند کر کے ماں باپ کی خواہش کے مطابق شادی کرو گی ضرور، مگر سکون نہیں ملے گا۔ یہ دونوں تمہارے شوہر سے بدلہ لیں گے، مگر ناکام ہوں گے، کیونکہ پہاڑوں کے اوپر یہ جو پرندہ ہے، وہ تمہیں ہر دُکھ سے نجات دلائے گا۔ دل کو صاف رکھنے کے لیے کبھی کبھی صدقہ دینا تمہارے لیے اچھا رہے گا۔''

فال گیرن نے اپنی بات کہہ کر پیالی اور پرچ دُوسری طرف بڑھا دی۔

پری کے چہرے کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ اس نے خاموشی سے پرس میں سے

روپے نکالے اور بجھے دل کے ساتھ فال گیرن کو تھمائے۔ اس نے شکریے کے ساتھ وہ روپے کمر میں بندھے کپڑے کے بٹوے میں ڈال لیے۔ اگلی بار اس نے اختر کے سامنے کی پیالی اُٹھائی۔ اختر کے چہرے پر تجسس تھا۔

''دیکھو تم اندر ہی اندر کڑھتی رہتی ہو۔ یہ کڑھنا بند کردو۔ تمہارے دل پر جو تفکرات کا بوجھ ہے، بے سبب ہے۔ یہ سیدھی لکیریں اس بات کی غماز ہیں۔'' اس نے قہوے کی لکیروں کو سفید پیالی پر دکھاتے ہوئے کہا، پھر رُک کر بولی۔ ''تمہاری زندگی میں جلد ہی زبردست تبدیلی آنے والی ہے۔ یہ تبدیلی تمہیں راحت دے گی۔ تمہاری قسمت میں قید ہے۔''

یہ سن کر اختر نے گھبرا کر چہرہ پیچھے ہٹا لیا۔

فال گیرن نے کہا۔ ''یعنی عشق کی قید۔ جو تمہیں پیار کرے گا، وہ اپنا تن، من، دھن سب تم پر نثار کردے گا۔ مستقبل میں امن و امان ہے۔ تم لال رنگ پہننا شروع کردو اور گوریوں کو صبح میں دانا ڈال دیا کرنا۔ ساری مشکلیں جاتی رہیں گی۔ سر پر آئی بلا ٹل جائے گی۔''

یہ کہہ کر فال گیرن نے اختر کے دیے نوٹ پرس میں رکھ کر تیسرا پیالہ اٹھایا، مگر طیبہ نے اسے روک دیا۔ ''نہیں، مجھے وقت ضائع نہیں کرنا ہے۔ میں خود پینٹنگ کرتی ہوں...... کہو تو تمہارا ماضی اور مستقبل مختلف رنگوں اور لکیروں سے نقش کردوں۔''

طیبہ نے یہ کہتے ہوئے اپنی پیالی سیدھی کی اور اس میں پانی بھر دیا۔ پھر بڑی طنزیہ نظروں سے فال گیرن کو گھورا اور بولی۔ ''میری قسمت پڑھنا اتنا آسان نہیں ہے۔ اس کی زبان تمہارے لیے انجان ہے۔ میری قسمت میرا عمل ہے نہ کہ قہوے کی تلچھٹ۔''

فال گیرن اپنی ٹوٹتی دُکان یوں بکھرتی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں باقی لڑکیاں بھی انکار نہ کردیں، اس لیے بڑی نرمی سے وہ طیبہ سے بولی۔ ''اُف، اتنا اچھا ہاتھ! کیا لکیریں ہیں؟ دُور سے دیکھ کر ہی اندازہ لگا لیا ہے۔ لاؤ، اپنا ہاتھ ادھر لانا......''

''نہیں! یہ لکیریں میری قسمت کی نہیں ہیں۔ یہ ایران کا نقشہ ہے، جو میرے ہاتھ پر نقش ہے۔ یہ پہاڑ، یہ ندیاں، یہ میدان اور یہ یونیورسٹی، یہ جیل اور یہ گھر...... یہ

سب مجھے سنوارنا ہے۔ اسے تم کیا پڑھ پاؤ گی؟"

فال گیرن کا کھلا منھ دیکھ کر طیبہ ہنس پڑی، بولی...... "یوں حیرت سے مجھے کیا تک رہی ہو؟"

"اپنا فلسفہ چھوڑو، طیبہ......!"

"ہاں، اب میرا نمبر ہے۔" ملیحہ نے پیالی آگے سرکاتے ہوئے کہا۔

فال گیرن نے لپک کر پیالی سیدھی کی۔ "آہا...... کیا قسمت ہے! کیا مستقبل ہے! سکھ کا جھولا ہے جس میں تم جھول رہی ہو۔ پیار کرنے والا شوہر ملے گا، سات سمندر پار کی سیر کرائے گا، مگر یہ کیا، تمہاری قسمت کے نگینہ میں شگاف ہے...... طویل غموں کے بعد خوشی ملے گی۔ تمہارا کوئی دشمن ہے جو تمہاری زندگی میں دبے قدموں داخل ہوگا اور پیار سے لبریز دو دلوں کو کاٹ کر رکھ دے گا۔"

"ہائے! چھوڑو! اتنی خطرناک باتیں مجھے نہیں سننی ہیں۔ خدا نہ کرے ایسا ہو۔ توبہ کیسی خوفناک باتیں ہیں!" ملیحہ نے بڑی بڑی آنکھیں بند کر کے دل پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

"ارے ملیحہ، یہ باتیں کون سی سچ ہیں! لطف اُٹھانے کے لیے ہم نے اسے بلوایا تھا، تم تو اسے......" سوسن نے ملیحہ سے کہا، پھر فال گیرن سے بولی۔ "ذرا میرا ہاتھ تو دیکھنا، خانم!"

"یہ دیکھو سورج، یہ تمہارے سارے دُکھ دُور کر دے گا۔ ایک نہیں، دو دو سورج ہیں۔ پریشان مت ہو، میں فال بہت اچھی دیکھتی ہوں۔" فال گیرن نے ملیحہ کے چہرے کو دیکھا اور اسے دلاسہ دے کر کافی کے پیالے میں بنے دو چاند نما دھبوں کو دِکھاتے ہوئے کہا۔ ملیحہ نے اُداسی سے پرس کھولا اور بڑا سا نوٹ فال گیرن کے ہاتھ پر رکھ کر بے دلی سے دیوار پر لگے ہتھیار دیکھنے لگی۔

"لاؤ تمہاری قسمت بھی دیکھوں!" کہہ کر فال گیرن نے سوسن کا پیالہ پکڑ لیا۔ کافی دیر تک اسے گھورتے رہنے کے بعد بولی۔ "تم جو چاہتی ہو شاید وہ نہ ملے، لیکن جو ملے گا وہ تمہاری چاہت سے کہیں زیادہ ہوگا۔ دونوں ہاتھوں سے سنبھالوگی تب بھی نہ

سنبھلے گا۔ اگر اُنگلی میں ایک فیروزے کی انگوٹھی ڈال لو تو بہت اچھا ہوگا۔ اس سے تمہاری زندگی میں تبدیلی آئے گی۔'' فال گیرن نے اتنا کہہ کر سوسن کی پیالی سیدھی کی، پھر اس پر ہی قہوے کی تلچھٹ سے بنی لکیروں کو پڑھتی رہی۔ سوسن کا چہرہ میز پر آگے کی طرف جھک گیا اور آنکھیں فال گیرن کے ماتھے پر پڑتی شکنوں میں اُلجھ گئیں۔

''تمہارا مستقبل سب سے زیادہ روشن ہے، مگر...... تین مرد آئیں گے تمہاری زندگی میں......''

''بس کرو!'' سوسن لال ہوگئی اور فال گیرن کو منع کرنے لگی۔

''واہ، مزے ہیں تمہارے! مگر 'مرد' سے کیا مراد ہے؟'' طیبہ نے مذاق اُڑایا۔

''مرد سمجھو یا یوں کہوں تین لڑکے، وہ تینوں میں سے پہلا......''

فال گیرن لڑکیوں کے مذاق بھرے طنز سے کھسیا کر بات سنبھالنے لگی مگر سوسن نے اس کے سامنے نوٹ ڈال کر اپنی پیالی اس کے ہاتھوں سے تقریباً چھینتے ہوئے کہا۔

''مجھے نہیں سننا ہے کچھ!''

''اب میری باری ہے۔'' مہناز نے بے چین ہوتے ہوئے کہا۔

''میری قسمت مت دیکھنا، مجھے ڈر لگتا ہے۔'' صنوبر نے گھبرائے لہجے میں مداخلت کی اور اپنا ہاتھ پیچھے کرتے ہوئے کرسی کی پشت سے ٹک کر بیٹھ گئی۔

''تمہاری زندگی جنت اور دوزخ کے بیچ میں ہے۔ اگر تمہاری شادی جلد ہو جاتی ہے تو اچھا نہیں ہوگا۔ تمہارے اندر ہجر اور تنہائی کے بیابان ہیں، مگر اس کو باغ میں بدلنے والا انسان تمہیں ملے گا اور تم باغ میں رہ کر بھی اس بیابان کا خواب دیکھو گی...... یہ مکڑی کا جالا جیسا دھبہ بتا رہا ہے کہ آگے تمہاری زندگی بہت اُلجھی ہوئی ہے...... مگر اس کے بعد سکھ ہی سکھ ہے۔'' فال گیرن نے مہناز کی پیالی کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''کچھ صاف صاف نہیں بتایا۔'' مہناز نے اپنی پلکیں جھپکائیں۔

''بس اتنا ہی پڑھا جا رہا ہے۔'' فال گیرن نے پیالی کو دوبارہ گھمایا، پھر گردن ہلاتے ہوئے، اُسے رکھ کر صنوبر کی پیالی اُٹھالی۔

''بس رہنے دو۔ مجھے نہیں پڑھوانا ہے قہوے کا فال۔'' صنوبر نے اس کے ہاتھوں

سے پیالی لے کر اس میں گلاس کا بچا پانی اُنڈیل دیا۔
فال گیرن نے تمتما کر صنوبر کو دیکھا۔
''میں نے کہا نا، مجھے ڈر لگتا ہے۔'' صنوبر نے جواب میں کہا۔
''یہ لو، پکڑو۔'' مہناز نے ہاتھ میں پکڑا نوٹ آگے بڑھایا۔
''فال گیرن! تمہارا بہت بہت شکریہ! اگر کوئی انسان چالاک ہو اور اسے کوئی بیوقوف مل جائے تو وہ پیسہ خوب کماتا ہے۔ یہاں بیٹھے بیٹھے اپنی چرب زبانی سے چار سو تومان کما لئے۔'' اس کے چہرے پر طیبہ کی چھیڑ چھاڑ سے ایک عجیب سا رنگ آ گیا تھا۔
''تم لوگوں نے بہت بور کیا۔ یہاں آئے تھے تھوڑا تفریح کے لیے اور تم لوگ لے بیٹھیں قسمت کا رونا۔ قسمت اگر ہاتھ میں لکھی ہوتی تو آج دُنیا میں کوئی دُکھی اور بیچارہ نہ رہتا، سب قسمت کی لکیروں کو پڑھ کر اپنی راہ بدل لیتے۔ بہر حال...... میں قہوے کا آرڈر دے رہی ہوں، ساتھ میں کچھ لینا ہے؟'' طیبہ نے کہا۔
''نہیں، صرف قہوہ ٹھیک رہے گا۔'' سوسن بولی۔
''خبردار، جواب کسی نے قہوے کا فال دیکھا۔'' پری نے جو طیبہ کے لہجے کی نقل اُتاری تو سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔
قہوے خانے میں نقالی شروع ہوگئی تھی۔ میزوں سے اُٹھتی ہنسی کی آوازیں اس کی تان کے زیر و بم میں گھلنے لگی تھیں۔ ماحول خوشگوار ہو گیا تھا۔ لال روشنی میں نہائے قہوہ خانے کی دیواروں پر پرانے ہتھیار سجے تھے۔ ان کے نیچے میز سجاتے، چائے لاتے بیرے اپنے اساطیری لباس میں ہزاروں سال قبل کا منظر پیش کر رہے تھے۔ شاہنامہ فردوسی کو گا کر سنانے والے مغنّی کی بھاری آواز پورے ماحول کو ایک عجیب وقار بخش رہی تھی اور سننے والوں کو ایران کے اس تہذیبی پس منظر کی طرف لے جا رہی تھی جو ہزار ہا سال پہلے تاریخ کے گلیاروں سے نکل کر کاغذ پر ثبت ہو چکے تھے۔ آس پاس کی میزوں پر بیٹھے لوگ موتیوں سے سجے حقے گڑگڑا رہے تھے۔ ان میں کچھ غیر ملکی بھی تھے جو فردوسی کے دَور کے ایران کو جینا چاہ رہے تھے۔ سماوروں سے اُٹھتی بھاپ، حقے، سگریٹوں اور پائپ سے نکلتا دھواں سرخ رنگ کی فضا میں سرمئی رنگ کے بادلوں کی

طرح لوگوں کے سروں پر منڈلا رہے تھے۔ قہوہ ختم کر کے جب وہ ساتوں سہیلیاں باہر نکلیں تو آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ پیدل گھوم کر وہ جب کار تک پہنچیں تو بونداباندی شروع ہو گئی تھی۔

تہران یونیورسٹی میں اس وقت فارسی ادب کی کلاس چل رہی تھی۔ استاد بولتے بولتے رُک گئے۔ سامنے روشن دان میں بیٹھا کبوتر غٹرغوں کر رہا تھا۔ باہر سے اُڑتی کبوتری چونچ میں تنکا پکڑے داخل ہوئی۔ پھر دونوں نے ایک ساتھ بولنا شروع کر دیا۔ بوڑھے استاد نے گردن ہلائی۔

''اب یہ گھونسلا بنائیں گے، پھر انڈے دیں گے اور پھر بچے...... بچوں کو دانا کھلانے یہ کبوتر بار بار اندر آئیں گے...... ہو چکا میرا لکچر...... ہر روز یہ اسی طرح شور مچا کر میرے خیالات کی دُنیا تہس نہس کریں گے اور میں پڑھا نہیں پاؤں گا۔ انہیں باہر نکالو!''

لڑکے لڑکیوں کو یہ بات اچھی نہیں لگی، مگر وہ کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ سامنے سے دو لڑکے اُٹھے اور کبوتروں کو اُڑانے لگے۔ کبوتر باہر نکلنے کے بجائے کمرے میں اِدھر سے اُدھر پنکھ پھڑپھڑاتے دیواروں سے ٹکرانے لگے۔ یہ دیکھ کر پوری کلاس میں ہنسی اور طرح طرح کی آوازیں اُبھرنے لگیں۔ استاد کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ وہ ذہنی تناؤ میں آ چکے ہیں۔

طیبہ بڑے انہماک سے استاد کی تصویر کاپی پر بنا رہی تھی۔ اس نے ان کے سر پر دو کبوتر بھی اڑتے دکھائے تھے اور نیچے لکھا تھا۔ ''امن کی علامت، امن کے دشمن بنے۔''

ملیحہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے مسکراہٹ چھپا رہی تھی۔ پری اور اختر کبوتروں کی اُڑان کے ساتھ اپنا سر کبھی اِدھر کبھی اُدھر گھما رہی تھیں۔ اسی اثنا میں اُستاد کا ذہنی تناؤ اپنے عروج پر پہنچ چکا تھا۔ وہ ہاتھ اُٹھا کر بولے۔ ''رہنے دو۔ میں اس کلاس کو ختم کرتا ہوں۔ آفس میں جا کر رپورٹ کر دینا کہ یہ روشن دان پورا بند کر دیا جائے۔ وہ کمرے سے نکل گئے، ان کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

کلاس میں لڑکے لڑکیاں باہر نکل کر لان میں بکھر گئے۔ کچھ لائبریری کی طرف بڑھ گئے۔ تہران یونیورسٹی دو بجے تک سنسان ہو جاتی تھی۔ مگر آج پروگرام کے سبب خوب چہل پہل نظر آ رہی تھی۔ لڑکیاں شام کے لیے خوب سج دھج کر آئی تھیں۔ لڑکوں کا بھی یہی حال تھا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت یونیورسٹی کی کینٹین میں غضب کی بھیڑ تھی۔ طیبہ ہمیشہ کی طرح غائب تھی۔ مہناز، پری، سوسن، ملیحہ، اختر اور صنوبر ایک کونے میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں۔ کھانا کھانے کے بعد جب وہ باہر نکلیں تو سامنے سے طیبہ کہیں سے آتی نظر آئی۔ وہ رُک گئی۔ کچھ لڑکے بھی آ گئے۔ سب آپس میں باتیں کرنے لگے۔ طیبہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا رول کھولا۔ وہ کسی مردانا چہرے کا اسکیچ تھا۔ سب نے تعریف کی۔ اس اسکیچ کو ڈاکٹر شمش کے حوالے کر کے طیبہ آگے بڑھ گئی۔ اُسے بہت سے کام نپٹانے تھے۔

مہناز کو ایک کتاب لینی تھی، اس لیے وہ پانچ منٹ کے لیے گروپ سے الگ ہوئی اور یونیورسٹی کے گیٹ کی جانب چل پڑی۔ سڑک پار کر کے وہ کتاب کی دُکان پر پہنچی۔ کتاب لی اور مڑ کر سڑک پار کرنے لگی، تبھی اس کو کسی نے پیچھے سے پکارا۔ وہ پیچھے مڑی۔ سامنے اسلم کھڑا تھا۔ اسے اپنی طرف مڑتے ہوئے دیکھ کر وہ بولا۔

''سلام مہناز!''

''سلام!!''

مہناز نے لاپرواہی سے جواب دیا۔ مگر اس کی پیشانی پر بل پڑ گئے۔ اس نے

کندھے ہلکے سے جھٹکے اور سڑک پار کر کے آگے یونیورسٹی میں داخل ہو گئی۔ غصے کے مارے اس کا بُرا حال تھا۔ وہ بڑبڑائی۔

''لوگ عجیب ہوتے ہیں۔ نہ جان نہ پہچان۔ اُوپر سے مجھے سلام کر رہا تھا۔ جانے اسے میرا نام کیسے معلوم ہو گیا، احمق کہیں کا۔''

اُدھر اسلم بے عزت سا کھڑا رہ گیا۔ اس کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا جب اس نے خود کسی لڑکی سے یوں بات کرنا چاہی تھی۔ حقیقت تو یہ تھی کہ اسے مہناز بہت پیاری لگتی تھی۔ وہ اس کی کلاس میٹ ضرور تھی مگر کبھی کھل مل کر بات نہیں ہوئی تھی۔ صرف سنا تھا کہ اپنی سہیلیوں میں وہ سب سے زیادہ مغرور ہے۔ ویسے تھی بھی بلا کی حسین۔ چلتی تو فراک کا گھیرا ایسا بل کھاتا کہ لگتا لہروں کو چیرتی ہوئی کوئی جل پری آگے بڑھ رہی ہو۔ نرم نرم بال کندھے پر جھولتے ہوئے، سڈول پیر، جن میں نازک سینڈلیں ہوتیں۔ اس وقت وہ اُوپر سے نیچے تک ہلکے نیلے رنگ کے کپڑوں میں تھی، جو اس کے سرخ سفید رنگ پر پھب رہے تھے۔ وہ یونیورسٹی میں داخل ہو گئی۔ اسلم کا موڈ خراب ہو گیا۔ وہ یونیورسٹی کی طرف نہ جا کر سامنے ناک کی سیدھ میں چلتا چلا گیا۔ اسے اپنے برتاؤ سے زیادہ مہناز کے رویے پر غصہ آ رہا تھا۔ عجیب لڑکی ہے۔ سلام کا جواب تو آدمی ٹھیک سے دیتا ہے، میں اس کا ہم سبق تھا، کوئی اٹھائی گیرا نہیں۔

یونیورسٹی پہنچ کر مہناز سہیلیوں کے جھنڈ میں شامل ہو گئی۔ سوسن نے اس کا موڈ خراب دیکھ کر پوچھا۔ ''کیا ہوا؟''

''عجیب فضول قسم کے لوگ پیچھے لگ جاتے ہیں!'' مہناز نے کہا۔

''کون؟'' سوسن نے پوچھا۔

''میں کیا جانوں! کتاب خرید کر لوٹی تو ایک صاحب بڑے آرام سے میرا نام لے کر سلام کرنے لگے، جیسے کہ......'' مہناز اپنا جملہ پورا بھی نہ کر پائی تھی کہ پری بول اُٹھی۔

''جیسے کہ کہنے والے ہوں، آیئے، اس سہانے موسم میں کہیں بیٹھ کر چائے پیتے ہیں اور میٹھی میٹھی باتیں...''

''تمہیں مذاق سوجھ رہا ہے اور مجھے اس کی بدتمیزی پر غصہ آ رہا ہے۔'' مہناز نے کتاب کے پیکٹ کو پری کے کندھے پر مارتے ہوئے کہا۔

''سنو مہناز! اسلم تم سے کچھ کہہ رہا تھا کیا؟'' جعفر نے آ کر پوچھا۔

''کون اسلم؟'' مہناز کی بھنویں تن گئیں۔

''کون اسلم! اپنا ہم جماعت اور کون؟ ابھی تک آیا نہیں لوٹ کر۔ ابھی تم سے باتیں تو کر رہا تھا دُکان کے سامنے۔ میں اسے پیچھے سے آواز دیتا رہا اور وہ آگے بڑھ گیا۔ اس نے تمہیں کچھ بتایا نہیں، کتنی دیر میں لوٹ رہا ہے؟'' جعفر نے پروگرام کی فہرست دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''وہ اسلم تھا؟ مگر میں......''

مہناز کی بات بیچ ہی میں کاٹتے ہوئے پری نے کہا۔

''ابھی آتا ہوگا۔'' اور وہ مہناز کو ڈھکیلتی ہوئی آگے لے گئی۔

''خبردار، جو اسلم کو کسی کے سامنے کچھ کہا! وہ کیا ہے؟ پتہ بھی ہے۔ مجھے لگتا ہے، تجھے کچھ غلط فہمی ہوئی ہے۔''

پری کی بات سن کر مہناز خاموش ہوگئی۔ چہرہ اُتر گیا۔ پھر آہستہ سے بولی۔

''دیکھو، تم تو جانتی ہو، مجھے اپنی کلاس کے لڑکوں کے نام یاد ہیں نہ شکلیں۔ اس نے میرا نام لے کر سلام کیا۔ مجھے لگا جیسے کوئی...... میں نے ذرا...... خیر میری غلطی نہیں ہے۔ میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔ تم تو جانتی ہو میری بدحواسی کا عالم......''

''چھوڑو...... جو ہوا سو ہوا، مگر یہ جان لو، اسلم پروفیسر عطاپور کا بیٹا ہے جو نظمیں تم پڑھ پڑھ کر غش کھانے لگتی ہو، وہ اسی اسلم عطاپور کی ہیں۔'' پری نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''ارے سچ!''

حیرت اور رنج سے ملی جلی آواز مہناز کے منہ سے نکلی۔ اس نے جاتی ہوئی پری کو روکتے ہوئے اس پر اپنی گھبرائی آنکھیں گڑا دیں۔

''اور نہیں تو کیا! ایک بار اسے دِکھا کر سو بن تمہیں یہ بات بتا چکی ہے۔'' پری نے

ہلکے سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تب تمھو سچ مچ بہت بُرا ہوا...... خیر، میں انجان تھی، مجھے کیا پتہ تھا؟'' مہناز نے بالوں میں انگلیاں پھنسا کر کہا۔

دونوں خاموشی سے چلتی ہوئی لڑکے لڑکیوں کے جھنڈ میں جا کر شامل ہوگئیں۔ وہاں ہر کوئی اسلم کو پوچھ رہا تھا۔ مگر اسلم غائب تھا۔ پروگرام کا سارا بوجھ اس پر تھا۔ اسے مائک سنبھالنا تھا، تعارف کرانا تھا اور شعر پڑھنے تھے۔ فون پر معلوم ہوا، وہ گھر پر بھی نہیں ہے۔ لڑکوں نے مجید کو کسی طرح تیار کیا۔

سب کا غصہ اسلم پر تھا۔ بتا کر جانا تھا۔ اسلم کے نہ آنے کو لے کر مہناز خاصی پریشان ہوگئی۔ جیسے اسی کی غائب دماغی سے یہ سب ہوا ہو۔

آج 'سیزدے بدر' کا دن تھا۔ رواج کے مطابق کوئی بھی گھر پر نہیں تھا۔ یہ نحس مانا جاتا تھا۔ نوروز کے لیے جو گیہوں گہری طشتری یا پیالی میں بوتے تھے اُسے اُٹھا کر جنگل میں پھینکنے جانا ہوتا تھا۔ کیونکہ عقیدہ ایسا ہے کہ نئے سال ''نوروز'' کے بعد ایسا کرنے سے گھر کی ساری نحوست دُور ہو جاتی ہے۔ اس دن لڑکیاں گھاس (یعنی اسی گیہوں کے لمبے اکھوں) میں گانٹھ باندھ کر اپنے ہونے والے شوہر کو پانے کی منت مانتی تھیں۔ پہلے کچھ شہروں میں، خاص کر چھوٹے شہروں اور دیہاتوں میں لڑکیاں چابی گرا دیتی تھیں، جو صبح اسے پالیتا تھا، وہ لڑکی سے شادی کر لیتا تھا۔ بظاہر یہ رسم تھی، مگر دو چاہنے والوں کے لیے ایک آزاد رشتہ ہوتا تھا جو سماجی رسم ادا کر کے مان لیا جاتا تھا۔

طیبہ کی ساری سہیلیاں آج سیزدے بدر کے دن اپنے اپنے گھر والوں کے ساتھ، شہر سے دُور باغوں میں گئی ہوئی تھیں۔ پورا شہر خالی تھا۔ طیبہ نے سامنے چھت پر ایزل رکھ لیا تھا اور البرز پہاڑ کے دامن میں پھیلی انسانوں کی بستی کو، جس میں آسمان سے باتیں کرتی عمارتیں، گھر اور لاکھوں کی تعداد میں دروازے اور کھڑکیاں تھیں، اپنے کینوس پر اُتار رہی تھی۔

گھر کی نحوست کو پھینکنے لوگ جنگل کی طرف جاتے ہیں۔ مگر اپنے اندر کی نحوست کو کہاں اُگلیں؟ مصنوعی قہقہوں، دعوتوں، فیشن اور تیز فراٹے بھرتی کاروں میں......؟ طیبہ نے سوچتے ہوئے رنگ ملانا شروع کیا۔ اسے کل شام ملیحہ کے گھر جانا ہے۔ سب وہیں جمع ہوں گی۔ کینواس پر اس کا برش تیزی سے چل رہا تھا۔ 'ایک مردہ خاموش شہر' بے جان سفید کینوس پر مختلف رنگوں میں اُبھر رہا تھا۔

بہار کا آغاز، چاروں طرف ہریالی تھی۔ شہر کی سجاوٹ کا کہنا ہی کیا تھا۔ دھوپ ایسی مدمست تھی گویا شراب کی بارش کر رہی ہو۔ طیبہ کار میں بیٹھی شعر گنگنا رہی تھی۔ ایسے موسم میں اُسے اکیلے کار ڈرائیو کرنا بہت اچھا لگتا ہے، مگر بھیڑ اور کاروں کی ریل پیل نے اس کا موڈ خراب کر دیا۔ ملیحہ کا مکان بھی آ گیا تھا۔ اس نے گلی میں پہنچ کر کسی طرح جگہ بنا کر کار کھڑی کی اور لاک کر کے آگے بڑھی۔

ملیحہ نے دروازہ کھولا۔ دونوں سہیلیاں ایک دُوسرے سے لپٹ گئیں۔ پھر انہوں نے ایک دُوسرے کے گالوں کو چوما۔ ملیحہ نے کہا۔ ''اوپر چلو، سب آ گئے ہیں۔ کب سے کھانے پر انتظار ہو رہا ہے!''

کمرے میں گھستے ہی طیبہ نے جوتے اُتارے اور سفرے کے قریب بیٹھ گئی، بولی۔ ''معاف کرنا مجھے دیر ہو گئی۔ راستے میں کئی جگہ رُکنا پڑا۔''

''ہم بہت بے چینی سے تمہاری راہ دیکھ رہے تھے۔ ویسے بھی صنوبر اور مہناز کی کمی کھل رہی ہے۔'' ملیحہ بولی۔

سب کھانے میں مصروف ہو گئے۔ کھانا ختم کر کے سب نے برتن سمیٹے اور ملیحہ کے کمرے میں چلی گئیں۔ پیٹ بھر چکا تھا۔ ایک گرم گنگناہٹ پورے بدن پر چھا رہی تھی۔

طیبہ نے موقع دیکھتے ہی آرام سے لیٹی ہوئی سوسن پر جملہ کسا۔

''ہاں، تو بھائی! جو سوسن ہیں۔ ان کی زندگی میں تین شخص۔ یعنی تین جوان ہیں۔ کون کون ہیں وہ؟ ذرا بتاؤ تو۔ ایسے موقع پر کسی کا دردِ دل سننے میں مزا آتا ہے۔''

''تم اپنی کہو نا۔'' سوسن نے جل کر کہا۔

سوسن کی کھسیاہٹ، حیرت اور شرم سے مزہ لیتے ہوئے طیبہ نے اپنی نازک گردن کو پیچھے ڈالا۔ طیبہ خوبصورت نہیں تھی مگر نازک، بے داغ، سفید بدن اور گلابی چہرہ، جس کے چاروں طرف چھوٹے گھنگھرالے بال آدھے ماتھے اور کندھوں کو چھپائے رکھتے تھے۔ اس وقت یکبارگی پیچھے پیٹھ پر سمٹ گئے۔

''میں کیا کہوں! میری قسمت کھلی کتاب ہے۔ تم لوگوں کی طرح لکیروں کا جال نہیں، جسے کوئی بھی جاہل عورت پیسے کی خاطر پڑھ کر بتا دے۔ میری کتاب کی زبان کو سب نہیں پڑھ سکتے ہیں۔''

''جو پڑھتے ہیں، وہ زندگی کب پڑھ پاتے ہیں! وہ تو کچھ اور......'' سوسن نے جل کر کہا۔

''جل کیوں رہی ہو؟'' طیبہ نے ہنس کر کہا۔

''میں کیوں جلوں!'' تم پر تو یوں ہی پروانے جل جل کر اپنی جان نثار کر دیتے ہیں!'' سوسن سچ مچ برا مان گئی تھی۔

''دیکھو، میں تو برا نہیں مانتی۔ مرے دوستوں کو پروانہ کہو یا بھنورا، ہیں تو وہ میرے دوست ہی۔'' طیبہ نے آرام سے لیٹتے ہوئے کہا۔

''لیکن تمہاری خواہشات، غیر محسوس ہی رہتی ہیں نا؟'' پری نے پوچھا۔

''کیوں غیر محسوس رہتی ہیں۔ اس پر متعدد رنگ آتے اور جاتے ہیں اور ہر رنگ نیا ہونے کے ساتھ، نئی اُمنگ، نیا حوصلہ لاتا ہے۔''

طیبہ نے سچائی بتاتے ہوئے کہا۔

''کیوں! تم چپ کیوں ہو؟'' کسی نے سوسن کو ٹوکا۔

''کیا بولوں! اس سلسلے میں میرا کوئی تجربہ نہیں ہے۔''

''وہ اصغر اور مراد؟'' طیبہ نے تیزی سے پوچھا۔

سوسن کا منہ گلنار ہو گیا تھا، ماتھے اور ہونٹوں کے اوپر پسینہ چھلک آیا اور کان کی لویں گرم ہو گئیں۔ وہ کچھ بول نہ سکی۔ اس پر یہ دونوں لڑکے مرتے تھے، مگر اس نے کبھی

بھی ان کی پرواہ نہیں کی تھی۔
''بھائی میرا تو خیال ہے میں شادی سے پہلے 'پریم جال' میں پھنسنے سے رہی۔ عشق تو شادی کے بعد خود اپنے شوہر سے کروں گی۔ تاکہ مستی سے کٹے اور محبت کا رنگ تیز اور مزہ چٹ پٹا......'' ملیحہ نے تالی بجا کر کہا۔
''اور اگر اتفاق سے ہو گیا تو؟'' پری نے شرارت سے پوچھا۔
''ہو گیا تو ہو جانے دوں گی، مگر دل میں رکھوں گی اس اتفاق کو۔ اس سے کہہ کر یا اظہار کر کے خود کو چھوٹا نہیں کروں گی۔'' ملیحہ نے بڑے یقین سے کہا۔
سوسن اُس کا منہ تکنے لگی۔ پھر مسکرا کر ہاتھ ملیحہ کی طرف بڑھایا۔ ''اپنا بھی یہی خیال ہے۔'' کہتے ہوئے اس نے اس کا ہاتھ زور سے دبایا۔
''جذبات! جذبات! مشینی دَور میں یہ پاگل پن! جیو کام کے لیے۔ کھانا پینا، سونا اور عشق کرنا سب طبعی ضرورتیں ہیں۔ انہیں ضرورت ہی رہنے دو۔ اپنے اُوپر ان جذبات کو حاوی کر کے اپنی صلاحیت، اپنا حسن، اپنی گرمی مت ضائع کرو۔ یہ دن، یہ رات دوبارہ تمہاری زندگی میں لوٹیں گے نہیں۔ بڑھاپے میں جسمانی تھکن کے ساتھ کچھ نہ کر سکنے کے ملال کا بوجھ بھی کندھوں پر ہوگا۔'' طیبہ نے مذاق اڑایا۔
''کیسے؟'' سوسن کا سوال اُبھرا۔
تم ساری جوانی، ساری توانائی سب کچھ جذبات پر، دماغی عیاشی پر خرچ کر رہی ہو۔ ہمیں دماغی سفر کے ساتھ اپنے وقت کی ضرورت، اس کی مانگ، اس کی فراہمی، اس کے سفر کا بھی خیال کرنا چاہئے۔'' طیبہ کا جواب تھا۔
''جذبات ہی تو رہ جاتے ہیں۔ جذبات ہی سب کچھ ہیں اور تم اسے دماغی عیاشی کا نام دے رہی ہو۔'' سوسن نے کہا۔
''اگر جذبات سب کچھ ہیں تو پھر اس مشینی دَور میں جی کیوں رہی ہو۔ شعر پڑھو، آہیں بھرو، آنسو بہاؤ اور لیلیٰ بنی جنگل جنگل کے پھل کھاتی پھرو۔ پھر اس سارے بناؤ سنگار، سارے آرام و آسائش، ان سارے لوازمات کی ضرورت کیا ہے؟ شروع ہو جاؤ، آج ہی دل کو ہتھیلی پر رکھ کر گھومنا۔ اس کے اشارے پر ناچو۔

دل کی بات مانو۔ اسی کی تسبیح پڑھو، پھر دیکھو کیا گل کھلتا ہے۔ دُنیا کے عاشقوں میں تمہارا بھی نام درج ہو جائے گا۔''

''کیوں نہیں، درحقیقت عشق تو ایسا بج ہے، جیسے ہی دل کی سرزمین پر پھوٹا، جانے کیسے کیسے معجزے دکھاتا ہے۔ لیلیٰ مجنوں، شیریں فرہاد آج بھی زندہ ہیں۔'' ملیحہ نے کہا۔

''زندہ ان کے لیے ہیں جو حقیقت سے فرار چاہتے ہیں، ورنہ شیریں کا عاشق بیچارہ فرہاد شہید ہوا، اس کے لیے نہر کھودتے کھودتے جس کی ایک جھلک ہی اس نے دیکھی تھی، اور وہ پہاڑی راستہ کھود ڈالا جس سے شیریں کے لیے دُودھ کی نہر بہائی جانی تھی۔ اور خسرو، جس پر شیرین خود فریفتہ تھی، وہ صرف اس کے حسن کا دیوانہ تھا۔ شیریں کا انکار، اس بات کا اشارہ تھا کہ رسمی طور پر شادی کے رشتے میں بندھنا چاہتی تھی۔ اتنی بات خسرو جیسا عاشق سمجھ نہیں پایا اور الجھن کو سلجھانے کے بجائے کئی بار شادی کرتا، شیریں کو اس طرح جلاتا، پڑھنے سننے میں ایک معمولی واقعہ لگتا ہے، جو حقیقت میں طبقاتی کشمکش کی داستان ہے۔ ایک طرف مزدور جان سے گیا، دُوسری طرف بادشاہ شیریں کی خواہش سمجھ نہ سکا کہ وہ پہلے شادی کرنا چاہتی ہے۔ یہ سب عورت کا استحصال ہے۔ ادھر مجنوں کا لیلیٰ لیلیٰ کرتے بھٹکنا بیکار کی جذباتیت ہے۔ تصوراتی ادب کا زمانہ گزر چکا۔ احساس کے تار، کسی دُوسری دُھن پر بھی بج سکتے ہیں۔ کسی ایک کو مرکز بنانا نادانی ہے۔'' طیبہ بولی۔

''تم عشق کو پہچانتی ہو؟ تمہیں عشق ہے کسی سے؟'' ملیحہ نے پوچھا۔

''ہاں، عشق کو پہچانتی ہوں میں۔ مجھے اس کائنات سے عشق عرفانی کی حد تک لگاؤ ہے۔ اسی عشق کو میں نے سارے جہاں میں بانٹا ہے۔ اپنے کام میں، کچھ دے کر جانے کی خواہش مستحکم ہے۔ میری زندگی کا نشانہ فقط مرد نہیں ہے۔ بلکہ مرد ایک ضرورت ہے۔ ایک غذا ہے، جو ہماری جسمانی اور جذباتی بھوک کا علاج ہے۔'' طیبہ کہتی گئی۔

''کیا بول رہی ہو...... پتہ ہے تمہیں؟'' اختر بولی۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ سچ یہی ہے۔ اگر عشق ہی سب کچھ ہے تو پھر روز ہوتے حادثات، طلاق، قتل، دھوکا، بے وفائی، خودکشی، سب مٹ جاتے۔ عشق ایک طے شدہ معاہدے کا نام ہے، جو کچھ وقت بعد خود ہی ٹوٹنے لگتا ہے۔ زندگی، وہ بھی آج کے دَور کی، کسی سے زندگی بھر ساتھ رہنے کا معاہدہ نہیں لکھوا سکتی ہے۔" طیبہ نے کہا۔

"تم میں ایک خلا ہے۔ تمہارے اَندر کا حسن مر چکا ہے۔" ملیحہ نے کہا۔

"صرف تمہارا وہم ہے ملیحہ! تم سب میں، سب سے زیادہ کام کرتی ہوں۔ خوش رہتی ہوں، زندگی جیتی ہوں۔ ہاں، بکواس نہیں کرتی ہوں۔ بھاری بھرکم الفاظ، گہرے گہرے فلسفوں سے لبریز رٹے رٹائے جملے نہیں بولتی ہوں۔" کتابیں اور پیکٹ سنبھال کر مسکراتی ہوئی طیبہ کھڑی ہوئی۔ "چلتی ہوں۔ شام کو نئے دوست ڈاکٹر شمس سے پہلی ملاقات طے ہوئی ہے۔ اس کے بعد بیٹھ کر ایک ڈیزائن بناؤں گی۔ ڈیزائن کے رنگ اور انداز شام کے گزرنے پر منحصر ہوں گے۔"

طیبہ چلی گئی۔ اس کی کوئی بات ان میں سے کسی کو بھی اچھی نہیں لگی۔ اصل میں تو یہ فلسفہ ہی ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ آخر کہہ کیا رہی تھی۔ سوسن کے دل میں خیال آیا، طیبہ تاجر ہے، اپنے کام کے لیے جذبات کے جھولے جھولتی ہے۔ نگی وہ اپنی بھی نہیں ہے۔ شاید عورت نہیں ہے وہ، بس ایک پرزہ ہے یا پھر یہ کہہ لو، پوری مشین جو بہترین چیزیں بناتی اور چھاپتی ہے۔

ملیحہ سوچ میں ڈوب گئی، کیسی ہے طیبہ؟ کہاں کہاں سے اس پر نچھاور ہونے والے بھنورے مل جاتے ہیں؟ اس کی نگاہ میں انسان اور مردہ چیزوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ آخر کیوں؟ مگر دُوسری طرف دوسروں کے دُکھ دَرد میں تڑپ جاتے والی طیبہ کیا حقیقت میں حساس دل کی مالک ہے یا صرف مرد کے لیے اس کا ایسا برتاؤ ہے۔

اختر پلنگ پر لیٹی چھت کی طرف ٹکٹکی باندھے دیکھ رہی تھی۔ "کیسی خوش قسمت ہے طیبہ! یہاں تو میرے پیچھے بھاگنے کو کوئی بھی تیار نہیں ہوگا۔ اللہ نے ایسی کنجوسی سے مجھے بنایا ہے۔ نہ ناک نقش اچھے، نہ رنگ روپ، کہنے کو کہنے والے کہتے ہیں کہ مجھ میں نمک غضب کا ہے۔ مگر ایسی نمک کی کھان سے کیا فائدہ؟ جب کوئی نظر اُٹھا کر ہی نہ

دیکھے۔ طیبہ، سوسن، ملیحہ، ان کے چہرے دودھ سے دھلے اور آنکھیں......؟ میری آنکھیں بھی چھوٹی ہیں ان کے مقابلے میں......!'' اختر کے سینے میں ہوک سی اٹھی۔

تینوں گم سُم، سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ سنتروں کے پھولوں کی خوشبو ہوا میں بسی ہوئی تھی۔ روحی خانم نے کمرے میں آ کر بجلی جلائی۔ ''کیا بات ہے؟ طیبہ گئی؟ میں کب سے چائے پر انتظار کر رہی ہوں، آؤ چلو نیچے۔''

سب کے چہرے اُترے ہوئے تھے۔ ان کے کہنے سے بھی جب کوئی نہ ہلی تو وہ بولیں۔ ''آخر تم سب کو ہوا کیا ہے، جو یوں بت بنی بیٹھی ہو؟''

تینوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا، پھر اپنی اپنی جگہ سے اٹھیں۔ اختر نے بھرپور انگڑائی لی۔ سوسن نے پیروں کے موزے ٹھیک کیے۔ ملیحہ نے گردن پر پڑا اسکارف ٹھیک کیا۔ تینوں نیچے آئیں۔ فرید بیٹھا ہوا چمچے سے جلترنگ بجانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''خالہ! اب ان لوگوں کی شادی کر دیں۔ ان کا دل گھر میں لگ نہیں رہا ہے۔ کہیں تو اپنے گھر کے سامنے والے بنیے سے بات کروں۔ دیکھنے میں خوبصورت ہے، آنکھ خراب ہے تو کیا! کمائی تو اچھی ہے، ڈنڈی مارتا ہے تو کیا! سودا سڑا دیتا ہے، کبھی کبھی گراہکوں کی گالیاں بھی کھا لیتا ہے تو برا کیا؟ کم سے کم مار تو نہیں کھاتا۔ بولیں خالہ کس کے لیے بات کروں؟''

ملیحہ نے بھائی کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تینوں کے لیے۔ تاکہ ہم تینوں مل کر آپ کے دوست کی پٹائی کر سکیں۔'' ملا جلا قہقہہ پڑا۔

''سنو ملیحہ! تمہارے خالہ زاد بھائی کے لیے ہم نے ایک لڑکی دیکھی ہے۔ بیچارے ہمیں لے کر بڑے دُکھی اور فکرمند رہتے ہیں۔ ہمیں بھی تو ان کے گنجے ہوتے سر اور اُداس ہوتے چہرے کی فکر کرنی چاہیے نا!'' اختر بولی۔

''ٹھیک ہے! مگر لڑکی ہے کہاں؟''

''ارے وہی نیدا......'' نیدا کے نام سے ہی سب ہنسی سے لوٹ پوٹ ہوگئیں۔ فرید کھسیانی ہنسی ہنستا ہوا سر پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ وہ کچھ کہنا چاہتا تھا، مگر خاموش رہا۔

اسے ڈر تھا، طنز سن کر اختر کے آنسو نہ نکل پڑیں۔ پیٹھ پیچھے وہ ملیحہ سے کہتا تھا، کہاں سے ڈھونڈی ہے یہ دوست؟ کسی چیز کی کوئی میچنگ نہیں ہے چہرے پر؟

روحی خانم نے ہونٹوں کے بیچ ہنسی دباتے ہوئے کہا۔ ''خدا کی مار ہو تم پر، بھائی سے کوئی اس طرح مذاق کرتا ہے؟''

''اور بھائی کو بہن کے ساتھ ہر قسم کے مذاق کی اجازت ہے، مامان! چہرہ تو دیکھو اس بیٹے کا، لگتا ہے جانے کب سے منھ نہیں دھویا ہے۔ کھونٹیوں کی طرح سارے چہرے پر داڑھی اُگی ہوئی ہے۔ چھی...... چھی......'' ملیحہ نے منھ بنایا۔

''توبہ! توبہ! لڑکیوں کی آنکھوں کا پانی مر گیا ہے۔ منگیتر کا کیسے ذکر کر رہی ہیں! شادی کے بعد کیا حال ہوگا؟'' فرید نے چہرہ بنا کر کہا۔

کھنکارتے ہوئے طباطبائی آغا کمرے میں داخل ہوئے۔ سب مؤدب ہو گئے۔ ٹھیک طرح سے بیٹھ کر چائے پینے لگے۔ دادا کے سامنے کوئی بھی شرارت نہیں کرنا چاہتا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اختر اور سوسن اپنے اپنے گھر چلی گئیں اور ملیحہ کچن میں ماں کا ہاتھ بٹانے لگی۔ طباطبائی آغا کی بھاری آواز کمرے میں گونجتی رہی۔ فرید ساری چلبلاہٹ بھول، بڑے نپے تلے انداز میں سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ ہر جواب پر 'ماشاء اللہ' سن کر اس کا دل کر رہا تھا، کاش! وہ تینوں بھی یہاں ہوتیں۔

کمرے کے بیچ میں قالین پر چیزیں سجی ہوئی تھیں۔ پورا گھر مہک رہا تھا۔ فرید مذاق کرتا اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا۔ مہمانوں سے گھر بھرا ہوا تھا۔ سب اپنے ہی لوگ تھے۔ آج ملیحہ کو لڑکے والے دیکھنے آنے والے تھے۔ لڑکا ابھی ابھی انگلینڈ سے لوٹا تھا۔ چونکہ ڈگری غیر ملکی تھی، اس وجہ سے ایران میں اس کی مانگ تھی۔ ابھی اس نے طے نہیں کیا تھا کہ لوٹ کر بیرونِ ملک بسے گا یا اپنے ملک ایران میں۔ بہرحال، ملیحہ کا دل گھبرا رہا تھا۔ خواہش اور خدشات کے بیچ وہ گھبرائی سی بیٹھی تھی۔ دِکھانے کو تو وہ ناول پڑھ رہی تھی، مگر اس کا ذہن کہیں اور بھٹک رہا تھا۔ اس کی طرف اختر کا دھیان بار بار جا رہا

تھا، جو قریب ہی بیٹھی گلدانوں میں پھول سجا رہی تھی۔ آخر تنگ آ کر بولی۔ ''ملیحہ جان! ذرا صفحہ تو پلٹ لو، پندرہ منٹ سے اسی لائن پر تمہاری نظر جمی ہوئی ہے۔''

ملیحہ شرم سے سرخ ہو گئی۔ طیبہ نے بھی آنے کو کہا تھا۔ سب کو انتظار تھا کہ آج طیبہ دیکھو کیا کہتی ہے؟ وہ تو ہمیشہ مذاق اُڑاتی آئی ہے کہ لڑکیوں کی ساری جوانی شوہر کے تصور میں کٹ جاتی ہے۔ ہر کام جو وہ کرتی ہیں، صرف شادی کے لیے کرتی ہیں کہ کہیں اچھی جگہ شادی ہو جائے۔

رسم کے مطابق جب ملیحہ چائے کے فنجان لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو بہت روکنے پر بھی اس کی لویں گرم ہو گئیں اور رُخساروں پر بھاپ کے بادل اُٹھنے لگے۔ اس نے سینی آگے بڑھائی۔ ایک زبردست قہقہہ بلند ہوا۔ اس نے سٹپٹا کر جو نظریں اوپر اُٹھائیں تو سامنے ماں کو دیکھ کر کھسیا سی گئی۔ بجائے مہمانوں کے آگے سینی بڑھانے کے اس نے سینی گھر والوں کے آگے کر دی۔ غلطی اس کی بھی نہ تھی، سر جھکائے تو کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ اس سادگی اور بھولے پن نے سب کے دلوں کو جیت لیا۔ منگنی کی تاریخ طے ہو گئی۔

ساتھ آئے ہوئے چھوٹے بھائی کے دوست کے ساتھ سوسن کی بات طے ہو گئی۔ دوسرے ہی دن وہ لوگ سوسن کے گھر پہنچ گئے۔

امتحانات کے نتائج آ چکے تھے۔ سبھی بہت خوش تھے۔ زیادہ تر لڑکے، لڑکیاں بیرونِ ممالک سفر پر جا رہے تھے۔ یونیورسٹی سے جانے والا سالانہ ٹور اِس مرتبہ یورپ جا رہا تھا۔ مہناز، طیبہ، اختر، پری اور صنوبر کو سوسن اور ملیحہ کی کمی بہت کھل رہی تھی۔ ان کی شادی ہو چکی تھی، اور اب وہ پہلے کی طرح ان کے پروگراموں میں شامل نہ ہوتی تھیں۔ جب کبھی ملنے کے لیے آتیں تو اپنے شوہر کے ساتھ آتیں، اس وجہ سے ماحول بڑا رسمی سا ہو کر رہ جاتا تھا۔ ملیحہ تو امتحان کے بعد ہی اپنے شوہر کے پاس انگلینڈ چلی گئی تھی۔ اسے گئے ہوئے بھی مہینہ بھر ہو چکا تھا۔

اس وقت چاروں بید مجنوں کے درخت کے نیچے کھڑی تھیں۔ مہناز کا خیال تھا کہ شاہِ رضا سڑک کی جانب چلا جائے، اسے کچھ نئے شیڈز کی لپسٹک لینی تھی۔ پرسوں صبح سویرے یورپ کے سفر پر روانہ ہو جانا ہے۔ کل جمعہ کی وجہ سے چھٹی رہے گی۔ پری کا کہنا تھا کہ گھر چلتے ہیں، کھانا کھا کر پھر نکلیں گے۔ بالآخر اختر نے فیصلہ کر دیا کہ کھانا باہر ہی کھاتے ہیں۔ ابھی گیارہ بجے ہیں، ڈیڑھ گھنٹے بعد دوکانیں بند ہوں گی، تب تک بھوک نہیں لگے گی۔ اس لیے پہلے شاپنگ کر لیتے ہیں۔ پھر وہیں کہیں بیٹھ کر کھانا کھا لیں گے۔ یہ طے کر کے چاروں باہر نکلیں۔ کار کا دروازہ آگے بڑھ کر مہناز نے کھولا۔ جیسے ہی بیٹھنا چاہتی تھی کہ سامنے سے اسے اسلم آتا دکھائی دیا۔ محسوس ہوا، وہ وہیں جم گئی ہے۔ دوسری طرف کھڑی اختر اور پری نے کار کے شیشے پر انگوٹھی بجا کر اس کا دھیان کھینچنا چاہا، مگر اسے جیسے کسی نے پتھر کا بنا دیا تھا۔

اسلم عطاپور نے یونیورسٹی میں ٹاپ کیا تھا۔ قریب سے گزرا تو اختر اور پری نے سلام کر کے مبارکباد دی۔ مہناز نے بہت چاہا کہ ان کا ساتھ دے، مگر حلق میں کچھ پھنس گیا تھا اور کانوں میں صرف دل دھڑک رہا تھا۔ پیچھے سے لگاتار ہارن دیتی کار کا دھیان ذرا سا بھی جو مہناز کو ہوا ہو۔

کار میں طیبہ تھی۔ اس نے ٹھیک مہناز کے نزدیک جا کر کار روکی اور زور سے چلائی۔ مہناز چونکی، مگر خود کو دو کاروں کے بیچ پھنسا دیکھ کر گھبرا گئی۔ طیبہ نے کار آگے نکال کر کھڑی کی اور نیچے اتری۔ اسلم نے آگے بڑھ کر طیبہ سے ہاتھ ملایا اور بڑی شائستگی سے اس کی خیریت پوچھی۔ ایک خاص طرح کے طلبا میں طیبہ کا احترام بہت زیادہ تھا، سب لڑکیاں اس حقیقت کو جانتی تھیں، مگر آج جانے کیوں مہناز کو بُرا لگا۔ تبھی اسلم نے ہاتھ میں پکڑے پیکٹ سے ایک کتاب نکالی اور طیبہ کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''میرا پہلا شعری مجموعہ......!''

طیبہ نے لے لیا، پھر تیزی سے صفحات پلٹتے ہوئے بولی۔ ''گیٹ اَپ تو اچھا ہے، کوَر بھی خوبصورت ہے۔ اچھی کتاب ہے، چھپائی بھی صحیح ہے۔''

''اندر کی نظموں کے بارے میں تو مہناز کچھ بولنا چاہے گی۔'' پری نے مہناز کی

دلی کیفیت کو سمجھتے ہوئے چھیڑا۔
''شاعری کی سمجھ سب میں نہیں ہوتی ہے، پری خانم۔ پتھر پر شاعری تحریر تو ہوسکتی ہے مگر نکلتی وہاں سے نہیں ہے بلکہ انسان کے دل سے اور اس کے جذبات کی گہرائی سے نکلتی ہے...... اور انسان کے دل پر ہی اثر ڈالتی ہے، پتھر کی بے جان، بے حس چٹان پر نہیں۔'' اسلم نے عجیب تیکھے انداز سے کہا۔ پری کے چہرے کا رنگ بدلا۔ مہناز کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ طیبہ تعجب سے کبھی اسلم اور کبھی مہناز کو دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک دم سے بول پڑی۔
''اسلم کی کتاب آئی ہے اور ہم یوں کھڑے ہیں۔ چلو کہیں بیٹھ کر جشن مناتے ہیں۔'' اس کے اتنا کہتے ہی سب نے مبارکباد دی اور پھر پانچوں نے سڑک پار کی اور سامنے ایک ریسٹورینٹ میں جاکر بیٹھ گئے۔ سبھی نے جان بوجھ کر ایسی نشستیں منتخب کیں کہ مہناز اور اسلم روبرو رہیں۔ چائے کے فنجانوں اور کیک سے میز بھر گئی۔
اختر نے طیبہ کے ہاتھوں سے اسلم کی کتاب لی اور مہناز کو دیتے ہوئے بولی۔
''دیکھو، کیا ان میں اسلم کی وہ نظمیں بھی ہیں جن کی تم دیوانی ہو؟''
یہ سن کر مہناز کا منھ لال بھبھوکا ہوگیا۔
''اسلم! مہناز تمہاری شاعری کو سمجھنے کی عجیب صلاحیت رکھتی ہے۔ مجھے تو کبھی کبھی حیرت ہوتی ہے، جیسے تم دونوں نے ایک ساتھ بیٹھ کر ان شعروں کی تخلیق کی ہو۔ خاص کر وہ نظم 'پیاس'۔ اس دن مہناز نے مجھے سنائی تھی۔ اس کی تشریح سب نے الگ الگ کی تھی، مگر جب جعفر نے تم سے معلوم کیا اور تم نے جو تشریح کی، وہ مہناز کی تشریح سے اس قدر قریب تھی کہ سن کر حیرت سی ہوئی تھی۔'' پری نے کہا۔
صنوبر بولی۔ ''سچ پری! تم نے میرے منھ کی بات چھین لی، عجیب اتفاق ہے۔''
طیبہ خاموشی سے سب کے چہروں سے کچھ پڑھنے کی کوشش کررہی تھی۔ اسلم کی آنکھوں میں حیرت وخوشی اور تجسس کی چمک رقص کررہی تھی، جو وہ چھپا نہیں سکتا تھا۔ مہناز کتاب کے ورق بہت آہستہ آہستہ پلٹ رہی تھی۔ سب باتوں میں اتنے محو تھے کہ مہناز اور اسلم کی کشیدگی کب ختم ہوئی، اس کا بھی علم نہ ہوسکا۔

ایک گھنٹے تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر طیبہ بولی۔ ''مجھے اسٹوڈیو جانا ہے۔''

''مجھے بھی بازار جانا تھا۔'' پری بولی۔

اسلم نے پیکٹ سے دوسری کتاب نکالی اور اس پر کچھ لکھ کر مہناز کی جانب بڑھا دی۔

''اب میری کتاب مجھے واپس کردو۔'' طیبہ نے کتاب میں ڈوبی مہناز سے کہا۔ مہناز چونکی، پھر اسلم سے کتاب لیتے ہوئے شکریہ ادا کیا، تبھی بیرہ بل لے کر آگیا۔ اسلم نے پرس نکالا تو طیبہ بولی۔

''یہ چائے مہناز کی طرف سے تھی۔''

مہناز نے گھبرا کر کہا۔ ''ہاں...... ہاں بالکل!'' اور پرس سے روپے نکالے۔ پری نے اختر کو شرارت بھرا اشارہ کیا۔ اختر مسکرا دی۔ سب باہر نکلے، تبھی پری بولی۔

''اب میں گھر جاتی ہوں۔ لنچ پر مہمان آرہے ہیں۔ صنوبر اور اختر کو اس کے گھر چھوڑتی جاؤں گی۔''

''پھر میں بازار......'' مہناز بولی۔

''تم اسلم کے ساتھ چلی جاؤ، مجھے اسٹوڈیو جانا ہے، ورنہ چلی جاتی...... پھر ملاقات ہوگی...... چلو تم لوگ...... خدا حافظ!'' کہہ کر طیبہ آگے بڑھی، اس کے پیچھے اختر اور پری بھی چل دیں۔

اس وقت اختر، پری اور صنوبر کے دل و دماغ میں ایک ساتھ ملیحہ کے الفاظ بازگشت کرنے لگے۔ ''ہم چیزیں جمع کرتے رہ جاتے ہیں، طیبہ انہیں لمحوں کو شکل دے دیتی ہے۔''

اس وقت بھی کیسے ایک لمحہ نے دو کناروں کو ملا دیا۔ دونوں کی کاریں آگے چوراہے پر سگنل کی وجہ سے رُکیں تو انہوں نے کار کے آئینے میں دیکھا کہ مہناز اور اسلم کار میں بیٹھ رہے ہیں۔

شام کو مہناز جب گھر میں داخل ہوئی تو اس کا عجیب سا حال تھا۔ اسے تمام زندگی بدلی بدلی سی لگ رہی تھی۔ کار پارک کر کے جب وہ اپنے گھر کے طویل وعریض باغیچے سے گزرنے لگی تو اسے محسوس ہوا کہ آج پھولوں اور شاخوں کے رنگ کیسے کھلے ہیں! ہر چیز نکھری اور دھلی ہوئی ہے۔ آخر کیوں؟

''کہاں تھی، مہناز؟ تمہارے بابا کافی دیر سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔''

''آئی ماما!'' مہناز نے تیزی سے قدم بڑھاتے ہوئے ماں کو جواب دیا، جو اُوپر کمرے کے سامنے والی بالکنی پر کھڑی تھی۔ مہناز اپنی سب سہیلیوں میں نہ صرف خوبصورت تھی بلکہ ذہین اور رئیس بھی تھی، مگر امیروں والی کوئی بات اس کے خاندان کے کسی فرد میں نہیں تھی۔ ہاں، اس کی بدحواسی اور کھوئے پن کو لوگ، جو اسے قریب سے نہیں جانتے تھے، اس کا غرور سمجھتے تھے۔ جبکہ وہ دل سے ایک بے حد سیدھی سادی معصوم سی لڑکی تھی۔ جدّی رئیس تھی، اس لیے نئے امیروں کی طرح بے لگام نہ تھی۔

باپ نے بیٹی کی پیشانی چومی اور اسے اپنے قریب بٹھاتے ہوئے بولے۔
''شاباش! رزلٹ اچھا آیا ہے۔ میں بہت خوش ہوں۔''

''مگر بابا! آپ کو کیسے معلوم ہوا؟''

''ہم سارے جہاں کی خبر رکھتے ہیں تو کیا اپنی بیٹی کی نہیں رکھیں گے؟'' کہہ کر مہناز کے بابا لال مخمل کے صوفے سے اُٹھے اور سامنے میز پر رکھا ڈبہ اُٹھا لائے اور مہناز کو دیتے ہوئے بولے۔ ''اپنی بیٹی کو ایم۔ اے فرسٹ کلاس پاس

کرنے کی خوشی میں۔"

مہناز نے جو ڈبہ کھولا تو دنگ رہ گئی۔ ہیروں کے درمیان جھلملاتے نیلے نگینے۔ "کتنا خوبصورت ہے، بابا! مجھے بہت پسند آیا...... بہت!" کہہ کر مہناز نے باپ کے دونوں گالوں کو چوم لیا۔

باپ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔ وہ بولے۔ "تم میری واحد اولاد ہو۔ لڑکے اور لڑکی دونوں کی خوشی تم نے مجھے دی ہے، میں خوش نصیب باپ ہوں...... ہاں بیٹی...... رات کو اختر مرزا کے گھر کھانے پر جانا ہے، تیار رہنا، میں جا رہا ہوں۔ کچھ کام ہے۔ سات بجے تک لوٹ آؤں گا۔"

"بہت اچھا بابا!" مہناز نے کہا اور وہ ڈبہ اُٹھایا۔ ماں نے بھی اسے لپٹایا۔ انہیں بھی پیار کرتی ہوئی مہناز اپنے کمرے میں چلی گئی۔

"کیسے عجیب دن ہیں!" اس نے آئینے میں خود کو سراہا۔ اسلم کا اسے دھیان آیا، کیا اسی احساس کو......؟ اس نے دروازہ بند کیا اور پری کا نمبر ملایا۔

"ہیلو! پری، میں مہناز بول رہی ہوں۔"

"ہاں! کیسی ہو؟ کیا کچھ کام ہے جو فون کیا ہے؟" اُدھر سے نیند میں ڈوبی آواز اُبھری۔

"نہیں، کام کیا ہوگا، بس تمہاری خیریت معلوم کرنی تھی۔ کیسی ہو؟"

"اچھا، سمجھ گئی۔" پری کا کھنکتا قہقہہ سنائی دیا۔ "کب لوٹیں؟ اسلم چھوڑنے آیا تھا؟" پھر ہنستی ہوئی بولی۔ "تم ٹھیک تو ہو؟ مجھے الٹا تمہاری خیریت پوچھنی چاہیے تھی۔" پری ہنسے جا رہی تھی۔ "اور تم میری خیریت پوچھ رہی ہو۔"

"میں ٹھیک ہوں۔ مگر معلوم نہیں......" اتنا کہہ کر مہناز نے رونا شروع کر دیا۔

"کیوں، کیوں کیا ہوا؟ پھر کچھ کہہ دیا گیا؟" پری نے پوچھا۔

"نہیں۔ نہیں ایسی کوئی بات نہیں، مگر سب کچھ اتنا اچھا ہے اور مجھے کچھ ہو رہا ہے۔ میں نہیں جانتی، پری کہ......" باقی الفاظ رونے میں ڈوب گئے۔

"تم آرام سے روؤ، میں سن رہی ہوں، تمہارے آنسوؤں کی زبان سمجھ رہی

ہوں۔'' پری نے نہایت سنجیدگی سے کہا۔ مہناز ناک سڑکتی، کاغذ کے بھیگے نیپکن بار بار بدلتی، بہتے آنسوؤں کو خشک کررہی تھی۔ جب آنسو کچھ رکے تو بولی۔ ''مجھے معلوم نہیں......!''

''معلوم کیوں نہیں تمہیں! عشق کی یہی زبان ہوتی ہے۔ پوری کتاب پڑھ ڈالو مہناز! ابھی تو پہلا سبق ہے۔ عشق کا ہونا، پھر اس کی کیفیات کا کسی سے اظہار کرنا...... آج دُوسرے سبق کی شروعات تم نے کردی ہے۔ زندگی کی خوشیوں سے دامن بھرلو، مہناز......! میری دوست، فنا ہو جاؤ۔'' پری نے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''معلوم نہیں۔'' مہناز نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے، تم اطمینان رکھو۔ پھر کبھی اس طرح سے رونا آئے تو فون کر لینا۔ تم تو جانتی ہو کہ میں تمہارے رونے کی گُنگ زبان سمجھتی ہوں، سمجھیں؟''

''تم ہمیشہ مذاق کرتی ہو۔'' مہناز نے کہا۔

''خیر! پرسوں صبح ملاقات ہورہی ہے، باقی باتیں تب کریں گے۔'' پری نے کہا۔

''میں ٹور پر نہیں جارہی ہوں، وہ...... اسلم بھی نہیں جارہا ہے تو...... میں نے سوچا کہ......'' مہناز نے تھوڑا جھجکتے، شرماتے ہوئے کہا۔

بہت تیز نکلے تم لوگ...... خیر، تیسری دوست بھی کام آگئی۔ ہم اب کُل تین بچے ہیں۔ طیبہ تو پہلے سے ہی کام سے عشق کررہی ہے۔ اس کا شمار ہی کیا!''

''سنو، تصویریں ضرور لانا، تاکہ پتہ چل سکے کہ تم لوگ کہاں کہاں گھومی ہو۔''

''ٹھیک ہے۔ ایک مہینے کے لیے بائے بائے۔ اپنا اور اپنی شاعری کا دھیان رکھنا...... کہیں پھر کچھ بدحواسی میں، خیر...... خدا حافظ!'' پری نے کہا۔

''اچھا! سفر بخیر ہو۔ اختر کو سلام کہنا، خدا حافظ!'' مہناز نے فون رکھ دیا اور بستر پر دراز ہوکر چھت کو تاکنے لگی۔

''مہناز! تیار ہوگئی کیا؟'' ماں کی آواز سے مہناز اُٹھ بیٹھی۔ وہ دروازہ کھٹکھٹا رہی تھیں۔

''اوہ، سات بج گئے!'' وہ چونک پڑی، اس نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ پھر بولی۔

''نہیں ماماں!''

''کمرہ بند کر کے پھر کیا کر رہی تھی؟''

''آنکھ لگ گئی تھی۔ پورے دن گھومنے سے تھک سی تھی۔''

''خیر حمام گرم ہے، نہالو۔ وہ نیلی ڈریس پہننا اور نیا سیٹ۔ شہر بھر کے بڑے بڑے لوگ وہاں جمع ہوں گے۔''

''آخر اختر چچا کس خوشی میں دعوت دے رہے ہیں؟''

''ان کا بیٹا سلیمان پانچ سال بعد جرمنی سے لوٹا ہے۔ وہ خوشی منا رہے ہیں۔ ہماری طرح، جیسے ہماری بیٹی نے ایم۔اے کرلیا ہے۔ کل ہمارے یہاں دعوت ہے۔''

دونوں ماں بیٹی تیار ہوکر ٹھیک آٹھ بجے نیچے آگئیں۔ اسی وقت ناصر زراعتی آگئے۔ وہ دونوں کار میں بیٹھ گئیں۔ ناصر زراعتی دیر سے پہنچنے کی وجہ بتاتے رہے۔ مہناز اپنے خیالات میں ڈوبی رہی۔

''مجھے لگتا ہے کہ مہناز کو لڑکا پسند آگیا ہے۔'' ناصر زراعتی نے رات کی دعوت سے لوٹ کر نسرین خانم سے کہا۔

''شاید...... ویسے وہ باتیں ہی کب کسی سے کرنا پسند کرتی ہے۔ مگر آج مجھے خود بھی تعجب ہوا کہ بہت آرام سے اس نے سلیمان سے باتیں کیں۔'' نسرین خانم نے کہا۔

''لڑکے کو میری لڑکی ضرور پسند آئی ہوگی! مجھے تو مہناز کی فکر ہے۔''

''میری لڑکی ہزاروں میں ایک ہے۔''

''کل گھر میں ذرا غور سے دیکھنا دونوں کو۔''

''دیکھنا کیا ہے، پوچھ لیتے ہیں۔''

''ابھی نہیں۔ اگر پسند کا اندازہ ہوتا ہے تو پوچھیں گے، ورنہ کوئی اور لڑکا سہی۔''

''خیر! لڑکا بُرا نہیں ہے، مگر اتنا اچھا بھی نہیں ہے جو ہم مہناز پر زور ڈالیں۔ اس کی اپنی مرضی پر ہے۔''

''اپنی مرضی کیسی! آج تک کسی لڑکے کو دوست تک تو بنا نہیں سکی۔ مرضی.......
ہماری مرضی پر چھوڑ دے گی۔'' ناصر زراعتی نے کہا۔
''ہوں۔'' نسرین خانم نیند میں ڈوب گئی۔

شام کی پارٹی میں بہت رونق تھی۔ مہناز خوب کھل رہی تھی۔ وہی مہناز، جو کسی لڑکے کے بولنے پر ابروئیں تان لیتی تھی، اس وقت سلیمان سے خوب ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اختر اور پری آئی تھیں اور آپس میں بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ مہناز کی نظران پر نہیں پڑی۔ وہ جان بوجھ کر شاخوں کی آڑ میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

''ہم یوں ہی رہ جائیں گے، اختر جان؟'' پری بولی۔

''اس طرح دل چھوٹا مت کرو۔ اس کے بعد تمہارا ہی نمبر ہے۔ دل چھوٹا مت کرو۔'' اختر نے کہا۔

''تم نے دلاسہ دیا ہے تو سمجھو، میرے نکلنے والے آنسو تھم گئے۔'' پری نے منھ شرارت سے بسورتے ہوئے کہا۔

''تم کب آئیں؟'' مہناز نے آکر حیرانی سے پوچھا۔

''آپ کی بلا سے۔'' پری نے بناوٹی غصے سے کہا۔

''تم کو جب ہماری فکر ہو تب نا!'' اختر نے کہا۔

''اسلم کی جگہ پر یہ ڈمی کون ہے؟'' پری نے پوچھا۔

''چپ! بابا کے دوست اختر مرزا کے بیٹے سلیمان مرزا ہیں۔ حال ہی میں جرمنی سے آئے ہیں۔''

''ویسے ہیں بے حد حسین! ذرا ملاقات تو کرا دو۔'' پری چھیڑنے لگی۔

''ابھی لو! اٹھو بھی۔'' تینوں آگے بڑھیں۔

''یہ میری سہیلیاں ہیں۔ پری...... اور یہ اختر اور آپ ہیں......''

''سلیمان مرزا۔'' پری نے درمیان میں ہی ٹوک کر جملہ مکمل کر دیا۔

''پری ہماری سب سہیلیوں میں سب سے شرارتی اور اتنی ہی نرم دل ہے۔''
مہناز نے کہا۔

''لیجیے، اِدھر دیکھئے۔'' اختر نے مہناز کو کہنی ماری۔ مہناز کا سارا خون چہرے پر جمع ہو گیا تھا۔ اسلم کالے سوٹ میں بہت خوبصورت لگ رہا تھا۔ چہرے پر ہلکی سی گھبراہٹ تھی۔ نظریں کسی کی متلاشی تھیں۔

مہناز کے والد وہیں کھڑے تھے بولے۔ ''آؤ بیٹے! میں ناصر ہوں، مہناز کا والد۔''

''میں مہناز کا کلاس میٹ اسلم عطاپور ہوں۔''

''آؤ، تمہیں مہناز کے پاس لے چلتا ہوں۔'' ناصر زراعتی بولے۔ مہناز کا خود کو سنبھالنا مشکل ہو گیا۔ وہ تیزی سے مڑی اور گھبراہٹ بھری خوشی میں پاس کے کمرے میں گھس گئی۔

ناصر زراعتی پری، اختر اور سلیمان کے پاس گئے اور مہناز کو وہاں نہ پا کر سب کا تعارف سلیمان سے کرایا۔ پھر مہناز کو دیکھنے آگے بڑھ گئے۔ کافی دیر گزرنے کے بعد جانے کہاں سے مہناز ٹپک پڑی اور اسلم کے قریب کھڑی ہو گئی۔ ''آیئے، آپ کو اپنا کتب خانہ دکھاؤں۔''

''چلئے۔'' کہہ کر اسلم آگے بڑھا۔ دونوں ہال سے باہر نکل گئے۔ کمرہ کیا تھا، علم کا خزانہ تھا۔ اسلم کو اپنے والد کا کتب خانہ اِس کے سامنے پھیکا لگنے لگا۔ طرح طرح کی تصویریں، مورتیاں اور عجیب سا عرفانی ماحول تھا۔ کتابوں کی الماری سے ٹیک لگا کر شرماتے ہوئے مہناز بولی۔

''بابا اور میں شام کو اکثر و بیشتر یہیں آ کر بیٹھتے ہیں۔ بچپن سے اب تک میں نے جانے کتنی کتابیں پڑھ ڈالی ہیں! ہزاروں کی تعداد میں، لیکن بابا ہمیشہ کہتے ہیں کہ علم کا سمندر لامحدود ہے۔ اسے پینے کے لیے انسان کے پاس وقت نہیں ہے۔ اس طرف میرے دادا کی کتابیں ہیں۔ زیادہ تر عربی میں ہیں۔ وہ بہت مشہور حکیم تھے۔ شاید نام سنا ہو آپ نے، منصور زیراعتی۔ یہ میرے والد کی کتابیں ہیں۔ ان کی غزلوں کا مجموعہ، جانے کیوں شائع نہیں کراتے؟ یہ میرے پرنانا کی کتابیں ہیں۔ تمام مذہبی ہیں اور یہ

ہیں میرے چچا اور ماموں کی...... یہ ہے آپ کی کتاب...... پورا شیلف میں نے خالی رکھا ہے میں چاہتی ہوں کہ یہ آپ کی کتابوں سے بھرے...... فی الحال خالی جگہ کو سجانے کے لیے میں نے یہ پتھر کی مورتی رکھ دی ہے۔'' مہناز کا چہرہ جذبات کی شدت سے اسلم کو فانوس کی طرح لگ رہا تھا، جس کے شیشے روشنی میں ہزاروں رنگ بکھیرتے ہیں۔

اسلم کو محسوس ہوا کہ اس کے وجود میں مہناز عجیب طرح سے پگھل رہی ہے۔ بہت دیر تک وہ مہناز کو دیکھتا رہا۔ اتنی خوبصورت اور اتنی کھوئی ہوئی شخصیت کے اندر اتنی دانائی، اتنا علم اور اتنا حساس دل، کیسی نازک روح ہوگی مہناز کی؟

''تم لوگ یہاں ہو، سب وہاں پوچھ رہے ہیں۔'' ماں نے آ کر کہا، پھر وہ بھاری سینی اُٹھائے باہر نکل گئی۔

''چلیے۔''

''چلو۔''

دونوں باہر نکل گئے۔

دعوت کے بعد، سونے سے پہلے ناصر اور ان کی بیوی میں باتیں ہوئیں۔

''تمہیں کچھ اندازہ ہوا؟''

''مجھے لگتا ہے، مہناز کو سلیمان پسند ہے۔''

''تو پھر میں اختر مرزا سے کہہ دیتا ہوں۔ مجھے بھی یقین ہو گیا ہے۔ اب تو پوچھنا ہی بیکار ہے مہناز سے۔''

''پوچھنا کیا ہے! سلیمان میں کیا کمی ہے؟''

''بس، تم تیاری کرو، منگنی کی تاریخ اگلے ہفتے کی رکھ دی جائے؟''

''ٹھیک ہے۔''

''میں پی۔ایچ۔ڈی باہر سے کرنا چاہتا ہوں، لیکن......'' اسلم نے ایک روز مہناز سے کہا۔

''لیکن کیا۔۔۔؟'' مہناز نے پوچھا۔
''اکیلے نہیں جانا چاہتا ہوں۔'' دھیرے سے اسلم بولا۔
''پھر......'' مہناز کی پلکیں لرز گئیں۔
''دیکھو! بابا سے آج بات کروں گا۔'' اسلم نے سوچتے ہوئے کہا۔
''میرے بابا تو ایک ہفتے کے لیے یورپ گئے ہوئے ہیں۔'' مہناز نے نظریں اُوپر اُٹھائیں۔

مہناز اور اسلم روز ملتے تھے، لیکن آج تک ان میں کھل کر قول و قرار ہوا اور نہ ایک دُوسرے سے کھل کر انہوں نے کچھ کہا، جو اکثر و بیشتر ایک دُوسرے کو پسند کرنے والے کہتے ہیں۔ یہاں تو ایک ایسی خاموش لیکن دائمی محبت تھی جسے زبان کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ اس وقت بھی وہ ادھورے جملے، چھوٹی چھوٹی باتیں مگر گہرائی سے پُر اور بڑے بڑے اہم فیصلے کر رہے تھے۔ عشق ان کا پہلا تجربہ تھا۔

نسرین خانم اور ناصر زراعتی کو بیٹی کی طرف سے پورا اطمینان ہو گیا تھا کہ اسے سلیمان پسند آ گیا ہے۔ دونوں دوستوں میں بات طے ہو گئی۔ منگنی کی تاریخ بھی طے ہو گئی۔ دونوں طرف سے انگوٹھی کے ہیرے کی تلاش شروع ہو گئی تھی۔ ان چیزوں سے بے خبر، بدحواس مہناز اپنے آپ میں کھوئی رہی۔

شام کو جیسے ہی ناصر زراعتی بیرون ملک سے لوٹے، انہیں مرزا کا فون ملا کہ منگنی کی تاریخ بدلنی پڑے گی، کیونکہ یکا یک سلیمان کو تار ملا ہے، اس لیے کسی ضروری کام کی وجہ سے، اگلے ہفتے بیس دن کے لیے جرمنی جانا پڑ رہا ہے۔

''ٹھیک ہے، جلدی کیا ہے! جلدی کا کام تو شیطان کا ہوتا ہے۔'' یہ کہہ کر ناصر زراعتی نے دیگر باتیں شروع کر دیں۔ رات کے کھانے پر انہوں نے بیوی کو ساری باتیں بتائیں۔ اپنی منگنی کی بات سن کر مہناز بہت فکر مند ہوئی۔ کیسے کہے سب کچھ؟ اس سے کھانا نہیں کھایا گیا۔ سر درد کا بہانہ کر کے وہ کمرے میں چلی گئی۔

جاتے ہی پری کو فون ملایا۔

''پری! سلیمان کی منگنی طے ہو رہی ہے۔'' کہہ کر وہ رونے لگی۔

''تو اس میں تمہارے رونے کی کیا بات ہے؟'' پری نے حیرانی سے پوچھا۔

''میرا تو سیدھا......'' مہناز پھوٹ پڑی۔

''بھئی دیکھو! سلیمان کی منگنی، تمہارا رونا...... پھر وہ تمہاری شاعری! میں خود پاگل ہو رہی ہوں...... کہیں وہ ڈی صاحب تمہارا دل تو نہیں......'' پری کے اتنا کہتے ہی مہناز چیخ پڑی۔

''شٹ اپ! منگنی مجھ سے ہونے والی ہے اور میں......'' مہناز جھنجھلا گئی۔

''اب بھی! بات تو سیریس ہے۔ فوراً بابا کو بتا دو، بلکہ اسلم کو بابا سے ملوا دو۔ وہ سمجھدار ہیں، خود سمجھ جائیں گے۔ پریشان مت ہو۔'' پری کی باتیں سن کر مہناز چپ ہو گئی۔ رات کو اس نے سارا پروگرام دل ہی دل میں بنا ڈالا۔

صبح ناشتے کی میز پر مہناز نے پوچھا۔

''بابا، آپ شام کو گھر پر رہیں گے نا؟''

''ہاں بیٹے! کیوں کچھ کام ہے؟''

''نہیں بابا، ایسے ہی پوچھ لیا۔''

مہناز نے اسلم کو فون کیا، کہ وہ شام کو گھر، چائے پر آ جائے۔ اس کے دل میں خواہش تھی کہ بابا آج اسلم کو پسند کر لیں...... دوسری طرف اسلم بھی اسی سوچ میں غرق تھا کہ اکتوبر سے پہلے اگر سب کچھ طے ہو گیا تو وہ دونوں ساتھ ساتھ بیرونِ ملک جا سکتے ہیں۔

شام سے پہلے ہی ناصر زراعتی کا ٹیلی فون آیا اور وہ کسی ضروری کام سے باہر چلے گئے۔ شام کو کافی دیر تک اسلم بیٹھا رہا، لیکن ناصر زراعتی سے ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کا فون تقریباً آٹھ بجے مہناز کے نام آیا کہ اب وہ گیارہ بجے تک آئیں گے۔ کچھ پریشانی آ پڑی ہے۔ اسلم اور مہناز کافی دیر تک باہر باغ میں چائے پیتے ہوئے باتیں کرتے رہے۔ مگر کب تک بیٹھتے۔ نسرین خانم کئی بار اشاروں میں رات زیادہ

ہونے کی بات کہہ چکی تھیں۔

اسلم کے جانے کے بعد وہ بولیں۔''بڑی دیر بیٹھ گیا تمہارا کلاس میٹ۔'' مہناز نے کوئی جواب نہ دیا۔ بس کتاب میں ڈوبی رہی۔ رات کو ناصر زراعتی نے بتایا کہ انہیں صبح ہی بیرونِ ملک جانا ہے۔ بہت ضروری کام ہے۔

اسلم کا جانا ضروری تھا۔ ادھر کیمبرج یونیورسٹی میں اس کا داخلہ ہوگیا تھا۔ ادھر مہناز کے والد سے بات نہیں ہو پائی تھی۔ وہ بات کیا کرے؟ مردہ دل سے اسلم بیرونِ ملک چلا گیا۔ مہناز پھر اختر، طیبہ اور پری کے ساتھ زیادہ وقت گزارنے لگی۔ چاروں نے پی۔ ایچ۔ ڈی کے لیے درخواستیں دی ہوئی تھیں۔ کسی وجہ سے ابھی تک کچھ معلوم نہ ہو سکا تھا۔ یہ اندازہ تو انہیں ہورہا تھا کہ یونیورسٹی کے ماحول میں اندر ہی اندر بہت کچھ اُبل رہا ہے۔ مگر کیا؟ یہ صحیح صحیح پتہ نہیں چل پا رہا تھا۔

آج بھی جب وہ چاروں یونیورسٹی سے لوٹ رہی تھیں، راستوں میں کچھ لڑکوں کے جھنڈ انہیں نظر آئے، پھر کتابوں کی دُکان پر اسلحہ سے لیس کچھ پولس والے! وہ چاروں تیز قدموں سے چلتی ہوئی آگے بڑھیں اور کاروں میں بیٹھ گئیں۔ اس سے پہلے کہ ہنگامہ بڑھ جائے وہ اپنے اپنے گھر پہنچ جانا چاہتی تھیں۔

ناصر زراعتی کی اچانک موت کی خبر مہناز اور نسرین خانم کو کہیں اندر سے توڑ گئی۔ کیسے ہوا یہ سب۔ اس کا کوئی جواب نہ تھا اور جو جواب تھا اس پر انہیں یقین نہیں ہورہا تھا کہ ان کو قتل کرایا گیا ہے۔ ان کی کسی سے دشمنی نہ تھی۔ پھر ایسا کیا تھا؟ کسی اور کے دھوکے میں؟

سات سہیلیوں کے درمیان یہ پہلا غم تھا۔ مہناز اس ناگہانی صدمے سے ٹوٹ گئی تھی۔ موت کا تجربہ اسے خوفزدہ کر گیا۔ کوئی اپنا اس طرح رہتے رہتے یک لخت غائب

ہو جاتا ہے۔ طیبہ نے مہناز کے زخم پر پھایہ رکھا تھا، اسے سمجھایا تھا، لیکن کچھ باتیں وہ کھل کر نہیں کہہ سکتی تھی، جیسے انقلاب کا لاوا گزشتہ پچاس سالوں سے صبر و ضبط کی سخت زمین کے نیچے دہک رہا تھا جو جوالامکھی بن کر کسی بھی وقت پھوٹ سکتا تھا۔ شاید یہ طوفان سے پہلے کی اطلاع ہے کہ شاہی شیرازہ بکھرنے والا ہے۔ پھر مہناز، تمہارے والد کو کیسے چھوڑا جاسکتا تھا؟ لاکھ وہ بے قصور سہی، بے گناہ سہی، مگر تھے تو وہ جاگیردار خاندان اور شاہی دربار کے قریبی اور سامراجیت کے حامی۔ آج اسی ایک نشان کو مٹانے کا طوفان لاکھوں دلوں میں اُٹھ رہا ہے...... مت رو میری سہیلی...... میری بہن۔ اس کا بھی علم نہیں کہ اس ملک کے کتنے باشندوں نے اپنی زندگی کی قربانی دے ڈالی ہے؟ ایک دن آئے گا، جب تم اپنی ذاتی پریشانیوں سے نجات پاؤ گی، تب تمہیں یہ دُنیا سمجھ میں آئے گی۔ طیبہ یہ تمام باتیں چاہ کر بھی مہناز سے کہہ نہ سکی۔

ناصر زراعتی کی وفات کو آج دو ماہ گزر چکے تھے۔ ماں بیٹی کالے کپڑے پہنے بیٹھی تھیں۔ سلیمان کے والد تشریف لائے اور ماں بیٹی کی افسردگی دیکھ کر بولے تھے۔
''ناصر زراعتی کی آخری خواہش جتنی جلدی پوری ہو جائے، اُسی میں ہی بہتری ہے۔''
مہناز کی کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کرے؟ جب سے اسلم گیا تھا، اس کا کوئی خط بھی نہیں آیا تھا۔ اس کے پاس اسلم کا پتہ بھی نہیں تھا جو اسے حالات سے آگاہ کر دیتی۔ اس کی پریشانیوں کو سہیلیوں نے ماں کے سامنے رکھا تو انہوں نے کہا کہ جس کو گئے ہوئے دو ماہ گزر گئے ہوں اور وہ خط بھی نہ لکھے، اس کا کیسا انتظار؟
زخمی پرندے کی طرح مہناز بہت تڑپی۔ ماں کو منانے، سمجھانے کی تمام کوششیں بیکار ہو گئیں۔ ان کی دلیلوں کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ حالات کے سامنے اسے ہتھیار ڈالنے ہی پڑے۔
شادی کے بعد مہناز بھی جرمنی چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد اسلم کا خط آیا کہ وہ سخت بیمار ہو گیا تھا، دو مہینے اسپتال میں رہا۔ وہ کیسی ہے...... وغیرہ وغیرہ۔ وہ خط بھی

ماں نے ایران سے جرمنی بھجوا دیا، یعنی جب وہ سلیمان کے بچے کی ماں بننے والی تھی تب اس کو اپنی پچھلی زندگی کا جواب ملا۔ مہناز کیا جواب دیتی؟ اس نے وہ خط رکھ لیا اور پری کو تمام حالات لکھ کر پوچھا کہ حقیقتاً زندگی ہے کیا؟

ادھر جواب نہ ملنے پر کچھ دنوں بعد مارچ میں نوروز کی تعطیلات میں اسلم وطن واپس لوٹا۔ حالات کا علم ہونے کے بعد جیسے اس پر سکتہ سا طاری ہوگیا۔ کافی دیر تک تو اسے یقین ہی نہیں آیا کہ کیا ایسا ہوسکتا ہے؟ بار بار اسے خالی شیلف کے ایک کونے میں رکھی اپنی کتاب یاد آتی اور خالی جگہ کو پُر کرنے کے لیے رکھی گئی پتھر کی مورتی اور اس کے قریب کھڑی مہناز۔ نس نس میں، خون کی ایک ایک بوند میں صرف مہناز تھی۔ اس کی دھڑکن کی آواز، اس کے خیالات کا مرکز، یہ سب کیا ہوگیا اچانک سے؟
اسلم پھر بیمار پڑ گیا۔ اس کے آنے کے بارے میں مہناز کی سہیلیوں کو علم نہ ہو سکا، ورنہ ساری بات صاف ہو جاتی۔ کچھ دن ٹھہر کر اسلم لوٹ گیا۔

اختر نے پری کو فون کر کے بلایا۔ ''ملیحہ کا خط آیا ہے، وہ ایران لوٹ رہی ہے۔''
''کب تک؟'' پری نے پوچھا۔
''تمہاری شادی کے کئی مہینے بعد، سمجھیں؟''
''اُف! اس کو آنا ہی تھا تو ایسے وقت آتی جب......''
''کیوں نہ فون کر کے بات کر لی جائے!''
''خیال اچھا ہے، ملاتی ہوں۔''
''سنو! ایک بری خبر ہے......''
''کیا؟''
''ندا خانم کا انتقال ہوگیا۔ کل رات کو۔''
''ارے......!''

''دکھ جب زیادہ بڑھ جاتا ہے تو مذاق بن جاتا ہے۔ ندا خانم کی پوری زندگی تو چلتا پھرتا زخم تھی۔ ہم انہیں لے کر ہنستے تھے۔''

''لیکن دل سے ان کی عزت کرتے تھے۔'' پری نے دکھ سے کہا۔

''ان کا منگیتر، سنا ہے کہ آیا تھا، اپنے بچوں اور بیوی کے ساتھ۔''

''یا اللہ! انسان کو خدا نے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ لیکن دکھ جھیلنے کے لیے! اپنی اچھائیوں کی بھی بھاری قیمت چکاتا ہے۔''

''ابھی طیبہ ہوتی تو ایک جملے میں ہماری تمام باتوں کے جواب دے ڈالتی۔''

''وہ تو ہے!... ہاں یہ بھی سن لو، انہوں نے اپنی تمام جائداد منگیتر کے نام لکھ دی ہے۔ میں نے جب سے سنا ہے پاگل سی ہوگئی ہوں۔ کوئی اتنے لمبے عرصے تک ایک کمینے شخص کی ایک بات کے سہارے زندہ رہ سکتا ہے؟''

''کیوں نہیں رہ سکتا ہے؟ زندگی تباہ کرنے والا کیا بھلایا جا سکتا ہے؟ لیکن اس کمینے پر کیا اثر! وہ تو دولت پاکر خوش ہوگا۔''

''اچھا، کل رُدکی ہال میں ملاقات ہوگی۔''

''ٹھیک ہے...... خدا حافظ!''

''خدا حافظ!''

فون کا ریسیور رکھ کر پری ندا خانم کے خیالات میں ڈوب گئی۔ ندا خانم ایک بہت امیر ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ منگیتر نے ایک دن ان کے والد سے جاکر پوچھا کہ جہیز میں کیا کیا دیں گے؟ اس سوال میں پوشیدہ گستاخی نے انہیں دیوانہ سا بنا دیا، اور ہاتھ کی چھڑی سے انہوں نے اسے خوب دوڑایا تھا۔ باپ کا غصہ اور غرور رہ گیا۔ منگیتر کا لالچ اور کمینہ پن رہ گیا۔ نہیں رہ پائی تو ندا خانم کی زندگی۔ ان کے سینے پر مونگ دلنے کے لیے وہ کسی اور لڑکی کے ساتھ پڑوس میں آتا جاتا تھا۔ پھر شادی بھی اسی سے کرلی۔ لیکن اس درمیان ایک لفظ بھی ندا سے اس نے نہیں کہا تھا، جیسے منگنی کے بعد جو بھی کہتا رہا تھا، وہ جہیز کی اُمید میں۔ جب بات بگڑ گئی تو کچی سیاہی سے لکھی تختی کی عبارت بھی ڈھل گئی۔ والد بھی انتقال کر گئے۔ بے شمار دولت پر ندا خانم تنہا رہ

گئیں۔ اختر کے گھر جب بھی وہ آتی تھیں تو ایک بات بار بار دہراتی رہتی تھیں اور مسکراتی رہتی تھیں، جیسے وہ سارے غم کو مسکان کے ٹانکوں سے سی ڈالیں گی...... اور آج اس غم کا آخر ہو گیا۔ کس کو کیا ملا؟ کسی نے راحت پائی، کسی نے دکھ...... سب اپنا حصہ پاتے ہیں۔ پری سوچ میں ڈوبی رہی۔

پری کی شہناز سے جب پہلی ملاقات ہوئی تھی تب شہناز کی ماں کو بیوہ ہوئے چھ ماہ کا عرصہ گزر چکا تھا کہ بھائی بھی چل بسے۔ بہت چاہنے پر بھی وہ پڑھائی کو آگے جاری نہ رکھ سکی۔ کام کی تلاش تھی، کام مل جائے تو وہ ماں کو کردستان سے وہیں بلا لے گی۔ کردستان میں بھی ہنگامے بڑھ رہے تھے۔

پری نے اس شام کو شہناز سے کہا۔ ''کیہان اخبار میں ایک صحافی کی ضرورت ہے...... کیا خیال ہے جناب کا؟''

''خیال اچھا ہے۔ کل ہی جاتی ہوں۔'' شہناز نے اسی انداز میں لہرا کر کہا۔

''چلنے سے پہلے ذرا فال دیکھ لیتے ہیں۔ دیوانِ حافظ کہاں ہے؟''

''یہ رہا۔''

''مانگو۔'' کہہ کر پری نے ہونٹوں ہی ہونٹوں میں حافظ کی محبوبہ شاخِ نبات کو یاد کیا۔

''مانگ لیا۔'' کہہ کر شہناز نے آنکھیں بند کرلیں۔

''واہ......! غزل بہت اچھی نکلی ہے۔'' کہہ کر پری نے فال نکالا۔

''زور سے پڑھو۔''

''تمہاری نوکری پکی...... خود پڑھ لو یہ شعر۔''

''خیر! میرا کام بن گیا، تمہارا کیا بننے والا ہے پری خانم!''

''ہم پری ہیں، جادوئی دُنیا میں رہتے ہیں۔ ہمیں کوئی دُکھ نہیں ہے۔'' پری نے ہنستے ہوئے کہا۔

''دُکھ ہوا بھی تو تم جھیل جاؤ گی۔ کافی گہری ہو۔ ایک دم گہرا کنواں۔ بس بیٹھے

پانی کے علاوہ اپنی گہرائی کسی کو لینے نہیں دیتی ہو۔'' شہناز نے کہا۔

''چلو فلم دیکھنے چلتے ہیں۔'' پری نے کہا۔

''چلو۔''

دونوں باہر نکلیں۔ گلابی سردی کی شروعات تھی۔ لال، پیلی، ننھی پتیاں شاخوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر درختوں سے گر رہی تھیں۔ ہوا میں پکے پھلوں کی خوشبو بسی تھی۔

''کون فلم دیکھے ایسے موسم میں...... چلو ٹہلتے ہیں۔'' پری نے کہا۔

''تم پروگرام مت بدلا کرو، موڈ خراب ہو جاتا ہے۔'' شہناز نے کہا۔

''موڈ کی نہیں، جان کی خیر مناؤ۔ میں تو تمہارے بھلے کے لیے کہہ رہی تھی۔''

''میرا بھلا......؟''

''اور نہیں تو کیا؟ ریکس سنیما آبادان کی آگ یاد ہے۔ بچے، عورتیں تڑپ تڑپ کر مرے تھے۔ تم اکلوتی ہو اپنی ماں کی۔'' پری نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

شہناز بھی سوچ میں پڑ گئی، پھر بولی۔ ''تمہاری شرارت کا کوئی جواب نہیں۔ خود جانا نہیں چاہتی ہو تو......''

''چلو، میں تو تمہارے......''

''خیر، چھوڑو۔ اتنا سب سن کر کون جائے گا! چلو 'فرح' پارک چلتے ہیں۔''

''چلو......'' پری نے کہہ کر اپنی ہنسی دبائی۔ پارک کے باہر بھٹے بک رہے تھے۔ دونوں نے خریدے اور پارک میں گھومنے لگیں۔ شام ڈھل رہی تھی، پھولوں کی خوشبو سے باغ مہک رہا تھا۔ فوارے کھلے ہوئے تھے۔ بید مجنوں کے درختوں کی شاخیں زمین کی طرف جھکی جھوم رہی تھیں۔ دونوں بھٹے کھاتی ہوئی بینچ پر جا کر بیٹھ گئیں۔ قریب سے لڑکوں کا جھنڈ گزرا۔

دونوں کو تنہا بیٹھا دیکھ کر لڑکے چھیڑ چھاڑ کرتے ہوئے گزر گئے اور آگے فٹ بال ٹیم میں شامل ہو گئے۔

''ہمارا کوئی بھائی ہی نہیں۔'' پری نے کہا۔ شہناز چپ بیٹھی رہی۔ بھٹا ختم ہو گیا تھا۔ دونوں کھڑی ہو گئیں۔ گھاس اور درختوں کے سائے سے گھری پگڈنڈیوں پر سے

گزرتے ہوئے پری نے انقلابی شاعر احمد شاملو کی نظم 'شبانہ' کو پڑھنا شروع کر دیا۔

جب اس نے نظم ختم کی تو شہناز بولی۔ ''اب نادر نادر پور کو سناؤں؟''

''سناؤ۔''

نظم پڑھتی، شعر سناتی وہ دونوں کافی دیر تک ٹہلتی رہیں۔

''آٹھ بج رہے ہیں۔''

''چلو واپس چلتے ہیں۔''

''آئس کریم کھاؤ گی؟''

''ہاں۔'' دونوں نے آئس کریم لی اور کھاتی ہوئی باغ سے باہر نکلیں۔

''آج کل تمہاری سہیلی طیبہ نظر نہیں آ رہی ہے؟''

''معلوم نہیں، رہتے رہتے اچانک کہاں غائب ہو جاتی ہے۔''

''اختر مشہد سے لوٹ آئی؟''

''ابھی نہیں۔''

''بڑے دن لگا دیے؟''

''کچھ کام پڑ گیا ہوگا۔''

''ہو سکتا ہے۔''

پری نے شہناز کو اس کے گھر پر چھوڑا اور خود اپنے گھر کی جانب چل پڑی۔ راستے بھر وہ سوچ میں ڈوبی رہی۔ دُور سے کہیں گولی چلنے کی آواز آئی، کیا ہوا پھر؟ اس نے کار کی رفتار تیز کر دی۔ شہناز قدیم تہران کے ایک غریبوں کے محلے میں اپنی خالہ کے یہاں رہتی تھی۔ اس کی کار کو دیکھنے کے لیے چھوٹے اور کچے گھروں سے جھنڈ کے جھنڈ باہر نکل آتے تھے۔ لڑکیاں چادر کی اوٹ سے اسے دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھیں۔ آتے وقت تو وہ اپنی کار سڑک پر کھڑی کر کے، اس گلی کی طرف کافی دُور پیدل چل کر آتی تھی۔

گھر پہنچ کر اس نے جو پہلا کام کیا، وہ تھا نہانا۔ جی بھر کر نہائی، اس کے بعد ماں کے پاس جا کر بولی۔ ''مامان! بابا کب لوٹیں گے؟ آج تو لوٹنے والے تھے۔ فون آیا کیا؟''

"کل صبح آ رہے ہیں۔" ماں نے سوئٹر بنتے ہوئے کہا۔

پری کی ماں سوتیلی ہیں۔ اس کی ماں کو بابا نے اس وقت طلاق دی تھی جب وہ صرف چھ سال کی تھی۔ اسے سب کچھ دھندلا دھندلا یاد ہے۔ موجودہ ماں بابا کی اسٹینو تھیں۔ شروع میں وہ ان سے بہت ڈرتی تھی۔ لیکن بعد میں اسے محسوس ہوا کہ سوتیلی ماں ہمیشہ ہی ڈائن کا روپ نہیں ہوتی۔ اس کی اپنی ماں جب اسے دیکھنے آتی تھی تو نئی ماں ان کی خوب تواضع کرتی تھیں۔ آہستہ آہستہ ماں سے نئی ماں کی شناسائی دوستی میں تبدیل ہوگئی۔ اپنا تمام دُکھ، سکھ بابا کو لے کر وہ آپس میں تقسیم کرتی تھیں۔ جب وہ کچھ بڑی ہوگئی تو اسے پتہ چلا کہ بابا کی دوستی کسی گانے والی سے ہوگئی تھی۔ نئی ماں سے کوئی اولاد نہ ہوئی۔ ایک دن وہ بابا سے بولیں۔ "میرا کیا میرے سامنے آرہا ہے۔ میں تمہیں کس منھ سے منع کروں......؟ لیکن ایک بات کا دھیان رکھنا۔ لڑکی بڑی ہورہی ہے۔"

بہت کوشش کے بعد بھی وہ بابا کے جوابات نہیں سن سکی تھی۔ اس وقت ماں پورے گھر میں اکیلی تھی۔ وہ پاس جا کر بیٹھ گئی۔

ابھی ملیحہ کو بیرونِ ملک رہتے ہوئے ایک سال ہی گزرا تھا کہ حسین نے یک لخت ایران لوٹنے کی ٹھان لی۔ ملیحہ کے پوچھنے پر حسین نے بتایا۔ "یہاں رہنے کو دل نہیں چاہتا ہے۔ جب ملک کی تاریخ بننے والی ہو تب غیر ملک میں رہ کر میں کیا کروں گا!"

تہران واپسی کے بعد ملیحہ تو اپنی پرانی زندگی میں لوٹ آئی۔ وہی سہیلیاں، وہی گلیاں، وہی کوچے، وہی خوشبو، وہی صبح و شام۔ البتہ حسین ضرور ہر روز بدلتا نظر آرہا تھا۔ رات کو بھی دیر سے لوٹتا، پوچھنے پر کام کی زیادتی بتا دیتا۔

ایک دن شام کو ملیحہ ٹی۔وی دیکھ رہی تھی کہ اختر آ گئی۔ ساتھ میں طیبہ بھی تھی۔ انہیں دیکھ کر ملیحہ نے سوسن کو فون کیا کہ وہ بھی آجائے۔ اتنے دنوں کے بعد سب مل کر بیٹھی تھیں۔ ایک دُوسرے کی زندگی پر تنقید، طنز، مذاق سب چل رہا تھا۔ طیبہ نے اپنے بے داغ چہرے کو گھما کر سوسن کی چوڑی ہوتی کمر پر نظر ڈالتے ہوئے کہا۔ "ارے

سوسن، یہ کمر، کمرے میں کیوں تبدیل ہو رہی ہے؟ کس ڈاکٹر نے کہا ہے، شادی کے بعد موٹی ہو جاؤ؟"

"کسی نے نہیں کہا، تبھی تو ملیحہ کی کمر پہلے سے ایک انچ اور کم ہو گئی ہے۔" سوسن نے ہنستے ہوئے کہا۔ چائے آ گئی تھی۔ سب کی نظریں اختر پر جم گئیں۔ "تم نے کیا سوچا ہے؟"

"کس بارے میں؟"

"زندگی کے بارے میں؟ طیبہ کی طرح اکیلے رہنا ہے کیا؟" اختر نے بال جھٹکے اور جواب دینے کے بدلے پرس سے ایک پرچہ نکالا۔ "دیکھو اسے۔" سب نے باری باری سے پڑھا، کوئی کچھ نہیں بولا۔ ٹی۔وی پر فلم شروع ہو چکی تھی۔ سب اس میں ڈوب گئیں۔
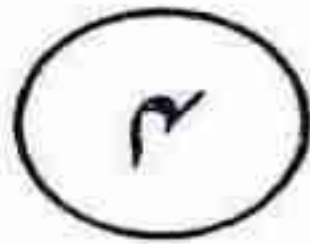
رات سنسان تھی۔ صرف ٹینکوں کی گڑگڑاہٹ سناٹے کو چیر رہی تھی۔ لیکن اس خاموشی کے باوجود کوچہ ساربانان کے کونے والے گھر میں زندگی خونی لباس پہنے ٹہل رہی تھی۔ صبح ہوتے ہی نوجوانوں کی جماعت کو کیسے اور کن سڑکوں سے لے جانا ہے کہ کوئی بھی سینہ زخمی نہ ہو پائے۔ خیالوں میں الجھا مجید بستر پر تڑپ رہا تھا۔ بھوک تو مہینوں سے ختم ہو چکی تھی، ایسا محسوس ہوتا تھا کہ کوئی گولہ حلق میں اٹک گیا ہے جو ہر لقمہ کو پہلوی سلطنت کی طرح اگلنا چاہ رہا ہے۔

کل بارش ہوئی تو سردی بڑھ گئی تھی، لیکن کوئی رکا نہ تھا۔ پلاسٹک سر پر ڈال کر

نعرے لگاتے یہ نوجوان ٹینک اور جیپ کے حرکت میں آنے سے قبل ہی منتشر ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں تو یہ سپاہی صرف ڈرانے کی اداکاری کرتے ہیں، یہ بات لڑکے خوب سمجھتے ہیں کہ وہ ڈرنے اور بھاگنے کا ڈرامہ کرتے ہیں۔ یہ تو جدو جہد کا پہلا مرحلہ ہے۔ یک طرفہ تسلط کو توڑنا بھی تو ایک طرح سے جنگ کا اعلان نامہ ہی ہے۔

میدانِ ژالہ کا وہ منظر...... کتنے مرد، عورتیں، بچے، لڑکے، لڑکیاں زخمی ہوئے تھے۔ تب سے کیا ہو گیا تھا مجید کو؟ کسی کو بھی چھری سے تربوز کاٹتے دیکھتا تو غصے سے بھر اُٹھتا۔ کٹے سر، چھلنی سینے اس کی آنکھوں کے سامنے رقص کرنے لگتے تھے۔ اس روز گھر میں پانچ لاشیں آئی تھیں۔ ان میں سے بھائی کو جب مردہ سمجھ کر دفنانے کے لیے لوگ اُٹھا کر ٹرک میں ڈال رہے تھے تو اس کا دوست چلّایا تھا۔ ''مجید! حمید زندہ ہے۔ اس کا بدن گرم ہے۔''

لیکن تھوڑی دیر بعد حمید نے اس کے بازوؤں میں دم توڑ دیا۔ پانچ لاشوں کو اس دن بہشتِ زہرا قبرستان میں دفنا کر آیا تھا۔ اپنے عزیز بھائی، بہن، ماں، باپ کو، تب سے یہ گھر سونا سونا، خون میں ڈوبا، آنسوؤں میں تر، سفید کفن سے لپٹا اس سے فریاد کرتا ہے۔ زنجیریں توڑ دو۔

میں کیسے بچ گیا اس دن! اپنی ہوشیاری کی وجہ سے! کل اس زنجیری کتے شاہ پہلوی کی سالگرہ ہے۔ چراغ کی جگہ پورے ایران میں شعلے بھڑکنے چاہئیں...... جونک...... پورے ایران کو اپنے مفاد کے لیے تباہ کرتا رہا......

صبح ہونے والی تھی...... وہ تیزی سے اُٹھا، کپڑے تبدیل کیے، لائٹ جلا کر قالین کے نیچے چھپی اپنی کتاب نکالی۔ اس کو پیکٹ میں لپیٹا اور اس کے اُوپر پرانا کپڑا، جیسے کسی مزدور کی کھانے کی پوٹلی ہو۔

تبھی دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون ہے؟''

''میں اختر......''

''آہ! اختر، تم! اتنی صبح!''

"ہاں، حمام کے بہانے نکل آئی ہوں۔"
"بیٹھو میں چائے بناتا ہوں۔"
"آج کالج کی طرف ہنگامے کا ارادہ ہے!"
"یہ پیکٹ لیتی جانا، احتیاط سے بانٹنا۔"
"سمجھتی ہوں، نام بدلوانے والی خبر ملی ہوگی۔"
"ہاں۔ سنو، پورے ایران میں چپے چپے کا نام بدلا جائے گا۔" وہی تصویریں، وہی نام اچھا خاصا آدمی دیکھتے دیکھتے پاگل ہوسکتا ہے۔ ابھی تو یہ شروعات ہے۔"
"لڑکے تو لڑکے، لڑکیاں اتنی جم کر میدان میں اُتر رہی ہیں کہ بس پوچھو مت!"
"چائے کے ساتھ کچھ لونا!" مجید نے اختر سے کہا۔
"نہیں...... چائے پی لی۔ یہ لو کاغذ، میں اب چلتی ہوں۔" اختر تیزی سے کھڑی ہوئی، پھر بولی۔ "میں کل رات تہران جارہی ہوں۔"
"کیسے؟ پلین سے؟"
"نہیں......ٹرین سے۔"
"خطرہ ہے۔ وقت بھی زیادہ لگتا ہے۔"
"ہم کر تو رہے ہیں جدوجہد۔ مگر ابھی خیالات وہی سرمایہ داروں والے، بالکل بورژوائی ہیں۔ مرنا اب بھی اہم ہے کیا؟"
"نہیں، مرنا نہیں، منزل اہم ہے۔"
"اچھا، چلتی ہوں۔"
"کامیاب ہو!" مجید مسکرادیا۔
اختر گھر سے باہر نکل کر پاس کے حمام خانے کی طرف بڑھ گئی۔

شہناز کو نوکری مل گئی۔ اس خوشی میں اس نے سب کو اپنے یہاں مدعو کیا تھا۔ رنگ برنگی کاروں سے قدیم تہران کی گلی بھر گئی تھی۔ جب تک شہناز کی سہیلیاں بیٹھی رہیں،

پاس پڑوس کی لڑکیاں بار بار گھر میں جھانک کر، ان کی ایک جھلک دیکھ کر، ہنستی ہوئی بھاگ رہی تھیں۔ بڑی لڑکیوں کی سمجھدار آنکھیں، بہت معنی خیز ڈھنگ سے ان کے چہرے، بالوں، پیروں، کپڑوں کی حیثیت کا اندازہ لگا رہی تھیں۔ پری کو عجیب سی بے چینی کا احساس ہو رہا تھا۔ جب اس سے نہیں رہا گیا تو شہناز سے بولی۔

''تمہیں خدا کی قسم! اُن لڑکیوں کو بھی اندر بلالو، یہ بھی بیٹھ کر ہمارے ساتھ گپے لڑائیں نا......''

شہناز نے آواز دی۔ ''مہرو، حنا، تمہیں پری بلا رہی ہے۔ آؤ تمہیں ان سب سے ملواؤں۔''

طیبہ، سوسن، اختر، پری، ملیحہ سب کے درمیان میں بیٹھ کر مہرو اور حنا بہت خوش تھیں۔ مہناز کا ذکر چل پڑا، کیونکہ اسی کی کمی تھی۔

''مہناز کا کوئی خط آیا؟''

''آیا تھا۔ یورپ کی سیر کو نکلی ہے۔''

''وہاں کیوں نہیں ڈاکٹریٹ کر لیتی؟''

''لکھا تھا میں نے، جواب آیا، بہت مشکل ہے، شادی کے بعد پڑھنا۔ پتہ نہیں، بہر حال یہ اس کا تجربہ ہے!'' پری نے کہا۔

''تم لوگ ہمیشہ ہی پریشان رہتی ہو۔'' طیبہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اب ایسا بھی نہیں ہے۔'' سوسن نے کہا۔

''جب تک شادی نہیں ہوئی تھی، شادی کے لیے فکر سے مری جاتی تھی، پھر شادی ہوئی تو پڑھائی کے لیے۔'' طیبہ بولی۔

اسی درمیان شہناز کی خالہ آگئیں۔ لڑکیوں نے کھڑے ہو کر سلام کیا، ہاتھ ملا کر گلے ملیں، ایک دُوسرے کے گالوں کو بوسہ دیا، پھر ادب سے بیٹھ گئیں۔

''شہناز! سب کی خاطر کرو بیٹی۔ پلیٹیں خالی ہیں...... ہم ٹھہرے غریب لوگ۔ جو کچھ ہے، خلوص اور محبت سے سامنے رکھا ہے۔ غریب کا گھر سمجھ کر ہماری کمیوں کو درگزر کرنا۔''

"کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ! اس گھر میں جو سکون اور اطمینان ہے وہ ہمارے گھروں میں کہاں؟" سوسن نے کہا۔

"اتنی شفقت اور محبت واقعی ہمارے گھروں میں نہیں ہے خالہ!" پری بولی۔

"مجھے تو کردی لباس بہت پسند ہے۔" اختر بولی۔

اسی درمیان ملیحہ کی بیٹی گھر میں داخل ہوئی۔ شاید باہر نالی میں پھسل کر گر گئی تھی۔ پوری کی پوری کیچڑ میں لت پت کھڑی تھی۔ ملیحہ اور شہناز اسے نہلانے میں لگ گئیں۔ حنا سب کی خاطر کرنے میں لگ گئی۔ کیسٹ پر کردی گانا لگا دیا گیا۔ خالہ نے شہناز سے آکر کہا۔ "جب انہیں کردی گانا پسند ہے تو روشن وغیرہ کو بلالو، کچھ کردی لوک رقص بھی ہو جائے!"

خالہ کی بات سب کو پسند آئی۔

سب کمرے میں دیواروں سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ روشن، افتخار، سونا، کردی لباس میں تالیوں اور موسیقی کی دھن پر رقص کر رہی تھیں۔ تمام محلے والوں کے دل میں تھا کہ شہناز کی خالہ کے یہاں بڑے لوگ مہمان آئے ہوئے ہیں، ان کی خاطر میں کوئی کمی نہ رہ جائے۔ اس لیے جو بھی کردی سامان تھا، سب نے بھیج دیا، اور محلے میں کردی گھر ہی کتنے تھے۔ بس یہی تین چار۔

کردی رقص کے بعد پری، اختر اور شہناز نے شیرازی موسیقی پر رقص کیا۔ ملیحہ نے ایک بہت پرانا لوک گیت سنایا، جو بعد میں کورس کی شکل میں سب نے گایا۔

"او شیرازی حسینہ، آنکھیں ہیں تیری یا کاغذی بادام؟"

"بادام کا نام مت لینا، بازار میں ہے بہت مہنگا۔"

"او شیرازی حسینہ، تیرے ہونٹ ہیں یا شہد؟"

"شہد کا نام مت لینا، بازار میں ہے بہت مہنگا۔"

رات کے گیارہ بجے تک یہ محفل چلتی رہی۔ اس کے بعد کھانا لگایا گیا۔ کھانے پر بھی ہنسی مذاق کا دور جاری رہا۔

تقریباً بارہ بجے شہناز کے گھر سے سب نے وداع لی اور اندھیری گلی میں

یکے بعد دیگرے روشنی اگلتی کاریں گلی کے نکڑ پر جاکر غائب ہو گئیں، اور پیچھے وہی تاریکی باقی بچی رہ گئی۔

شہناز کی ماں کو آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔ وہ روزانہ شہناز سے کہتیں کہ وہ اب شادی کر لے۔ ماں کے اس اصرار سے شہناز تنگ آچکی تھی۔ مگر ہوں، ہاں کر کے ٹال جاتی تھی، ادھر کیہان کے دفتر میں الگ ہنگامہ برپا رہتا تھا۔ جو خبریں موصول ہو رہی تھیں وہ سب چھپ نہیں پاتی تھیں۔ بہت توڑ مروڑ کر چھپتی تھیں۔ پورے ماحول سے شہناز کو اندازہ ہو چکا تھا کہ موجودہ شاہی حکومت کی کشتی ڈگمگا رہی ہے۔ اندر ہی اندر بہت زبردست لاوا اُبل رہا ہے۔ کبھی بھی، کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد وزیر اعظم ہویدا کے کہنے پر اخبارات کو تھوڑی بہت آزادی ملی۔ خود ان کا یہ خیال تھا کہ ابھی ایرانی عوام میں لڑکپن موجود ہے، اور یہ عمر کا نازک دَور ہوتا ہے۔ سیاسی خیالات کے لیے یہ کچی عمر ہے۔ جو دماغی نشو نما کے لیے بھی نقصان دہ ہوتی ہے۔

مگر حالات کے تقاضوں نے مجبور کر دیا کہ سینسر شپ کی لگام ڈھیلی چھوڑی جائے۔ اس لیے ہویدا کے حکم سے سینسر شپ میں ڈھیل دے دی گئی تھی۔

ریڈیو بی۔ بی۔ سی اور وائس آف امریکا ایسی خبریں نشر کر رہے تھے جن سے معلوم ہوتا تھا کہ واقعی ایران کی کشتی منجدھار میں ہے۔ امریکا کے صدر کارٹر کا رُخ بھی تبدیل ہو رہا تھا۔ آج جو خبر ملی، اس سے تمام صحافی حیرت زدہ تھے کہ ایران کی ملکہ شہبانو فرح دیبا کو کارٹر نے ملنے کا وقت نہیں دیا، بلکہ یہ کہہ دیا کہ وقت کی کمی کے باعث وہ بات چیت نہیں کر سکتے۔ لیکن جب وہ گلیارے سے گزریں گے اس وقت راستے میں دو منٹ بات ہو سکتی ہے۔

اس بے عزتی کا مطلب صاف تھا۔ خدشات سے سب سہمے رہتے تھے اور ہر وقت اخباروں کے دفتر میں کھلبلی مچی رہتی تھی۔ اخبارات سڑک پر آئے نہیں کہ ہاتھوں

ہاتھ فروخت ہو جاتے تھے۔ اخبار کا ایک ایک لفظ پڑھا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں شہناز رات دن کام میں مصروف رہتی تھی۔ جب رات کو گھر لوٹتی تو ماں کو ہمیشہ پریشان پاتی۔ بس سے گھر جانے کا مطلب پورا ایک گھنٹہ، اس کے بعد دس منٹ کا پیدل کا راستہ۔ کبھی کبھی شہناز دُکھی ہو کر سوچتی۔ کیوں نہ نوکری چھوڑ دوں! پھر آگے کیا کرے گی وہ؟ دوسری نوکری اس کے لیے رکھی تو ہے نہیں، مگر یہ بات ماماں نہیں سمجھنا چاہتی تھی۔

مشہد میں لگ بھگ آٹھ ہزار عورتوں کا جلوس نکلا۔ کالی چادروں میں لپٹا پورا جسم اور ادھ کھلے چہروں سے نکلتے نعرے 'امام خمینی عزیزم بگو خون بہ ریزم' (عزیز خمینی کہو، ہم حاضر ہیں خون بہانے کے لیے) سب کے ہاتھوں میں تصویریں تھیں۔ اپنے رہبر، اپنے لیڈر کی۔ ایک سمندر تھا جو بڑھا چلا آ رہا تھا۔ سڑک کے کنارے ٹینک کھڑے تھے۔ ان پر مسلح شاہی سپاہی کھڑے تھے۔ یہ سب کچھ آٹھویں امام حضرت رضا کے حرم کے سامنے ہو رہا تھا۔

حضرت رضا کے حرم کا سونے کا کلس، گنبد وغیرہ روشنی میں نہائے ہوئے تھے۔ ان کی ہرے، نیلے، کاشی کے کام کی باریکی کو دیکھنے اور سراہنے والی آنکھیں آج غصے سے اُبل رہی تھیں۔ دُور دُور سے آئے عقیدت مند مسافر سجدے میں گرے ہوئے تھے۔ منتیں مان رہے تھے، زری سے لپٹے رو رہے تھے، اور باہر گولی چل رہی تھی۔ جس کی زد سے خود حرم کا کاشی کاری سے تزین جسم لہولہان تھا۔ کئی جگہ سے کاشی کاری اکھڑی، خون کی چھینٹیں اُڑیں اور سڑک پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ نوجوانوں کا قافلہ کالے جھنڈے لے کر چلا رہا تھا......

"اے بے شرم شرم کن۔

"وطن را رہا کن۔" (ارے بے شرم، شرم کر، وطن کو چھوڑ دے)

دوسری طرف سے آواز آ رہی تھی......

"انقلاب برائے اسلام نہ برائے نان۔"

[انقلاب اسلام مذہب کے لیے ہے روٹی کے لیے نہیں ہے]

آنسو گیس کے سلنڈر پھٹتے ہی تمام لوگ منتشر ہو گئے۔ ایمبولینس لاشوں اور زخمیوں کو اُٹھانے پہنچ گئیں۔ دوسری سڑک پر ٹائر جلا کر لڑکے بہتے ہوئے آنسوؤں کو روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔

طیبہ ایک ہفتے کے لیے مشہد آئی ہوئی تھی۔ اتنی شہامت، اتنی مزاحمت، اتنا غصہ جوانوں میں دیکھ کر حیران رہ گئی۔ تصویریں اُتار نہیں سکتی تھی ورنہ بہت اچھے اچھے مناظر اس کے ہاتھ سے نکل رہے تھے۔ پوری رات وہ بستر پر لیٹی جاگتی رہی کہ یہ حقیقت ہے یا پھر خواب! کیا حقیقتاً شاہی ڈھانچہ چرمرا کر ٹوٹنے والا ہے یا پھر سے خفیہ پولس 'ساواک' اور امریکا کی سی۔آئی۔اے ساری بغاوتیں کچل کر زبان اور بیان پر قفل لگا کر ایسے اقتدار کو اور بڑھاوا دیں گے؟

گاؤں اور چھوٹے شہر کے باشندے بہت مشکل سے ساتھ آ رہے ہیں۔ وہ تو شاہ کو خدا کے بعد اپنا محافظ تصور کرتے ہیں۔ پروپیگنڈے نے ان کے دل و دماغ پر جادو کر رکھا ہے۔ کچھ جگہوں اور کچھ شہروں میں تو کمال ہو گیا۔ انقلابیوں کے پیچھے لوگ لاٹھی ڈنڈے لے کر دوڑے۔ یہ انقلاب اوپر سے نیچے کی طرف پھیل رہا ہے۔ عجیب ہے!

تہران میں ایک طوفان برپا تھا۔ جتنے ملازمین مخالف تھے اور کام پر نہیں آ رہے تھے، سب کی چھٹی کا حکم مل گیا تھا اور تنخواہ بند کر دی گئی تھی۔ لوگ گھر کے اخراجات کہاں سے پورے کریں؟ دو دن تک بڑی بے چینی رہی، پھر سب نے طے کر لیا کہ یہ جدوجہد جاری رہے گی۔ اس اعلان کے ساتھ ہی مسلح پولس گشت کرنے لگی۔ تمام ملازمین دفتروں میں تھے۔ کچھ کمزور دِل لڑکیاں اور عورتیں بیہوش ہو گئیں، کیونکہ اُنہوں نے پہلی مرتبہ سڑک پر یوں پولس والوں کو بندوقیں لے کر پھرتے ہوئے دیکھا تھا۔ ورنہ ہنسی، خوشحالی، رقص، موسیقی کے علاوہ ایران میں مارکاٹ کا یہ منظر انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ سنتے رہتے تھے مگر سب پس پردہ رہتا تھا۔ کچھ پکڑے گئے انقلابی

یا باغی گولیوں سے اُڑائے جاتے تھے لیکن سال میں ایک مرتبہ، لیکن اب تو ہر دن، ہر گھنٹہ موت کا سلسلہ جاری ہے...... شاہ کی تصویریں دوسری سڑکوں پر جلائی جا رہی تھیں۔ دُکاندار دوطرفہ خوف کی وجہ سے کانپ رہے تھے۔ کچھ نے خود کو دُکان کے اندر بند کر لیا۔ کتابوں کی دُکانوں پر چھاپے پڑ رہے تھے۔ ایک عجیب سی بیداری پورے ایران میں چھا رہی تھی، جو رَوکے سے بھی نہیں رُک رہی تھی۔ جلی حرفوں میں اخبارات لکھ رہے تھے کہ سیاسی قیدیوں کو آزاد کرو۔ شہر کی دیواروں پر بھی یہی لکھا نظر آ رہا تھا کہ...... ''قیدیوں کو آزاد کرو۔''

شاہی جیل میں تقریباً دو ہزار سیاسی قیدی تھے۔ متعدد دانشور، جو برسوں پہلے بھاگ کر غیر ممالک میں جا بسے تھے وہ بھی لوٹ کر آنا چاہتے تھے۔ خمینی عراق سے پیرس چلے گئے تھے، اور بار بار بڑھتے انقلاب کو اور بڑھاوا دے رہے تھے۔

ایک کے بعد ایک وزیر اعظم بدلے جا رہے تھے۔ کوئی بھی ٹک نہیں پا رہا تھا۔ نظام کی تبدیلی کے لیے ہر تنظیم، ہر پارٹی اپنی رائے پیش کر رہی تھی۔ برسوں بعد انجمن مصنفین بنانے کا خواب دانشور حضرات دیکھنے لگے تھے۔ غیر ملکی صحافی بڑی تیزی سے خبریں چھاپ رہے تھے۔ آیت اللہ تالغانی جیسے روحانی پیشوا نے بھی امام خمینی کو رہبر مان لیا تھا۔ سب کو ان کے ایران لوٹنے کا انتظار تھا، لیکن انہوں نے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا...... ''جب تک شاہ رضا شاہ پہلوی ایران میں ہے، وہ ایران کی زمین پر قدم نہیں رکھیں گے۔''

اشتراکی اور مذہبی شاہ مخالف جماعتیں ایک ساتھ کھڑی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ دُنیا حیران تھی کہ ایسی ہم آہنگی پہلی بار دیکھنے کو ملی ہے۔

پری کو تبریز سے آئے ہوئے دو ہی دن گزرے تھے کہ اسے خبر ملی کہ اس کی نانی کی طبیعت بہت خراب ہے۔ پورے خاندان کو پھر سے جانا پڑا۔ ایک طرف پریشانی اور غم تو دوسری طرف شہر میں 'مارشل لا' لگا ہوا۔ آٹھ بجے ہی

سب گھر میں قید ہو کر بیٹھ گئے۔

پری کا ننہال کافی بڑا تھا، پورا خاندان نانی کے یہاں اکٹھا تھا۔ جوان لڑکیوں نے ایک بڑے کمرے میں قبضہ کرلیا۔ جب قالینوں پر گدے ڈال کر سونے کا انتظام ہو گیا تب انہوں نے باتیں شروع کر دیں۔

زرین بولی۔ ''ابھی تو صرف دس بجے ہیں، کیا بوریت ہے!''

زہرا بولی۔ ''باہر جھانک کر دیکھو، سڑکوں پر کیسا سناٹا ہے! طبیعت گھبرانے لگی ہے، میں جاتی ہوں، کچھ پھل لے کر آتی ہوں۔''

شبنم بھی اپنی جگہ سے اُٹھی اور بولی۔ ''سماور روشن ہوا تو چائے لاتی ہوں، کون کون چائے پیئے گا؟''

سب نے ہاتھ اُٹھا دیا۔

پری بولی۔ ''تاش لاؤ، ذرا تاش کھیلیں گے۔''

صغریٰ نے کہا۔ ''تاش واش نہیں، میں فون لاتی ہوں، ذرا گپیں ماری جائیں۔ مزا آئے گا۔'' یہ کہہ کر وہ اُٹھی اور پاس کے دو تین کمروں سے انٹرکام اُٹھا لائی۔

زہرا کھیرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی، پھر وہیں آلتی پالتھی مار کر بیٹھ گئی اور کھیرے کاٹ کر نمک، چھڑک چھڑک کر سب کو دینے لگی۔ اُلٹی سیدھی لیٹی لڑکیاں مست، ہنس بول رہی تھیں۔ تبھی شبنم چائے لے کر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر صغریٰ بولی۔ ''شبنم! کوئی مزیدار نمبر ہے تمہارے پاس؟'' شبنم چہکی۔ ''انصاری آغا کو فون کرو، فون نمبر وہی پرانا ہے۔''

صغریٰ نے کہا۔ ''مزا آ گیا، پری۔ دس پندرہ منٹ تک اس کو پریشان کرتے ہیں۔ کمبخت ہے بہت منحوس آدمی۔'' کہہ کر اس نے نمبر ملایا۔ دوسری طرف گھنٹی بجنے لگی۔ ایک ایک ریسیور میں دو دو لڑکیوں کے کان فٹ ہو گئے۔ ادھر سے کسی نے فون اُٹھایا۔

''الو۔''

''الو!'' صغریٰ بولی۔

''بفرمائید۔'' ادھر سے کھیپے جناب کی آواز اُبھری۔

''بھول گئے، انصاری جان، ہمیں...... یاد...... کچھ بھی یاد نہیں آرہا؟ میں تمہاری...... ہاں، ہاں شہلا ہوں...... کل ہی آئی ہوں......ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں...... مل کب رہے ہیں......؟ کل کس وقت؟ چار بجے...... باغ کے سامنے......ٹھیک ہے۔''

فون بند ہوتے ہی سب کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔ پری نے پوچھا۔ ''کون تھا وہ؟''

''اپنے اسکول کا ایک لیب کیپر ہے۔ شہلا نام کی ایک لڑکی کے پیچھے بھاگتا تھا۔ کام دھام تو بس...... خیر، کوئی اور نمبر دو۔'' صغریٰ نے کہا۔

زہرا نے بغیر کچھ کہے فون سے نیا نمبر ملایا۔ گھنٹی بجی۔ ادھر سے مردانہ آواز آئی...... ''الو!''

''الو! شہباز آغا، کیسے ہیں؟'' زہرا نے میٹھی آواز میں پوچھا۔

''معاف کیجئے گا خانم! میں شہباز آغا نہیں ہوں، میرا نام حسنین ہے۔''

''اب مذاق چھوڑو، شہباز! اس طرح پریشان مت کرو۔ تین دن بعد تو آپ سے اب بات ہو رہی ہے، اس میں بھی مذاق، سچ، تھک گئی ہوں میں اس تنہائی سے۔''

زہرا کی آواز میں بلا کا درد ٹپک رہا تھا۔

''خانم! معاف کریں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں شہباز نہیں ہوں۔ میں حسنین ہوں، میری بیوی سو رہی ہے۔ میرے تین بچے ہیں۔ میں اس عمر میں کیا مذاق کروں گا؟''

''اب یوں بہانے مت بناؤ، شہباز! کل کہاں مل رہے ہو؟''

''دیکھئے خانم! بہت ہوا مذاق۔ آپ ریسیور رکھتی ہیں یا میں رکھوں! میں آپ کی بے عزتی کرنا نہیں چاہتا ہوں۔ مہربانی کر کے ریسیور رکھ دیں اور آرام سے سو جائیں۔''

''خیر شہباز، تم مذاق کے موڈ میں ہو۔ ٹھیک ہے۔ یہ بھی برداشت کر لیں گے۔ شب بخیر۔''

''شب بخیر......''

''کچھ مزا نہیں آیا، بور نکلا۔'' شبنم نے منہ بنا کر ریسیور نیچے رکھ دیا اور چائے کے گھونٹ بھرنے لگی۔

پری نے چائے کا خالی فنجان رکھ کر کہا۔ ”لاؤ اس بار میں قسمت آزماتی ہوں۔“
اس نے جو نمبر چاہا گھما دیا۔ گھنٹی بجتی رہی۔ کافی دیر بعد کسی نے ریسیور اُٹھایا۔
”الو!“ کہیے میں میجر سہراب بول رہا ہوں۔“
”سلام! میں آپ کی کنیز اسما بول رہی ہوں۔ جناب کا مزاج کیسا ہے؟“
”خدا کا شکر اور آپ کی مہربانی۔“
”آدمی دلچسپ ہی نہیں، احسان شناس بھی نظر آتے ہیں۔“
”سب آپ کی عنایت ہے۔“
”مشغلہ کیا ہے؟“
”راتوں کو تارے گننا، اور صبح سے رات تک آہیں بھرنا اور آپ بتائیں، کیا میری عقیدت میں کچھ کمی نظر آتی ہے آپ کو؟“
”جی! آپ خون جگر اور غم کو کب پیتے ہیں، کیا یہ کھانا پینا آپ نے بالکل چھوڑ رکھا ہے؟“
”نہیں! وہ میں اس وقت پیتا ہوں جب سو جاتا ہوں اور خواب میں آپ کے ساتھ پکنک کی سیر کے لیے دشت لوط میں مارا مارا پھرتا ہوں۔“
”تبھی کہوں آج کل میرے پاؤں میں چھالے کیوں پڑے ہیں! تو یہ آپ کی شرارت ہے۔ روز مجھے ریگستان لے جاتے ہیں۔“
”اگر آپ کہیں تو سائبیریا چلتے ہیں؟“
”خیال بُرا نہیں، آپ کا اصرار ہے تو ضرور چلیں گے۔ ہمارا کیا، ہم آپ کی کنیز جو ٹھہرے۔“
”آپ کی آواز بہت میٹھی ہے، جیسے سکرین!“
”شکریہ! صحیح پہچانا، میں آپ سے اپنی آواز میں نہیں بولتی ہوں۔ میری جگہ پر میری دوست آپ سے بات کرتی ہے۔ آپ کی سمجھ کی داد دیتی ہوں۔ اصلی نقلی خوب پہچانتے ہیں آپ۔“
”کرم و نوازش کا شکریہ! اگر برا نہ مانیں تو گھر کا پتہ یا فون نمبر دیں گی؟“

"ضرور مگر جلدی کیا ہے! رات کو سائبیریا جا ہی رہے ہیں۔ وہیں برف کا گھر بنا لیتے ہیں۔ پتہ آپ جو چاہیں سمجھ لیں۔"

"کل میں شاہی پارک جا رہا ہوں، سات بجے آپ بھی آیئے!"

"ضرور! شب بخیر!"

سب لڑکیاں منھ دبا کر ہنسی روکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ ساری بوریت دُور ہو گئی تھی۔ لگ بھگ رات کے دو بجے تک یہ سلسلہ چلتا رہا، پھر جب دل بھر گیا تو لائٹ بجھا کر سب نے آنکھیں بند کر لیں۔

شب یلدا کل ہے۔ آج دُکانوں میں تربوز کے لیے لائن لگی ہوئی ہے۔ اتنی بھیڑ ہے کہ بس! سب کا یہی خیال ہے کہ جس نے شب یلدا (یعنی ۲۵ر دسمبر) کو تربوز کھا لیا تو وہ گرمی کی تپش سے بچا رہے گا۔ سردی کے موسم میں تربوز کا ملنا ناممکن ہے۔ لیکن اس ایرانی عقیدے کی وجہ سے لاکھوں کی تعداد میں تربوز کولڈ اسٹوریج میں رکھ دیے جاتے ہیں اور آج ان کی قیمت دو یا تین تومان نہیں بلکہ پورے سو تومان ہے۔ پھر بھی سب خریدنا چاہتے ہیں۔

بندوق اور مشین گن سے بھرے شہر میں ہر کار کی ڈگی میں بڑے بڑے تربوز رکھے ہوئے تھے۔ گھروں میں گانا بجانا، شعر و شاعری چل رہی تھی اور ایک خاص گروہ مخالفت میں سب کچھ بھولا ہوا تھا۔ اس کے سامنے اگر کچھ تھا تو وہ صرف جد و جہد تھی۔ شب یلدا ان کے لیے کوئی اہم چیز نہیں تھی۔ نہ ان کے لیے اس میں کوئی کشش باقی بچی تھی۔ اس لیے وہ سب اس وقت بھی نعروں اور جلوس میں مصروف تھے۔ اختر انہیں لوگوں میں سے تھی۔

شام سے گھر میں اختر کا انتظار ہو رہا تھا اور وہ سب کچھ بھول کر تہران کے ایک پرانے علاقے میں موجود تھی، جہاں پر ایک انڈر گراؤنڈ میٹنگ چل رہی تھی۔ گروہ کا نظریہ سیاست کی سطح پر بہت صاف نہیں تھا لیکن ایک بات تو طے تھی کہ وہ

سب شاہ مخالف ہیں، اور شاہ کو ایران سے باہر نکالنا چاہتے تھے۔ تمام ممبر نوجوان تھے اور اپنے کو انقلابی کہتے تھے۔

آبادان کی ریفائنری کے ملازمین نے بھی آج شاہ کی مخالفت میں کام روک دیا۔ ایران کی اقتصادی حالت ختم گئی۔ اس خبر نے سب کو سوچنے پر مجبور کردیا۔ ہر دفتر، ہر فرم میں ہڑتالیں شروع ہوگئیں۔ پورا ایران ہل کر رہ گیا۔ مشہد میں انقلابی جواں لڑکے زندہ چلتے ٹینکوں کے آگے کودنے لگے۔ ان کے گوشت کے لوتھڑے ٹینکوں کے دانتوں میں پھنسے خون کے آنسو روتے رہے۔ سڑکوں پر فقیروں کے چہرے نظر آنے لگے۔ ان کے پھیلے ہاتھوں پر آتے جاتے لوگ ایک دو تومان کا سکہ ڈال کر گزر جاتے تھے۔

سینما ہال نذرِ آتش ہوئے، بینک لٹے، دُکانیں بے نور، سب کچھ بدل رہا تھا۔ اس بدلاؤ میں سب سے بڑا کردار عورتوں کا رہا تھا۔ عورتیں مٹھی بند کیے جب سڑکوں پر نکلیں تو ان کے پیچھے ان کے شوہر اور بچے تھے۔ اس انقلاب کی سب سے بڑی خوبی یہی تھی کہ جو حسین گڑیا آرائش و زیبائش جانتی تھیں، انہوں نے بھی بندوق اُٹھانا سیکھ لیا تھا۔ تہران، مشہد اور شیراز کی یونیورسٹیوں کے احاطوں میں ساٹھ ستر ہزار عورتوں کی بھیڑ ایک ساتھ نماز ادا کرتی تھی۔ جس کا خاموش پیغام صرف مذہبی اتحاد اور جدیدیت کے خلاف زبردست احتجاج تھا۔ عورتوں کا کہنا تھا، ہم اس جنس پرستی اور کھلے پن کے ننگے ناچ سے عاجز آچکے ہیں۔ ہم کو ہمارے شوہر واپس چاہئیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شاہ کے والد رضا شاہ نے عورتوں کو دقیانوسی طرزِ زندگی سے آزادی دلائی تھی، لیکن کیسی آزادی؟ جبکہ دوسری طرح سے ہم قید ہوگئے ہیں۔ وہ آزادی ہمیں کچھ نہ دے پائی۔ سوائے خالی پن کے، بس ایک طبقہ ہی اس سے فیضیاب ہوتا رہا ہے۔ سب سے زیادہ عورتوں نے ہی شاہ کے وقت میں آزادی کے نام پر تکلیفیں اُٹھائیں ہیں۔ اسّی فیصد عورتیں تو اسی کھائی میں پڑی رہیں، جہاں وہ تھیں۔

لڑکیوں نے ناخن اور چہرے رنگنا بند کردیا تھا۔ وہ نظام میں اپنے لیے سخت زمین

اور اعتماد کی طلبگار تھیں۔ بندھی مٹھیوں سے سڑکیں اور گلیاں بھر گئیں۔ غریب محلے کی عورتیں کھانے کی پوٹلیاں باندھ کر صبح گھر سے نکلتیں تو شام کو ہی گھر پہنچتی تھیں۔ جلوس میلوں تک چلتا رہتا تھا، نعرے لگاتا اور چیختا ہوا۔

غیر ملکی اخبارات لکھ رہے تھے کہ 'ایرانی جذباتی ہو چکے ہیں' لیکن کیا حقیقتاً وہ وقت جذباتی ہونے کا تھا؟ نہیں، بلکہ گزشتہ پچاس برسوں سے جو درد ایرانی قوم کے منہ پر تالا ڈالے ہوئے تھا، وہ اب ٹوٹ گیا تھا، اور اب درد کا سیلاب تھا جو کہ بڑھا چلا آرہا تھا۔ اس کو روکنے والا، سنبھالنے والا کوئی نہ تھا۔ ہر طبقہ میں ایک طوفانی آندھی تھی جو سب کچھ نیست و نابود کر کے ایک نئی دُنیا بسانا چاہتی تھی۔ پورا دن، کبھی پوری رات، کبھی بم پھٹتے، کبھی گولیاں چلتیں، کبھی نعرے لگتے، کبھی شاہی تصویروں کی ہولی جلائی جاتی۔ مختلف آوازوں کے لوگ عادی ہو چکے تھے۔

میدانِ سپاہ میں شاہ کا مجسمہ لگا ہوا تھا۔ کتنا وقت اور پیسہ لگا تھا اس کی فنی باریکیوں پر...... اس وقت اسی مجسمہ کو رسیوں سے باندھ کر گرایا جا رہا تھا۔

''دیکھو! اس کو کہتے ہیں وقت کی مار۔'' سودا خریدتی ہوئی عورت نے کہا۔

''ہاں! جس گھر میں شاہ کی تصویر نہیں ہوتی تھی، اس گھر اور دُکان پر حملہ کیا جاتا تھا، اور اسے سیل کر دیا جاتا تھا۔ اس الزام پر کہ وہ شاہ مخالف ہے، اور آج وہ تمام تصویریں جل کر راکھ ہو گئیں ہیں۔''

''کل صابرہ کے گھر پر حملہ ہوا تھا۔ تم جانتی ہو، وہ کیا، اس کا پورا خاندان شاہ کا دیوانہ ہے۔ گھر پر تصویریں تھیں، کتابیں تھیں۔ سب کو پکڑ کر لے گئے اور گھر بھی لوٹ لیا ہے۔''

''یہ سب مارکسی ہیں جو فساد کر رہے ہیں۔''

''شاہ تو سدا سے کہتے آرہے ہیں کہ یہ لوگ ایران کو ایرانستان بنانا چاہتے ہیں۔ روس سے تو اچھا ہے کہ ہم امریکہ کے زیرِ اثر رہیں۔''

''بات تو ٹھیک ہے، بہن! مگر رہنے کون دے گا؟ لوگ تو کہتے ہیں کہ شاہ سے سب ہی جلتے ہیں۔ ڈرتے ہیں ان کی شخصیت سے۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو؟ اپنے تو ڈر نہیں رہے ہیں؟''

''کل یہی پچھتائیں گے...... کیا تھا ہمارے پاس آج سے چالیس سال پہلے؟ تمام سکھ کس نے دیا؟ لیکن آج وہی....۔''

''خیر، سکھ کی نہ کہو! سکھ تو صرف ایک خاص طبقے کو ملا ہے۔ غریب تو آج تک بیچارہ بدنصیب ہی رہا ہے۔ اس کے لیے کیا ہوا۔ کچھ بھی نہیں۔''

''نعرہ لگتا ہے امریکہ کے خلاف اور سامان بازاروں میں امریکہ کا بھرا ہے۔''

''اب کیا دُکاندار لاکھوں کا سامان پھینک دیں؟''

''یہ دوغلی باتیں مجھے پسند نہیں ہیں۔''

''ہماری پسند کا کب خیال کیا ہے کسی نے! ہماری قسمت میں تو بس سوکھی روٹیاں ہیں۔''

''ہمیں سیاست سے کیا ملے گا؟ بدلاؤ آیا بھی تو کسی اور طبقہ کے لیے آئے گا۔ ہم تو نہ اب خوش ہیں اور نہ تب ہوں گے۔''

''چلو، بس لے لیتے ہیں، تھیلے بھاری ہیں۔''

''پیدل چلتے ہیں۔ باتوں میں راستہ کٹ جائے گا۔''

اسی وقت کاریں ہارن بجاتی ہوئی گزریں۔ نعروں اور تالیوں کا شور بلند ہو رہا تھا۔

''دیکھو! اس مارکاٹ میں شادیاں بھی ہو رہی ہیں۔''

''مارکاٹ، شور، ادھم، دوسروں کے لیے ہے۔ ان کی زندگی میں کیا فرق پڑتا ہے؟''

''ہاں! کہتی تو تم ٹھیک ہو، مرنے والے تو سب جوان غریب ہی گھر کے ہیں۔ بڑے مرتے ہوں تو شاید ہمیں پتہ ہی نہ چلتا ہو۔''

''کیسی باتیں کرتی ہو! یہ کیوں مریں گے؟''

''ہاں! انہیں کس چیز کا دکھ جوان کا سینہ جلے!''

''سنا ہے، پٹرول کا سارا پیسہ عیاشی میں جاتا تھا اور ہمارا حق......؟''

''اپنا شوہر تو حق دیتا نہیں۔ تم بات کر رہی ہو شاہ کی......''

''شاہ دیتا تو شوہر بھی مجبور.....!''

"قانون تو ہے... لیکن...."

کہیں قریب سے آنسو گیس کے سلنڈروں کے پھٹنے کی آواز آئی۔ دھواں چاروں طرف پھیل گیا۔ دونوں ادھیڑ عمر کی عورتیں کھانستی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ نعروں، گالیوں، چیخوں وغیرہ سے سڑکیں پُر ہونے لگیں۔

امریکی رفتہ رفتہ گھر اور کمپنیوں کو بند کر کے بھاگ رہے تھے۔ ان کے گھروں پر حملے ہو رہے تھے۔ سامان کی توڑ پھوڑ چل رہی تھی۔

نکڑ والے گھر میں لوگ گھسے۔ پہلے پلکیں جھپکاتے ہوئے سب کچھ دیکھتے رہے، پھر ایک نے آگے بڑھ کر سنہری لال مخمل کی کرسی اُٹھائی، اسے چھوا، اسے سہلایا پھر کچھ بڑبڑایا۔ "انور کے لیے لے جاتا ہوں۔ ٹھاٹ سے بیٹھ کر اس پر کھیلے گا۔" وہ کرسی لے کر آگے بڑھ گیا۔

پیچھے والے اکرم کی نظر برتنوں پر پڑی۔ "کب سے شاہینہ کی ماں کہہ رہی تھی چینی کی پلیٹوں کے لیے۔" آنکھیں ان پھولدار پلیٹوں پر چپک کر رہ گئی تھیں۔ تیزی سے اکرم آگے بڑھا۔ سائڈ بورڈ کھول کر درجن بھر پلیٹیں اُٹھا کر سینے سے چپکا کر دروازے کی طرف لپکا۔ دیکھتے ہی دیکھتے سب نے اپنی اپنی من پسند چیزیں اُٹھالیں۔ سڑک پر جاتے ہوئے کریم کو کسی نے پکڑا۔

"لعنت ہے تم پر جو خیانت کار کی پلیٹوں میں کھانا کھاؤ۔ توڑ دو...... چور چور کردو۔ اس نے ہی ہمیں تباہ کیا ہے...... مرگ بر امریکا...... مرگ بر سگ زنجیری...... مرگ بر کارٹر......" لعنت بھیجنے کے ساتھ ساتھ تڑاتڑ پلیٹیں ٹوٹنے لگیں۔ لال بکھرتے پھولوں پر کریم کی آنکھیں اب بھی جمی تھیں۔ سڑک کے بیچوں بیچ لکڑی کے نازک سامان کی چتا جل رہی تھی اور چاروں طرف گھومتے ہوئے لوگ نعرے لگا رہے تھے۔

"مرگ بر امریکا......!"

اس قطار کے تمام غیر ملکی گھروں کا یہی حال ہوا۔ چاہے وہ امریکی تھے یا نہیں۔

پھر ہر شہر میں یہ ہوا پھیل گئی۔ چھوت کی بیماری کو پھیلتے ہوئے دیر ہی کتنی لگتی ہے۔ ہر سفید پوست والے کا گھر جل کر راکھ ہوگیا۔
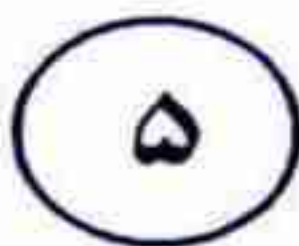
کردستان آئے شہناز کو ہفتہ ہی گزرا تھا کہ دفتر سے تار موصول ہوا۔ ''فوراً ڈیوٹی پر پہنچو۔'' وہ دوڑتی ہوئی واپس آئی۔ جس روز وہ آئی وہ شاہ کے جانے کا دن تھا۔ خوشی و غم سے لوگ دیوانے ہو رہے تھے۔ شاہ کی آنکھیں اشکبار تھیں۔ اس نے ایران کی خاک اُٹھائی جو اسے لے جانے نہیں دی گئی۔ لیکن قیمتی کتابیں وہ یہ کہہ کر لے گئے کہ ان کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہوگا۔ اس بات پر لوگ تلخ ہنسی ہنسے کہ زندگی بھر مصنفوں کا گلا گھونٹ کر، ان کو شہر بدر کر کے یہ ڈھونگ رچا جا رہا ہے۔

''میں جا رہا ہوں اور میرے ساتھ ہی مسرت، امن اور دولت بھی ایران کی سرزمین سے جا رہی ہے۔'' ان جملوں کو سن کر لوگوں کے سینوں میں نفرت کا طوفان اُٹھ کھڑا ہوا اور انہوں نے کہا کہ زبردستی کا امن اور گھٹے دل و دماغ کی دولت نہیں ہوتی ہے۔

صحافی کیمرے، ٹیپ ریکارڈر لیے گرتے پڑتے گھوم رہے تھے۔ اس بھیڑ میں شہناز کے پیروں کی انگلیاں بری طرح سے مجروح ہوگئی تھیں۔ لیکن اسے اس کا بھی احساس نہ ہوا۔

اخبارات کی سرخیاں تھیں .....

''شاہ رفت، شاہ رفت۔''

ایران کے در و دیوار، لوگوں کے دل و دماغ اور پوری دُنیا حیرت زدہ تھی کہ شاہ ایران کو چھوڑ کر چلا گیا۔

شاہ کے لیے کسی نے دروازہ نہیں کھولا سوائے مصر کے...... اخبارات ہر دن ہونے والے واقعات کو تفصیل سے لکھ رہے تھے۔ اکثر لوگ پوچھا کرتے۔ ''آگے کا کیا پروگرام ہے؟''

جواب ملتا۔ ''دو قدم ہیں۔ پہلا شاہ کو نکالنا۔ وہ نکل گیا، دوسرا امریکی اثرات کو کم کرنا، پھر آگے دیکھا جائے گا۔''

شاہ کے ساتھ بڑی تعداد میں ایرانی اپنا سب کچھ سمیٹ کر غیر ممالک میں جا بسے تھے۔ بانک خالی تھے اور نئی فضا اُبھر رہی تھی۔

صحافیوں میں اکثر باتیں ہوتی تھیں......

''اس کے بعد تو لگتا ہے کہ مذہب کے اثرات بڑھیں گے۔''

''وہ تو ہے، لیکن آزادی تو ملی۔''

''آزادی مستقبل کے لائحہ عمل کے بغیر کوئی معنی نہیں رکھتی ہے۔''

''معنی سے کیا مراد ہے تمہاری؟''

''کوئی ٹارگیٹ تو ہونا چاہیے؟''

''پھر؟''

''جب بغاوت کی وجہ ہو، انقلاب کا مقصد ہو، تبھی کوئی تغیر بامعنی اور آزادی اپنے معنی رکھتی ہے۔''

''اتنی دقیق باتیں بغیر کسی تجربے کے سوال کی شکل میں جب سامنے نہیں آتی ہیں تو پھر کوئی جواب بھی نہیں سوجھتا ہے۔''

''اس لیے میرا خیال ہے کہ لوگ شاہ کے جانے اور خمینی کے آنے کو ہی انقلاب سمجھ رہے ہیں۔ یہ ان کا وہم ہے۔ حقیقت میں انقلاب تو تب ہوگا جب حقیقتاً نظام میں کوئی تبدیلی ہوگی، معاشرے کا نیا ڈھانچہ تعمیر ہوگا۔ ابھی تو ایسا لگ رہا ہے جیسے وقت

سے پہلے آپریشن کر کے انقلاب کو پیدا کیا گیا ہے۔"

"تم مارکسی ہو کیا؟"

"نہیں۔"

"شاہ کے دوست ہو؟"

"نہیں، بالکل نہیں۔"

"پھر ضرور انقلاب کے دشمن ہو۔"

"یہ کیسے؟"

"تم سب سے اہم واقعات کو معمولی بتا رہے ہو، اس لیے۔"

"خیر چھوڑو۔ وقت سے پہلے میں نے کچھ مدعے اٹھا لیے ہیں۔ اچھا چلتا ہوں۔"

فی الحال ایران میں باتوں کا موضوع دو خانوں میں سمٹ کر رہ گیا تھا۔ شاہ کے دوست اور شاہ کے دشمن۔ جو شاہ کا دوست تھا وہ موجودہ انقلاب کا دشمن..... اور جو دشمن تھا وہ خود ہی انقلاب کا حامی سمجھ لیا جاتا تھا۔

پورے ایران میں خمینی کی تصویریں کہیں کہیں دکانوں کے شیشوں، موٹروں کی کھڑکیوں وغیرہ پر چسپاں نظر آنے لگی تھیں۔ عوام کے بیچ ایک نیا چہرہ اپنی شناخت قائم کر رہا تھا۔ آیت اللہ تالغانی جیسے مشہور و معروف ہردلعزیز مولوی بھی ان کے بڑھتے ہوئے اثرات کو دیکھ رہے تھے۔

امام خمینی کا شہر 'قم' خبروں میں چمکنے لگا تھا۔ کچھ اخبارات ان کی سوانح کے ساتھ ساتھ اس حقیقت کو بھی پیش کر رہے تھے کہ وہ شاہ مخالف تھے۔ شاہ نے ان کے بیٹے کا قتل کرایا اور انہیں ملک سے نکال دیا تھا۔

شاہ ایک تناور درخت تھا۔ اس کے زمین چھوڑتے ہی بہت بڑا علاقہ ہل گیا تھا۔ جو اس کی عزت کرتے تھے، ملک چھوڑ کر جانے کی ان کی حیثیت نہیں تھی۔ وہ خود کو آریائی نسل کا سمجھتے تھے۔ انہیں بڑھتے اسلامی اثرات سے خوف محسوس ہونے لگا تھا۔ وزیر خارجہ کے ایک کمرے میں اسی پر گفتگو ہو رہی تھی۔

"شاہ کا مولویوں کے ساتھ حسن سلوک دراصل آج اس کے زوال کا سبب بنا

تھا۔ ان کو دبا کر رکھتا تو آج یہ سر نہ اُٹھا پاتے۔''

''اُلٹے وہ ملک اور بیرونِ ملک کے مذہبی مقامات کے دروازے سونے چاندی کے لگواتے، ہیرے جواہرات چڑھاتے۔ اس سے ان کی مقبولیت میں اضافہ تو ہوا، لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی لوگوں کے درمیان مکالموں کا دَور شروع ہو گیا، جو آج ان کی مخالفت میں کھڑے تھے۔ دیکھ رہے ہو، پوری دُنیا کے مولوی ایران کے انقلاب سے کتنے حساس ہو گئے ہیں!''

''تم لوگ کسی حد تک ٹھیک کہہ رہے ہو۔ لیکن میرا خیال ہے کہ ایران جتنا ماڈرن ہو چکا تھا اسی کا یہ ردِعمل ہے کہ اب ایران میں مذہبی اثرات کو بڑھاوا ملے گا۔''

''مذہبی اثرات بڑھے تو ایران اندھیرے میں ڈوب جائے گا۔ یہ وقت تو آگے بڑھ کر شاہ کی خامیوں کو ٹھیک کرنے کا ہے، نہ کہ پیچھے جا کر اپنے اباؤ اجداد کو ڈھونڈنے کا۔ میں تو بہت فکر مند ہوں۔''

''ایران کو متوازن ہونے کی ضرورت ہے۔ مذہب، ترقی، خیالات، کھلا پن سب کو ساتھ لے کر چلنے میں ہی بھلائی ہے۔''

روز ہوتی اِن بحثوں کا کوئی آخر نہیں تھا، مگر ہر جگہ اسی طرح کی باتیں کر کے لوگ اپنے ملک کا اور اپنا مستقبل جاننا چاہتے تھے۔ صحافیوں میں تو شاہ کے لوٹنے کو لے کر قیاس آرائیاں ہو رہی تھیں۔ اکثر صحافیوں کا یہ خیال تھا کہ ۱۹۵۳ کی طرح، جب ڈاکٹر مصدق کے ذریعہ پٹرول کا نیشنلائزیشن کے چلتے شاہ کو ایران چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا، تو سب قیاس لگا رہے تھے کہ ان کی پارٹی 'نیشنل فرنٹ' اقتدار میں آئے گی۔ مگر دیکھتے ہی دیکھتے پانسا پلٹ گیا۔ ڈاکٹر مصدق جیل میں بند کر دیے گئے اور امریکا کی مدد سے شاہ دوبارہ اقتدار میں آ گئے تھے۔ ہو سکتا ہے، اس مرتبہ بھی کچھ ایسا ہی ہو، اور عظیم برطانیہ ان کا ساتھ دے۔

ایران میں اشتراکی تحریک کی سو سال پرانی تاریخ ہے۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ متعدد جماعتیں ہیں لیکن پارٹی صرف ایک ہے جس کا نام 'تودہ' ہے۔ اس نے مولویوں کو کھل کر اپنی حمایت دی۔ سوویت یونین (موجودہ روس) کی طرف جھکاؤ

رکھنے والی یہ پارٹی شاہ کے زمانے میں زیادہ تر زمین دوز ہی رہی ہے۔ اس وقت اسی کا بول بالا ہے۔

ماہر سماجیات اور مورخین خاموش تماشائی بنے یہ دیکھ رہے تھے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ مگر ان کا خیال تھا کہ برسوں پہلے 'تمباکو تحریک' کا سارا دار و مدار مولویوں پر تھا۔ ایران جیسے آگ کی پرستش کرنے والے ملک میں مذہب اب ایک بار پھر اہم کردار نبھائے گا، اس لیے اگر مولوی اقتدار میں آتے ہیں تو کافی دنوں تک حکومت کریں گے۔

ان ساری بحثوں سے دُور دُنیا کے کونے کونے سے ہوائی اُڑانیں سب سے زیادہ ایرانی مسافروں کو ایران پہنچا رہی تھیں، اور انہیں ایران سے باہر لا رہی تھیں۔ سفر کی تاریخ کا یہ سب سے اہم وقت تھا جب اتنی کثیر تعداد میں ایرانی اڑانیں بھر رہے تھے۔ اس کی وجہ بھی تھی۔ دُنیا کے تمام اخبارات ایرانی انقلاب کو اہمیت دے رہے تھے۔ ریڈیو، ٹی۔ وی اس کی خبریں خوب سنا اور دِکھا رہے تھے۔ جس کو دیکھ دیکھ کر بیرونِ ملک بسے ایرانی وطن واپس آنے کے لیے بے چین تھے۔ خصوصاً دانشور طبقہ تو اس تاریخی لمحہ کا چشم دید گواہ بننا چاہتا تھا۔ دوسری طرف شاہ کے زمانے میں اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں کا وقت پریشانیوں سے گھر گیا تھا۔ جان مال کا خطرہ تھا۔ انہیں ایران سے باہر جانا تھا۔ بہت تیزی سے وہ اپنی دولت باہر کے بینکوں میں منتقل کر رہے تھے۔ قیمتی سامان سے بھرے صندوق، تھیلے لیے وہ ہوائی اڈّے کی طرف بھاگتے نظر آ رہے تھے۔ اندر باہر کا یہ حقیقت میں سکّے کے دو مختلف پہلو تھے۔

ان دو طرح کے لوگوں سے الگ ایک گروہ اور بھی تھا جو شاہ کے جانے کو تاریخی جھروکوں اور گلیاروں سے دیکھ رہا تھا۔ ان کے دل میں، شاہ کا ملک سے جانا ایک کسک پیدا کر رہا تھا۔ اچھا تھا یا برا، آخر تھا تو اپنا ہی، پھر اس نے کچھ اچھے کام بھی کیے تھے۔ دُنیا کے نقشے پر ایران کا نام روشن کیا تھا۔ عربوں کے بیچ آریوں کی پہچان الگ سے

دکھانے کی درخواست کی تھی۔

''قاچار کے دَور میں کیا تھا؟ شاہ عیاش تھا، صرف اپنا خیال رکھتا تھا۔ اس کی فوج کے ایک سردار محمد رضا نے بغاوت کی اور خود تخت نشین ہو گیا۔ فارسی زبان کے قدیم نام پر اپنے خاندان کا شاہی نام پہلوی رکھا۔''

''اس کے بیٹے یعنی موجودہ شاہ کو اپنے آریہ ہونے پر بڑا ناز تھا۔ اسی لیے وہ اپنے نام کے آگے آریہ مہر لکھتا تھا۔''

''اس کی دو بڑی غلطیاں تھیں۔ ایک تو اس نے لکھنے پڑھنے والوں کو آزادی نہیں دی۔ دُوسرے پیٹرول سے پیدا ہوئی سہولیات کو برابری سے لوگوں تک نہیں پہنچایا۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ اگر شاہ خود اس ماحول میں آجائے اور اپنے بارے میں سنے تو کوئی تعجب نہیں کہ وہ خود اپنے خلاف نعرے لگانے لگے گا۔''

اس طرح کی باتوں پر لوگ سر ہلاتے، پھر اپنے اپنے کاموں میں لگ جاتے تھے۔ ان کے لیے روٹی کمانا بھی تو ایک کام تھا۔ کچھ اور لوگ تھے جو شاہ کے جانے کی تحقیق و تفتیش اس ڈھنگ سے کر رہے تھے کہ شاہ اس علاقے میں اتنا طاقتور بن گیا تھا کہ اس کو اُکھاڑنا امریکا کے لیے بہت ضروری تھا۔ دُنیا میں امریکی ایئر فورس کے بعد ایران کا نام آتا تھا۔ اس کے پاس ہتھیاروں کا ذخیرہ اور تیل سے بھرے کنویں تھے۔ جس سے عرب ممالک بھی خوفزدہ رہتے تھے۔ لیکن شاہ کے دبدبے کے آگے آواز بلند نہیں کر سکتے تھے۔

ان تمام خیالات، جذبات اور واقعات کا ایک ہی سچ تھا کہ وقت کسی کا ورثہ نہیں ہے۔ شاہ کو جانا تھا چلا گیا۔ وہ وقت کا تقاضا تھا۔ خمینی کو آنا تھا تو وہ آ رہے ہیں۔ کیونکہ آج وقت کی یہی ضرورت ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے ایران سے شاہ کی تصویریں غائب ہو گئیں، اور ہر جگہ امام خمینی کے بڑے بڑے پوسٹر نظر آنے لگے۔ کچھ لوگوں کے دماغ میں سوال اُٹھا کہ اسلام میں تصویر بنانا ممنوع ہے۔ پھر ایک مولوی کی اتنی تصویریں کیوں بن رہی ہیں؟

ایران میں امام خمینی کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ پورا ملک جھلمل کر رہا تھا۔ ہر گھر میں ایک ہلچل سی مچی ہوئی تھی۔ جو صرف امام خمینی کے لیے نہیں تھی، بلکہ بدلتے وقت کے ساتھ سمجھوتہ کرنے اور تال میل بٹھانے کی بھی تھی۔

پری، اختر، طیبہ کو اب پی۔ایچ۔ڈی میں اپنے داخلے کی اُمید ختم ہو چکی تھی۔ سب اپنے اپنے میں مصروف رہنے لگیں۔ ادھر ملنا بھی کم ہو رہا تھا۔ ہر روز کسی نہ کسی محلے میں ہنگامہ ہو جاتا تھا۔ گھر سے باہر نکلنے کی اجازت ہی نہ ملتی۔ اختر اور طیبہ تو پھر بھی کچھ نہ کچھ انتظام کر کے کام سے نکل ہی جاتی تھیں، لیکن پری تو گھر میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ ماں کو اس کی شادی کی فکر لگ گئی تھی کہ کوئی لڑکا ملے اور وہ اس سے پری کی شادی کر دیں۔

گرمی غضب کی ہو رہی تھی۔ سب گرمی سے بھاگنا چاہ رہے تھے۔ سمندر کی طرف جانے والی سڑک تہران سے لے کر شمال میں سمندر تک کاروں سے بھری تھی۔ کہیں کہیں پر تو صرف کاریں رینگ رہی تھیں۔

طیبہ، سوسن اور پری ایک کار میں تھیں اور ملیحہ، شہناز اور اختر دوسری کار میں۔

''دو گھنٹے تو راستے میں ہی رینگتے رینگتے لگ گئے ہیں۔''

''سچ! ایسے میں کیا بھی کیا جا سکتا ہے۔ جمعہ کا دن ہے، سبھی باہر نکلے ہوئے ہیں۔''

''پیچھے لوٹنے کو بھی جگہ باقی نہیں بچی ہے اب تو۔'' سوسن نے اوپر سے پیچھے نظر ڈالی۔ خمدار، اوپر نیچے، میلوں لمبی سڑک پر صرف رنگ برنگی کاریں نظر آ رہی تھیں۔

سمندر کے کنارے پہنچ کر سب پہلے خوب نہائے۔ بالو میں کھیلے پھر جنگل کی طرف گھومنے کے لیے چلے گئے۔ خوشی سے مست بچے اُچھل کود کر رہے تھے۔ شام ہوتے ہی سب واپسی کے لیے مڑ گئے۔

"آج رات یہیں پر کیوں نہ ٹھہرا جائے؟" پری بولی۔
"نہیں! گھر پر سب کو انتظار ہوگا۔"
"فون کر دیتے ہیں۔"
"نہیں، پھر آئیں گے اگلے ہفتے۔"
راستہ پھر سے طویل کاروں سے بھرا ہوا تھا۔
"واقعی کوئی کہے گا کہ ہم نے انقلاب کیا ہے؟"
"کیسے، سب خوشی میں جھوم رہے ہیں!"
"خوش تو صرف ہم ہیں، باقی کا حال تو ہمارے محلے میں آکر دیکھو۔" شہناز بولی۔
"کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔" طیبہ نے کہا۔
آس پاس کی کاروں سے گانے اور تالیوں کے پیٹنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ روشنی اُگلتی سڑک پر کاروں کا آبشار دھیمی رفتار سے لگاتار بہہ رہا تھا۔

شاہ کی خفیہ پولس 'ساواک' شاہ کے جانے کے بعد ششدر سی رہ گئی تھی۔ دوسروں کے گھروں میں جھانکنے کی ان کی عادت بن چکی تھی۔ ہر شخص کا کچا چٹھا انہیں پتہ تھا۔ کس کے ساتھ کیسا سلوک کرنا ہے، اس کی قانونی دفعات انہیں حفظ تھیں۔ لیکن اقتدار کے بدلنے کے ساتھ ہی ان کی ساری خدمات بیکار ہوگئی تھیں۔ اعلیٰ افسران کو بھاگنے کا موقع مل گیا تھا۔ کچھ مشہور افسران کو گولیاں مار دی گئی تھیں۔ لیکن جو چھوٹے موٹے تھے، ان کی خدمات لینے سے نئی حکومت نے انکار کر دیا تھا۔ ان کو یہ پریشانی لاحق تھی کہ کہاں جائیں؟ کیا کریں؟
جو عقلمند تھے انہوں نے اپنی داڑھیاں بڑھا لیں اور سڑکوں پر نکلتے جلوس میں شامل ہو گئے، اور خود کو مذہبی اور پرہیز گار دکھانے لگے۔ پورے دن، اللہ اللہ کرتے، اور گھر پہنچ کر خوب شراب پیتے، تریاق کا نشہ کرتے، پرائی عورتوں پر بری نظر رکھتے۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ اکثر لوگوں کو مولوی کا لباس پہننے والوں کی آنکھوں میں

روحانی پاکی کی جگہ کرختگی اور عیاری نظر آنے لگی۔ لڑکے لڑکیوں نے اپنے گلی کوچوں اور محلے میں پہلی بار مولوی دیکھے تھے۔ وہ اپنے آپ ہی مذہب اور مذہبی لیڈروں کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔

اِن تمام اُلجھنوں اور انتشار سے ادیب حضرات چکرا کر رہ گئے تھے کہ ایسے وقت میں کون سا افسانہ اور کس طرح کی شاعری لکھی جائے؟ طیبہ نے ایک روز ڈاکٹر شمس سے کہا کہ ''اگر شیکسپیئر زندہ ہو کر دوبارہ آجائے اور اس ماحول پر ڈرامہ لکھے تو اس کی شکل، اس کا تصور، اس کی زبان و بیان اور انداز کس طرح کا ہوگا؟''

''تب تو جذباتی سطح پر ہر کردار صرف اپنی بات کہے گا اور......'' باقی کی باتیں ہنسی مذاق میں اُڑ گئیں۔

''میں سوچتی ہوں کہ ان ڈراموں کا کوئی سر پیر کسی کی سمجھ میں نہیں آئے گا...... اتنے کردار، اتنے واقعات اور اتنے تضادات ہوں گے کہ لکھنے والے پڑھنے والے کے ساتھ ڈرامہ دیکھنے اور کرنے والے بھی بھول جائیں گے کہ وہ کہاں سے چلے تھے اور کہاں جانا ہے۔'' طیبہ نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''خیر، مذاق چھوڑو۔ وہ مضمون ختم ہو گیا ہو تو مجھے دے دو، ورنہ پریس کا چکر دوبارہ لگانا پڑے گا۔'' ڈاکٹر شمس نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ابھی ٹھہرو! میں 'کیپٹل' کو دوبارہ پڑھ رہی ہوں۔ اس میں سے کچھ لائنیں اخذ کرنی ہیں...... اگلے ہفتے دوں گی۔'' طیبہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے، تو پھر چلتا ہوں۔'' کہہ کر شمس کمرے سے باہر نکل گیا۔

''بہروز سے ملاقات ہوئی؟'' طیبہ نے سیڑھی سے اُترتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں...... اوہو...... میں تو بھول ہی گیا تھا، تمہارے لیے نرگس نے ایک جنگلی گھاس جیسا کچھ بھیجا ہے۔ گزشتہ دنوں وہ شمال کے جنگلوں کی طرف گئی تھی۔'' کہتے ہوئے ڈاکٹر شمس نے کار کا دروازہ کھولا اور بیوی کا بھیجا ہوا تحفہ، پیچھے کی سیٹ سے اُٹھا کر طیبہ کو دے دیا۔

''بے حد خوبصورت ہے! نرگس کی پسند کی میں داد دیتی ہوں، سچ......'' طیبہ نے

سفید پلاسٹک میں لپٹے چھوٹے گلدان میں اُلجھے بالوں جیسے ایک پودے کو دیکھا۔
''اچھا۔'' شمس نے ہاتھ ہلایا اور کار اسٹارٹ کی۔
''میری طرف سے نرگس کو پیار کہنا، کسی دن آؤں گی۔'' کہہ کر طیبہ مڑی اور سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
کمرے میں پہنچ کر طیبہ نے گلدان کو پلاسٹک سے آزاد کیا اور اس ہرے پودے کو انگلیوں سے چھوا۔ اس کے لمس میں اتنی نرمی تھی کہ طیبہ نے اس پودے کو چوم لیا اور بہت احتیاط سے کتابوں کی الماری پر رکھ دیا۔ کچھ عجیب سی مخملی سرمئی بالوں کی لٹیں تھیں۔ قدرت کتنی عظیم ہے، اسے دیکھنے اور سمجھنے کے لیے اپنی یہ زندگی کتنی مختصر ہے؟ طیبہ نے سوچا اور کرسی پر بیٹھ کر میز پر رکھے اپنے نامکمل مضمون پر جھک گئی۔

اصفہان جیسے تاریخی شہر میں میدانِ شاہ خاص مقام رکھتا ہے۔ کاشی کاری کے بہترین نمونے اور بازار میں طرح طرح کی دُکانیں، جو غیر ملکی سیاحوں کو ہی نہیں مقامی لوگوں کی توجہ بھی اپنی جانب مبذول کراتی ہیں۔ اُونچے پہاڑ پر لگا شاہی تاج رات کو اندھیرے میں جھلمل جھلمل کرتا رہتا تھا۔ پری کو جب وہ نظر نہیں آیا تو اسے ایک عجیب طرح کی کمی کا احساس ہوا۔ جیسے کچھ کھو گیا ہو، کچھ چھین لیا گیا ہو۔ وہ دو روز کے لیے ماں کے ساتھ آئی ہوئی تھی اور اب چپ چاپ بیٹھی سوچ رہی تھی کہ 'وہ نہ تو شاہ کی دوست ہے اور نہ دشمن، پھر سب کچھ اسے عجیب سا کیوں محسوس ہو رہا ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ بچپن سے جس چیز کو دیکھنے کی عادت پڑ گئی ہے، اس عادت کی وجہ سے ہی آنکھیں متلاشی رہتی ہوں؟ نہ ملنے پر ایک انجانا سا خوف رہتا ہے کہ تم تنہا رہ گئے؟ تمہارا پچھلا سب کچھ کہیں کھو گیا ہے؟'
''کیا سوچ رہی ہے، پری؟'' ماں نے اسے یوں اُداس بیٹھے دیکھ کر پوچھا۔
''کچھ نہیں، ماماں......! بس یہ اصفہان اس مرتبہ کچھ بدلا بدلا سا لگ رہا ہے، جیسے......'' کہتے کہتے پری رُک گئی۔

''ہر دُکان، ہر گھر کی دیوار پر ایک تصویر کے ہٹنے کا نشان صاف نظر آ رہا ہے......
اور مجھے بھی ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جو کچھ میں اس شہر میں چھوڑ گئی تھی، ہو بہو ویسا یہ شہر اس بار مجھے نہیں ملا۔'' ماں نے کہا۔ ان کے چہرے پر بھی بدلے وقت کی پرچھائیوں کا عکس صاف نظر آ رہا تھا۔

''ہماری سوچ کے بہت سے حصے خالی ہو گئے۔'' پری اتنا کہتے ہی اُٹھی اور ماں کے پاس جا کر ان کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال کر ان کے گالوں کا بوسہ لینے لگی۔

''اسی لیے میری خواہش ہے کہ وقت اس سے بھی زیادہ بُرا لگے، میں تیری شادی کر دینا چاہتی ہوں۔''

''شادی سے گھر بدل جائے گا، دل و دماغ نہیں ماں۔'' پری نے اداس نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔

''خالی دماغ شیطان کا گھر ہوتا ہے بیٹی، پڑھائی پوری ہو چکی ہے تو اب دماغ کو کہیں تو لگانا پڑے گا۔ گھریلو زندگی میں مصروف رہنے سے انسان کے خیالات نہیں بھٹکتے۔'' ماں نے پری کی پیشانی چومتے ہوئے کہا۔

''اچھا، مامان! کیا واقعی آپ مجھ سے محبت کرتی ہیں؟'' پری نے عجیب سا سوال کیا۔

''کیوں کیا سوتیلی ماں محبت نہیں کر سکتی؟''

ماں کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ پری نے ان کے گلے میں اپنی بانہیں ڈال دیں اور ان کے گال پر اپنے ہونٹ ثبت کر دیے۔

پیرس سے اُڑان بھرتا ہوا خمینی کا جہاز، صحافیوں اور نئے نئے لوگوں سے بھرا ہوا جب تہران پہنچا تو لوگوں نے جوش میں ناچ ناچ کر اپنی کاروں کی چھتیں تک توڑ ڈالی تھیں۔ خمینی کی خواہش سیدھے بہشتِ زہرا قبرستان پہنچنے کی تھی تاکہ پہلے وہ شہیدوں کی نمازِ جنازہ پڑھیں۔ یہ جان کر ایرانی عوام جذباتی ہو گئے۔ میلوں تک لوگ اپنے کاندھوں پر امام خمینی کی کار کو لے جارہے تھے۔ سب پر دیوانگی طاری تھی۔ قبرستان میں شہیدوں کی قبر پر بہت بھیڑ تھی۔ ہیلی کاپٹر اُتر نہیں پار ہے تھے۔ لوگ رنگین ٹی۔وی پر امام خمینی کو دیکھنا چاہ رہے تھے۔ ایک دُوسرے، کے گھروں میں گھسے جارہے تھے کہ کس کے یہاں رنگین ٹی۔وی ہے۔ اسّی ہزار نوجوان شہید ہوئے تھے۔ جب امام خمینی رہبر نے یہ کہا۔ ''پانی اور پیٹرول ایرانیوں کے لیے مفت ہے۔ اپنی زمین کی دولت کا کوئی ٹیکس دیتا ہے؟ اور بجلی بھی سب کے لیے مفت ہے۔''

اس اعلان کے بعد پورے ایران میں ایک ہنگامہ سا برپا ہو گیا۔ خوشی سے لوگوں کے دِل پھولے نہیں سما پارہے تھے۔ دیوانہ وار لوگ چیخ رہے تھے۔ 'خمینی ہمارے لیڈر'، 'خمینی ہمارے رہبر'

ہر ایرانی کا دل امام خمینی کی محبت سے شرابور تھا لیکن ایک خاص گروہ جو ترقی پسند تھا، امام خمینی کا زبردست مخالف تھا۔

نیا ایران اُبھر رہا تھا۔ ہر جگہ سے شاہ کا نام اور شاہ کے آدمیوں کو ہٹایا جارہا تھا۔ شاہی ملبوسات، زیور، اور کتے نیلام ہو رہے تھے۔ گھروں میں لوگ چھپتے پھر رہے تھے۔ جو بھی اپنی زبان کھولتا، اسے انقلاب کا دشمن، شاہ کا دوست کہہ کر جیل میں بند کر دیا جاتا۔ شاہی فوج کے افسران یکے بعد دیگرے پھانسی پر چڑھائے جارہے تھے۔

ایون حصار کزون جیلوں سے بہت سے ناخن، انسانی ڈھانچے، ہتھیار، بینت اور

سلاخیں ملی تھیں۔ دو ہزار سیاسی قیدی......؟

کتنا ظالم تھا شاہ......؟

چہار سو شاہ سے نفرت کا بازار گرم تھا۔ امریکا سے بھی نفرت بڑھ رہی تھی۔ یونیورسٹی کے بیشتر پروفیسر، عالمی سطح کی تنظیم 'فراموسن' کے ممبر ہونے کی وجہ سے نکال دیئے گئے تھے۔ ان میں بھی کئی سینئر پروفیسر تھے۔ ان لوگوں میں اسلم کے والد پروفیسر عطاپور بھی شامل تھے۔ سب پر یہ خبر بجلی بن کر گری۔ اپنے لوگ پہچانے نہیں جا رہے تھے۔ پرانی پہچان کی عمارت منہدم ہو چکی تھی اور نئی پہچان مکمل طور پر منفی مناظر پیش کر رہی تھی۔ شاہی پولس 'ساواک' کے افسروں کے ناموں کی فہرست کی ایک کتاب چھپ کر آ چکی تھی۔ جس کو پڑھ کر بہت سے لوگوں پر غشی طاری ہو رہی تھی کہ ان کے بھائی، باپ، شوہر، بیوی، پڑوسی 'ساواک' میں اہم کردار نبھا رہے تھے اور اس کا انہیں علم بھی نہ ہو سکا۔ بہرحال ہر جگہ تحریری اور زبانی احکامات جاری کیے جا رہے تھے، کہ عوام ان ناموں سے ہوشیار رہیں اور ضرورت پڑنے پر پولس کو اس کی اطلاع دیں۔ ان میں بھی کئی سینئر پروفیسر تھے۔ ساواک کا جال عجیب و غریب چہروں سے لوگوں کو متعارف کرا رہا تھا۔ سب سہمے ہوئے تھے کہ نہ جانے کب انہوں نے کیا بات کہہ دی ہوگی۔ بہرحال وقت آگے بڑھتا رہا۔

سردی کی شدت تھی، مزید اس خبر نے ہڈیوں میں گلن پیدا کر دی تھی کہ امریکن ایمبیسی کو خمینی کے مرید طلبا نے اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اور خود کو خدا کی پارٹی حذب اللہ کہہ رہے ہیں۔ لوگوں کے جھنڈ کے جُھنڈ اس برفیلی رات میں امریکن ایمبیسی کے سامنے جمع ہو رہے تھے اور اندر امریکن قیدی ہتھیار ڈالے بیٹھے تھے۔

امریکیوں کے تئیں ایرانیوں کا نفرت بھرا یہ حوصلہ دیکھ کر دُنیا ایک بار پھر ہل گئی۔ امریکا کی اس دُرگت سے سوویت یونین کو بہت خوشی ہو رہی تھی۔ عظیم برطانیہ کو اپنی پرانی دوستی پھر سے بحال کرنے کی اُمید نظر آنے لگی تھی۔ شہناز پریشان سی خبریں سمیٹنے

میں لگی ہوئی تھی۔ ہر آدمی کوئی نہ کوئی نئی اطلاع دے رہا تھا۔ ریڈیو، ٹی۔وی پر متوجہ لوگ کچھ سننے کے لیے بے چین تھے۔

پری کی سوتیلی ماں کی طبیعت اچانک خراب ہو گئی۔ وہ ڈاکٹروں کو فون کر کر کے تھک چکی تھی، لیکن کچھ نہ ہو سکا۔ کوئی بھی ڈاکٹر گھر پر موجود نہ تھا۔ پری کے والد بھی گھر پر نہیں تھے۔ اب وہ کیا کرے؟ پری نے بیٹھ کر رونا شروع کر دیا۔
ماں کی طبیعت لحہ لحہ بگڑتی جا رہی تھی۔ جانے کیسا درد تھا جو اُن کے سینے میں اُٹھ رہا تھا۔ وہ بے چینی میں بار بار پری کی ماں کا نام لے رہی تھیں۔ پری کیا کرے؟ رات کے گیارہ بجے ڈاکٹر آئے۔ انہوں نے بتایا کہ "دِل کا دَورہ پڑا ہے۔" جب تک کچھ ہوتا، ماں کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ پری کے والد جب گھر لوٹے، تو گھر کی شکل ہی بدلی ہوئی تھی۔

سڑک پر 'مرگ بر، امریکا' کے نعروں کا شور بڑھتا جا رہا تھا جس میں پری کے رونے کی آواز بھی شامل ہو گئی تھی۔
چند ماہ گزر گئے۔ پری کو اُمید تھی، کہ اس درمیان پرانے تعلقات کے چلتے ماں کو اب گھر بلا لیا جائے گا اور اس کو اپنی ماں کی محبت مل جائے گی۔ مگر پری کے والد جوان لڑکی کا بوجھ جلد ہی ہلکا کرنا چاہتے تھے۔ اُدھر پری، تیسری ماں کا چہرہ دیکھنے کے خوف سے اَدھ مری ہوئی جا رہی تھی۔ اس لیے جب اس کے والد نے بیٹی کی شادی کا سوال اُٹھایا تو اس نے بڑی خاموشی سے اپنی رضامندی دے دی۔ بڑی سادگی سے پری کی شادی خالد سے ہو گئی۔

میں تمہارے لیے خاموشی سے آنسو بہاتے بہاتے کسی شمع کی مانند پگھل رہی ہوں۔ میرا رنگ و روپ، سب کچھ ڈھلتا جا رہا ہے۔ یا خدا! کہیں ایسا نہ ہو کہ جب

تمہیں پاؤں تو نہ آنکھوں میں روشنی ہو اور نہ گالوں پر زندگی کی چمک۔ زلیخا کی طرح خوش قسمت بھی تو نہیں ہوں کہ خدا دوبارہ جوانی بخش دے۔ میں تو بس اس لٹی ہوئی زلیخا کی طرح رہوں گی، جو محلوں سے اُتر کر جھونپڑے میں آکر صرف شب و روز یوسف کی سواری کے گزرنے کی راہ تکتی تھی اور بس...... وہی اس کی زندگی، وہی اس کی اُمید۔

سرخ آڑوؤں سے لدے درخت کے نیچے ملیحہ کھڑی سوچ رہی تھی کہ آج دو سال گزر چکے ہیں حسین کو گئے ہوئے۔ پہلے معلوم ہوا تھا کہ گرفتار ہو گیا ہے، جیل میں ہے۔ کون سی جیل میں؟ یہ پتہ نہ چل سکا۔ آزاد کیے گئے قیدیوں میں بھی وہ نہیں تھا۔ اِدھر سے اُدھر ہر جیل کا چپہ چپہ چھان مارا تھا، لیکن حسین کا پتہ نہ چلا۔ گھر میں سب کو یقین ہو چکا تھا کہ حسین کو مار دیا گیا ہے۔ اس لیے وہ ملیحہ کو بار بار زندگی کی طرف لانا چاہتے تھے۔ مگر اُنہیں کچھ ہی روز کے بعد ایسا لگنے لگا کہ یہ کوشش بیکار ہے۔ یہ سب کہنا بے معنی ہے۔ اُسے تو حسین سے عشق ہو گیا ہے۔ لیکن عشق تو زندوں سے ہوتا ہے، مُردوں سے نہیں۔ مُردوں کی تو صرف یاد ہوتی ہے۔ لمس نہیں اور لمس ہی حقیقت ہے۔ اختر نے ملیحہ سے کہا تھا۔

"جیل خانوں کے تمام قیدی آزاد ہو چکے ہیں اور اُن میں حسین نہیں ہے۔ اس کا انتظار بیکار ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔" لیکن ملیحہ کو یقین تھا کہ زلیخا کی طرح اس کے دن بھی پلٹیں گے۔

ایک روز طیبہ نے اسے بہت سمجھایا تھا۔ اس کا جواب اس نے دیا۔ "تم نے بنجارن کا جنم لیا ہے، جم کر چہار دیواری میں قید رہنا تمہیں پسند نہیں ہے۔ تمہاری زندگی کا ہر پڑاؤ تمہیں خوشی دیتا ہے طیبہ، مگر میں...... میں نے زندگی سے صرف حسین کو مانگا تھا۔ تمہاری طرح خوشی بھی فلسفیانہ نہیں مانگی تھی۔ میری خواہش، میری دُنیا حسین کے ساتھ ہے۔ تمہارے لیے عشق سماجی خوشی کا نام ہے۔ میرے لیے عشق کا مطلب روح ہے۔ میں اس دُنیا میں صرف سکھ اور دولت وحشمت کی دُنیاوی تلاش میں نہیں آئی ہوں اور نہ ہی ایسی زندگی جینا چاہتی ہوں۔ میرے دامن میں حسین

پھول بن کر گرا۔ اسے میں نے اپنا وجود دے ڈالا۔ میں ایک لمحہ کے لیے بھی اس کے بغیر کیسے جی رہی ہوں، تمہیں اس کا احساس نہیں ہو سکتا۔ ابھی یہ غم تمہیں دُکھ دے رہا ہے...... کل میرے سارے وجود میں پھیل کر اس کا اُوپری خول پھیکا پڑ جائے گا۔ تب لوگ کہیں گے کہ میں حسین کو بھول گئی ہوں۔ لیکن کیا ایسا ہوگا......؟ میں دراصل اس کے وجود کی روح کو جی رہی ہوں...... جذبات کی سطح پر کھڑی ہوں میں۔ طیبہ...... خدارا مجھے سمجھو، مجھ پر اپنا فلسفہ مت لادو۔ مجھے سمجھانے کے بجائے مجھے سمجھنے کی کوشش کرو۔"

"اگر تمہیں ایسا یقین ہے تو اسی یقین کے ساتھ جیو، میں اب کچھ بھی کہہ کر تمہیں تکلیف نہیں پہنچاؤں گی۔ میری خواہش تو بس تمہیں خوش دیکھنے کی ہے۔ اگر تم اس طرح سے خوش رہ سکتی ہو تو میرے لیے کافی ہے۔"

دونوں سہیلیوں کے درمیان پھر اس طرح کی گفتگو نہ ہوئی۔ طیبہ بہت دیر تک ملیحہ کے دونوں بچوں کے ساتھ کھیلتی رہی۔

شادی کے پانچ ماہ کے بعد پری، شیراز سے آج ہی تہران لوٹی تھی۔ اس نے آتے ہی سوسن کو فون کیا۔ سب کے بارے میں پوچھنے کے بعد وہ بولی۔ "میں کل آجاؤں؟ یا پھر تم لوگ میرے ہوٹل آجاؤ۔ تمام دن بیکار رہوں گی۔ خالد تو بزنس کے سلسلے میں نکل جائیں گے۔ تم سب لنچ میرے ساتھ کرو۔"

سوسن نے رات کو جواب دینے کے لیے کہہ کر فون بند کر دیا۔

دُوسرے دن سب ہوٹل کے اس کمرے میں جمع ہوئیں۔ اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد ایک دم پری نے اختر سے پوچھا۔ "تم نے زندگی کا یہ رُخ کیوں اپنی موت کی طرف موڑ لیا، اختر؟"

"بس یوں ہی۔" اختر نے ٹالنا چاہا۔

"پھر بھی۔"

''جو کہوں گی وہ تم لوگ کیا سمجھو گی؟'' اختر نے کہا۔
''اچھا جی، تو آپ اس درمیان بہت سمجھدار ہوگئی ہیں۔'' پری ہنس پڑی۔
''ہاں، لگتا تو ایسا ہی ہے۔'' اختر کھلکھلا پڑی۔
''سچ، مذاق مت کرو، اس راہ میں خطرہ ہے، دیکھ نہیں رہی ہو ملیحہ کا حال؟''
''ملیحہ کسی کے نام کو لے کر رو رہی ہے۔ میرے لیے رونے والا کون بیٹھا ہے؟''
''اچھا جذباتی نہ بنو، حقیقت بتاؤ، وجہ کیا ہے؟''
''بس دل میں آیا کہ جب انسان کے پاس کسی چیز کی کمی ہوتی ہے، تو وہ کتنا کڑھتا ہے، اور پھر مجھے تو اس کڑھن کا احساس بچپن سے تھا۔ جب دیکھا کہ وہ لوگ جو غریب ہیں، آگے آنا چاہتے ہیں۔ میں ان کی قطار میں شامل ہوگئی۔ اس زندگی سے مجھے سکون ملا، اعتماد ملا، محبت ملی، عزت ملی، میرے عیب اور میری خامیوں کی طرف کسی نے نہ دیکھا، بلکہ انہیں وہ عام سی لگیں۔ اب برسوں بعد میں کھل کر اقتدار مخالف گروہ کا حصہ ہوں۔ کبھی بھی میرے ساتھ کچھ بھی ہوسکتا ہے۔ مر بھی گئی تو مجھے افسوس نہیں ہوگا، کیونکہ میں تشنہ نہیں مروں گی۔'' اختر بولتی چلی گئی۔
''تشنہ نہیں مروں گی؟'' طیبہ نے جملہ دہرایا۔
''تشنگی سے کیا مطلب ہے تمہارا؟'' سوسن نے پوچھا۔
اختر خاموش رہی۔ سب کے چہرے سوالیہ نشان بن گئے۔ آخر پری نے پوچھ ہی لیا۔
''کیا کسی سے شادی کرلی ہے تم نے؟''
''تمہاری سمجھ کی گہرائی صرف تالاب تک محدود ہے، سمندر کا تو کنارہ بھی نہیں دیکھا تم نے۔'' سوسن نے مذاق سے کہا۔
''میری پیاس، میری سمجھ!'' پری کہہ کر چپ ہوگئی۔ کسی نے کچھ پوچھا نہیں، کیونکہ سب کو پتہ تھا کہ پری لاکھ پری چہرہ ہو، لیکن شوہر اس کا دیوانہ نہیں ہے۔ وہ تو بھنورا ہے۔ ہر روز اسے نئی لڑکی چاہیے۔ پری تو رو دھو کر چپ ہوگئی۔ اسے سدھارنا اس کے بس میں نہیں رہا تھا۔ اب پری دل ہی دل میں طیبہ کو سراہنے لگی تھی کہ کم سے کم اس نے شادی تو نہیں کی۔ شادی کے معاہدہ کو یوں توڑنا بہت بھیانک ہوتا ہے۔ اس کا

احساس صرف جلنے والا ہی کر سکتا ہے۔ پری نے شربت کا پورا گلاس آنسوؤں کی طرح ایک ہی سانس میں پی ڈالا، پھر ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔

"میں نے زندگی میں کبھی خواب نہیں دیکھا تھا۔ خواب دیکھنا مجھے پسند ہی نہیں تھا۔ حقیقت کی کھوج میرے متجسس دل کی تلاش تھی۔ مزا آتا تھا۔ ایک دم سے کسی گتھی کو سلجھا لینے میں، راز جان لینے میں، لیکن اب ایسا لگتا ہے کہ اُلجھی گتھی، پوشیدہ راز خوشی دیتا ہے۔ کیونکہ اس میں شک رہتا ہے، بھلاوا رہتا ہے۔ اس انکشاف سے میں نے خود پر قابو پایا ہے کہ مستقبل میں کسی بھی اُلجھن کو سلجھانا نہیں ہے...... اس وقت یہ سوال تم سے اس ناطے کر رہی ہوں کہ تم جو کچھ کر رہی ہو، اپنے ہوش و حواس میں کر رہی ہو، یا کسی کے کہنے پر، یا کسی مجبوری سے؟"

اختر خاموش رہی۔ وہ وجہ جانتی تھی، مگر کہہ کر سب کے سامنے حقیر بننا نہیں چاہتی تھی۔ اس میں طیبہ والی ہمت نہ تھی، ملیحہ الاصبر نہ تھا، پری کی طرح سمجھدار نہ تھی اور سوسن والی لاپرواہی نہ تھی۔ وہ تو آئینے میں خود کو پہچاننے والی، ایک پیاسی لڑکی تھی، جسے ایک حسین و جمیل لڑکے کی تلاش تھی۔ لیکن ان کے جذبات اور اس کے ارمانوں پر اس کی بدصورتی حاوی تھی۔ ہر لڑکے کی آنکھوں میں ایک ہنسی اُبھرتی جو اسے اندر تک گریدتی۔ ایسا بھی نہیں تھا کہ اسے کسی لڑکے کا پیغام نہ ملا ہو، مگر وہ اس سے بھی زیادہ بدصورت تھے۔ وہ خود لاکھ بدصورت سہی مگر خوبصورتی کی تو وہ دیوانی ہے۔ جب بدصورت مردوں کو خوبصورت بیویاں مل سکتی ہیں، تو ایک بدصورت بیوی کا شوہر خوبصورت کیوں نہیں ہو سکتا؟ جبکہ مور، مورنی سے زیادہ خوبصورت ہوتا ہے۔ اسے لبھانے کے لیے وہ اپنے پنکھ کھولتا ہے، لیکن انسان......؟ مگر اس کی یہ تڑپ اور تشنگی پارٹی کے دفتر میں جا کر بجھ گئی۔ ہر طرف عام سا سلوک تھا۔ بلکہ وہاں پر ایک دوسری صلاحیت کی مانگ تھی۔ جو خوبصورتی کے پیمانے سے دُور تھی۔ پچھلے چار برسوں میں وہ پیاس لڑکوں کے منھ سے اپنی تعریف، اپنا نام سنتے سنتے کچھ بجھنے لگی تھی۔ نئے لڑکے اس کی طرف اتنے احترام اور استعجاب سے دیکھتے کہ وہ اندر تک ہل جاتی۔ کبھی کبھی

دل میں ہوک سی اُٹھتی ۔ کاش! یہ تعجب، یہ احترام، یہ سلوک اس سے کچھ اور مانگے، کچھ اور...... جو مرد عورت کی پیدائشی مانگ ہے۔ مگر وہاں اس کا دبدبہ تھا اور وہاں جدوجہد اہم تھی، جسم نہیں۔

کچھ دنوں کے بعد جب جدوجہد نے خطرناک شکل اختیار کرلی، تب ان دنوں چار افراد ایک خفیہ پوشیدہ کمرے میں رہ رہے تھے۔ ایک دِن اُن میں سے دو افراد لوٹے نہیں۔ وہ اور نوید باقی رہ گئے تھے۔ رات کی تاریکی میں خوف، ہیجان اور حادثے کے انتظار میں اُس رات وہ ہوگیا جس نے اس کی پیاس کو پوری طرح سے بجھا دیا۔ پیاس دونوں طرف تھی۔ موت سے پہلے انسانی لمس کی تڑپ، زندگی کو جی بھر کر جینے کی پیاس اسی لیے ٹوٹ کر بجھی تھی۔ صبح جب وہ ہوش میں آئے، تو نوید شرمندہ تھا۔ لیکن وہ پوری طرح سرشار تھی۔ ایک ہفتے تک اس پُرمسرت تجربے کے بعد اسے بڑا زبردست جھٹکا لگا تھا۔ نوید ایک روز شام کو نہیں لوٹا۔ اس نے سوچا، وہ حاملہ ہے مگر یہ اس کا صرف وہم تھا۔ تب اسے خوشی بھی ہوئی تھی کہ پھنسی نہیں مگر دُکھ اس کو اس شبہ کی وجہ سے ہوا کہ کہیں وہ بانجھ تو نہیں ہے؟ اس کے بعد ہزاروں کی تعداد میں نوید شہید ہونے لگے۔ لیکن خاموشی سے، اندر ہی اندر، کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔ جو واقعات پوشیدہ نہیں رہ سکتے تھے وہ اخبارات میں آجاتے تھے۔ ان چند برسوں میں جو بھی مرد اس کی زندگی میں آیا، ناگہاں ایک راحت بخش واقعہ بن کر آیا اور حادثہ بن کر چلا گیا۔ کہیں بھی، قسمیں، وعدے، روٹھنا، منانا، گھومنا اور آہیں بھرنا نہیں ہوا بلکہ جو بھی ہوا وہ ماحول کی حصولیابی کی شکل میں ہوا۔ وہ مطمئن ہے کہ بدصورت ہونے کے بعد بھی سب سے حسین مردوں کے ساتھ اس کے تعلقات اپنے آپ بنتے چلے گئے۔ وہ کسی کے آگے جھکی نہیں، ٹوٹی نہیں، گڑگڑائی نہیں، بلکہ خوبصورت ہاتھوں نے خود آگے بڑھ کر اسے گلے لگایا...... یہ سب کچھ وہ نہیں بتا سکتی، خصوصاً طیبہ کے آگے۔ وہ کسی سے وابستہ بھی نہ ہوسکی۔ شاید مرد کے لمس کی بھوک اتنی تھی کہ وہی اس کے احساس کی مانگ بن گئی تھی۔ وہاں کا ماحول بھی ایسا نہ تھا کہ ایک واقعہ کو لے کر گھنٹوں اور دنوں تک سوچا جاتا۔ جو ہوگیا، وہ گزر گیا، آنے

والے کل کا پروگرام اہم ہوتا تھا۔

"کس سوچ میں ڈوب گئی تم؟" سوسن نے اختر کی آنکھوں میں کچھ ڈھونڈتے ہوئے پوچھا۔

"سوچ رہی ہوں کل کیا ہوگا؟ اتنی اموات، اتنی قربانیاں اور اتنا سب کچھ کیا بیکار جائے گا؟"

"موت! کتنی طرح کی موتیں ہوتی ہیں؟ میں بھی کچھ دن پہلے مری تھی اور میری موت کی کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہوئی۔ کچھ روز بعد میرے مردہ جسم میں ایک بد روح داخل ہوئی اور میں دوبارہ زندہ ہو اُٹھی۔" ایک ساتھ سب کی نظریں پری پر جم گئیں۔ "میری موت میری اپنی وجہ سے ہوئی تھی جب اُس بہار کی دوپہر، میں اپنے تجسس کو دبا نہ پائی اور گھر جلدی لوٹ آئی...... مجھے بہت دنوں سے کچھ اُلجھا ہوا سا نظر آرہا تھا۔ چھٹی کے دن کا پروگرام ساتھ ساتھ بنتا، مگر ٹھیک جانے کے وقت خالد کو کام یاد آجاتا، اور میں اکیلی ہی دُوسرے خاندانوں کے ساتھ پکنک پر جانے کے لیے مجبور ہو جاتی...... سچ، وہ لڑکی کہیں سے بھی مجھ سے زیادہ خوبصورت نہ تھی...... وہ بے حیا بھی تھی...... مجھے دیکھ کر گھبرائی نہیں تھی۔ خالد بوکھلا گیا تھا۔ بڑے آرام سے اُس نے کپڑے بدلے تھے...... جب وہ نارمل تھی تو میں کیوں مضطرب ہوتی...... میں نے بھی اپنی پوری طاقت کو جمع کیا، اور کچن میں جا کر مصروف ہوگئی۔ جب ناشتے سے بھری سینی لے کر کچن سے نکلی تو وہ چیونگم چباتی گھر سے باہر نکل رہی تھی۔

"ٹھہریے، چائے پی کر جائیے۔" میں نے اس سے کہا تھا۔

"وہ حادثہ گزر گیا، خالد سے کچھ نہ کہہ کر اکثر میں نے اس کو حقیر کیا ہے۔ لیکن اسی سے مجھے کیا حاصل ہوا......؟ پھر میرے سامنے بھی دُوسرے مردوں کی بھیڑ تھی اور میں کسی کا بھی انتخاب کرنے کے لیے آزاد تھی، مگر کس لیے؟ لیکن ایک دن جوش میں آکر کچھ کرنے ہی والی تھی کہ ہوش آگیا کہ اس سے کیا ملے گا؟ کیا میرا کھویا ہوا وقار، عزت، اور میرا یقین مجھے واپس مل جائے گا......؟"

سب کے چہرے ساکن تھے۔ جیسے ان کی گویائی یکا یک کسی صدمے نے چھین لی

ہو۔ طیبہ خاموشی سے ہر چہرے کا بغور معائنہ کر رہی تھی۔ کمرے میں بوجھل سا سناٹا اُتر آیا تھا۔ اچانک ہی طیبہ نے پری کو مخاطب کیا۔

''پری! کیا رشتے میں کچھ پانا ضروری ہوتا ہے؟''

''رشتوں کا قاعدہ تو یہی ہے۔''

'' کچھ رشتے ایسے بھی ہوتے ہیں جن کا کوئی قاعدہ نہیں ہوتا۔ وہ بننے سے پہلے ہی ٹوٹ جاتے ہیں۔ لمحاتی ہوتے ہیں، اور اتنے کم وقت میں کیا قاعدہ بنایا جا سکتا ہے؟ ہر رشتے سے کچھ ملنے کی آرزو کرنا صرف ایک خود غرضی ہے۔'' طیبہ نے کہا۔

''جو ایسی تمنا نہیں کرتے، وہ کیا ہوتے ہیں؟'' پری نے سوال کیا۔

''بہت زیادہ خود غرض۔''

''اور ان کی کوئی سزا؟'' پری نے دوسرا سوال کیا۔

''وہ تم دے رہی ہو۔'' طیبہ نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

''تمہارا معاشرہ، جس کے لیے تم جیتی مرتی ہو، وہ ایسے لوگوں کے ساتھ کیسا برتاؤ کرے گا؟ قانون کی بات کا تو مجھے پتہ ہے۔ وہ مت بتانا، کیونکہ...؟''

''معاشرہ مردوں کا ہے، اس لیے وہ ان سب کے باوجود آزاد ہیں...''

''پھر عورت پر ہی سارا غصہ، تمام الزامات، اور پورا قانون کیوں لاد دیا جاتا ہے؟''

''اس لیے کہ اس مرد سماج میں بدعنوانی کو سہارا دینے والی، اس کی شریک کار عورت ہی ہوتی ہے۔ اکیلے مرد گُل چھرّے نہیں اُڑاتا۔'' طیبہ نے کہا۔

''پھر تم خود کو کون سے طبقے میں شامل کرو گی؟'' پری بولی۔

''میرا طبقہ اس معاشرے کے لیے نیا ہے۔ جب تک ہم شادی نہیں کرتے تو شادی شدہ مرد ہماری توجہ کا مرکز بھی نہیں بنتے ہیں۔ یہ ستم تو ایک ہی طبقہ کی عورت دوسری پر کرتی ہے۔ عورت خود کو کب پہچانتی ہے؟ اگر مرد اسے سنجیدگی سے نہیں لیتا تو اس میں اس کی کیا غلطی؟'' طیبہ نے پیالوں میں چائے اُنڈیلتے ہوئے کہا۔

''طیبہ کی کچھ باتوں سے میں متفق ہوں۔'' سوسن بڑی سنجیدگی سے بولی۔

''جیسے......؟'' پری نے پوچھا۔

''جب پری نے اپنی زندگی کی کتاب ہمارے سامنے کھول کر رکھ دی ہے، تو مجھے بھی حقیقت کہنے میں کوئی تامل نہیں۔ شاید دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔ طیبہ، ملیحہ کی زندگی ہمارے سامنے کھلی ہوئی ہے۔ اختر نے خود کو، اپنے ملک اور مذہب کے نام پر داؤ پر لگا دیا ہے۔ وہ طیبہ کی طرح نکلی۔ لیکن اس سے تھوڑی مختلف۔ طیبہ نے ہماری طرح مرد کو زندگی کا مرکز تسلیم نہیں کیا۔ کیونکہ اس کی دماغی اور جسمانی ضرورتیں ہم سے الگ ہیں۔ وہ اس طرح سے زندگی گزار سکتی ہے۔ لیکن ہم نہیں جی سکتے۔ اس لیے ہم نے روایتی زندگی کو چنا مگر......؟ اسد اور میں شاید اس شادی کو زیادہ نہیں نبھا سکتے۔ اگر میں پری کی طرح نبھانا بھی چاہوں تو بھی رشتہ بنائے رکھنا اب غیر ممکن ہے۔ کیونکہ اسد خود نہیں چاہتے ہیں اور تعلقات کے پُل کے نام پر ہمارے بچے بھی نہیں ہیں جو میں ان کا بہانہ بنا سکوں۔ کسی مرد نے اسد کو مجھ سے نہیں چھینا ہے، بلکہ ایک عورت نے ہی چھینا ہے جو ہمارے درمیان دیوار بن گئی ہے...... غلطی میری ہی تھی جسے میں نے چاہا تھا، اس کا نام میں زبان پر نہ لا سکی...... اور وہ اس لیے خاموش رہا کہ شاید اسے شک تھا کہ میں اُسے پسند نہیں کرتی ہوں...... عمر کے اس دَور کا غرور یوں ایک چھناکے سے ٹوٹتا ہے، اس کا تجربہ، اس کا احساس ذرّہ برابر بھی جو اُس دَور میں ہوتا ہو...... وہ عورت طلاق شدہ ہے۔ اسد کی فرم میں ہے...... دیکھنے میں خوبصورت بھی ہے۔''

''خوبصورتی کا پیمانہ ہر ایک کے لیے مختلف ہوتا ہے۔'' طیبہ نے کہا۔

''تم اس سے ملی ہو؟'' ملیحہ نے دردمندانہ لہجے میں پوچھا۔

''ہاں...... اس سے سبب بھی پوچھا تھا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہے؟ اس کا جواب بھی سوال تھا مجھ سے...... کہ آپ اپنے شوہر سے دریافت کریں۔ جب اسد سے میں نے بار بار پوچھا ہوا سوال پھر دوہرایا اور اصرار کیا کہ وہ سچ بتائے، تب مجھے جواب ملا۔ ''میں اس کا دیوانہ ہو گیا۔ مجھے خود پتہ نہیں ایسا کیوں ہوا؟ تمہارے ساتھ رہ کر بھی اس سے دُور رہنا میرے لیے مشکل ہے، اس لیے میں نے مجبوراً اُس سے شادی کرنا طے کر لیا ہے...... وہ بنا طلاق کے شادی پر راضی نہیں، اس لیے......'' اسد اور اس عورت کا

عشق میری اور عمران کی آپسی پسند اور جھکاؤ سے ٹھوس اور زوردار ہے۔ میں نے زندگی کو کھیل سمجھا تھا۔ آج نہ عشق اپنے پاس ہے اور نہ اپنا شوہر، زندگی کے جوئے میں دونوں کو ہار بیٹھی ہوں۔"

"تم نے کبھی بتایا ہی نہیں یہ سب۔" ملیحہ کی آنکھیں نم تھیں۔

"پہلے ہی تم کون سی خوش حال تھیں کہ میں تم سے کچھ کہتی۔ آج پری نے اپنا درد سنا کر میرا زخم ہرا کر دیا۔" سوسن نے سیب کا چھلکا اتارتے ہوئے بڑے اطمینان سے کہا۔

"عمران آج کل ہے کہاں؟" پری نے پوچھا۔

"کہیں بھی ہو...... چھوڑی منزل پر لوٹنے والا بھٹکا ہوا کہلاتا ہے، مسافر نہیں۔ میری راہ عمران کی طرف جانے والی ہر راہ کے برعکس ہے۔ وہ ایک احساس ہے جسے تجربے نے روند ڈالا ہے۔ اب اسی تجربے کی سمت میں کوئی راہ ڈھونڈوں گی۔ اسد نے میری زندگی کا فلسفہ ہی بدل ڈالا۔"

"کیا کچھ بھی اُمید نہیں رہی آگے؟ گھر کا ٹوٹنا عورت کے لیے سب سے تکلیف دہ تجربہ ہوتا ہے۔" پری نے کہا۔

"تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے، پری جان!" سوسن نے لمبی آہیں بھرتے ہوئے کہا۔ "ہر انسان کا تجربہ دُوسرے انسانوں کے تجربات سے ہمیشہ مختلف رہا ہے، پھر...... شاید یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہر تجربہ ادھورا ہے۔ ایک تجربے سے کچھ سیکھ کر جب ہم آگے بڑھتے ہیں تو پھر ہم ایک نئے تجربے سے دوچار ہوتے ہیں...... دودھ کا جلا چھاچھ بھی پھونک کر پیتا ہے۔ اس کے بعد بھی دل ہر سازش سے تڑپ اُٹھتا ہے۔ یہ زندگی ہے پری جان! بس، تجربات کی ایک ایسی لڑی ہوتی ہے جسے پہن کر انسان اس دُنیا سے چلا جاتا ہے۔ میں تو بس اتنا ہی سمجھ سکی ہوں اپنی اس زندگی سے۔" سوسن کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

"میں نے آج غم سے فرار ہونا چاہا تھا، تم لوگوں کے درمیان بیٹھ کر اپنا غم بھولنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کے برعکس ہوا...... بہرحال، اس کی کوئی سزا، اگر تم لوگ مجھے دینا چاہو تو میں حاضر ہوں...... مجھے تو بس، آج ایک احساس ہوگیا ہے کہ ہم سب ایک ہی

رنگ میں ڈوبے ہوئے ہیں۔" پری نے غمگین ہو کر کہا۔

"اچھا ہوا یا بُرا...... لیکن ایک دن تو دل میں سلگتی اس آگ کو باہر آنا ہی تھا، تو آج کا دن ہی سہی، بُرا کیا ہوا اس میں؟" سوسن نے رومال سے آنکھیں صاف کرتے ہوئے کہا۔

ملیحہ کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں۔ اختر سوچ رہی تھی کہ جو کچھ اس کے ساتھ ہوا، وہ برا نہ تھا۔

"اسی لیے میں کہتی ہوں کہ شادی کا بندھن ایک عذاب ہے۔ دراصل وہیں سے عورت کا زوال اور استحصال شروع ہوتا ہے۔ پوری زندگی اپنی دوشیزگی کو سنبھال کر رکھو کہ یہ شوہر کی امانت ہے۔ مگر اس ریاضت کا پھل کیا ملتا ہے؟ بقول پری، حقارت، بے وفائی، توہین...... دراصل معاشرہ میں ہمارا مقام کیا ہے اور ہماری حیثیت معاشرہ کے لیے کتنی ضروری ہے، اسے ہمیں سمجھنا ہوگا۔ اسی لیے کہتی ہوں کہ..." طیبہ نے پہلو بدلتے ہوئے کہا۔

"احساس اگر اتنا ہی عملی اور حقیقی موضوع بن جائے تو پھر وہ احساس ہی کب رہ جاتا ہے طیبہ! احساس کی سطح پر جب کچھ چٹختا اور ٹوٹتا ہے، اس کو جوڑنے کے لیے عقل کا گوند بھی ناکافی ہوتا ہے۔ شاید اس مدلل گفتگو سے ہم ایک منزل پر پہنچ جائیں۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں، اور نہ اس کو بھلا سکتے ہیں کہ ہمارے احساسات زخمی ہوئے ہیں...... عورت لوہا یا لکڑی نہیں ہے۔ اسے محبت چاہیے...... کیا دولت ہمارے باپ کے گھر نہیں تھی؟ تعاقب کرنے والی نگاہوں کی نہ تب کمی تھی اور نہ آج ہے۔ مگر احساس کوئی ایسی شئے نہیں جسے کسی دُکان سے خریدا اور واپس کیا جا سکے...... تم شاید یہ سمجھ کر بھی نہیں سمجھنا چاہتی ہو۔" پری نے درمیان میں ہی بات کاٹ کر کہا۔

"میں سمجھتی ہوں، لیکن تم لوگ کچھ اور سمجھنے سے انکار کرتے ہو۔ تمہاری زندگی کے یہ تجربات کبھی نہ کبھی میرے جملوں کے معانی تک تمہیں پہنچا دیں گے اور تب میں پوچھوں گی...... چائے ڈالوں تمہارے لیے؟" طیبہ نے کہا اور اسی کے ساتھ باتوں کا

رُخ احساس کے جنگلوں سے نکل کر شہر کی چوڑی سڑکوں پر آ گیا۔ پری نے اپنا خریدا ہوا سامان دکھایا۔ دُوسرے بھی اپنی شاپنگ کا ذکر کرنے لگے اور وہ سب مکمل طور سے ان ہی باتوں میں ڈوب گئیں۔

سوسن کو طلاق ہوئے تین ماہ گزر چکے تھے۔ ان تین مہینوں میں اس نے طے کر لیا تھا کہ وہ دوسری شادی کرے گی۔ آخر اس کا قصور کیا ہے، جو وہ اپنی زندگی کی قربانی دے؟ پھر اُس کا عاشق تو نہیں مرا ہے کہ اس کی یاد میں پوری زندگی گزار دے! زینہ کی اگر ایک سیڑھی ٹوٹی ہوئی ہو تو کیا زینہ نہیں چڑھا جا سکتا......؟ اس سیڑھی کو چھوڑ کر بھی تو اُوپری منزل تک پہنچا جا سکتا ہے۔ میں اپنا ماضی بھول جانا چاہتی ہوں۔ زندگی کا ہر موڑ میرے لیے ایک منزل ہے اور ہر موڑ کا تمام راستہ جھوٹا ہے اور ان تمام جھوٹوں میں، میں بھی ایک جھوٹ ہوں۔ اپنا ماضی جھٹلا کر نئی زندگی کی حرص سے بے چین۔

کمرے میں ثریا خانم داخل ہوئیں۔ بیٹی کو سوچ میں ڈوبی دیکھ کر غمگین ہو گئیں۔

''کیا سوچ رہی ہو بیٹی؟ نیچے چلو، سب جمع ہیں۔''

''کچھ نہیں ماماں، بس ایسے ہی ایک ڈرامے کی تیاری کے متعلق سوچ رہی تھی۔''

''نیچے عباس آئے ہیں اپنی پرانی خواہش کو لیے ہوئے۔'' ماں نے سر کی چادر کو درست کرتے ہوئے کہا۔

''آپ کی مرضی کیا ہے، ماماں؟'' سوسن نے آنکھیں ماں کے چہرے پر

مرکوز کردیں۔

''تیری خوشی!'' ماں نے چھوٹا سا جواب دیا۔

''اپنی خوشی! خیر چھوڑو ماماں، عباس کی خواہش بھی پوری ہونی چاہیے۔''

''لیکن، تجھے تو وہ کبھی پسند نہیں تھا؟''

''جو پسند تھا وہ وقت کی دھندلی چادر میں تحلیل ہوگیا۔ جو شوہر ملا وہ چھوڑ گیا۔ اب جو ناپسند تھا وہ پسند بھی تو آسکتا ہے۔ انسان کا دماغ بدلتا رہتا ہے۔ دُنیا میں کچھ بھی سچ نہیں ہے، سب جھوٹ ہے۔ اب میں جھوٹ کو گلے لگانا چاہتی ہوں۔ دیکھوں یہ تجربہ کیسا رہتا ہے۔''

''خیر، تم ٹھیک طرح سے غور وفکر کرلو، میں چلتی ہوں۔ ابھی کون سا جواب مانگا جا رہا ہے...... ! ذرا سی دیر کے لیے نیچے آجانا، تمہیں پوچھ رہے تھے۔'' ماں نے سیڑھیاں اُترتے ہوئے کہا۔

سوسن نے اُوپر کھلے نیلے آسمان کو دیکھا، پھر چھت پر بکھری دھوپ کو۔ چہار سو مکان، کھڑکیاں، دھواں، انسانی چہرے، شور...... یہ سب کیسا جال ہے؟ وہ منڈیر کے قریب پہنچی، دُور سے پڑوسی کے آنگن پر نظر پڑی۔ جاڑے کی وجہ سے سارے پودے سوکھ چکے تھے۔ حوض پانی اور مچھلیوں سے خالی تھا، اِکلوتا نازک درخت سرخ پھل سے جھکا زمین کو چوم رہا تھا۔ خزاں کی وجہ سے تمام پتیاں نیچے گری ہوئی تھیں۔ سوکھی ٹہنیاں اور رسیلے لال پھلوں سے لدی شاخیں اسے بڑی معنی خیز سی لگیں۔ تھوڑی دیر تک وہ اس خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ نیچے سے اسے کسی نے آواز دی۔ وہ مڑی اور سیڑھیاں اُترنے لگی۔

''یہ احتیاط سے رکھ لو، مجھے کل باہر جانا ہے۔'' خالد نے پیکٹ پری کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

پری نے پیکٹ اُٹھائے اور احتیاط سے الماری میں رکھتے ہوئے کہا۔'' کتنے دن

بعد لوٹو گے؟"

"ایک ہفتہ لگ سکتا ہے۔" خالد نے جواب دیا، پھر وہ ہمیشہ کی طرح ایک سوال سننے کے انتظار میں لحہ بھر کے لیے رُکا کہ اکیلے جا رہے ہو یا کوئی......؟ لیکن آج بھی اسے مایوسی ہوئی۔ پری بڑے انہماک سے سامان کو درست کرتی رہی، پھر کھانے کی میز پر پہنچ گئی۔ اس کی پسند کا کھانا تھا۔ بچے اس کے دونوں جانب بیٹھے تھے۔ کچھ دنوں سے خالد کا دل متعدد سوالات سے گھبرا رہنے لگا تھا۔

جاتے وقت آج اس کا دل پہلی بار اداس تھا۔ آج تک پری اسے ہوائی اڈے تک چھوڑنے نہیں گئی تھی۔ اس کی وجہ کا علم دونوں کو تھا کہ یہ آفس کا کام بغیر کسی لڑکی کو ساتھ لیے پورا نہیں ہوتا ہے۔

ہوائی اڈے کے دروازے پر ہی فرح کھڑی مل گئی۔ ہمیشہ کی طرح اس کا دل شہوت سے بھرا اور نہ خون کا دَوران تیز ہوا۔ فرح کی مسکراہٹ کے جواب میں وہ بھی مشینی انداز میں مسکرا دیا۔ اٹیچی اُٹھا کر وہ آگے بڑھا۔

ہوائی جہاز میں بیٹھ کر بھی اسے کچھ پھیکا پھیکا سا محسوس ہوتا رہا، جبکہ فرح کے چہرے کا میک اپ غضب ڈھا رہا تھا۔ کوئی اور دن ہوتا تو وہ میگزین دکھانے کے بہانے سنترے کی قاشوں کو کئی بار چکھ چکا ہوتا، یا پھر رخساروں کو سہلا لیتا، لیکن آج......؟ ہوٹل میں موسیقی، رقص، بہترین کھانا بھی اس کے ذائقہ کو تبدیل نہ کر سکے۔ ڈھلتی رات اس کے نشے کو بھی تیز نہ کر سکی۔ اس خیال سے کہ کچھ لمحات کے بعد ایک نیا جسم اس کے پہلو میں ہوگا، اس مسرور کن مسرت کا بھی اسے احساس نہ ہوا۔ فرح سے اس کی ملاقات 'خیابان شاہ رضا' میں ہوئی تھی۔ ہر پھڑکتی ہوئی چیز کو دیکھ کر وہ کار میں بریک ضرور لگاتا تھا۔ اسی لفٹ دینے کی حصولیابی فرح بھی تھی۔ ایسی بہت سی لڑکیاں اس کی زندگی میں آئیں۔ جوانی کی ابتدا سے ہی اسے لڑکیوں کے پاؤں دیکھنے کی عادت پڑ چکی تھی۔ نازک ایڑیاں فٹ پاتھ پر چلتی خوبصورت سینڈلوں میں اس کے دل کو اپنی طرف کھینچتی اپنے ساتھ لیتی جاتی تھیں اور وہ فٹ پاتھ کے پاس سڑک پر رینگتی کار میں بیٹھا موقع کا انتظار کرتا، ان کا تعاقب کرتا رہتا تھا۔ فرح کا جسم ایک دم سفید

تھا۔ سفید جسم اس کی کمزوری تھی حالانکہ پری کا جسم بھی سفید ہی تھا، لیکن وہ بیوی تھی۔ کبھی بھی ہاتھ بڑھا کر اُسے حاصل کیا جا سکتا تھا۔ یہ تجسس، یہ ہیجان اور یہ جوش جو کسی کے پیچھے بھاگ کر حاصل ہوتا ہے وہ بیوی نہیں دے سکتی۔ وہاں تو بس ایک ٹھہرے ہوئے پانی کے تالاب کا احساس ہوتا ہے، جہاں نہ کوئی لہر بنتی ہے، نہ طوفان آتا ہے، نہ مسرت کے بھنور میں پھنس کر ڈوبنے کا سرور حاصل ہوتا ہے۔

فرح نے اس کے سینے پر سر رکھ کر پوچھا۔ "طبیعت ٹھیک ہے؟"

"یوں ہی سر میں ہلکا سا درد ہے...... پھر بھی...... آج کی رات تم مجھ سے باتیں کرو۔ تم نے کبھی پیار کیا ہے؟"

فرح اس ناگہانی سوال کو سن کر چونک پڑی، پھر اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ خالد کے چہرے پر پھیلی سنجیدگی کو پڑھ کر اس نے تکیہ کمر کے پیچھے لگایا اور قریب کی میز سے پرس اٹھایا۔ سگریٹ نکال کر سلگائی۔ کافی دیر تک دھوئیں کو دیکھتی رہی، پھر بولی۔ "میں پہلے جسم اور دل کو ایک مانتی تھی، لیکن زندگی نے بتایا، دل، دماغ اور جسم تین الگ چیزیں ہیں اور ہر چیز کی مانگ اپنا تعلق بناتی ہے، کبھی کبھی یہ تینوں چیزیں ایک دُوسرے پر منحصر بھی ہوتی ہیں...... جس سے میں نے محبت کی اس نے مجھے دھوکہ دیا...... میں امیر گھر کی نہیں تھی۔ نوکری مجھے کرنی تھی۔ شادی سے دل ہٹ گیا تھا۔ رفتہ رفتہ دل خالی ہوتا گیا۔ خالی پن کی دہلیز پر پہنچ کر کب میں اس طرح کی طرز زندگی میں ڈوبتی چلی گئی مجھے پتہ بھی نہ چلا۔ اب میرے پاس سب کچھ ہے۔ پیسہ، مرد، نوکری، لیکن گھر نہیں ہے...... گھر تھا ماں باپ کا، مگر بڑے ہو کر جو گھر بنتا ہے، وہ اپنا کہلاتا ہے۔ اس کی آرزو اب بھی ہے۔ لیکن گھر بنانے کی تمنا کہیں کھو گئی ہے۔ کبھی کبھی شادی کے متعلق سوچتی بھی ہوں تو لگتا ہے، کیا اس کی ضرورت حقیقتاً مجھے ہے؟ سب کچھ تو میرے پاس ہے، پھر ایک کھونٹے سے بندھ کر کروں گی بھی کیا؟ کھونٹے کا بھی کل کیا بھروسہ!"

خالد نے اُٹھ کر دونوں گلاس بھرے، ایک اس کی جانب بڑھاتے ہوئے بولا۔ "لیکن یہ زندگی بھی کب تک؟"

"جب تک یہ اسی طرح چل سکتی ہے۔" گلاس سے گھونٹ لے کر وہ بولی۔

''آپ نے کبھی محبت کی ہے؟''

خالد کھلکھلا کر ہنس پڑا۔ ''میں ہر موسم میں عاشق ہوتا تھا۔ موسم بدلنے کے ساتھ ہی لڑکی بھی بدل جاتی تھی۔ میں اوب جاتا ہوں۔ بہت دن تک، کسی ایک کے ساتھ نہیں گھوم سکتا۔ طبیعت بھر جاتی ہے۔ یہ بے چینی موسم سے بدل کر مہینوں اور اب ہفتوں پر پہنچ گئی ہے۔ مستقبل کا کہہ نہیں سکتا...... اتنی خوبصورتی چہار طرف بکھری پڑی ہے، اسے سمیٹنے کے لیے کئی زندگیاں درکار ہیں۔''

اتنا کہتے ہی خالد پھر ہنس پڑا۔ دونوں کی ہنسی سرخ جام میں بلتی برف کی طرح رات کے ڈھلنے کے ساتھ مدھم پڑ کر تاریکی میں گھل گئی۔

ایک ہفتے کے بعد خالد لوٹ آیا۔ پری سے بولا۔ ''میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔''

''ہاں...... بولو۔'' پری نے اسی اطمینان سے کہا جس میں وہ کھوئی رہتی تھی۔

''تم جانتی ہو، ہر سفر میں میں اکیلا نہیں جاتا ہوں۔'' خالد نے کہا تو پری نے سلائی سے نظریں اُٹھا کر صرف شوہر کے چہرے کو تاکا۔

''پھر تم کچھ بولتی کیوں نہیں ہو؟''

پری خاموش ہی رہی۔

''تمہاری اس خاموشی نے مجھے پہلے ڈرایا، پھر مجھے شیر بنایا، کیونکہ مجھے کھلی چھوٹ تھی، لیکن اب یہی خاموشی مجھے حقارت کی حد پر پہنچا رہی ہے۔ میرا دل ان مختلف جسموں کے جال میں پھنسا عاجز آچکا ہے۔ میں اپنی اس عادت سے تھک چکا ہوں۔ تم مجھے اس قید سے آزاد کرا سکتی ہو۔ میں آزاد ہونا چاہتا ہوں۔ سچ میں آزاد ہونا چاہتا ہوں۔''

پری نے ہاتھ میں پکڑے کپڑے میں سوئی گھونپی اور اسے میز پر رکھتی ہوئی کھڑی ہو گئی۔ وہ حد درجہ حیران تھی، یہ کیا ہو گیا تھا! کیا یہ خواب تھا، یا پھر خالد کا دماغ خراب ہو گیا تھا؟

اس نے تو پوری طرح اپنے حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا، پھر بھی وہ آگے بڑھی۔ خالد کے دونوں شانوں پر ہاتھ رکھ کر بڑے اعتماد سے بولی۔ ''لو تمہیں آزاد کیا۔'' پھر اسے صوفے پر بٹھاتے ہوئے بولی۔ ''مگر مجھے یقین ہے، میں اس تبدیلی کی وجہ نہیں ہوں، اگر ہوتی تو یہ جو آج ہو رہا ہے، بہت پہلے ہی ہو جاتا۔''

ہر شخص کی زندگی ایران کی سیاسی تبدیلی کی وجہ سے متاثر ہو رہی تھی۔ سماج کے بدلتے رنگ کو دیکھ کر لوگ اپنے دُکھ درد بھول کر حیران ہو کر سوچنے لگتے کہ کہیں وہ الف لیلا کی داستان تو نہیں پڑھ رہے ہیں؟ قصہ در قصہ ہر شخصیت کے ساتھ کسی روداد کی طرح جڑی تھی، جسے کھولنا اور لپیٹنا بہت مشکل کام تھا۔

اخبار امام خمینی کی تعریف اور ان کے ساتھ آئے انقلابیوں کے بیانات سے بھرے ہوتے۔ ہر دن صحافیوں، مذہبی رہنماؤں، متعدد سیاسی پارٹیوں اور مذہبی تنظیموں کا میلہ 'جماران' میں لگا ہوتا۔ ملکی و غیر ملکی صحافیوں کو کافی وقت دیا جا رہا تھا۔ خمینی نے بڑی صاف گوئی سے انٹرویو دیے۔ جس میں ایرانی عوام کے ساتھ اشتراکیوں کے تئیں بھی اپنا احترام دکھایا گیا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے انتخاب کی ضرورت نہ سمجھی اور بیک آواز کہنے لگے کہ امام خمینی موجودہ انقلاب کے رہبر ہیں۔ انہیں ولایت فقیہ منتخب کرلیا گیا یعنی قوم کا سردار۔ بغیر کسی کمیٹی اور بڑے بزرگوں کے انتخاب کیے۔ کچھ نے اعتراض بھی کیا تو اس کا کسی نے نوٹس نہیں لیا۔ پورا ایران خمینی کے رنگ میں رنگ گیا۔ اب ان کا رُتبہ اسلامی نظریہ سے سب سے اہم تھا۔ ان کی اجازت کے بغیر پتہ بھی نہیں ہل سکتا تھا۔

اس کے باوجود انقلاب کا رنگ لال نہیں، ہرا قرار دے دیا گیا تھا۔ حکومت نے اشتراکیوں سے کیا گیا اپنا وعدہ بھلایا نہیں تھا۔ ان کے ادب سے بازار آہستہ آہستہ بھرنے لگا تھا۔ جو سب سے زیادہ خوش کن احساس تھا، وہ تھا ہر محلے میں 'کھلی بات چیت' کا انعقاد۔ مختلف جماعتیں اپنی کتابیں، پیپر سجاتے۔ ان کے نمائندے نئے متجس

جوانوں کے سوالات کے جواب دیتے۔ محافظوں کے پہرے لگے رہتے تاکہ سیاسی جماعتوں کو کوئی پریشان نہ کرے۔ آس پاس کے گھروں کی کھڑکیوں سے لوگ حیرانی سے دیکھتے۔ دُکاندار دانتوں میں انگلی دبائے اس ہلچل کو خاموشی سے دیکھتے رہتے۔

تہران یونیورسٹی کی سامنے والی تمام دُکانیں اور سامنے کے فٹ پاتھ کتابوں سے بھر گئے۔ نہ معلوم کہاں سے تھوک کے حساب سے کتابیں آتیں اور شام تک فروخت بھی ہو جاتیں۔ یہ صرف ایرانی مصنّفین کے افسانے، ناول اور شاعری کی کتابیں نہیں تھیں، بلکہ دُنیا بھر کے انقلابیوں اور اشتراکی نظریات کی حامل کتابیں تھیں۔ انقلابی نغموں کے کیسٹ بازار میں ہر وقت بجتے رہتے تھے۔

اب نہ شاہی پولس کا خوف تھا، نہ سینسر شپ والوں کے حملے کا خطرہ اور نہ سماجی روک ٹوک تھی۔ اُلٹے کتاب فروشوں اور خریداروں کی حفاظت کے لیے پاسوار طعینات تھے۔ پوشیدہ مسودوں سے پریس بھرے رہتے۔ جن مصنفوں نے کسی دباؤ میں آکر اپنے مسودے نذرِ آتش کر دیے تھے، وہ اس آزادی کو دیکھ کر افسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے کیا غضب کر ڈالا۔ غیر ممالک میں قیام پذیر مصنّفین، دانشوران، اپنے ملک واپس آکر کھلے زمین و آسمان دیکھ کر بہت خوش تھے۔ اب یونیورسٹیوں میں اتحاد دِکھانے کے لیے اجتماعی نمازوں کی جگہ اشتراکیوں کی تقاریر کے علاوہ ڈرامہ، نمائش اور مقابلے ہوتے، شاعری پر مذاکرے ہوتے، مطلب یہ کہ پورا ایران آزادی کے نشے سے شرابور تھا۔ ہر کوئی اپنی آواز سن کر حیرت میں ڈوب جاتا کہ وہ بول سکتا ہے، سن سکتا ہے۔ اس کی آواز اس کے کانوں کو بھی سنائی پڑتی ہے۔ یہ کتنا خوبصورت تجربہ ہے اس آزادی کا، اس خوشبو کا، اس تلخی کا...... یا خدا......!!

طیبہ کی الماریاں کتابوں سے بھر چکی تھیں۔ جب بھی وہ بازار جاتی، تو خود کو روک نہ پاتی تھی۔ پہلے چھپی کتابیں، جن پر شاہ آریہ مہر اوران کے خاندان کی تصویریں تھیں، بازار سے غائب ہو چکی تھیں۔ خواہ وہ ادب، سائنس، آرٹ یا تواریخ پر مبنی تھیں، سب کو

نذرِ آتش کر دیا گیا تھا۔ کچھ ناشروں کی عقلمندی سے چند کتابیں اس لیے بچی رہ گئیں کہ انہوں نے کتابوں کے سرورق سے تصاویر کو ہٹا دیا تھا۔

سڑکوں، بازاروں، گاؤں اور قصبوں کے لوگ اپنی طرح کے معمولی چہرے والوں کو پارلیامنٹ میں بیٹھا دیکھ کر بہت خوش ہوتے کہ اب حقیقتاً ان کے نمائندے موجودہ سرکار میں ہیں۔ یہ انقلاب غریبوں کا انقلاب ہے۔ لوگ آہستہ آہستہ شہروں میں پھیلتی بیروزگاری سے گاؤں قصبوں کی طرف لوٹنے لگے اور اپنے کھیتوں اور باغات کی دیکھ بھال کرنے لگے۔ ایسے لوگوں کا شمار ایک فیصد تھا۔ گاؤں آباد ہونے لگے۔ ایک حقیقت یہ بھی تھی کہ شہروں میں روز ہنگاموں کے درمیان رہنا بھی ان کے لیے بیکار تھا، جب کام کی اُمید نہ ہو۔ سرکار بھی کھیتی کی طرف خاص توجہ دے رہی تھی اور دوسری طرف بار بار ایک ہی بات دہرائے جا رہی تھی کہ اگر انقلاب کے دشمن ہماری کوششیں اور محنت خراب نہ کریں تو ہم اور بہتر طریقے سے مشکلات کا حل نکال سکتے ہیں۔

طیبہ کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ گروہ میں پھوٹ پڑنے والی افواہ اب سچ ثابت ہونے والی تھی۔ بہت سے گروہوں نے اتنی آزادی اور کھلاپن دیکھ کر اپنی جدوجہد کا انداز تبدیل کرلیا، پھر تودہ پارٹی کو ہر طرح کا فائدہ اُٹھاتا دیکھ کر ان کے دل میں بھی یہ سوال اُٹھا کہ کیا ہر حکومت سے لڑنا، مخالف فرنٹ کھڑا کرنا اور گوریلا جنگ ہی ان کی تقدیر بن چکی ہے۔ جبکہ افہام و تفہیم سے اپنی بات زیادہ متاثر کن طریقے سے عوام تک پہنچائی جا سکتی ہے۔

اس کا احساس تمام مصنفوں اور جدوجہد کرنے والوں کو بخوبی ہو گیا تھا کہ گزشتہ پچاس برسوں میں قلم سے جنگ انہوں نے کی، آج کے انقلاب کو لانے کے لیے قربانیاں انہوں نے دیں، مگر زبان اور بیان پر لگی پابندی اور ان کی رسائی عوام میں نہ رہنے کی وجہ سے مولویوں نے ان کے حقوق چھین لیے، کیونکہ ان کا سیدھا رابطہ عوام سے تھا۔ ان تمام باتوں کو لے کر گروہ نے خود کو بدلنا شروع کر دیا۔ اہم فرقہ چریکِ فدائے خلق کا خیال اس فیصلے کی مخالفت میں تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ تودہ پارٹی کے مطابق موجودہ حکومت کو کم خطرناک سمجھنا نادانی ہے۔ ان سے ہاتھ ملانا، ان کے ساتھ چلنا اس

سے بھی بڑی نادانی ہے۔ اس بات سے حکومت اور دوسری سیاسی پارٹیوں کی نظروں میں تو وہ بُرے بنے ہی، اُلٹے اپنے گروہ کے کچھ ممبران نے بھی تنقید کی اور پارٹی سے الگ ہونے کا عمل شروع ہو گیا۔

اس مسئلہ کو لے کر طیبہ ایک مضمون تحریر کر چکی تھی کہ مولویوں کا ہمارے تئیں رجحان ان کی صرف ایک سازش ہے، وہ بھی ہمیں جاننے کی، پہچاننے کی اور ہمیں پھنسانے کی، اس لیے مولویوں کے ہاتھوں اپنی نکیل تھمانا مناسب نہیں ہے، کیونکہ مذہب اور کمیونزم دلائل کی سطح پر کبھی بھی ایک میان میں نہیں رکھے جا سکتے ہیں اور نہ ایک ساتھ چل سکتے ہیں۔

اس مضمون کو پڑھ کر بڑا ہنگامہ ہوا۔ کچھ نے ان فدائن گوریلاؤں کی مثالیں دیں جو اس بات کا دعویٰ کرتے تھے کہ کمیونزم کو انہوں نے اسلام کے ذریعہ زیادہ اچھی طرح سے جانا، کیونکہ اس میں فرقوں کی برابری کی بات پر زور ہے۔ اسی لیے وہ لوگ مارکسی تھے، وہیں پر پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے۔ اس کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ نماز ہماری تہذیب ہے اور مارکس ہماری ضرورت ہے، جو ہمیں ایک جدید دُنیا سے جوڑتا ہے۔ طیبہ کا دوسرا مضمون پھر اس کے جواب میں شائع ہوا کہ اس وقت اس طرح کے رومانی خیالات کے ساتھ رہا جا سکتا تھا، کیونکہ تیس سال قبل جدوجہد کی یہ شکل نہیں تھی۔ آج اشتراکیت لانے کے فیصلے کی گھڑی ہے، اور جو اس طرح کی موقع پرست باتیں کر رہے ہیں وہ ڈاکٹر مصدق کے زمانے میں ہوئی سازش کو بھول چکے ہیں۔ اس جواب سے لوگ چڑ گئے اور تودہ پارٹی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش بھی کی کہ 'کار' میں شائع ہوئے اس مضمون کا مضمون نگار کون ہے؟ بہر حال، کچھ پرانے جدوجہد کرنے والے گروہ سے الگ ہو گئے۔ وہ اب جان کی بازی لگانا نہیں چاہتے تھے۔

موجودہ حکومت کی پکڑ بازار پر مضبوط تھی۔ ان ہی کی حمایت سے یہ انقلاب بحال ہوا تھا۔ عوام بھی ابھی تک حکومت کی ستائش کر رہی تھی۔ ایسے وقت میں تحریکِ فدائے خلق کے ذریعہ اپنی یہ تنقید حکومت کو ناگوار لگی۔ اب موجودہ حکومت مجاہدین اور فدائین کو اپنا دشمن سمجھنے لگی۔ دوسری طرف تودہ پارٹی نے موقع سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے جلنے پر

نمک چھڑکا۔ اپنے اخبار 'مردم' میں فدائن جماعت کی تنقید کرتے ہوئے اس بات کی مذمت کی کہ وہ حقیقتاً وقت کی ضرورت کو سمجھے بغیر الٹرا لیفٹسٹ طریقہ عمل اپنا چکے ہیں۔
طیبہ کو انجام کا علم تھا۔ زبردست تاریکی کا عفریت اس کے گروہ کے سامنے منھ پھاڑ چکا تھا۔ اب بھاگنے سے، اس سے بچنے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ وہ چپ بیٹھے، تو آج جو عفریت انہیں نگلنے کے لیے بڑھ رہا ہے وہ پورے ایران کو کھا جائے گا۔ اس لیے اس نے قلم کی سیاہی کو سوکھنے نہیں دیا اور مسلسل اپنے ساتھی اشتراکی گروہ کی تنقید کر کے ان کو آنے والے خطرات سے آگاہ کر دیا۔

آج بہت دنوں کے بعد طیبہ کا گھر سے نکلنا ہوا تھا۔ سوسن کی دوسری شادی کی بات طے ہوگئی تھی۔ اس لیے سب سہیلیاں سوسن کے گھر منگنی کی رسم میں پہنچی ہوئی تھیں۔ پری کی شادی تو بہت سادگی سے ہوگئی تھی۔ شاید سوسن تو بالکل ہی ہنگاموں سے بچے۔ ملک کا جو حال ہے اس میں کوئی خوشی کھل کر منانے کا حوصلہ کسی میں بچا نہیں ہے۔ دل ہمیشہ بجھا بجھا سا موت کے خوف سے سہارا رہتا ہے کہ جانے کس کی شامت کب آ جائے؟
سوسن کے گھر میں کافی رونق ہو رہی تھی۔ طیبہ کو دیکھ کر سب کے چہروں پر رونق آ گئی۔
"آج بہت کام تھا، ورنہ......" طیبہ نے کہا۔
"خدارا کام کے نشے میں کہیں جان سے ہاتھ نہ دھو بیٹھنا، یہ حکومت تمہارے فلسفے کو سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔" ملیحہ نے تنبیہ کے انداز میں کہا۔
"میں بھی شادی کرنے کی سوچ رہی ہوں۔" طیبہ نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
"سچ!" سب ایک ساتھ چیخ پڑیں۔
"چل، چھوٹی کہیں کی۔" پری نے کہنی ماری۔
"تمہاری جان کی قسم۔" طیبہ ہنسی۔

''دیکھو، طیبہ! تم ہر مرتبہ میری جھوٹی قسم کھاتی ہو۔'' پری روٹھنے والے انداز میں بولی۔

''پری ٹھیک کہہ رہی ہے۔ وہ بچوں والی عورت ہے، پھر جھوٹی قسم تم اپنی کھایا کرو۔'' صنوبر نے آنکھیں دکھائیں۔

''آخر وہ خوش قسمت ہے کون؟'' سوسن نے خاموشی توڑی۔

''اپنے محلے میں ایک مولانا ہیں، نہ منھ میں دانت اور نہ پیٹ میں آنت۔ قبر میں پیر لٹکائے ہوئے ہیں، اِدھر نکاح ہوا، اُدھر نماز جنازہ تیار......'' طیبہ نے قہقہہ لگایا۔

''زہر مار!'' پری چیخی۔

''بے حیا، بے شرم، اس بار تمہیں نہیں چھوڑوں گی۔'' ملیحہ نے طیبہ کی پشت پر گھونسوں کی برسات کر دی۔

''تم بھی ہنس سکتی ہو۔ میک اَپ خراب نہیں ہوگا۔'' طیبہ نے سوسن کو چھیڑا، جو ماحول سے اُکھڑی کچھ نروس سی لگ رہی تھی۔ شاید اسے اپنی پہلی شادی یاد آ رہی تھی۔

کمرے میں چائے کی سینی لے کر سوسن کی ماں داخل ہوئیں۔ انہیں دیکھ کر سب لڑکیوں نے گھیر لیا۔ منگنی کی رسم کا وقت نزدیک آ رہا تھا۔ وہ لوگ ابھی پہنچے نہیں تھے۔ تبھی دروازے کی گھنٹی بجی۔ گھر میں بھگدڑ سی مچ گئی۔ استقبال کے لیے سب ایک ساتھ مہمان خانے کی طرف دوڑے۔

''تم لوگ کہاں جا رہی ہو؟'' سوسن نے تھوڑا چڑ کر کہا۔

''دولہے کو دیکھنے۔'' پری بولی۔

''بیٹھ جاؤ چُپ چاپ، اب ہم لوگ کمسِن لڑکیاں نہیں ہیں۔'' سوسن نے کچھ زیادہ ہی سنجیدہ آواز میں کہا۔

سب سمجھ گئیں کہ جس احساس کو چھپانے کے لیے وہ سب اچھل کود کا سہارا لے رہی تھیں، اسی بات کو بڑی سنجیدگی سے سوسن سنبھال کر رکھنا چاہ رہی تھی۔ سچ تو ہے، وہ اپنی ماؤں کی بیٹیاں ضرور ہیں، مگر اب حالات کا تقاضا یہ ہے کہ بچپن کی تمام شوخیاں چھوڑ کر سنجیدگی سے زندگی کا سامنا کریں۔

سوسن کی ماں مہمانوں کے احترام اور خاطر داری میں لگ گئی۔ طیبہ بڑی خاموشی سے اُٹھی اور مہمان خانے میں عباس کو دیکھنے پہنچ گئی۔ پہلی نظر میں اسے عباس ایک سیدھا سادہ انسان لگا، مگر اسی کے ساتھ ایک خدشہ بھی پھن اُٹھا کر اس کے دل میں بیٹھ گیا کہ یہ رسم ورواج سے بندھا خاندان کہیں سوسن کے لیے نئی گھٹن پیدا نہ کردے اور مذہب کی طرف جھکاؤ رکھنے والا عباس کہیں اپنی عادتوں میں ایک دقیانوسی مرد نہ نکلے۔

ایک ہفتے کے بعد سوسن کی شادی ہے۔ سوسن اپنی خریداری کر کے لوٹی تھی، عباس پانی کی طرح روپیہ بہا رہا تھا۔ اتنی تو اسد نے بھی اس کی قیمت نہ لگائی تھی، جبکہ وہ کنواری تھی۔ سوسن کبھی کبھی اپنے اندر کی تبدیلی کے بارے میں سوچتی تھی کہ وہ سارے نازک جذبات کہاں کھو گئے۔ اس کے الفاظ میں کیسے تلخی آگئی۔ کمرے سے باہر نکل کر چھت پر آئی۔ اسے پہلی شادی، اس کی تیاریاں یاد آنے لگیں۔ اسی چھت پر کیا ہنگامہ برپا ہوا تھا! آہستہ آہستہ چلتی ہوئی وہ منڈیر کے قریب پہنچی۔ ''یہ کیا؟'' اس کو ایک دھکا سا لگا، نیچے آنگن کا درخت برہنہ کھڑا تھا۔ اس کے سارے سرخ پھلوں کو توڑ لیا گیا تھا۔ اب اتنی ویرانی ٹپک رہی تھی کہ وہ زیادہ دیر تک اس درخت پر نظریں نہ جما سکی۔ گھبرا کر وہ کمرے کی طرف بھاگی۔ دیوار پر لگی اسد کی تصویر کو اس نے اُتارا اور نیچے الماری میں رکھ دیا۔ اس ویرانی کو وہ اپنے اندر جذب نہیں ہونے دے گی، خواہ اسے جھوٹی بہار کا ہی سہارا کیوں نہ لینا پڑے۔

آنکھیں بند کیے پسینے میں ڈوبی وہ بے سدھ سی بستر پر لیٹ گئی۔

شاہ کو ملک چھوڑے عرصہ گزر گیا تھا۔ امام خمینی کو ایران آئے ہوئے بھی مہینوں ہو گئے تھے۔ عوام اب انقلاب کا پھل کھانا چاہتے تھے۔ اس لیے آئے دن نکلنے والے جلوسوں میں بھیڑ کم ہونے لگی تھی۔ ہر گھر میں مٹی کا چولہا تھا۔ سب کو خالی پیٹ بھرنے کے لیے نمک، تیل، لکڑی کی فکر لاحق تھی۔ مفت تیل اور پانی دینے کا وعدہ صرف وعدہ ہی رہا۔ اُلٹے بیروزگاری اور بڑھتی ہوئی مہنگائی سے عوام پریشان ہونے لگے۔

ایران و عراق سرحد پر بھی کشیدگی بڑھنے لگی تھی۔ اکا دکا وارداتیں سننے میں آنے لگی تھیں۔ شاہی عہد کے فرار حاکم اب ایران لوٹنے کے لیے بے چین تھے۔ ان کی پوری حمایت ان سبھی دشمنوں کے ساتھ تھی جو ایران کے اس اسلامی انقلاب کو ناکام بنانا چاہ رہے تھے۔ عالمی سطح پر دونوں سُپر پاور طاقتیں ایران میں اپنے اپنے طریقے سے پیر جمانے کی کوششوں میں لگی ہوئیں تھیں۔ ان کی ان چالوں کو دیکھ کر امام خمینی بار بار اپنی بات کو دوہرا رہے تھے کہ 'نہ مشرق نہ مغرب' پھر بھی سوویت یونین اپنا اخلاص و ہمدردی دِکھانے کا کرتب دکھا رہا تھا۔ عظیم برطانیہ الگ اپنی کوششوں میں مصروف تھا۔ برسرِ اقتدار پارٹی بار بار ایک ہی بات پر زور دے رہی تھی کہ ہمارے ملک میں کچھ ایسی طاقتیں ہیں جو کسی بھی حالت میں ایران کو آباد نہیں دیکھنا چاہتی ہیں اور طرح طرح کی افواہیں اُڑا کر ہمیں بدنام کر رہی ہیں۔

عوام میں بے چینی کی لہر تھی۔ خود مولویوں میں مختلف نظریات اور مذہبی فلسفہ کو لے کر کئی گروہ بن گئے تھے۔ اسلامی قوانین کی توضیح کی جاتی۔ اس بات پر اعتراض ہوتا کہ بغیر کسی مقدمے کے لوگوں کو سزائیں دی جا رہی ہیں۔ جرم ثابت ہونے سے قبل ہی پھانسی کی سزا تجویز کر دی جاتی ہے۔ اس پر ان کو جواب دیا جاتا کہ جو بات دُنیا جانتی ہے اس پر وقت کیوں برباد کیا جائے؟

مجاہدین گروہ انتخابات کی حمایت میں بول رہے تھے۔ ان کے مذہبی نظریات میں کشادگی تھی۔ ان کے گروہ میں متعدد مولوی تھے۔ اس وجہ سے مجاہدین، اسلامی برسرِ اقتدار پارٹی کو انہیں کے دلائل کی بنیاد پر کئی مرتبہ چیلنج دے چکے تھے۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مجاہدین اور حزب اللہی میں کشیدگی بڑھنے لگی۔ موجودہ حکومت اشتراکیوں کی مزمت انہیں لامذہب (مادّہ پرست) کہہ کر بآسانی کر لیتی تھی۔ ان کے رجحان اور تاثرات فکری سطح پر چین اور روس سے دِکھا کر ان کو عوام کی نظروں سے گرا سکتی تھی، لیکن مجاہدین کو اس سیاسی چال سے ختم کرنا بہت مشکل تھا۔ کیونکہ وہ خود کو مذہبی جنگجو کہتے تھے۔ ان کی مقبولیت کو کم کرنا آسان نہیں تھا۔ اس بات کو لے کر بھی نہیں کہ وہ کارل مارکس کے مادّہ پرست نظریات کو تسلیم کرتے ہیں۔

آخر کچھ دنوں بعد اشتراکیوں والا الزام ان پر بھی لگا دیا گیا، جب سعادتی کو سوویت ایجنٹ کی شکل میں پکڑا گیا۔ کبھی کوئی سوویت سفارت خانہ میں ملنے گیا تھا۔ مہمانوں کے رجسٹر سے نام پتہ دکھا کر یہ مشہور کر دیا گیا کہ مجاہدینِ خلق در حقیقت اسلامی لباس میں اشتراکی ہیں۔ ان باتوں سے ان کی ساکھ پر بال آگیا۔ جگہ جگہ مجاہدین کو منافقین یعنی موقع پرست یا فرصت طلب کہا جانے لگا۔ اس سے مجاہدین طیش میں آگئے اور انہوں نے بھی کھل کر اسلامی آئین، اسلامی کورٹ اور مولویوں کے ہر قدم کا تجزیہ اسلامی نقطۂ نظر سے کرنا شروع کر دیا۔ وہ دلائل سے برسرِ اقتدار پارٹی کو نیچا دکھانے میں لگ گئے۔ حکومت نے بھی ان کے دفتروں اور گھروں پر حملے کرنے شروع کر دیے۔ ہر روز کسی نہ کسی محلّہ میں تیمی (مجاہدین کے سیاسی ٹھکانے) اور گھروں پر گولیوں کی بوچھار ہوتی، جوانوں کے سینے چھلنی ہوتے۔ ان کی لاشیں سرد خانوں میں رکھی جاتیں اور ان کے نام اخبارات میں شائع کیے جاتے تھے۔

اسی طرح کے مقابلوں میں اپنے ساتھیوں کے ساتھ ایک روز اختر بھی گولیوں سے بھون دی گئی تھی۔ اس کی موت کو مجاہدین گروہ نے شہادت کا نام دیا اور اس کی تصویر کو اپنے اخبار میں شائع کیا۔ اس کی موت کی خبر جب سوسن کو ملی تو اس کے منہ سے نکلا۔ ''وہ ہم سب میں جری اور خوش قسمت نکلی۔ جو اس نے چاہا وہ اسے زندگی میں ملا۔

ایسی قابلِ فخر موت ہر کسی کو نہیں ملتی۔"

ملیحہ کی بڑی بڑی آنکھیں خوفزدہ ہرنی کی طرح پھیل گئی تھیں۔ طیبہ اس کی موت پر چپ تھی۔ پری کا تعزیتی خط آیا تھا۔ البتہ ڈرپوک صنوبر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔

مجاہدین کے خلاف بڑھتے غصہ سے تودہ پارٹی نے اپنی دوستی حذب اللہ پارٹی سے بڑھائی۔ اپنا اعتماد قائم کرنے کے لیے انہوں نے نہ صرف مجاہدین بلکہ دیگر اشتراکیوں کے پتے ٹھکانے دینے میں بھی کوئی جھجک محسوس نہیں کی۔ ان کو اس بات پر یقین تھا کہ عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے۔ انہیں اس بات کا ذرا بھی خدشہ نہیں تھا کہ کل یہی برتاؤ موجودہ حکومت ان کے ساتھ بھی کر سکتی ہے۔ اسلامی برسرِ اقتدار پارٹی کی پانچوں انگلیاں گھی میں تھیں۔ انہیں بغیر کسی مشقت کے بہت سی اہم اطلاعات گھر بیٹھے مل رہی تھیں۔

سڑکوں پر بکنے والے مجاہدین کے اخبارات اور کتابوں پر چھاپے پڑنے لگے۔ ان کے اہم جنگجو پھر سے چھپنے کی جگہ تلاش کرنے لگے۔ ایک نئی قسم کی پابندی پھر سے ایران پر اپنے بازو پھیلا رہی تھی۔

مجاہدین کی حمایت میں تحریکِ فدائے خلق نے اپنے اخبار میں حکومت کی سخت تنقید کرتے ہوئے مجاہدین کے تئیں اپنی ہمدردی جتائی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے اخبار پر بھی سخت نگرانی شروع ہوگئی۔ طیبہ جیسے لوگوں کے لیے جدوجہد کا یہی مناسب وقت تھا، جب انہیں اپنی ذمہ داری نبھانے کے لیے جان ہتھیلی پر رکھ کر ہر چیلنج کو قبول کرنا تھا۔

ایک نئی طرح کا میدانِ جنگ ابھر رہا تھا۔ قدامت پسندی کے خلاف ہر روز کسی مسئلے کو لے کر بحث ہوتی تھی۔ گاؤں سے آئے لڑکے معمولی پاسدار کی نوکری پا کر مذہب کے ٹھیکیدار بن گئے تھے۔ اپنے فرض سے زیادہ انہیں دوسروں کو سدھارنے کا جنون سوار ہوگیا تھا۔ وہ یہ بھول گئے تھے کہ ان کا کام پہرا دینا ہے۔ ان کا دہقانی نظریہ سڑکوں پر لڑکے لڑکیوں کے ساتھ چلنے پر بھی شک کرتا تھا۔ انہیں الزامات میں پھنسا کر وہ سیدھے کمیٹی پہنچا دیتے تھے۔ اُن کی اِن حرکتوں سے بھائی بہنوں نے ایک

ساتھ سڑکوں پر نکلنا بند کر دیا تھا۔

نئی نسل، جس نے ایرانی انقلاب کے ساتھ آنکھ کھولی تھی، اس کی آنکھیں جس ایران کو دیکھ رہی تھیں وہ ایران ان کی ماؤں کے دیکھے سمجھے ایران سے اتنا ہی مختلف تھا، جتنا ان کی نانی یا دادی کے دیکھے ہوئے ایران سے ان کو جنم دینے والی ماؤں کا تھا۔ اس طرح سے ہر نسل کا اپنا ایک ماضی تھا، جو اسے یاد آرہا تھا۔

''ہم انگریزوں والے ایسے کپڑے نہیں پہنتے تھے۔'' پرانی نسل کہتی۔

''وہ کپڑے تو دیہاتی لگتے ہیں۔ لہنگا اور بلاؤز یا پھر پائجامہ......'' نئی نسل ناک بھوں سکوڑتی۔

''مجھے تو بیٹی یہ کپڑے ذلیل سے لگتے ہیں جس میں عورت کا سارا بدن باہر جھانکتا ہو۔'' پرانی نسل ناک بھوں چڑھاتی۔

''یہی تو آج کا چلن ہے۔'' نئی نسل شان سے کہتی۔

یہ بیس سال پہلے کی گفتگو تھی اور آج وہی نئی نسل کی ادھیڑ عورتیں چادر، موزے، دستانے اور رومال سے اپنے کو چھپائے توبہ کر رہی تھیں۔

''کیا مصیبت ہے۔ یہ چادر تو جان کی مصیبت بن گئی ہے۔ کھلی ہوا بدن کو لگے تو سالوں بیت گئے ہیں۔''

''الماری بھرے کپڑے بیکار گئے۔ اب انہیں کون پہنے گا؟ کیسے کیسے قیمتی کپڑے تھے۔ پھینکا بھی تو نہیں جاتا ہے۔'' اس کی ادھیڑ ساتھی روتی۔

''آدھی آدھی بانہیں اور کھلے گلے والا بلاؤز پہن کر نکلو گی تو تیزاب سے نہا جاؤ گی۔'' کوئی گھبرا کر بدن چھپاتا۔

اسی گھر میں پلی اولادیں اپنے ننھے منہ کو اُٹھا کر ماں سے پوچھتی ہیں، جو ٹی۔ وی پر غیر ملکی فلمیں دیکھ رہی ہیں۔

''یہ عورت خراب ہے نا ماماں؟ اس نے کمر اور سر کھول رکھا ہے؟''

''نہیں بیٹے...... یہ اچھی عورت ہے۔'' ماں سمجھاتی۔

''تم جھوٹی ہو۔ یہ عورت گندی ہے۔ اس نے ٹھیک کپڑے نہیں پہنے

ہیں۔'' بچہ مچل اُٹھتا۔

''اچھا اُٹھو تو......''

''پہلے کہو کہ یہ اچھی عورت نہیں ہے۔'' آٹھ سال کا لڑکا ضد پکڑ لیتا۔

''تم سے کس نے کہا؟'' ماں کا چہرہ تمتما جاتا۔ جیسے بیٹے نے اس غیر ملکی خاتون کے بہانے اس کے منہ پر طمانچہ مارا ہو، آخر یہ کپڑے کچھ وقت پہلے تک اس نے بھی پہنے تھے۔

''امام خمینی نے!'' بیٹا جواب دے کر ماں کا منہ دیکھتا ہے۔

''خاک ہمارے سر پر۔'' ماں کہتی ہوئی اُٹھ جاتی۔ اندر بہت کچھ کھولتا، مگر نادان بچے کے معصوم دماغ پر وقت کی گہری شکنیں دیکھ کر نہ انہیں مٹانے کا حوصلہ کر پاتی ہے، نہ اس کی وضاحت اور تبصرے کی ہمت کر پاتی۔ بس اپنے کو پوری طرح مجبور پاتی کہ کون سی دلیل دوں۔ آخر ہر وقت کی اپنی ایک حقیقت ہوتی ہے اور اسی حقیقت کے سہارے انسان چلتا ہے، مگر یہ اکیلی حقیقت دوسروں کو کیا کچھ دے سکتی ہے؟ انسان خود کو ہی کیا دے پاتا ہے...... صرف......، حسد، پست خیالی، اور...... یہ نئی نسل، کل کس ایران کی تعمیر کرے گی؟ اس نئے ایران میں عورتوں کا کیا کردار ہوگا؟

تہران کے زیادہ تر علاقوں میں حکومت مخالف گروہوں پر نظر رکھنے کے لیے سڑک پر نوکیلے اسپیڈ بریکر دَور تک بنا دیے گئے تھے۔ کہیں کہیں تو آدھے میل تک لہریہ دار سڑک تھی جس پر کار چلانا عام آدمی کے لیے تکلیف دہ تھا۔ راستہ بدلا نہیں جا سکتا تھا۔ تحفظ کے نام پر ان مشکلات کو سہنے کی عادت بھی ڈالنی تھی۔

بڑے بڑے خالی گھروں کی قطاریں پورے ایران میں تھیں۔ اپنے گھر اور وطن کو چھوڑ کر شاہی خاندان کے لوگ بھاگ گئے تھے۔ ان پر کچھ مولویوں اور برسرِ اقتدار لوگوں نے قبضہ کر لیا تھا۔ اسی صف میں اب ایک نئی طرز کے خالی مکان لوگوں کی نظروں میں چبھنے لگے تھے، جو پہلے گھروں سے الگ قسم کے گھر تھے۔ ان پر گولیوں

کے نشان تھے۔ کہیں کہیں پر دیواریں چھلنی بن گئی تھیں۔ پلاستر اکھڑ گئے تھے۔ یہ وہی گھر تھے جہاں سے اسلامی انقلاب کے دشمنوں کو روندا گیا تھا۔ ان پر ناجائز قبضہ کرنے کا حوصلہ کسی میں نہیں تھا۔

''ارے، یہ ریڈیو بند کرو، ورنہ......''

''سننے دو ماماں......''

''نہیں، بیٹی، فوراً بند کرو، یہ گوگوش کا کیسٹ تو کوڑے میں پھینک دو، ورنہ......''

''پھر ہم کریں کیا؟''

ہر گھر میں بچوں کی پرانی عادتیں چھڑائی جا رہی تھیں۔ وہ ہر چیز، جو شاہی دَور میں تھی، اسے رڈ کیا جا رہا تھا۔ پانچ دہائی کی نشانیاں پرت در پرت اُٹھا کر پھینکی جا رہی تھیں۔ داڑھی والوں کی تصاویر لگائی جا رہی تھیں۔ گھر گھر میں چرچا ہو رہا تھا۔

''نہیں لگانی ہے اس کی تصویر مجھے۔''

''لگانی پڑے گی بیٹی۔''

''مجھے ڈر لگتا ہے ماماں۔''

''ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

''روز نئی بات کرتی ہو تم، کل کہا تھا کہ گانا نہیں سن سکتے ہو، مگر ٹی۔وی پر روز گانا بجتا ہے۔''

''وہ ترانہ ہے، قومی ترانہ، مذہبی ترانہ ہے۔''

''بس ماماں، ہم سمجھ گئے۔ اب ہماری پسند کا یہاں کچھ نہیں بجے گا، بلکہ جو کچھ ہمیں سننا ہے وہ صرف تمہارے امام......'' غصے میں جوان نسل باہر نکل گئی۔

اندر یہ حال تھا۔ باہر سڑک پر کیا ہے؟ باغ سوکھ چکے تھے۔ دُکانیں بند تھیں۔ اگر کھلی تھیں تو ان میں کوئی نیا پن نہیں تھا۔ یونیورسٹی، کالج بند تھے۔ کتابوں کی دُکانوں میں صرف مذہبی کتابیں تھیں۔ حسین، جوان مغنیوں، اداکاراؤں اور مصوروں کی جگہ خمینی کی تصویریں لگتی دیکھ جوان لڑکے لڑکیاں بوکھلا رہے تھے۔ ان کی سمجھ میں، ان کی سوچ میں پوری دنیا نہ سہی، مگر اس عظیم انسانی کائنات کی دوسری

ہستیاں تھیں۔ جن کے ساتھ وہ بڑے ہوئے تھے، ان سے تہذیب وتمدن اور انسانی معاشرے کے فروغ کا تعلق تھا۔ ایسی حالت میں وہ کیا دیکھیں؟ کیا سمجھیں؟ سب اُکتا کر پھر گھر کے اندر جا بیٹھتے اور اسی اُکتاہٹ اور بے پناہ قوت کو مناسب ذرائع سے استعمال نہ کر پانے کے سبب نوجوان نشے میں گرفتار ہونے لگے۔ سچائی سے مقابلہ کرنے کی طاقت سے گھبرا کر نہیں، بلکہ جھوٹے بہتان سے بچنے کے سبب وہ نیم بیہوشی کی حالت میں رہنا چاہتے تھے۔ بھلے ہی ایسے لڑکوں کی گنتی ایک فیصد سے کم ہو، مگر تھی تو۔

طوائفوں اور نشیلی اشیا کی خرید وفروخت کرنے والوں کو پکڑا جاتا اور پھانسی دے دی جاتی۔ ہر روز اخباروں میں چھپی ان خبروں کو پڑھ پڑھ کر اب لوگ اوبنے لگے تھے۔ مگر یہ اوب صرف پڑھے لکھے طبقے کے بیچ پنپ رہی تھی۔ پسماندہ طبقہ بیچارہ غریب، جاہل اپنے مذہب کے ساتھ تھا۔ اعتماد اور عقیدت میں دلیل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جس کی وجہ سے روزانہ پرانے تہران سے خمینی کی حمایت میں جلوس نکلتا۔ امام کی بڑی بڑی تصویریں لے کر عورتیں نعرے لگاتی ہوئی پورے شہر کے چکّر کاٹتی تھیں، ایران کئی خانوں میں تقسیم ہوکر الگ الگ عقیدت کا امتحان دے رہا تھا، اور یہی وہ الجھنیں تھی جن کو سابق حکومت نے عوام کو قابو کرنے کے نام پر دیا تھی۔

امام خمینی اب پہلے کی طرح ہر کسی سے نہیں ملتے تھے۔ زیارت کرنے والوں کو بتایا جاتا تھا کہ وہ بیمار ہیں، لیکن سیاسی جماعتوں کا خیال تھا کہ امام خمینی اب ان سوالات کا جواب نہیں دے سکتے ہیں جو پورے ملک میں سر اُٹھا چکے ہیں۔ ہر دن پارلیامنٹ کے ممبران بدلے جارہے تھے۔ نئے منصوبے بنائے جارہے تھے۔ ملک کے دروازے دیگر ممالک کے لیے بند ہو چکے تھے۔ ایرانیوں کو لے جانے والے جہاز اب اس طرح سے اُڑان نہیں بھر رہے تھے۔ کیونکہ ویزا ملنا آج کی تاریخ میں سب سے مشکل کام تھا۔ ان تمام الجھنوں اور پریشانیوں کے بعد ہرے انقلاب کا جھنڈا ایران کے ماتھے پر لہرا رہا تھا۔

ملیحہ کی زندگی بہت تکلیف دہ دور سے گزر رہی تھی۔ پہلے تو صرف حسین کا غم تھا، اب اس پر الزام کا بوجھ بھی بڑھ گیا تھا۔ کچھ روز پہلے تک جس غم کو وہ سینے سے لگائے لوگوں کی نظروں میں احترام کے جذبات اپنے لیے دیکھتی تھی وہاں پر اب حیرت بھری نفرت دیکھنے لگی تھی۔ حسین مجاہد تھا، موجودہ سرکار کا مخالف۔ اس میں ان معصوم بچوں کا کیا قصور تھا؟ روز ان کے گھروں کو تہہ و بالا کیا جاتا تھا، حسین کے سارے کاغذ، ڈگریاں، تصویریں پاسدار اُٹھا لے گئے تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اتنی اہم بات جو اس طرح سے ان کی زندگیوں سے متعلق تھی، حسین نے کبھی اس کا ذکر کیوں نہیں کیا اس سے کہہ دیتا تو شاید آج کے لیے وہ تیار رہتی۔ تھوڑی بہت جو قیمتی اشیا فروخت ہونے سے بچ گئی تھیں انہیں پاسدار اٹھا لے گئے تھے۔ ان کے اچھے دنوں کے گواہ ہیرا، پنا، سیم و زر سب کچھ جا چکا تھا۔ فرنیچر کے بعد اگر کچھ ایسا تھا، جسے فروخت کرکے پیسہ مل سکتا تھا، تو وہ تھے قالین۔ کل شاید اسے یہ بھی کرنا پڑے۔

کل رات دو بجے کے قریب پاسدار دروازہ کھٹ کھٹا کر اندر داخل ہو گئے، اور ایک ایک کپڑا، ایک ایک کونا کنگھال ڈالا، جیسے کہ سوئی ڈھونڈ رہے ہوں۔ وہ دونوں بچوں کے ساتھ ایک کونے میں خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی۔ یہ کیا دیکھنے آتے ہیں آخر یوں؟ پورا گھر اُلٹ کر وہ گالیوں کی برسات کرکے چلے گئے۔ دونوں بچوں کی نیند سے بھری، مگر خوفزدہ آنکھیں دیکھ کر وہ اپنے آنسوؤں کو نہ روک سکی۔ وہیں گھٹنوں پر سر رکھ کر وہ سسکنے لگی۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ ایک دن وہ اتنی مفلس ہو جائے گی۔ جس کا دامن پکڑ کر وہ تمام زندگی قربان کرنے کو سوچ بیٹھی تھی، وہ اس طرح بغیر کچھ بتائے غائب ہو جائے گا۔ اگر اسے ان بچوں کا خیال نہ ہوتا تو وہ کب کی ٹوٹ چکی ہوتی۔ ان معصوموں کے چہرے دیکھ کر اس کے اندر جینے کی خواہش پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو ان کا کون پُرسان حال ہوگا؟

کئی بار دروازے کے پیٹے جانے کے بعد طیبہ کو یقین ہو گیا کہ یہ اسی کا دروازہ ہے۔ وہ تیزی سے اٹھی اور دروازے کی طرف لپکی۔ کون ہو سکتا ہے اتنی رات گئے؟ دروازہ کھولتے ہی وہ سناٹے میں آ گئی۔ دروازے میں پانچ مسلح پاسدار کھڑے تھے۔

"کیا چاہیے آپ کو؟" طیبہ نے حیرت سے پوچھا۔

"ہمیں اس گھر کی تلاشی لینی ہے۔"

"لیکن کیوں؟"

"کومیتہ سے آڈر ملا ہے۔"

"کیوں؟"

"آپ کے پڑوسیوں نے ہمیں ایک ہفتے پہلے اطلاع دی تھی۔"

"کیسی اطلاع؟"

"انہیں شک تھا، ہم حقیقت جاننا چاہتے ہیں، اندر آنے دیجئے۔"

"میں اکیلی رہتی ہوں۔ اس طرح رات کے دو بجے کسی کے گھر کی تلاشی کا کیا مطلب ہے؟ یہ کام تو شام یا دن میں بھی ہو سکتا ہے، آپ کل صبح تشریف لائیں۔"

"تاکہ آپ وہ تمام قابل اعتراض چیزیں چھپا سکیں...... کیوں؟"

"آپ کے بات کرنے کے انداز پر مجھے اعتراض ہے۔ میں نے آپ سے کہا، آپ لوگ صبح تشریف لائیں۔"

"آڈر ابھی کا ہے...... یہ دیکھیں۔"

طیبہ نے کاغذ کو دیکھا۔ انہیں دیکھ کر سمجھ تو وہ سب کچھ گئی تھی، لیکن کرتی بھی کیا؟ ایک طرف ہٹ گئی۔ وہ پانچوں اندر داخل ہوئے۔

"بس یہی ایک کمرہ ہے کیا؟" ایک پاسدار نے پوچھا، دو پاسدار آگے بڑھ کر کتابوں کی الماری کو الٹنے پلٹنے لگے، دو میز اور کیسٹوں کو ٹٹولنے لگے، ایک پاسدار کونے میں بچھے بستر کو الٹنے لگا۔ طیبہ کا توہین کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ ایک نے بڑھ کر اس کے کپڑوں کی الماری کھولی۔

"وہاں آپ کیا دیکھنا چاہتے ہیں۔ برائے مہربانی اسے مت کھولیں، وہاں میری

ذاتی استعمال کی چیزیں ہیں۔" طیبہ نے مزاحمت کی۔
"جیسے یہ!" ایک پاسدار نے کتابوں کے درمیان سے تصویروں کا ایک البم کھول دیا۔ عظیم مصوروں کی تصاویر۔ جسم کی مختلف ادائیں اور انداز۔
"اور یہ کیا ہے، خانم؟" ایک پاسدار نے میز کی دراز سے نکالے لفافے سے تصویریں نکال کر دکھائیں۔ اس کے ورک شاپ کی، اسٹوڈیو اور کانفرنس کی مختلف تصویریں تھیں۔
"مردوں کے ساتھ آپ ان تصویروں میں اکیلی کھڑی ہیں اور ہم سے ڈر رہی تھیں۔ ہم بھی مرد ہیں، بھیڑیے نہیں۔" ایک نے ہنس کر کہا۔
"سچ پوچھئے تو یہ نامرد ہیں جو عورت کو اس طرح بے پردا، بے حیائی سے برداشت کرتے ہیں۔" ایک پاسدار نے بے حیائی سے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
"یہ رہیں کتابیں، سنبھالو انہیں۔ پورا قابل اعتراض ادب ہے۔"
"آپ اسی وقت کمیٹی چلئے۔" پانچوں نے طیبہ کو گھیر لیا۔ طیبہ ایک لمحہ کے لیے متزلزل ہوئی۔ اسے ایسا لگا کہ وہ بیہوش ہو جائے گی۔ دوسرے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھالا اور بولی۔ "آپ لوگ باہر میرا انتظار کریں، میں کپڑے تبدیل کر لوں۔"
اس نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور کپڑے بدلنے لگی۔ اسے یقین ہو گیا تھا کہ وہ زندہ نہیں بچے گی۔ لیکن ان چیزوں کا وہ کیا کرے جو پلنگ کے نیچے چھپی ہوئی ہیں، ہٹانے کا وقت بھی تو نہیں ہے!
"چلئے۔"
اس نے دروازے میں قفل لگایا اور ان کے ساتھ نیچے اترنے لگی۔ دروازے کے سامنے کمیٹی کی گاڑی کھڑی تھی۔ وہ دروازہ کھول کر ڈرائیور کے قریب بیٹھ گئی۔

ایک ہفتے کے بعد مارے گئے لوگوں کی فہرست ٹیلی وژن پر پڑھی جا رہی تھی۔ ملیحہ بڑے غور سے ناموں کو سن رہی تھی۔ طیبہ کے منہ سے تھوڑی دیر بعد

نکلنا۔ ''یہ بھی گیا۔''
سوسن خاموش تھی۔
پروگرام ختم ہوگیا تو ملیحہ نے ساور کا پلگ لگایا اور چائے کے برتن ٹھیک کرنے لگی۔
''اب آگے کیا ہوگا، طیبہ؟'' سوسن نے پوچھا۔
''ایک نئے انقلاب کی زمین تیار ہو رہی ہے۔''
''......اور اس انقلاب کا کیا ہوا؟'' ملیحہ نے ہنس کر کہا۔
''یہ انقلاب آیا نہیں لایا گیا تھا، اسی لیے منزل تک نہیں پہنچ سکا۔ جدوجہد جاری ہے۔ دراصل اب آنا چاہیے تھا انقلاب۔'' طیبہ نے کہا، پھر کچھ سوچتی ہوئی گویا ہوئی۔ ''میں شاید اب تم لوگوں سے پھر نہ مل سکوں۔ آج بڑی مشکل سے وقت نکال پائی تھی۔ ہزار خطرے تمہارے اور میرے لیے پیدا ہو سکتے ہیں۔ اس دن کمیٹی والوں کو دیکھ کر میں تو حیران رہ گئی تھی۔ بس سمجھو کہ زندہ بچ گئی۔ لیکن جس دماغی موت سے گزری ہوں، میں ہی جانتی ہوں۔ آگے کا وقت اس سے بھی زیادہ تاریک ہے۔
''ہم نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ ایک پردہ تھا جو آنکھوں کے سامنے پڑا رہتا تھا۔ خوشیوں کے علاوہ ہم نے دیکھا ہی کیا تھا؟'' سوسن نے کہا۔
''اچانک پردہ ہٹا تو جیسے رات دن، نظریات کے حوالہ سے سب کچھ ہی بدل گیا؟'' ملیحہ نے چائے بناتے ہوئے کہا۔
''تب اپنی چھوٹی سے چھوٹی تکلیف بھی کتنی بڑی محسوس ہوتی تھی، آج پوری قوم پورے ملک کی تکلیف کے آگے وہ باتیں کتنی چھوٹی، ذاتی اور بچکانہ لگتی ہیں!'' سوسن نے قند کے ٹکڑے کو دانتوں کے نیچے دبا کر گرم چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔
''ابھی تو سوسن، بہت کچھ بدلے گا۔ میں نے دس سال کس گھٹن میں گزارے ہیں، میں ہی جانتی ہوں۔ تب جدوجہد کرنا اتنا مشکل نہیں تھا۔ لاپرواہی، عشق، شراب کی آڑ لے کر ہم کیا کچھ نہیں کرتے تھے، لیکن آج ہماری جدوجہد کو کسی بھی طرح کا سہارا نہیں ہے، کسی بھی چیز کی آڑ نہیں ہے...... خیر، یہ وقت بھی نکالنا ہے۔ دلی خواہش تو ہے آزادی کو دیکھنے کے بعد مرنے کی، آگے اس آرزو کے پورا ہونے تک کتنی رکاوٹوں

کو دُور کرنا ہے، معلوم نہیں۔ میرے کتنے ساتھی، کتنے دوست اس درمیان ہم سے جدا ہو گئے، شمار نہیں کر سکتی ہوں۔ دیکھنے والے سمجھتے تھے کہ ہم شرابی اور کبابی ہیں، عورت باز اور مرد خور ہیں مگر ہمارے ہی شانوں پر سارا بوجھ تھا۔ اس سختی کو لگا کر ہم نے حکومت مخالف بڑے بڑے کام انجام دیے تھے۔"

"وقت سے بڑی ظالم دوسری کوئی شئے نہیں ہے۔" ملیحہ نے کہا۔

"اچھا اب میں چلتی ہوں، میرے بارے میں کوئی کچھ پوچھے تو کہہ دینا تم لوگوں کو کچھ پتہ نہیں ہے۔"

سوسن اور ملیحہ باری باری طیبہ سے بغلگیر ہوئیں، اسے پیار کیا، جدا ہوتے وقت تینوں کی آنکھیں اشک بار تھیں۔ وہ طیبہ کو اب سمجھ پائی تھیں۔

ایران نظریاتی سطح پر منقسم ہو رہا تھا۔ خانہ جنگی کی آگ اپنی لپٹوں سے اس کے ہر کونے کو جھلسا رہی تھی۔ پلنگ کے نیچے رکھے کاغذات کو طیبہ کہاں چھپائے، سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کسی دوست کے پاس لے جانا بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ جب سے کمیٹی والے آئے تھے، اس دن سے اس کے گھر کی زبردست نگرانی ہو رہی تھی۔ آج کمیٹی سے لوٹے اسے تیسرا ہفتہ ہو گیا تھا، اسے خوف تھا، اس بار کی تلاشی میں وہ ضرور پکڑی جائے گی۔ اس کی گرفتاری اتنی اہم نہ تھی جتنا کہ ان کاغذات کی حفاظت۔ اس میں جدوجہد کی پوری ایک داستان تھی، جو افشا ہو جائے تو پورے گروپ کو اپنے ساتھ بہا لے جائے گی۔ آدھی رات تک وہ کمرے میں ٹہلتی رہی۔ چھوٹا سا کمرہ، اس کی زندگی کی جمع پونجی...... کتابوں کی الماری پر محبت سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ ہزاروں کتابیں پڑھ ڈالی ہیں میں نے...... کتنی راتیں تنہا ایک بلب کی روشنی کے نیچے ان کتابوں کے ساتھ گزاری ہیں...... انہیں اور ان کے ہر لفظ کو پوری سنجیدگی اور معانی کی مکمل تشریح کے ساتھ میں نے سمجھا تھا...... ایسی کتابوں کے علم سے بھرے جانے کتنے سر اور کتنے دماغ گولیوں سے چھلنی کر دیے گئے تھے۔ کسی تشنگی کی طرح برسوں سے علم کو ترستے دماغوں

نے کس دانشوری، کس سزا اور کن کن تکالیف سے گزر کر، ننگی تلواروں کے سائے میں کھڑے ہوکر ان کتابوں کو پڑھا تھا۔ اگر یہ پاسدار حقیقتاً پڑھے لکھے ہوتے تو کیا وہ اس دن بچ پاتی؟ وہ تصاویر بھی اتنی قابل اعتراض نہ تھیں کہ انہیں بہانہ بنا کر اس کا سینہ چھلنی کر دیا جاتا۔ صرف اس وجہ سے وہ بچ گئی کہ پاسدار بالکل دیہاتی تھے۔ وہ صرف ڈرانے دھمکانے آئے تھے۔ اس نے کتابوں پر سے ہاتھ ہٹایا اور گہری سانسیں لینے لگی، پھر پلنگ کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ کافی دیر تک کچھ تلاش کرنے کے بعد ایک بڑا سا پیکٹ باہر نکالا۔ اسے قالین پر الٹ دیا۔ جانے کس خیال سے وہ چونکی، فوراً اُس نے اُٹھ کر لائٹ بجھائی اور ٹیبل لیمپ کو نیچے کر کے رکھ لیا۔ کاغذ چھانٹ کر پلندہ اٹھایا اور کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ گیس کے اسٹوو سے ماچس اُٹھائی اور غسل خانے میں جا کر اندر سے قفل لگا لیا۔ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ لائٹ جلا کر کام کرے یا...... آخر میں اس نے بجلی کو جلتے رہنے دیا۔ تھوڑے تھوڑے کاغذات ماچس سے جلاتی جا رہی تھی، تاکہ بار بار فلش نہ کرنا پڑے۔ سارے کاغذ جل کر راکھ ہو گئے۔ ان کی راکھ اس نے بہا دی، مگر آنکھوں میں گھسا کالا دھواں ایک عجیب سی جلن پیدا کر رہا تھا۔

کمرے میں آکر اس نے بستر درست کیا۔ جب وہ بستر پر دراز ہوئی تو دل پر چھائے بوجھ کی ایک اینٹ خالی تھی، مگر وہ خالی جگہ اسے ایک دم نئے درد سے متعارف کرا رہی تھی۔

شام ہوتے ہی سڑکیں خالی ہونے لگتیں۔ پردے کھینچ کر لوگ گھروں میں بیٹھے رہتے تھے کہ کہیں کوئی قابل اعتراض منظر ان کے پڑوسی کی نظروں میں نہ آجائے۔ خصوصاً عورتیں بہت ڈرتی تھیں کہ کہیں سر کھلا نہ رہ جائے یا اسی قسم کی کوئی اور گستاخی ہو جائے تو کیا ہوگا؟ کیبرے، رقص، گانا بجانا جانے کب کا ختم ہو چکا تھا۔ تہران کی شامیں کہاں دلہن کی طرح سجی ہوتی تھیں اور آج کسی بیوہ کی طرح اپنا چہرہ گھٹنوں میں چھپائے رو رہی تھیں۔ ایسی ہی ایک شام آنسوؤں میں ڈوبی ہوئی تھی۔ جب چار حاملہ

عورتیں اپنے پستانوں سے دودھ کی دھار کے بجائے سینے سے خون کے اُبلتے فوارے کو دبائے تڑپ رہیں تھیں۔ ایسا منظر دیکھ کر آئے احمد کا دل کسی طوفان کی طرح حدوں کو توڑنے کے لیے زور مار رہا تھا۔ سمجھ نہیں پا رہا تھا کہ یہ بات، یہ راز، یہ جوش، یہ طوفان کس کے سامنے خالی کرے! دل چاہا کہ وہ ان پاکیزہ جذبات کو جو اس منظر کو دیکھ کر پیدا ہوئے ہیں، وہ کسی کو بتائے۔ بالکل سچ، اس نے کیا سوچا، اس کے اندر کیا ٹوٹا، اس کے احساس کی دُنیا کیسے بدلی؟

بار بار وہ اس سفید مکان کے سامنے جا کر رُک جاتا تھا، پھر سگریٹ سلگا کر اس کے گہرے گہرے کش لینے لگتا، کچھ سوچتا، پھر آگے بڑھ جاتا۔ چلّو کبابی کی دُکان تک جا کر وہ پھر لوٹ آتا...... اسی طرح سے دو گھنٹے گزر گئے۔ سگریٹ کے دو پیکٹ اس نے پھونک ڈالے۔ دل پر چھائی افسردگی کچھ کم ہو گئی تھی۔ اسے یوں ٹہلتا دیکھ کر سب سمجھ گئے کہ اس سفید مکان پر پھر کوئی آفت ٹوٹنے والی ہے۔ پڑوسی ہوشیار ہو گئے تھے، مگر اندر ملیحہ ان باتوں سے بے خبر قالین کو صاف کر کے لپیٹ رہی تھی، اس کی قیمت لگ چکی تھی۔ کل اسے خریدنے والا آئے گا۔ یہ قالین اسے جان سے زیادہ عزیز تھا۔ شادی کے بعد یہ پہلا تحفہ تھا جو حسین نے اسے دیا تھا۔

دروازے کی گھنٹی بجنے سے وہ چونکی، بڑا بیٹا دوڑ کر کھڑکی پر گیا اور نیچے جھانکا۔ مڑ کر اس نے ماں سے کچھ کہا۔ ملیحہ نے پوچھا اور دروازہ کھول دیا۔ اسے ایسے پاسداروں کی عادت پڑ گئی تھی۔ اس وقت اس کے دل میں یہ خدشہ پیدا ہوا کہ شاید اس قالین کو فروخت کرنے کی بھنک ان کے کانوں تک پہنچ گئی ہے۔ اب یہ مجھ سے مختلف سوالات کر کے پریشان کریں گے۔ وہ پھر بھی شائستگی سے بولی۔ ''آیئے۔''

احمد کیچڑ لگے اپنے بھاری جوتوں کے ساتھ اندر آیا اور سلام کیا۔ اس کے سلوک اور جھجک کو دیکھ کر ملیحہ کو کہنا پڑا۔ ''بیٹھیے۔''

دونوں بچے ماں کے پیچھے اس سے چپک کر کھڑے ہو گئے تھے۔ احمد سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ ملیحہ بھی بیٹھ گئی۔ ماں کے اشارے سے میز پر رکھی پھل کی پلیٹ بیٹے نے پیش کر کے گھر آئے مہمان کا استقبال کیا۔ احمد نے شکریہ کے ساتھ ایک نارنگی اُٹھائی۔ اس

نے پھلوں میں نارنگی کا انتخاب اسی لیے کیا تھا، تا کہ اس کا چھلکا اتارتے، اس کی پھانکیں الگ کرتے ہوئے اسے اتنا وقت مل جائے کہ وہ خود کو محتاط کر کے اپنی بات کی شروعات کر سکے۔

ملیحہ کے سامنے اس کا آنا ایک سوال تھا، کیا پوچھتی؟

اسے چھلکے اتارتے دیکھ کر وہ اُٹھی اور اُبلتے سماور سے چائے کی کیتلی اُتارنے لگی۔ چائے کی ٹرے لے کر جب وہ واپس آئی تو احمد نے گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''بچوں کے والد کا کچھ پتہ چلا؟''

ملیحہ کی آنکھیں جھک گئیں، آہستہ سے بولی۔ ''نہیں۔''

''آپ نے کوشش کی...... میرا مطلب ہے کسی دوست......''

''نہیں۔'' بیچ میں ہی گھبرا کر ملیحہ نے بات کاٹ دی۔ ''ہمارا اب کوئی دوست نہیں رہا...... میرے شوہر مجاہد تھے، اس کا علم تو آپ کو بھی ہوگا...... پھر اس طرح کے سوالات پوچھنے سے آپ کا کیا مطلب ہے؟ بُرا نہ مانیں تو میں آپ کے آنے کی وجہ پوچھ سکتی ہوں؟'' اس بار ملیحہ کے دل میں خدشہ پیدا ہوا کہ وہ ضرور طیبہ کے بارے میں پوچھنے آیا ہوگا۔ اسے ہر قسم کے جواب دینے کی تیاری کر لینی چاہیے۔

''میں ایوان جیل کا ملازم ہوں۔ گاؤں سے ایک سال پہلے آیا تھا۔ اس سے قبل میں کبھی ٹرین میں نہیں بیٹھا تھا۔ اس ایک سال میں میں نے وہ سب کچھ دیکھ لیا، جو گزشتہ چوبیس برسوں میں نہیں دیکھ پایا تھا۔ کاش، یہ سب کچھ نہ دیکھتا تو کتنا اچھا ہوتا...... میں اسی محلے کی کمیٹی میں ہوں۔ آپ کے مکان سے کچھ دُوری پر جو مسجد ہے، وہیں پر میں رہتا ہوں...... میرے ساتھی ہر مہینے آپ کے پاس چار پانچ مرتبہ آتے ہیں، تا کہ آپ کو آپ کے شوہر حسین آغا کی غلطیوں کا احساس دلا سکیں...... مجھے بھی مجاہدین سے نفرت تھی لیکن اب نہیں ہے۔ میں آپ سے تنہائی میں کچھ کہنا چاہتا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو، کیونکہ جو بوجھ میرے دل پر ہے وہ ہزاروں قبروں کے بوجھ کے برابر ہے۔ میں اس سے آزاد ہونا چاہتا ہوں۔''

گھبرائی ہوئی ملیحہ نے بچوں کو کمرے میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا اور دروازہ باہر سے

بند کر دیا۔ پھر اس کمرے میں آئی اور سوالیہ نگاہوں سے اس کے چہرے کو دیکھنے لگی۔

''میں نے بہت سے لوگوں کو مرتے ہوئے دیکھا ہے۔ ان کے مرنے پر ایسا لگا کہ دُنیا سے برائی ختم ہو رہی ہے۔ زمین سے گنہگاروں کا بوجھ ہلکا ہو رہا ہے۔ ان کی چیخیں میرے دل کو ایک نئے ایمان اور یقین سے متعارف کراتی تھیں، لیکن آج کا منظر مجھے اندر، بہت گہرائی تک ہلا گیا، شاید وہ میرے دُکھ کے قریب تھا یا اس کی جھلک اس میں تھی......''

اس کی خاموشی ملیحہ کو مشتعل کرنے لگی کہ کیا بات ہے جس کی تمہید وہ اس طرح باندھ رہا ہے۔

''میری بیوی ایک سال پہلے حاملہ تھی۔ آپ جانتی ہیں، ہم دیہاتی لوگ جہاں غیر تعلیم یافتہ ہیں، وہیں مفلس بھی۔ ہمارے گاؤں میں کوئی ڈاکٹر بھی نہیں تھا، صرف ایک دائی تھی۔ ڈاکٹر کو تو میں نے یہیں آ کر دیکھا، ورنہ ہمارے لیے وہی دائی خدا کا دوسرا روپ تھی۔ بیوی کے حمل گرنے کو وہ روک نہ سکی، نہ بیوی ہی بچ سکی۔ اسے بچے کی بہت خواہش تھی۔ شادی کے پانچ سال بعد یہ ہمارا پہلا بچہ تھا...... دل اُچاٹ ہو گیا۔ شہر سے گئے مولوی اور ان کے ساتھیوں کے ساتھ میں خدمت کے جذبات لے کر تہران آ گیا۔ تہران کی چمک دمک، روز نئے فرائض نے میرے دُکھ کو کافی حد تک کم کر دیا۔ میں اس میں ڈوبا خود کو بھول گیا۔ اس باپ کو بھول گیا جو اس احمد نام کے آدمی کے سینے میں تڑپتا تھا۔ اس شوہر کو بھول گیا جو اس احمد نام کے انسان کے سینے میں اپنی بیوی کی محبت میں بے چین رہتا تھا۔ لیکن آج صبح میں نے اس کھوئے ہوئے احمد کو پا لیا، اور تب سے میں بے چین ہوں کہ اس وصولیابی کو کس کے سامنے کھولوں، کس کے سامنے سچائی کو اُگلوں......'' احساس اور جذبات کی وجہ سے اس کی آواز بھاری ہو گئی۔ اس نے خود کو سنبھالا، چائے کا گھونٹ بھرا، خود کو محتاط کیا۔

ملیحہ کی رگوں میں خون تیزی سے دوڑنے لگا تھا۔ اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس پاسدار کے ساتھ کیسا سلوک کرے۔ درحقیقت یہ جاسوسی کر رہا ہے؟ یا پھر یہ کوئی نئی سازش ہے؟

''آپ کے شوہر مجاہد تھے۔ آپ کو اس بات پر دکھ نہیں کرنا چاہیے۔ مجاہد...... مجاہد...... آج چاروں لڑکیاں آخری وقت تک اپنی بات پر اَڑی رہیں۔ انہیں گولی سے اُڑا دیا گیا۔ ان کے مردہ جسم کو جب سیدھا لٹایا گیا تو وہاں پر وہی اُبھار تھا جس کی خواہش میری بیوی کو تھی۔ زندگی میں سورج کا طلوع اور غروب میں نے ساتھ ساتھ دیکھا تھا۔ وہاں سے میں نے جانا، اس موت کے پیچھے کوئی راز ہے۔ کوئی بہت بڑا راز۔ ورنہ ایک ماں اپنے بچے پر سے...... میں نے یہ پندرہ گھنٹے کس درد سے گزارے ہیں، وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اس وقت میں ہلکا ہو گیا، یہ کہہ کر کہ جو ہو رہا ہے اس کے پیچھے کچھ اور ہے جس کا پتہ مجھ اَن پڑھ کو نہیں ہے۔ میں آپ سے بھی نہیں پوچھوں گا، خود اسے تلاش کروں گا۔ اتنا وعدہ کرتا ہوں۔ اس کے بعد آپ کو کوئی تکلیف نہیں پہنچے گی۔ میں یہاں موجود ہوں...... بھائی کہہ سکتی ہیں آپ......''

ملیحہ کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔ کیا بولے، سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ وہ پھر گویا ہوا۔ ''مجھے معاف کریں، اس طرح میں آ گیا، مگر میں یہ راز کس سے کہتا؟ اس شہر میں اپنا کون ہے! جو تھے وہ اب اپنے نہیں غیر ہو گئے، بلکہ دشمن...... میں وعدہ کرتا ہوں۔ آپ کے شوہر کی تلاش جاری رکھوں گا...... زندہ۔ مردہ دونوں قطار میں انہیں ڈھونڈوں گا...... شاید میں اسی وجہ سے اب اس شہر میں رکوں گا۔ ورنہ...... غریبی ان تمام چیزوں سے کہیں اچھی ہے۔ میں وہیں لوٹوں گا...... لیکن...... ازالہ کے بعد...... جو مجھے کرنا ہے۔''

جب وہ چلنے لگا تو ملیحہ اس کے پیچھے پیچھے دروازے تک آئی۔ ایک گھنٹے میں وہ پہلی بار بولی۔ ''میری اُمید کا بھرم مت توڑیے گا۔ مجھے ان کے انتظار میں جینے کا حوصلہ ملتا ہے، ورنہ...... سچائی مجھے ڈراتی ہے...... گمان، اس باب کو ایسا ہی ادھورا رہنے دیں۔ وقت نے وفا کی تو ضرور وہ باقی ابواب کو ختم کرنے، ہمیں زندگی دینے آئیں گے...... ورنہ بھرم کا اپنا سکھ ہے، وہ مجھ سے نہ چھینیں۔''

احمد جا چکا تھا۔ صوفے پر بیٹھی ملیحہ بُری طرح سے رو رہی تھی۔ وجہ وہ خود بھی نہیں جانتی تھی۔ بچے سہمے ہوئے ماں سے لپٹ کر بیٹھے تھے۔

کتابوں کی دُکانوں پر حملے شروع ہو گئے تھے۔ اشتراکی کتابیں ضبط ہو رہی تھیں، بلکہ کہیں کہیں تو فٹ پاتھ پر ان کو نذرِ آتش بھی کیا گیا۔ گھروں کے تہہ خانوں میں قبریں کھود کر لوگوں نے کتابیں گاڑ دی تھیں۔ اُوپر سے اچار کے مرتبان، کوئلے، لکڑی، پیٹرول اور مٹی کے تیل کے کنستر رکھ دیے، تاکہ تلاشی میں زیرِ زمین دبی کتابیں بچ جائیں۔ لیکن ایسی سہولت طیبہ کے پاس نہ تھی۔ طیبہ کو پہلی بار احساس ہوا کہ درحقیقت زندگی پیچیدہ گلیوں کا ایک جال ہے، جس سے نکل کر صاف شفاف سڑک تک پہنچنے کے لیے کتنے امتحانات سے گزرنا پڑتا ہے۔ تاریکی، کیچڑ، ناہموار راستہ، ٹھوکر، زخمی اور کھوجتی آنکھوں کی روشنی۔ مگر یہ پورا ادب، پوری تاریخ، یہ تمام خزانہ ایک لمحہ میں راکھ ہو گیا۔ طیبہ کو پورا آسمان کالا نظر آرہا تھا۔ بچپن میں بھیڑ جیسے بادل دیکھ کر اسے لگتا تھا کہ تمام حلال بھیڑیں جنت میں جاتی ہیں اور ان کی کھالیں آسمان پر لٹکا دی جاتی ہیں، لیکن آج اسے احساس ہوا، آگ میں تپے سب الفاظ دُھویں کی کالی لکیر میں ڈوبے اوپر آسمان میں جا کر پھیل گئے۔ انہیں چمکانے والا سورج کب نکلے گا، آخر کب......؟ اس کا پورا ادب جل گیا تھا۔ وہ سب کچھ، جو اس نے چُھپا کر لکھا تھا، شائع کرانے کی اُمید میں، جل کر راکھ ہو گیا تھا۔ یہ قلم، یہ کاغذ کتنے بے معنی ہو گئے تھے آج! جہاں پر آنکھوں سے سینسر ہوتا ہو، دل کا ایکسرے لیا جاتا ہو، وہاں پر کاغذ پر لکھے الفاظ کو گولیوں سے بیندھ دیا جاتا ہے۔

ہم نے کبھی ایسا نہیں سوچا تھا۔ آج کے دن کے لیے ہم نے پوری زندگی داؤں پر نہیں لگا دی تھی۔ ہم کہاں ٹھہرے تھے؟ کہاں ہوئی ہم سے غلطی؟

طیبہ نے خالی الماریوں میں ہاتھ پھیرا، وہاں سے کتابوں کا لمس غائب تھا۔ وہ خود ہی قبروں کی طرح خالی تھیں۔ دیواریں ننگی تھیں۔ وہ تمام تصویریں، وہ آرٹ جانے کہاں دم توڑ گئی۔ پورے کمرے میں اسے اس وقت ہر چیز بے معنی اور بے مطلب لگ رہی تھی۔ کرسی میز کی اہمیت کیا ہے اب؟ قلم اور روشنائی کا استعمال؟ خالی الماری، میز پر

رکھا لیمپ اور یہ ٹی۔وی، ریڈیو جو کبھی بھی صحیح خبریں نہیں دیتے۔ یہ بستر، جس پر آرام کی جگہ کفن سے لپٹی لاشوں سے اٹھتی بے قصور خون کی بو آتی ہے۔ پھر اس کا وجود اس ماحول میں اس سے کیا مانگتا ہے؟ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر وہ پتھر کی مورتی بن جائے یا پتھر کی ان دیواروں سے اپنا سر پھوڑ ڈالے؟ کیا کرے وہ؟ آخر کیا کرے وہ؟ جدوجہد کا سرا گم ہو گیا، اسے پھر سے پکڑے، لیکن کہاں سے؟ آخر کہاں سے پکڑے؟

رات کافی گزر چکی تھی۔ کئی روز سے اس نے بھر پیٹ کچھ بھی نہیں کھایا تھا۔ دل کھانا پکانے کو نہیں چاہتا تھا اور کہیں وہ جا سکتی نہیں۔ کہاں جائے؟ کتب خانہ؟ کتابوں کا بازار؟ یونیورسٹی؟ جلسہ؟ سیمینار؟ سنیما؟ ڈرامہ؟ ادبی موسس؟ پارک؟ باغ؟ رشتہ داروں کے گھر؟ دوستوں کو فون کرے؟ سب دروازے سب اُمیدیں اس کے لیے بند ہیں، یہ کمرہ اتنا خالی...... اتنا خالی؟ پہلے کبھی نہیں لگا۔ کتنی گھٹن ہے ان بے جان فرنیچروں میں! کہاں سے لائے زندگی؟ کس سے ادھار مانگے؟ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے؟ کیا ترکیب ہو سکتی ہے؟ آہ......! کتنی بار ایمانداری کا امتحان لیا جائے گا، کتنی بار؟ طیبہ سوالات کے گھیرے میں قید باہر نکلنے کا راستہ تلاش کر رہی تھی۔ تبھی دروازے پر کسی نے ہلکے سے ہاتھ رکھا۔ طیبہ چونک گئی۔ بہت ہلکی ہلکی دستک تھی۔ اس کا کوئی ساتھی، اسی کی طرح کا کوئی بدقسمت قلم کا مارا آیا ہے۔ اس نے دروازہ کھولا۔ سامنے فرید کو کھڑا پایا۔

''تم!''

''ہاں بڑی مشکل سے پہنچا ہوں۔ دس ٹیکسیاں بدل کر، کئی میل پیدل چل کر......''
فرید نے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ اس کا چہرہ داڑھی بڑھی ہونے کے باوجود جذبات سے چمک رہا تھا۔ ہونٹ خشک ہو رہے تھے۔ کپڑے بے حد گندے تھے۔ کیا یہ وہی فرید تھا، جو اس ڈر سے کرسی پر نہیں بیٹھتا تھا کہ اس کی پینٹ پر سامنے شکنیں نہ پڑ جائیں۔ فرانسیسی خوشبو سے معطر وہ فرید آج کے فرید سے کتنا جدا تھا۔

''اتنی ٹھنڈ ہے، کوٹ کیوں نہیں پہنا؟'' اسے ناک صاف کرتے ہوئے دیکھ کر طیبہ نے پوچھا۔

”وہ اتنا پُر رعب و اسٹائلش ہے کہ اسے پہنتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے۔ اب تو میں صرف وہی کپڑا پہنوں گا جو ہمارے مزدور اور کاریگر پہنتے ہیں! بس! یہی مناسب ہے، آخر وہ کیسے رہ لیتے ہیں؟“ فرید نے آنکھیں سامنے دیوار پر گڑاتے ہوئے کہا۔

”چائے بناؤں؟“

”کہاں تکلیف کرو گی؟“

”اس بہانے سے میں بھی کچھ کھا لوں گی؟“

”ہاں! تو میں آیا تھا یہ کہنے کہ......“

طیبہ کے ہاتھ گیس جلاتے ہوئے رک گئے۔ اس نے مڑ کر فرید کو دیکھا۔

”وہاں، میرا مطلب ہے، اب اس گھر میں میٹنگ ہونا ناممکن ہے۔ کل میں گیا تھا۔ زلیخا خانم نے بتایا کہ محلے والوں کو شک ہو گیا ہے کہ ہم لوگ مزدور یا ان کے دوست نہیں ہیں، بلکہ...... کہہ رہی تھیں کہ پنچور یہ محلے والوں سے کہہ رہا تھا۔ ”یہ نوجوان کون ہے، بڑے جلالی چہرے والا، آنکھیں کیسی متفکر رہتی ہیں جیسے کوئی مصنف ہو......“ زلیخا خانم اور ان کے شوہر کی مہربانی سے کام چلتا رہا ہے۔ لیکن اب ہم ان کے یہاں جانا کچھ دن کے لیے بند کر دیں۔ ورنہ......“ فرید نے متفکر ہو کر سگریٹ جلایا۔

”نہ جانے سے شک نہیں ہوگا؟“ طیبہ نے فرج سے مکھن اور مربّے کی شیشی نکالتے ہوئے پوچھا۔

”شک، حقیقت میں تو نہیں بدلے گا...... خیر، اب کسی نئی جگہ کی تلاش ہمیں کرنی ہوگی۔“ فرید نے سگریٹ بجھاتے ہوئے کہا۔

”بہروز سے ملاقات ہوئی؟“

”ہاں وہ لوگ موقع پرست ہیں، موجودہ حکومت کے خلاف نہیں جائیں گے۔ ان کا کہنا ہے......“

”ان کا کہنا جو ہے وہ میں جانتی ہوں۔ اسے چھوڑو، یہ بتاؤ کتنے بچے؟“

”آدھے سمجھو کام آ گئے اور آدھے بچے ہیں۔ کل شاید......“

''ہوں اشتراکی جانے کیوں مل کر نہیں رہ سکتے! ہمیشہ خیالات کا ٹکراؤ اور گروہوں کا ٹوٹنا، بٹنا...... یہ دوسری بار ہماری تنظیم میں ہوا ہے۔ جدوجہد اس سے کمزور پڑتی ہے۔ عوام کا اعتماد ہم پر سے اُٹھتا ہے اور......''

''احمد وطن دوست اور انا پتا تو چلے گئے۔ آج وہ سرحد کے پار ہو چکے ہوں گے۔'' فرید نے سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

''تمہیں موقع ملا تو جاؤ گے؟'' چائے دم کرتے ہوئے طیبہ نے پوچھا۔

''نہیں، فی الحال نہیں۔ کل کیا ہوتا ہے، کہہ نہیں سکتا۔ بدلتے چہروں نے تو اب اپنے اوپر سے بھی مستحکم اعتماد کو متزلزل کر دیا ہے۔ کوئی سوچ سکتا تھا، کاظم کا یوں بدل جانا؟ میں تو سچ میں چکرا کر رہ گیا، جب وہ تیور بدل کر اپنے ہی کہے جملوں کو رد کرنے لگا۔ خیر چھوڑو...... جنگ اور عشق میں سب کچھ جائز ہے۔'' فرید نے چائے کا فنجان لیتے ہوئے کہا۔

''عشق بھی تو ایک سے ہوتا ہے، مگر...... فرید مجھے لگتا ہے کہ کل ہمارا سایہ بھی ہم سے بھاگنے لگے گا، کیونکہ وہ بھی وقت پر قربان ہو جائے گا اور ہم وطن کے عشق میں شہید، گناہگار، لامذہب اور اشتراکی ہونے کے کا الزام ماتھے پر لے کر چلے جائیں گے۔''

''موت ڈرا رہی ہے تمہیں؟''

''بالکل نہیں! لیکن مجھے یہ بدلتے حالات اندر تک کچوکے لگاتے ہیں۔ لگتا ہے، ایمانداری پھر کیا ہے؟ وطن ہے؟ عوام ہے؟ نظریہ ہے؟ اپنا خاندان ہے؟ یا اپنا مستقبل ہے؟ آج سے دس سال پہلے ہم نے، ہم چالیس لوگوں نے، ساتھ عہد کیا تھا کہ شادی نہیں کریں گے، جسم کی بھوک کو نظریہ اور وطن پر قربان کر دیں گے۔ ہماری شادی ہمارے وطن سے ہوتی، لیکن اکثر لوگوں نے اسے کورے جذبات کہہ کر رد کر دیا۔ ایک سال بعد اُنہی نے سب سے پہلے شادی کی، خاندان کے نام پر سمجھوتے کیے اور اب...... وطن کی قیمت پر مستقبل کا سمجھوتہ کر بیٹھے، اور ہم کل دس لوگ...... کچھ نہ جوڑ پائے۔ کل ہمارے پاس نہ گھر ہوگا نہ کھانا...... تب؟ شاید تب بھی

ہم نہیں بدلیں گے...... کبھی نہیں...... لیکن اس یقین کے بعد مجھے زبردست مایوسی نے جکڑ رکھا ہے کہ کیا دس لوگ یا سمجھو ہم جیسے دس ہزار لوگ چھتیس ملین عوام کو متاثر کر پائیں گے؟ آج ہمارے پاس کچھ بھی نہیں ہے، نہ بیٹھنے کی جگہ، نہ چھپوانے کا سامان، ہماری زندگی لایعنی ہے!''

''جذباتی مت بنو! وہ انقلاب ہی کیا جوان بیکار کے حادثات سے ٹوٹ کر بکھر جائے! مجھے جلدی لوٹنا بھی ہے۔ یہ لو کاغذ......'' فرید نے موزے میں سے کاغذ نکالا۔

''باقی تم پورا کر دینا، بہروز کل تم سے مصدق سڑک کے چوراہے کے کنارے ٹیلیفون بوتھ پر ملے گا...... طے یہی ہوا ہے کہ اس کے نکلتے اور تمہارے اندر گھستے وقت کے اس لمحہ میں یہ کاغذ اس تک پہنچ جائے۔'' فرید نے چائے کا فنجان رکھتے ہوئے کہا۔ چلتے وقت وہ بولا۔ ''اب شاید میں لمبے عرصے تک نہیں آپاؤں گا، تمہیں پیسوں کی تو ضرورت...... معاف کرنا...... آج ہماری خود کی ذاتی پریشانیاں ہم سب کی اپنی ہو گئی ہیں۔''

''ابھی کچھ روپے ہیں، پارٹی سے ملے روپے سے کرایہ ادا ہو گیا۔'' پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولی۔ ''وہ بیش قیمت آئل پینٹنگ، جو کبھی لوگ ہزاروں تومان میں خریدنا چاہتے تھے، تب میں نے نہیں دی تھی۔ اب جب بیچنا چاہا تو کوئی خریدار نہیں ملا اور اب وہ پاسدار اُٹھا لے گئے، کمیٹی کے کسی کوڑے دان میں پڑی ہوگی...... یہ تین سال تین زمانوں جیسے بیت رہے ہیں۔'' طیبہ نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

''طیبہ خانم، انقلابی کبھی تھکتا نہیں ہے۔ آرام اس کی ڈکشنری میں نہیں ہے، اس کے سامنے اس کا مستقبل نہیں ہے، بلکہ آنے والی نسل کا ہے...... مجھے دیکھو، میری دونوں بہنیں کہاں ہیں، مجھے علم نہیں ہے۔ قبرستان میں سو رہی ہیں یا جیل میں سڑ رہی ہیں؟ ان سوالوں کی کوئی اہمیت نہیں رہ گئی ہے۔ جب گھر گھر کی کہانی ایک ہو جائے تب ہر رشتہ ایک محبت کی کڑی میں بندھ جاتا ہے۔'' فرید بولا۔

''اسی کو عرفان کہتے ہیں، کیوں!'' کہہ کر ہنس پڑی طیبہ۔

''ہنسی تو تم! ہمیں سکھ دیتی تھی۔ اب خود کمزور بن رہی ہو۔'' فرید اُٹھتا ہوا بولا۔

''سیما سے ملاقات ہوئی؟'' طیبہ نے فرید سے پوچھا۔
''اس نے اور امجد نے شادی کر لی ہے۔'' فرید بولا۔
''کب؟'' طیبہ نے سوال کیا۔
''تقریباً پانچ مہینے پہلے، سیما حاملہ ہے ان کا خیال ہے کہ ایسے وقت میں انسانوں کی زیادہ ضرورت ہے اور دوسری ان کی دلیل اپنی شادی کے بارے میں یہ ہے کہ کبھی کبھی تعلق کسی تخلیق کے لیے بھی بنانا پڑتا ہے۔ اس کی مدد اس انقلاب میں ایک نئی زندگی، نئے جنگجو کا ہی سہی۔''
''سیما بھی خوب نکلی! کیسی مخالفت ہماری کرتی تھی پہلے، پوری طرح سے اسلامی، اسلامی حکومت کی مرید اور اب......'' طیبہ کو یاد آیا کہ اس کے دوست شہریار کی بہن سیما اس کی شہادت پر کتنا غصہ ہوئی تھی، اشتراکیوں کو کتنا بُرا بھلا کہا تھا! ان کے خلاف پروپیگنڈہ کیا تھا، کچھ وقت تک وہ حزب اللہی بھی بن گئی تھی، لیکن آج وہ اس چھوٹے سے سفر سے لوٹ کر ایک اشتراکی کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ بالکل پاگل ہے سیما!
فرید کے جانے کے بعد وہ کمرے میں لوٹی۔ مڑے ہوئے کاغذ کو کھول کر پڑھنے لگی، پڑھ کر وہ خیالات میں ڈوب گئی، پھر اسے پھاڑ کر اس نے غسل خانے میں جا کر فلش کیا اور خود قلم سنبھال کر بیٹھ گئی۔

سوسن کا دوسرا شوہر عباس ایک مذہبی خیالات کا آدمی تھا، لیکن سخت گیر نہیں۔
وزارت میں وہ جس عہدے پر تھا وہاں سے ہٹا کر اسے اسلامی کورٹ میں جج بنا دیا گیا

تھا۔ اس کے کاندھوں پر بہت بڑی ذمہ داری تھی جس کو وہ بہت اچھی طرح سے نبھا رہا تھا۔ سوسن کو کچھ واقعات کا علم ہو جاتا اور کچھ کا نہیں، لیکن جو ہو رہا تھا، اس کو یقین تھا کہ برائی زمین سے ہٹائی جا رہی تھی۔ کئی روز سے ایک حسین عورت اپنی ماں اور تین سال کی بیٹی کے ساتھ اس کے یہاں جج صاحب سے ملنے کے بہانے سے آجاتی تھی۔ پہلے تو وہ ان کی تواضع کرتی، ان کا غم سنتی، لیکن جب یہ روز کا چکر ہونے لگا تو اس کی گھریلو زندگی اس سے متاثر ہونے لگی۔ کام پڑا رہ جاتا۔ کھانا وقت پر حاضر نہ کر پاتی۔ شوہر بولتے تو کچھ نہیں، مگر وہ شرم سے گڑ جاتی۔ جب وہ آتیں تو وہ چائے وغیرہ دے کر اپنے کام میں مشغول ہو جاتی، مگر اسے لگتا کہ وہ کورٹ میں بھی تو جا کر مل سکتی ہیں، پھر یہاں گھر پر رات کو ملنے کیوں آتی ہیں؟ وہ منع بھی کیا کہہ کر کرے؟ لڑکی کا شوہر جیل میں ہے، اس پر مختلف الزامات ہیں۔ عجیب مشکلات آگئی ہیں لوگوں پر۔

ایک روز سوسن کے شوہر نے خود ہی منع کیا کہ وہ ان محترمہ کو پھر گھر میں گھسنے نہ دے۔ اسی شام کو وہ کسی دوست کے یہاں چلے گئے۔ وہ بھی جج تھے۔ ان کے گھر جا کر سوسن کو چکر سا آ گیا۔ جج، جو نشہ کرنے والوں کو پھانسی اور کوڑے کی سزا دیتا ہو، وہ اپنے گھر میں آرام سے تریاق کھینچ رہا تھا اور شراب پی رہا تھا۔ ہنس کر کہنے لگا۔ ''ہم تو ٹھہرے نوکری پیشہ لوگ، ہمارا کام ہے حکومتی نظام کو مضبوط کرنا۔ وہ کہتی ہے، شراب حرام ہے، ہم کہتے ہیں بالکل حرام ہے، مگر دل میں کہتے ہیں، تم پر حلال ہے اور پیتے ہیں۔ حکومت کہتی ہے پھانسی پر چڑھا دو تریاق پینے والوں کو، ہم کاغذ پر دستخط کر دیتے ہیں، ہمارا گناہ کیا ہے؟''

گھر لوٹ کر سوسن نے شوہر سے پوچھا۔ ''آپ کے کورٹ میں کیا ایسے اختلافات اور بھی ہیں؟''

''تمہارا مطلب وجاہت سے ہے؟'' شوہر نے تکیے پر سر رکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے بڑا عجیب سا لگا سب کچھ، کیا سچ ہے؟' سوسن نے چہرے پر کریم لگاتے ہوئے کہا۔

''سچ اور قانون عام انسان کے لیے ہوتا ہے، ورنہ باقی سب......''

''پھر آپ؟''

''میں اس عہدے پر زیادہ دن تک ٹک نہیں پاؤں گا۔ مجھے خود اندر ہی اندر بہت گھٹن کا احساس ہوتا ہے۔ لیکن اس جگہ سے واپس لوٹنا میری جان کے لیے خطرہ بن سکتا ہے۔''

''لیکن کیوں؟'' سوسن نے تڑپ کر پوچھا۔

''میں سارے راز سے واقف جو ہوں......

''خدا کے لیے مجھے اپنا دکھ بتائیں۔ ہوسکتا ہے، میں آپ کی کچھ مدد کرسکوں...... مدد نہ کر پائی تو کم سے کم آپ کا بوجھ تو بانٹ لوں گی؟''

''اگر مجھے غلط نہ سمجھو تو میں تم سے کچھ کہوں۔''

''آپ کی کوئی بات میں غلط کیسے سمجھوں گی! میری زندگی کو دوبارہ سنوارنے والے آپ ہی تو ہیں۔ ورنہ آج میں صرف ایک ملعون، ترک، طلاق شدہ عورت ہوتی۔'' سوسن کی آنکھیں اشکبار ہوگئیں۔

''یوں کہہ کر مجھے شرمندہ نہ کرو، ہیرے کی پہچان جوہری کو ہی ہوتی ہے۔ تمہاری قدر اگر کسی بدقسمت نے نہیں کی تو وہ بدنصیب تھا، نہ کہ تم۔ یوں میرا احسان جتا کر مجھے چھوٹا مت کرو۔ میں خوش نصیب ہوں جو تم جیسی معصوم عورت اور محبت کرنے والی بیوی کا شوہر بنا۔''

سوسن نے اپنا سر شوہر کے سینے پر رکھ دیا اور جذباتی ہوکر سسکیاں بھرنے لگی۔

''پگلی ہو! خدا مجھ سے سارا جہاں بھی مانگے تو میں خوشی خوشی دے دوں، لیکن تمہیں کسی قیمت پر اپنے سے جدا نہیں کرسکتا۔ جس جگہ سچ اور جھوٹ اتنا خلط ملط ہوگیا ہو وہاں پرخلوص کا مل جانا بہت بڑا حاصل ہے۔ وہ میں نے پایا ہے۔ اب اس کا دوسرا رخ سنو کہ جھوٹ کی مکمل حصولیابی کیا ہوتی ہے۔ جو لڑکی روز آتی تھی وہ مناسب کردار کی نہ تھی۔ اسے میں نے بعد میں جانا، ساتھ ہی یہ بھی جانا کہ تم کتنا بڑا سچ ہو اور سچ ہمیشہ معصوم ہوتا ہے۔ اس عورت یا لڑکی کا شوہر جیل میں ہے۔ اس کا مقدمہ میرے پاس تھا۔ اس کی درخواست سن کر جب میں فیصلے سے نہیں ہلا تو اس نے وہ تمام حربے

استعمال کیے جو کسی بھی مرد کی شہوت کو مشتعل کر سکتے ہیں۔ میرا اِنکار، اس کا غصہ، اس کا انتقام سب مجھ پر سے گزر گیا۔ اب اس کا مقدمہ میرے دوست وجاہت، جن کے یہاں ہم شام کو گئے تھے، کے پاس ٹرانسفر ہو گیا ہے، یا پھر یہ کہہ لو میں نے خود خاموشی اختیار کر لی تھی۔ وہ مقدمہ جیتے گی۔ اس کا شوہر تمام الزامات سے بری ہونے کے بعد، ایک بے قصور کی شکل میں رہا ہوگا۔ مجھے اس کی فکر نہیں ہے کہ وہ کیوں چھوٹ رہا ہے۔ وہ قصوروار ہے، اسے پھانسی ملنی چاہیے۔ میرے دماغ میں اس طرح کا کوئی اشتعال نہیں ہے۔ بلکہ ایک بنیادی سوال بار بار اُٹھتا ہے کہ کیا وہ جوان عورت، جو ایک تین سال کی لڑکی کی ماں بھی ہے، صرف شوہر کی محبت میں اپنا سب کچھ لٹانے کو تیار ہو گئی یا پھر اس کے پیچھے کوئی اور بات ہے؟ تن اور من تو عاشق یا شوہر کے علاوہ عورت کسی دُوسرے کو......؟ تم خود سوچو۔ میں تو کبھی کبھی یہ تمام باتیں دیکھ کر چکرا جاتا ہوں۔ کل جب وہ مرد جیل سے باہر آئے گا تو کیا یہ جوان عورت بتائے گی کہ اس کی آزادی کی قیمت اس نے کیا دے کر چکائی ہے؟ مان لو، سوسن، اس نے بتا بھی دیا تو کیا وہ مرد اس قربانی کو قبول کر پائے گا؟ اگر کیا بھی تو کب تک کے لیے؟ سچ پوچھو تو یہ جوان عورت ہی میری مصیبت بنے گی۔"

"وہ کیسے؟"

"مجھے میری ایمانداری کا جواب جلد ہی ملے گا۔ جس حمام خانے میں سب ننگے ہوں وہاں پر ایک کپڑوں سے اپنا بدن چھپائے تو......؟ یہ تمام لوگ، جو کل شاہی حکومت کی رونق کو بڑھا رہے تھے، وہی آج اس اسلامی حکومت میں ہیں۔ فرق کہاں سے آئے گا؟ سوٹ اُتار کر داڑھی بڑھا لینے سے نظام کی باہری شکل ضرور بدل سکتی ہے مگر اس کے تانے بانے تو وہی پرانے سوت کے ہیں۔ ہم جیسے لوگ نہ اس نظام میں سکھی تھے، نہ اب ہیں۔ میں نے بہت بڑی بھول کی جو اپنی مذہبی عقیدت میں آ کر اسلامی کورٹ کا جج بن گیا، اب نکلنے کا دروازہ میرے لیے بند ہے، خدا مجھ پر رحم کرے......"

سوسن شوہر کی پریشانی کو سن کر کانپ اٹھی۔ رات کو شوہر کے سو جانے کے بعد

وہ دُوسرے کمرے میں جا کر جانماز بچھا کر خدا کی بارگاہ میں اپنے شوہر کے لیے دُعائیں مانگتی رہی۔

ایک ہفتے کے بعد سوسن کے شوہر عباس آغا کو کئی الزامات کے ساتھ اس جج کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ تمام اخبارات ان کی تصویروں اور ان کی جھوٹی دھاندلیوں سے بھر گئے۔ سوسن کلیجہ تھام کر رہ گئی۔ ''ایسے الزامات پر تو حکومت پھانسی......نہیں! خدا کے لیے نہیں!''

شام کو گھر لوگوں سے بھر گیا۔ طے ہوا کہ وہ شہر چھوڑ کر، کسی دُوسرے شہر میں جا کر، معمولی زندگی گزاریں، چونکہ کوئی ثبوت نہیں ہے. صرف زبانی بات ہے، اس لیے مقدمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ مناسب وقت بھی نہیں ہے کہ اپنے اوپر لگے داغ کو دھونے کی کوشش کی جائے۔ یہی کیا کم ہے کہ جان بچ گئی۔

سب کو معلوم تھا کہ یہ جھوٹ ہے، لیکن کوئی زبان نہیں کھول سکتا تھا۔ سوسن کو ایسا لگا کہ جس پر اعتماد تھا اس نے ٹھگا اور اسے چھوڑ دیا۔ دنیا نے خود اسے قصوروار ٹھہرایا تھا۔ آج جس پر اعتماد ہے اسے بھی دنیا والے برا سمجھ رہے ہیں۔ جھوٹ کو سچ بنا رہے ہیں۔ رات کی ٹرین سے انہیں نامعلوم سمت کی طرف خاموشی سے نکلنا تھا۔ چلتی ٹرین میں آمنے سامنے بیٹھے دونوں میاں بیوی باہر پھیلی ہوئی تاریکی میں کچھ ڈھونڈ رہے تھے۔ سوسن کی آنکھیں نم تھیں۔ وہ سوچ رہی تھی، 'ان کچھ برسوں میں زندگی کی ندی نے کتنے موڑ لیے ہیں! اسے خواہش اور خیالات کے برخلاف جینا پڑا، سب کچھ سہنا پڑا۔ یہ تیسرا پڑاؤ خدا مجھ سے مت چھیننا۔ اب میں انہیں کے قدموں پر مرنا چاہتی ہوں۔ انہیں کے قریب، انہیں کی بانہوں میں۔

''کیا ہوا، سوسن؟'' شوہر نے پوچھا۔

''اب ہم ایسی جگہ چل کر رہیں گے، جہاں ہم ہوں، صرف ہم، ہماری زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے والی کوئی اور طاقت نہ ہو۔ میں تھک چکی ہوں۔'' یہ کہہ کر سوسن

شوہر سے لپٹ گئی۔
"یہ کیسے ممکن ہے اِس دُنیا میں؟ بدلاؤ ہی تو حرکت ہے۔ ہم تو اس خدا کے بندے ہیں۔ جیسے چاہے امتحان لے۔ جیسے چاہے ہمیں خوشی وغم دے۔ ہمیں تو اس کے آگے سجدہ کرنا ہے۔"

پری نے جب دامن پھیلا کر زندگی سے کچھ مانگا تھا تب زندگی نے اسے صرف کانٹے دیے تھے، مگر اب، جب اس نے مانگنے کی جگہ دامن سمیٹ لیا تھا تب زندگی نے اسے پھول ہی پھول دیے۔ صبح کا بھٹکا اگر شام کو گھر آجائے تو اسے بھٹکا نہیں کہتے۔ یہی حال خالد کا تھا۔ گھر کیا لوٹا، گھر کا ہی بن کر رہ گیا تھا۔ پری کو اس کی کھوئی ہوئی جنت مل گئی تھی۔ اس وقت بھی وہ دونوں آمنے سامنے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ ویڈیو پر ایک امریکن فلم چل رہی تھی۔ خالد کے ہاتھ میں گھر کی بنی شراب کا گلاس تھا۔ کھانا ختم کر کے وہ اس کے گھونٹ بھر رہا تھا۔ پری آہستہ آہستہ لقمے منہ میں ڈال رہی تھی۔ اس کا پورا دھیان فلم کی طرف تھا۔ تبھی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ خالد اٹھا اور دیوار کے قریب لگی میز پر سے رسیور اٹھایا۔ "ہیلو۔"

"سنو خالد! میں پرویز بول رہا ہوں۔ تمہارا سارا انتظام ہو گیا ہے۔ خدا حافظ!"

فون رکھ کر خالد نے لمبی سانس کھینچی اور صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ فلم کے ختم ہونے پر اس نے پری کے دونوں ہاتھوں کو محبت سے تھپ تھپایا، پھر کہا۔ "سنو، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔ دو مہینے سے میں یہ بات دل میں ہی دبائے جی رہا تھا۔ بات کچھ ایسی ہے کہ جب تک مجھے یقین نہیں ہو جاتا، میں کہہ نہیں سکتا تھا۔ حالات تو تم دیکھ ہی رہی ہو، تجارت کب کی ٹھپ ہو چکی ہے۔ جمع پونجی ہم کھا رہے ہیں۔ پیسے کی مجھے فکر نہیں ہے، کیونکہ جو کچھ میری دولت ہے، وہ غیر ملکی بینکوں میں ہے۔ میری فکر دوسری ہے، ایران سے خاموشی کے ساتھ پُر امن طریقہ سے نکل جانا۔"

"کیوں؟" پری نے حیرت سے پوچھا۔

''وقت ہمارے لیے سازگار نہیں ہے۔''
''کچھ دن پہلے تو تم خوش تھے پھر اب......؟''
''کچھ دن پہلے کی بات اور تھی، پری...... تب ہم نے سوچا تھا کہ ہم جیسی چھوٹی صنعتوں والے کاروباری غیر ملکی بازار کے ٹوٹنے سے پنپیں گے اور اسی اُمید میں ہم نے جی بھر کر شاہ کی مخالفت کی تھی، لیکن آج نہ کچا مال ہے، نہ بجلی، نہ صارف اور نہ پیداوار...... شکر ہے کہ ساواک کی فہرست میں میرا نام نہیں تھا، لیکن اب بچنا مشکل سا لگتا ہے۔''
''لیکن کیوں؟ تمہارا قصور کیا ہے؟'' پری نے خوفزدہ ہوکر پوچھا۔
''میرا قصور ہے مال دار ہونا۔ جانتی تو ہو، نصف سے زیادہ روپیہ تو حکومت نے چھین لیا۔ ہماری دو کوٹھیاں اور تین باغ پہلے ہی چھین لیے گئے۔''
''افسوس کیوں کر رہے ہو؟ گیا، اسے جانے دو۔ تمہاری جان کا صدقہ گیا۔ خدا کے فضل سے اب بھی بہت ہے، اور آگے بھی خدا نے چاہا تو پھر کما لیں گے۔'' پری نے دلاسا دیتے ہوئے کہا۔
''مجھے یہ افسوس نہیں کہ میری جائداد جا رہی ہے، بلکہ افسوس اس بات کا ہے کہ جنہوں نے اسے لیا ہے، وہ غریبوں کے نام کی جگہ اپنے نام کرا رہے ہیں۔ دوسرا ڈر جو مجھے ستا رہا ہے، وہ ہے جان مفت میں گنوانے کا۔ میں اپنی جان ان مولویوں اور مجاہدین کی آپسی جنگ میں نچھاور نہیں کرنا چاہتا۔ میں جینا چاہتا ہوں۔ اس لیے اس جینے کی قیمت صرف پچاس ہزار فی آدمی ہے۔ میں لگ بھگ ڈیڑھ لاکھ تومان میں ایران کی سرحد کے پار جا سکتا ہوں۔''
''ایران کی سرحد کے پار......! مگر کہاں؟'' پری نے خوف سے پوچھا۔
''معلوم نہیں!'' خالد نے سر پکڑ لیا۔
''ویزا تو پہلے بھی نہیں دیا جاتا تھا...... اب تو باہر جانا خواب بن گیا ہے۔ کہاں تو ہر سال گھومنے جاتے تھے۔'' پری نے ٹھنڈی سانس بھری۔
''دیکھو! ابھی ہم رشوت دے کر، خاموشی سے بلوچستان کی طرف سے پاکستان

ہوتے ہوئے کہیں بھی چلے جائیں گے۔ سب قیمتی سامان کہیں چھپا دیں گے......، لیکن کہاں؟''

''کل ہی تو ماجو آقا کے گھر میں رات کے دو بجے پاسدار آئے تھے۔ تمام زیور اور قیمتی سامان یہ کہہ کر لے گئے کہ ان کے پاس کمیٹی کا اجازت نامہ ہے۔ ساری پونجی چلی گئی ہے۔ اس کے بعد وہ اپنی جوان بیٹی ریشما کے لیے ڈر رہے ہیں کہ کہیں دُوسرے گھروں کی طرح ان کے یہاں آکر لڑکی پر الزام لگا کر پوچھ تاچھ کے بہانے کمیٹی میں نہ لے جائیں۔''

''میرا خیال ہے، جو فروخت ہو سکتا ہے اسے فروخت کر دیتے ہیں، چھوٹی موٹی چیزیں ساتھ لیے چلتے ہیں۔''

''کون خریدے گا؟ سب ہماری طرح فروخت کرنے والے ہی نکلیں گے۔''

''ایسا نہیں ہے۔ کچھ اس حکومت کی بدولت بن گئے ہیں، وہ خریدیں گے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ان کا پتہ کیسے چلے؟'' خالد کمرے میں ٹہلنے لگا۔

''گھر بند کر کے چلتے ہیں، سامان ایک کمرے میں سیل کر دیں گے۔ لیکن کون سا سامان؟ پورا گھر سامان سے بھرا ہے۔ دس کمروں کا سامان ایک کمرے میں بھلا کیسے آپائے گا!''

پری پریشان ہو اُٹھی۔ فون کی گھنٹی بجی۔ خالد نے فون اٹھایا۔ ''ہیلو۔''

''میں پرویز ہوں۔''

''ہاں، کہو۔''

''بات طے سمجھوں۔''

''صد فیصد طے سمجھو!'' خالد نے کہا اور فون رکھ دیا۔ فون پر زیادہ بات نہیں ہو سکتی تھی۔

''بچوں کو پہلے بھیج کر ہم نے عجیب سمجھداری کا ثبوت دیا ہے۔'' خالد نے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔

''تب مجھے بہت بُرا لگا تھا، لیکن آج کی پریشانی کو دیکھتے ہوئے محسوس ہو رہا ہے،

اچھا...... بہت ہی اچھا ہوا۔ بچے لاکھ ہم سے دُور سہی، لیکن ان خطروں سے بچ کر اپنی خالہ کے پاس محفوظ تو ہیں۔''

''یہاں پر عراق سے جنگ ہے، خانہ جنگی ہے، جاسوسی ہے، سمجھ نہیں پاتا ہوں کبھی کبھی یہ ساری لعنتیں اچانک ہم پر ٹوٹیں کیسے! یہ مت سمجھنا کہ ان کے بعد مجاہدین آئیں گے تو سب کچھ بدل جائے گا۔ اس سے بھی بُرا ہوگا ایران کا حال، یہی مجاہدین تھے جن سے عوام متاثر تھی۔ آج عوام انہیں گالیاں دیتی ہے، اس کے بعد ......''

''حکومت کے مخالفین کی تعریف کب ہوتی ہے، خالد؟ مجاہدین کی باتیں میرے دل کو چھوتی ہیں، اسی طرح جیسے مارکسیوں کی، میں سیاسی داؤں پیچ نہیں سمجھتی، مگر......''

''تم پر طیبہ کے اثرات ہیں۔ مجاہدین سے بُرے مارکسی ہیں۔ وہ ایران کو ایرانستان بنانا چاہتے ہیں، روس کا ایک حصہ۔ تب جوتیوں میں دال بٹے گی۔ ہمارا ایران ویران ہو رہا ہے۔ میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اس ملک کو اگر کوئی بچا سکتا ہے تو وہ ہے۔ مونارکی، شاہ کا بیٹا لوٹے گا کل اور......''

''کیا تو ے ہزار لوگوں کا خون اس دن کے لیے بہا تھا؟'' پری نے حیرت سے پوچھا۔

''ہرگز نہیں مگر یہ افسوسناک ہے کہ ہمارا انقلاب پٹری سے اتر گیا ہے۔ مصدق کا زمانہ بھی ایسا ہی تھا۔ شاہ فرار ہو گئے تھے۔ لیکن کچھ عرصہ بعد پھر وہی لوٹے۔ اب لگتا ہے، انسان کی پرانی پہچان اس کا پیچھا نہیں چھوڑتی۔ آخر کورش بزرگ ایران کے پہلے شہنشاہ سے آج پہلوی زمانے تک ایران میں شہنشاہیت رہی ہے۔ بُرا کیا ہے، اگر انگلستان والا نظام ہمارے یہاں بھی ہو...... نئے پرانے کا میل...... خیر، تم یہ باتیں نہیں سمجھوگی۔''

''شاید جو تم کہنا چاہتے ہو وہ میں نہیں سمجھوں گی، لیکن میرا خیال ہے کہ نہ شاہ اچھے تھے اور نہ موجودہ حکومت، تمہارے خیال سے مجاہدین اور مارکسی بھی بُرے ہیں، تب تو سارا ایران بُرا ہوا۔ بہتر ہے کہ ایران ویران ہو جائے۔ جب ایرانیوں کی کمر کی ہڈی ہی ٹوٹی ہوئی ہے تو افسوس کس بات کا! خیر چھوڑو۔ وقت ہی اس مسئلہ کو حل کرے

گا۔ یہ بتاؤ، اب کرنا کیا ہے؟"

"جان بچانی ہے تو سامان کا لالچ چھوڑنا پڑے گا۔ زیورات اور نقدی لے چلتے ہیں۔ نقدی میں غیر ملکی کرنسی ہے۔ بینک کا روپیہ بچوں کے نام کرنا پڑے گا، تاکہ ہر ماہ ان تک پہنچتا رہے۔ اس کے لیے میں نے بات کر لی ہے۔ یہ سارا کام لگ بھگ پانچ لاکھ میں ختم ہوگا۔ ایک لاکھ تو صرف وکیل لے رہا ہے۔ میری قسمت ہے جو اتنے سستے میں کام ہو رہا ہے۔ وحید کا کام جانے کیوں اٹک گیا ہے!"

"تم چائے لو گے؟"

"شراب اور چائے......؟ تم لو۔"

"جانا کب تک ہے؟"

"ہفتے بھر تک پتہ چل جائے گا۔"

"ٹھیک ہے۔"

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ کہنے کو کچھ بچا نہ تھا۔ پری خاموشی سے چائے کے گھونٹ بھر رہی تھی۔ خالد دُوسرے کمرے میں چلا گیا تھا۔ پری کو اس کے بدلے ہوئے خیالات جان کر تعجب ہو رہا تھا۔ کل تک وہ شاہ مخالف تھا۔ امریکہ اور روس کو بُرا بھلا کہتا تھا، اور اب وہ حال سے بھی ناخوش تھا۔

تمہارے رنگ میں رنگ کر دُوسرے رنگ کو پہچاننے سے نگاہوں نے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت اپنے ہی حسن و لطافت پر فریفتہ ہو اُٹھی تھی۔ تب معلوم نہ تھا کہ یہ رنگ کچا ہے، جب حقیقت کی دھوپ میں تپے گا تو لاتعداد دھبے بدنما داغ کی شکل میں میرے وجود کو بدصورت بنا دیں گے۔

مہناز اکثر ایسے خیالات میں الجھی رہتی تھی۔ جب کبھی وہ خالی وقت میں کرسی ڈال کر دھوپ میں بیٹھتی تو اسے ماضی اپنے خوابوں کی دنیا میں کھینچ لے جاتا تھا۔ اس وقت بھی ڈاک سے آئی اسلم عطاپوری کی کتاب اس کے سامنے رکھی تھی، جو پری نے اس

کے کہنے پر بھیجی تھی۔ نیا مجموعہ، نئی نظمیں، ہر نظم کا تجزیہ وہ پہلے کی طرح ٹھیک اسلم کے خیال کے مطابق نہیں کر پائے گی۔ ان نظموں میں جو خاموش بیوفائی کا شکوہ ہے، وہ اسے بالکل مصنوعی لگتا ہے۔ بیوفائی تو تب ہوتی، جب وقت وفا کرتا۔ وقت ٹھہرا نہیں، چلتا رہا۔ اس وقت کس بنا پر رُکتی اور وقت کو گزر جانے دیتی۔ اسلم کا پختہ یقین وقت کے بہاؤ اور اس کے حادثات کو متاثر نہیں کر سکا۔ اس کی ایک چھوٹی سی لاپرواہی نے اسے وہ زندگی نہ دی جو اس نے چاہی تھی، اور آج اس کے پاس سب کچھ ہے، لیکن اندر ایک تشنگی ہے۔ کیسی تشنگی؟ کسے پانے کی؟ کوئی بھی تو قول و قرار اُن کے درمیان نہیں ہوا تھا، لیکن ایک خاموش معاہدہ ہوا تھا۔ وہی خاموشی اسے گھن کی طرح کھا رہی تھی۔ اس نے کتاب بند کر دی اور آنکھیں بند کر کے سوچ میں ڈوب گئی......

ہمارا راز، ہماری محبت صرف وہ کمرہ تھا۔ وہ بھی موم کا بنا ہوا۔ بہت پہلے سنی ایک کہانی اسے یاد آ رہی تھی...... کہ کالے کوے کا گھر نمک کا اور مینا کا گھر موم کا تھا۔ بارش میں بھیگ کر نمک پگھل گیا اور کوا بے گھر ہو گیا۔ مینا نے ترس کھا کر اسے اپنے گھر میں جگہ دے دی تھی اور کوے کی جان بچائی تھی۔ بچپن سے مجھے موم سے محبت ہو گئی تھی کہ موم جان بچاتا ہے، پناہ دیتا ہے...... وغیرہ وغیرہ۔ موم مجھے چکنا، رنگ برنگا، سر پر روشنی کا مینار اُٹھائے پگھلتا، دیکھنے میں بہت خوبصورت لگتا تھا۔ محسوس ہوتا کہ اس میں کتنا صبر، کتنی گہرائی ہے۔ پگھلتا بھی ہے جلتا بھی ہے، اس کے بعد بھی اس کا وجود باقی رہ جاتا ہے، دوبارہ جلنے کے لیے۔ شمع کی شکل میں نہ سہی، پگھلے موم کی شکل میں ہی سہی، مگر باقی تو بچتا ہے......

تب سے آج تک...... میں نے اپنے وجود کو پگھلا کر، قطرہ قطرہ ٹپکا کر تمہارے ساتھ ذہنی فضا بنائی تھی۔ آج میرے پاس سب کچھ ہے۔ گھر، بچے، شوہر، بس پرواز کی کمی ہے۔ تم میرے خیالات کے پنکھ بنے اور میں مینا بن کر اس نیلے آسمان پر جب تک چاہتی، پر پھیلائے اڑتی رہتی تھی، پھر اسی موم کے ایک کمرے میں تھک کر آنکھیں بند کر لیتی تھی، لیکن مجھے تب کیا معلوم تھا کہ بارش اور پانی کی رفتار کی شدت جو کرتی ہے اس سے زیادہ شدت آگ میں ہوتی ہے۔ رنگین موم کا وہ کمرہ آگ کی

تپش سے پگھل کر میرے وجود میں ڈھ گیا ہے۔ گرم ملائم موم کو اپنے بدن سے الگ کرتے کرتے میں نے اپنا وجود، اپنا سب کچھ کھو دیا ہے۔ کہیں بغیر موم کے صرف دھاگہ شمع بن کے جلا ہے! میں بس وہی ایک بالشت بھر دھاگہ رہ گئی ہوں اور وہ رنگین موم...... پرواز...... سب کچھ......۔

میں پری کو دل کی کوئی بات نہیں لکھ پاتی ہوں۔ پہلے اس سے کیا چھپاتی تھی، کچھ بھی نہیں، مگر اب لکھوں بھی کیا! الفاظ شخصیت سے چھین کر تو نہیں بنا سکتی۔ میں خود ایک درد بن گئی ہوں۔ پری نے مجھے دیکھا تو بنا کہے مجھے پڑھ جائے گی۔ وہ میری روح کی خاموش زبان کو پڑھنا جانتی ہے۔

باہر گاڑی رکنے کی آواز آئی، پھر ہارن بجا۔ مہناز چونک اٹھی۔ کتاب میز پر رکھی اور آگے بڑھی۔ سلیمان لوٹ آیا تھا۔

"کیا بات ہے؟ کچھ تھکی ہوئی سی لگ رہی ہو، طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"بس یوں ہی اکیلی تھی، ایران کی یاد میں کھو گئی تھی۔" مہناز نے سلیمان کے ہاتھ سے بریف کیس لیتے ہوئے کہا۔

"یہ کتاب کب آئی؟" سلیمان نے پوچھا۔

"آج ہی آئی ہے۔ ویسے پری نے اسے چھ ماہ پہلے پوسٹ کیا تھا اور یہ آج ملی ہے۔" مہناز نے دُوسرے ہاتھ سے کتاب اُٹھاتے ہوئے کہا۔

"جو خبریں بی۔بی۔سی لندن دیتا ہے اور جو اخبار میں چھپتی ہیں ان سے تو دماغ میں ایران کا بہت برا نقشہ اُبھرتا ہے۔ ان حالات میں بھی ڈاک آرہی ہے۔ تعریف کی بات ہے۔" اوورکوٹ کے بٹن کھولتے ہوئے سلیمان نے کہا۔

"یہ تو واقعی تعجب کی بات ہے۔" مہناز نے حامی بھری۔

"میں ذرا کپڑے بدل لوں، پھر تم سے باتیں کروں گا۔"

سلیمان ٹائی ڈھیلی کرتے ہوئے ڈریسنگ روم کی طرف بڑھا۔

"میں چائے بنا کر لاتی ہوں۔" یہ کہہ کر وہ کچن میں گھس گئی۔

جب مہناز چائے کی ٹرے لے کر کچن سے باہر نکلی تو سامنے سے سلیمان

کو آتے دیکھا۔

''ارے مہناز! تمہارے عشق کا شاہکار رو رہا ہے۔ لو مجھ سے سنبھل نہیں رہا ہے۔'' سلیمان نے چھ ماہ کے سیف کو اُٹھائے بڑی بے چینی سے کہا۔

''اُٹھ گئے تم! آؤ ماماں کی گود میں۔'' مہناز نے چائے کی ٹرے میز پر رکھ کر، اپنے بیٹے سے اپنی آغوش کو بھرلیا۔

''مہوش کہاں ہے؟'' سلیمان نے پیالی میں چائے انڈیلتے ہوئے پوچھا۔

''بھول گئے؟ سب بچے نرسری کی طرف سے پکنک پر گئے ہیں۔'' سیف کی نیپی بدلتے ہوئے مہناز بولی۔

''اس کے بغیر گھر اچھا نہیں لگتا ہے، کب تک لوٹے گی؟'' سلیمان نے پوچھا۔

''شام کے چار بجے! یہ سینڈوچ تو لو، تمہیں پسند ہیں۔ کیا بات ہے؟''

''آفس سے ایک میٹنگ میں چلا گیا تھا، وہاں ہائی ٹی تھی۔ پیٹ بھرا ہونے پر بھی میں یہ سینڈوچ کھاؤں گا ضرور، کیونکہ میری بیوی نے اسے میرے لیے بنایا ہے۔ چونکہ وہ بہت جذباتی ہے، اس لیے اس کے تند وتیز جذبات کا گرم مسالہ بھی اس میں ہوگا۔'' سلیمان نے کہا۔

مہناز خاموشی سے بیٹے کو تھپکی دیتی رہی۔ اس کے پورے وجود سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ اندر ہی اندر کسی جذبہ کو لے کر آہستہ آہستہ پینگیں لے رہی ہے۔ جس کی گنگناہٹ اس کے پورے سراپے میں گونج رہی تھی۔

''کتاب کہاں ہے؟ ذرا وہی پڑھی جائے۔ دیکھوں، اسلم نے اس مجموعہ میں کیا کمال دِکھا کر ہماری خوبصورت بیوی کو متاثر کیا ہے!'' سلیمان نے کتاب اُٹھائی۔

''اس مجموعہ کا لہجہ ایک ہے، جذبوں کی منشا ایک ہے، لیکن...... مجھے پوری طرح سے اسلم کا مجموعہ اچھا لگا، لیکن تیکھی تنقید کے ساتھ۔''

''بس، بس، نقاد خانم! مجھے بھی پڑھ کر اپنی رائے دینے کا موقعہ دیں، ورنہ اچھی خاصی میری رائے اسلم کی نظموں کے بارے میں آپ بدل دیں گی۔''

اچانک دروازے کی گھنٹی بجی۔ اُٹھ کر سلیمان نے دروازہ کھولا اور لپک کر مہوش کو

گود میں اُٹھالیا۔ بوسوں کی بوچھار کرتے ہوئے اسے اندر لایا۔
''ممی! میرے گال بابا نے گندے کر دیے۔'' مہوش بوسوں کی بارش سے پریشان ہو اُٹھی تھی۔
مہناز نے اس کو گود میں لیا۔ غسل خانے میں لے جا کر اس کے ہاتھ منھ دھلائے۔ کپڑے تبدیل کیے۔ پھر ناشتہ کرایا۔ چار سال کی مہوش تھکی تھکی لگ رہی تھی۔ اسے بستر پر لٹا کر اس کے ہاتھ میں رنگین تصویروں کی کتاب تھما کر، بچوں کا میوزیکل ریڈیو کھول کر مہناز کچن کی طرف جاتے ہوئے سلیمان سے بولی۔ ''آپ مہوش کو دیکھ لیجیے، میں ذرا کھانے کا انتظام کرلوں۔''
اس کی بات سن کر سلیمان مہوش کے بستر کے پاس رکھی کرسی پر بیٹھ گیا اور اسلم کی نظموں کے مجموعہ کے ورق پلٹنے لگا۔
ایک گھنٹے کے بعد جب مہناز کمرے میں داخل ہوئی تو دیکھا کہ مہوش سو رہی ہے اور سلیمان پینسل سے کتاب میں کچھ نشان لگا رہا ہے۔ وہ آگے بڑھ کر سیف کا دُودھ بنانے لگی۔ اس کے اٹھنے کا وقت ہو رہا تھا۔
''تم نے پورا مجموعہ پڑھ ڈالا؟'' سلیمان نے پوچھا۔
''ہاں، ہے ہی کتنا بڑا!'' مہناز بولی۔
''تم تو جانتی ہو تکنیکی دماغ ادب کو ہضم نہیں کر پاتے ہیں۔ مجھے ابھی تک ادب کا کوئی شوق نہ تھا، مگر تمہارے اتنے دقیق مطالعے نے مجھے بھی متاثر کر دیا ہے۔ اس کتاب میں میں نے ہر نظم پر دو دو جملوں میں ریمارکس دیے ہیں۔ پڑھنا، پھر بتانا، میری سمجھ اور تنقید کتنی برمحل ہے۔''
سلیمان نے کتاب رکھ کر ایک بھرپور انگڑائی لی، پھر بولا۔ ''تمہارے لیے سیف ہی سب کچھ ہو گیا ہے۔ ہم تو جیسے......'' سن کر مہناز ہنس پڑی۔
''ایک منٹ کا موقع اور دو۔ بس کام ختم ہو گیا۔''
''ہم دو منٹ دیتے ہیں، تم آؤ! پوری زندگی میں تمہارا انتظار کر سکتا ہوں۔''
''لو آ گئی...... کتاب لاؤ، ذرا تمہارے ریمارکس دیکھتی ہوں۔'' کہہ کر مہناز نے

پڑھنا شروع کیا۔ پہلی بار اسے لگا کہ سلیمان میں ادب سمجھنے کی بہترین صلاحیت موجود ہے۔ یہ بات اسے اور خود سلیمان کو ابھی تک نہیں معلوم تھی۔ سلیمان ہمیشہ کہتا رہتا تھا کہ اسے ادب سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، گھر میں ناول پڑھنے پر ڈانٹ پڑتی تھی وغیرہ وغیرہ۔

''واہ! غضب کے ریمارکس ہیں۔ میرے خیالات سے ملتے جلتے یا یوں کہہ لو ایک دم وہی۔''

''میرا خیال ہے، وفاداری حالات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ اس نازک مسئلہ کو اسلم نے پوری طرح سے نظر انداز کر دیا ہے۔ جو وفادار ہوگا، وہ آگے نہیں بڑھے گا، میرا...... میرا مطلب انسان کی دماغی دنیا سے ہے، جس کا ارتقا ضروری ہے کیونکہ تبھی جس اپنے تیور کے ساتھ اُبھرتی ہے۔ یہ جذبہ کسی ایک نظم کا ہو سکتا تھا، مگر پورا مجموعہ بے وفائی پر ہے، اس سے لگتا ہے کہ شاعر کا دل و دماغ صرف ماحول سے متاثر ہے، اور دماغ وقت کے ایک خاص سفر پر نکلتا ہے۔'' اچانک سیف رو پڑا۔

''جائیے، آپ کے دُوسرے ادب دوست اپنے خیالات کا اظہار کرنے کے لیے جاگ اُٹھے ہیں۔'' سلیمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میری خواہش ہے۔ سیف ایک بہت اچھا مجسمہ ساز بنے، اس کے بنائے مجسمے اصلی ہونے کا گمان پیدا کریں اور مہوش بہترین افسانہ نگار......''

''بچے خوبصورتی میں تم پر گئے ہیں تو معلوم ہے، دماغی رجحان بھی تمہاری طرح ہی رکھیں گے۔'' سلیمان نے اُٹھ کر مہوش کا کمبل ٹھیک کیا۔

''تم کمرے میں چل کر بیٹھو۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔'' مہناز نے سیف کو تھپکی دیتے ہوئے کہا۔

''ایران میں کئی ملازموں والے گھر میں رہتی تھیں، یہاں میں تمہیں...... خیر، میں خود کھانا لگاتا ہوں۔ بیوی کا ہاتھ بٹانا شوہر کا فرض ہے۔'' کہہ کر سلیمان کمرے سے نکلنے لگا۔

''ٹھہرو! میں ابھی آئی۔'' جلدی سے مہناز بولی۔

دونوں نے کھانا کھایا۔ بستر پر دراز سلیمان کی بانہوں میں پڑی مہناز بار بار اس

کے کہے الفاظ کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ وفاداری زندگی کے حالات کے مطابق بدلتی رہتی ہے۔ یعنی ہر حالت میں وفاداری کا اپنا ایک کردار بنتا ہے!

سلیمان نے لائٹ آف کر دی۔ اس نے آنکھیں بند کرلیں، مگر نیند میں ڈوبتے ہوئے دماغ میں سوال اُٹھ رہا تھا کہ موجودہ حالات میں اس کی وفاداری کے خدو خال کیا ہیں؟

۱۰

خالد سو گیا تھا، لیکن پری کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ ماتھے پر ہاتھ رکھے سوچ رہی تھی۔ اتنے بڑے گھر کا سامان وہ کہاں بند کرے! کتنی چاہت اور ارمان سے اس نے یہ گھر سجایا تھا۔ سچ پوچھا جائے تو اسے گھر پہلی بار نصیب ہوا تھا۔ بچپن باپ، نئی ماں، پرانی ماں، پھر باپ کی نئی پرانی سہیلیوں میں بکھر کر رہ گیا تھا، جہاں سکون اور سلامتی کے نام پر کشیدگی اور غیر محفوظ ہونے کا ہی احساس ملا تھا۔ دراصل شادی کے کچھ دن بعد ہی گھر اس کا ہوتا گیا اور شوہر پرائی عورت کا۔ اس گھر کے ہر کونے سے اس کا نظم جڑا تھا۔ خالد نے کتنی آسانی سے کہہ دیا کہ سامان کا لالچ چھوڑو، جان کی حفاظت کرو، بھلا یوں اتنی آسانی سے میں یہ گھر چھوڑ سکتی ہوں۔ وہ کافی دیر اسی انداز میں بیٹھی رہی، پھر بڑی اداسی سے اٹھی۔ سیف کھول کر سارا زیور نکالا۔ کیسے اسے لے جایا جائے؟

الماری کھول کر ایک خاص قسم کا تھیلا نکالا، جس میں اندر کئی زِپ تھے۔ اس میں

روئی میں لپیٹ کر زیور برابر سے چُن دیے۔ اوپر سے کچھ ریشمی اسکارف رکھ دیے۔ تھیلے کے بیچ میں کچھ زنانی استعمال کی چیزیں رکھیں تا کہ اسے سب ہاتھ نہ لگا سکیں۔

بینک میں روپے رکھنا انہوں نے کافی دنوں سے بند کر دیا تھا۔ جو کچھ بینک بیلنس تھا وہ پہلے کا تھا۔ خالد کے مطابق، وہ نقد روپے رشوت دینے میں کام آجائیں گے۔ اس کے بعد یہ بیش قیمت مجسمے، اینٹک چیزیں، انہیں کہاں سمیٹیں اور کہاں چھپا کر جائیں؟

کیوپڈ کا مجسمہ جب کپڑے میں لپیٹ کر رکھنے لگی تو اسے یاد آیا کہ اس کی شادی کی پہلی سالگرہ تھی۔ کتنے زور و شور سے منائی گئی تھی۔ ناچ گانا، کھانا پینا، تحائف اور میوؤں سے لد گئی تھی۔ یہ یونانی مجسمہ اسے خالد نے دیا تھا۔ یہ سگریٹ کیس پانچ سو سال پرانا، لندن سے خالد ہزاروں پاؤنڈ دے کر لایا تھا۔ کیسے تھے وہ دن۔ صرف امنگوں کے، خوشی اور سکھ کے علاوہ کچھ نہ تھا اور اچانک سب کچھ کیسا گڑبڑا گیا۔ پہلے باہری سکھ تھا لیکن اندرونی دُکھ، آج اندرونی سکھ ہے تو باہری دکھ۔ ایک ساتھ خدا انسان کو سب کچھ نہیں دیتا ہے۔

پوری رات پری چیزں کو سمیٹتی ہوئی پرانی یادوں کو تازہ کرتی رہی تھی۔ صبح کے قریب جب خالد نے اسے دیکھا تو وہ غمگین ہو گیا۔

سامان کے انبار کے درمیان وہ ٹوٹی ہوئی سی بیٹھی تھی۔

''صبح کر لیتیں یا مجھے جگا لیا ہوتا۔ آؤ تھوڑا آرام کر لو، کتنی تھکی ہوئی لگ رہی ہو!''

''ہم لوگ رُک نہیں سکتے کیا؟'' پری نے ناگہاں ایسا سوال کر ڈالا جس کا جواب خالد پہلے ہی دے چکا تھا۔

''رُک سکتے ہیں، مگر کہیں ہمارے بچے والدین سے محروم نہ ہو جائیں۔''

''یہ کیسا انقلاب ہے جو ہم سے ہمارا گھر، ہمارا وطن چھین رہا ہے؟'' پری نے تھکن سے ڈوبے لہجے میں کہا۔

''یہ انقلاب نہیں۔ یہ ایران کی تباہی کی سازش ہے جو پوری ہو رہی ہے...... آہ ایران! تم بہت بدنصیب ہو میرے ملک!'' خالد نے بڑے جذباتی انداز میں یہ الفاظ کہے اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

حفاظت کے مدِّ نظر پبلک بوتھ سے سب کو خدا حافظ کر کے جب پری گھر لوٹی تو پوری طرح سے ٹوٹی ہوئی تھی۔ رات کی تاریکی میں ہی کار میں سامان بھرا تاکہ لوگ انہیں جاتا دیکھ کر سوالات نہ کریں۔ سامان رکھ کر خالد نے پری سے کہا۔ ''میں یہیں کار کے پاس رُک جاتا ہوں، تم ایک بار پھر اپنے گھر سے مل آؤ اور......''

پری ایک ایک کمرے میں گھومتی، دیواروں کو چھو رہی تھی۔ اب اس کے آنسو روکے نہیں رک رہے تھے۔ وہ ہر کمرے سے نکل کر اس کے دروازے پر تالا لگا رہی تھی۔

''کیسا وقت آگیا، اپنے گھر سے چوری چھپے نکلنا پڑ رہا ہے!'' اس نے کالی چادر سے اپنے سراپے کو چھپایا اور باہر نکل کر گھر کا بڑا سا دروازہ بند کر دیا، پھر بند دروازے پر سر رکھ کر پھوٹ پڑی۔ ''کیسا ظلم ہے، خدا!''

خالد کار کا دروازہ کھول کر باہر آیا اور آہستہ سے پری کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''پری جان، ادھر دیکھو، یوں دُکھی مت ہو، آؤ۔'' کہہ کر خالد نے اسے اپنے سینے سے لپٹا لیا۔

''پاگل ہو! ہمیشہ کے لیے تھوڑے ہی جا رہے ہیں، لوٹیں گے...... ایک دن لوٹیں گے......'' اس کا گلا بھی اندر سے اٹھتے سوالات سے رُندھنے لگا۔

خالد سہارا دے کر پری کو لایا اور کار میں بٹھایا۔ ''ہمت سے کام لو، جو وقت شروع ہوتا ہے، ختم بھی ہوتا ہے، مجھے یقین ہے کہ ہم زیادہ خوش و مطمئن یہاں لوٹیں گے...... بس، آنسو پونچھ ڈالو۔'' کہہ کر خالد نے کار اسٹارٹ کی۔

تمام راستے دونوں کے دلوں سے ایک ہی آواز اُٹھتی رہی۔ ''عزیز ملک الوداع...... تبریز اور چنار کے درختوں، خدا حافظ! سڑکو، مکانو، پہاڑو، تم کو ہمارا سلام! پھر ملیں گے۔''

صبح کے قریب پہلے سے طے شدہ جگہ پر وہ پہنچ گئے۔ دونوں بھاری پیکٹ خالد نے مسلح فوجیوں کو دے دیے۔ ان میں سے ایک ان کے ساتھ ہو گیا۔

پری کے دل میں اب دُکھ کی جگہ خوف نے لے لی تھی۔ آگے کیا ہوگا؟ پیچھے بیٹھا مسلح فوجی اس کی پیٹھ میں سنسناہٹ پیدا کر رہا تھا۔ راستہ ناہموار تھا۔ لیکن خالد بڑی ہوشیاری سے کار چلا رہا تھا۔ اس کی جیب میں پڑی پستول سے پری کو کچھ سہارا تھا۔ چیک پوسٹ پر بندوق اُٹھائے فوجی نے کچھ اشارہ کیا، کار آگے نکل گئی۔ کھانے کا کسے ہوش تھا۔ صبح چائے بھی نہیں پی تھی۔ کام خطرناک تھا، پکڑے جانے پر صرف جیل تھی۔ خالد نے پری سے کہا۔ ''تم کچھ پھل کھالو، پیچھے بھی ان کی خاطر داری کرو۔ صبح کے دس بج رہے ہیں۔ ایک گھنٹے اور ہم آبادی سے دُور رہیں گے پھر کہیں کچھ ملے گا۔''

کوئی اور وقت ہوتا تو پری قدرتی مناظر کو دیوانہ وار دیکھتی، مگر اس وقت ان پتھریلے راستوں اور پہاڑیوں کے پیچھے ہونے والے حادثے کے خوف سے سہمی ہوئی تھی۔ خالد پر کیا گزر رہی تھی، اسے کچھ پتہ نہ تھا۔ بس وہ دل ہی دل میں قرآنی آیات پڑھ کر دُعا مانگ رہی تھی کہ خیریت سے وہ نکل جائیں۔

آبائی مکان اور تھوڑی سی جائداد جس کا نہ کوئی محافظ تھا اور نہ سرپرست! سوسن بہت دیر تک اس کھنڈر کو دیکھتی رہی۔ یہ اس کا تیسرا گھر ہے، زندگی کا تیسرا پڑاؤ۔ سمجھوتے کا تیسرا معاہدہ، خوشی اور استقامت ڈھونڈنے کی تیسری کوشش اور تلاش...... آگے پھر...... نہیں...... میرے خدا، یہاں سے مت اکھاڑنا۔ میرے معبود، تونے جیسا وقت ڈالا ہم نے سہا۔ اب امتحان لینا بند کردے۔ بہت ہوگیا...... بہت ہوگیا......

عباس نے چادر سے لپٹے اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور آہستہ سے کہا۔ ''سوسن! نیا گھر مبارک ہو، تمہارے وجود سے ویرانا بھی پھولوں سے آباد ہو جائے گا۔''

سوسن نے سر اُٹھایا اور مسکراتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا ساتھ مجھے کبھی مایوس نہیں کرتا ہے، عباس!''

عباس نے گھر کے دروازے پر لگا پرانا تالا کھولا، پھر سوسن کو اندر لے جا کر بولا۔ ''ابھی بلقیس اور اس کا شوہر عبدل آرہے ہیں۔ ان کی مدد سے ایک کمرہ رہنے کے

قابل بنالو۔ آہستہ آہستہ شہر سے چیزیں ضرورت کے مطابق آتی جائیں گی۔"

سوسن نے ڈرتے ڈرتے ایک کوٹھری نما کمرے کے دروازے پر ہاتھ رکھا اور کھولنے کے لیے دھکا دیا۔ ایک تیز بدبو کا جھونکا اور چمگادڑوں کی پھڑپھڑاہٹ نے اسے گھیر لیا۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹی اور آنگن میں آ کر کھڑی ہوگئی۔ عباس آقا جا چکے تھے۔ عبدل اور بلقیس کی وہ منتظر تھی۔ آنگن میں انار کا ایک پیڑ تھا، جس کی پتیاں جھڑ چکی تھیں۔ اسی کے نیچے جا کر وہ پیڑ کے تنے کی پپڑی ہاتھوں سے اُکھاڑنے لگی۔ پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ آواز آئی۔ "سلام، خانم جان! خوش آمدید! میں بلقیس، عباس آغا کے خاندان کی پروردہ۔"

سوسن نے چونک کر دیکھا۔ سامنے لال گالوں والی ایک سفید، دبلی پتلی، لڑکی نما عورت کھڑی تھی۔ چہرے پر دیہاتی پن اور تجسس لیے ہوئے۔

"اوہ! تم بلقیس خانم ہو۔ آؤ آؤ۔"

"میں جھاڑو اور دوسری چیزیں لے آئی ہوں، بتایئے کہ......"

سچ سچ سوسن کیا بتائے کہ گھر کی صفائی کس کمرے سے شروع کرائے۔ کچھ سوچ کر بولی۔ "پہلے سامنے والا کمرہ صاف کرنا شروع کر دو، میں بھی آتی ہوں تمہاری مدد کے لیے۔"

"سوسن!" عباس نے گھر میں گھستے ہوئے مخاطب کیا۔ "یہ دونوں جب تک صفائی کرتے ہیں، ہم لوگ مرتضیٰ کے گھر چلتے ہیں۔ میرا دوست ہے، بچپن میں ساتھ ساتھ گلی ڈنڈا کھیلے ہیں۔ مجھے علم نہیں تھا، وہ یہیں ہے، آیا بھی تو پورے دس سال کے بعد ہوں۔ والد کے انتقال کے بعد صرف ایک بار دو تین دن کے لیے آیا تھا۔ آؤ...... بہت سی باتیں ہیں...... آہستہ آہستہ سب معلوم ہوں گی...... پہلے چل کر چائے پیتے ہیں...... ہاں، وہ مٹھائی کا ڈبہ کہاں ہے؟ لے لو، مرتضیٰ کے ایک نہیں، اللہ بُری نظر سے بچائے، ماشااللہ پورے آٹھ بچے ہیں۔"

سوسن نے ہاتھ میں پکڑے پرس سے آئینہ نکالا، بال اور چہرہ دیکھا، لپ اسٹک

لگائی، چادر ٹھیک سے سر اور سینے پر لپیٹ کر سامان کے ڈھیر کی طرف بڑھی۔ اس میں سے ایک پھولدار پیکٹ نکالا اور بولی۔ ''چلیے۔''

پڑوس سے آتی رونے کی آواز ملیحہ کو کہیں پر اپنی مٹھی میں لے کر نچوڑ رہی تھی۔ اس کے وجود سے جیسے کوئی اس کی ساری توانائی چوس رہا تھا۔ ایسا بین، ایسا دکھ اس کے سینے میں کب سے گھر آیا تھا۔ کل پڑوس میں دو جوان لڑکوں کی لاشیں آئی تھیں۔ ایک کا سر غائب تھا، دُوسرے کا نیچے کا دھڑ۔ میدان جنگ سے آیا یہ تحفہ ماں باپ کے سینے کو چھلنی کر رہا تھا۔ کل مدفون ہو گئے تھے اور آج پورے محلے میں ان دونوں کی خوبصورت تصویریں بڑے بڑے پوسٹروں پر چھپ کر دُکان کے شیشوں، دروازوں اور دیواروں پر لگائی جا رہی تھیں، اس کے دروازے پر جب کسی نے پوسٹر لگانے چاہے تھے تو کسی نے دُور سے چلّا کر کہا تھا...... ''غدار وطن کے ناپاک مکان پر...... نکالو۔''

''نہیں! اس کے مکان کی ناپاکی کو پاک کرنا ہے۔'' کہہ کر کئی لڑکوں نے ملیحہ کے گھر کے سامنے والی دیوار اور دروازے کو ان پوسٹروں سے بھر دیا۔

ملیحہ آنکھیں بند کیے، کمرے کی دیوار سے ٹیک لگائے پورے منظر کو اپنی نگاہوں کے سامنے زندہ دیکھ رہی تھی، کہ اس کے گھر پر انجانے ہاتھ اور چہرے کیا گل کھلا رہے ہیں! لیکن حق کا ایک لفظ اس کے منہ سے نہیں نکلا، بلکہ دل میں حسین کی تصویر کو وہ دونوں ہاتھوں سے یوں پکڑے تھی جیسے وہ لوگ دندناتے ہوئے اوپر آئیں گے اور اس کے سینے کو چیر کر دل کے ٹکڑے کر دیں گے کہ حسین یہاں کیوں چھپا ہے؟ جیسے جیسے نیچے شور بلند ہو رہا تھا، اس کے ہاتھ سینے پر مضبوطی سے جکڑتے جا رہے تھے۔ پورا جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ پانی میں ڈوب رہی ہے۔ آنکھیں بند ہونے لگی ہیں۔ دم گھٹنے لگا۔ وہ تھوڑا سا ہانپی اور پھر وہیں فرش پر بیہوش ہو کر گر پڑی۔

باہر گلی میں خاموشی چھا گئی تھی، مگر پڑوس سے سسکیوں کی آوازیں اب بھی آرہی تھیں۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ ملیحہ کی پلکیں تھوڑی سی لرزیں۔ بچے اسکول سے آگئے تھے اور وہ دونوں نیچے بند دروازے کے سامنے پریشان کھڑے تھے کہ آخر دروازہ کھل کیوں نہیں رہا ہے، جبکہ روز ماماں کھڑکی سے ہنستا چہرہ نکال کر دُور سے انہیں دیکھتے ہی دروازہ کھول دیتی تھیں۔ لیکن آج...... پھر گھنٹی کے بٹن پر انگلی رکھی ان کو اس بات پر حیرت ہورہی تھی کہ ان کے گھر پر اتنی تصویریں کیوں چسپاں ہیں، جبکہ دُوسرے گھروں اور دُکانوں پر صرف ایک ایک ہے! یہ کون ہے آخر؟

اس بار گھنٹی کی آواز سے ملیحہ کی حس واپس آئی اور اُسے اپنا بدن اکڑا سا لگا۔ ہاتھ کو ہلانا چاہا تو دیکھا، وہ سینے پر کپڑے میں الجھا ہے۔ انگلیاں کھولیں۔ کپڑے سے ہاتھ ہٹایا۔ سینے پر ہلکی سی جلن کا احساس ہوا۔ سامنے گلے کے نیچے کا کپڑا مڑا تڑا ہوا تھا اور ناخنوں کی تیز چبھن اور خراش سے سینے پر جگہ جگہ سے خون چھلک رہا تھا۔ ایک دم سے اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اسے ہوا کیا ہے! تبھی دروازے کی گھنٹی پھر بج اٹھی۔ اس بار دیر تک بجتی رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ مشینی انداز میں دروازے پر گئی اور دروازہ کھولا۔

دروازے کے سامنے دونوں بچے کھڑے تھے۔ ان کی آنکھوں میں آنسو اور چہرے پر گھبراہٹ تھی۔ ماں کو دیکھتے ہی ان کے تھمے آنسو رُخساروں پر بہہ آئے۔ ملیحہ نے بہت مضبوطی سے خود کو سنبھالا اور بچوں کو سینے سے لپٹالیا۔

"کیا ہوا آپ کو ماماں؟"

"کچھ نہیں، بیٹے۔ چکر آگیا تھا۔"

"آپ اپنا خیال نہیں رکھتی ہیں۔"

"باہر ہماری دیوار پر اتنی تصویریں کیوں چسپاں ہیں؟"

بیٹے کے اس سوال میں ہلکا سا غصہ تھا۔ ملیحہ کیا جواب دیتی۔ خاموشی سے بچوں کے لیے کھانے کا سامان لگانے لگی۔ لاوارث دیواریں کسی کی بھی ملکیت ہوجاتی ہیں، یہ بات وہ زبان پر نہیں لاسکتی تھی۔ میز پر کھانا سجا کر وہ باتھ روم میں گئی۔ جی بھر کر منھ دھویا۔ ٹاپ اتار کر سینے کے زخموں کو ڈٹول کر دھویا اور پھر کریم لگائی۔ اچھی طرح سے کنگھی کر کے اس نے غور سے آئینے میں خود کو دیکھا۔ چہرے پر ایک درد اور پریشانی کی گہری تہہ تھی۔ جلد کی چمک جانے کہاں کھو گئی تھی۔ خود کو سنبھال کر وہ باہر نکلی۔ بچوں کے سامنے اسے یوں ٹوٹنا نہیں چاہیے، ان پر کیا اثر پڑے گا۔ لیکن اس کے بس میں رہ ہی کیا گیا ہے؟

دونوں بچے میز کے دونوں طرف بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ''سالن کیسا بنا ہے؟''

''بے حد لذیذ!'' دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ ان کی آنکھوں میں ماں کی مسکراہٹ کا رنگ چھلک آیا تھا۔

پڑوس میں کوئی تعزیت کے لیے آیا تھا۔ رونے کی آوازیں پھر چیخوں میں تبدیل ہوگئی تھیں۔ ملیحہ پریشان ہوگئی، لیکن طاقت کو مجتمع کر مسکرا کر بچوں سے بولی۔ ''کھانا کھا کر باہر چلیں گے...... مجھے کچھ سامان خریدنا ہے، پھر تم لوگوں کو آئس کریم کھلاؤنگی۔''

''واہ، ماماں! مزا آگیا۔ کتنے دن بعد چلیں گے باہر!''

''چلو اب کپڑے بدل لو، بستہ اُٹھا کر رکھو، تب تک میں برتن سمیٹتی ہوں۔'' ملیحہ اتنا کہہ کر صفائی میں لگ گئی۔ پڑوس سے آتی آوازیں کم ہونے کے بجائے اور تیز ہوگئی تھیں۔ بیچ بیچ میں نعرے بھی لگ رہے تھے۔ روس پر لعنت، امریکہ پر لعنت، مجاہدین اور انقلاب کے دشمنوں پر لعنت۔

ملیحہ کے دل میں پھر کچھ غبار اٹھنے لگا۔ موت کے گھر میں تو دُعا اور عبادت ہوتی ہے، تاکہ مرنے والے کی روح کو سکون ملے، مگر یہاں تو دو دن سے صرف کوسنے جیسے نعرے بلند ہو رہے ہیں...... کیا ہو گیا ہے ہم ایرانیوں کو! وہ عزت، وہ جذبات، وہ

خیالات، وہ فلسفہ، وہ عرفانی محبت سب کہاں گم ہو گیا ہے جس کے لیے ایران کی زمین مشہور و معروف تھی! یہ سب کچھ کہاں پر جا کر ختم ہوگا؟ اسی زمیں کی چاہت میں حسین سب کچھ چھوڑ کر ایران آیا تھا، مگر کس لیے؟ صرف دشمنوں کی تلخیوں کی کھیتی بونے؟ دشمنوں کو برا کہتے کہتے ہم خود برے ہوتے جا رہے ہیں۔ کہیں کوسنے کے ماحول میں کوئی گھر آباد ہوا ہے۔ پھر یہ ایران؟

''ماماں، ہم تیار ہیں۔'' بیٹی کی آواز سے ملیحہ چونکی۔ ''بس پانچ منٹ اور......، ملیحہ نے کہا اور گیلے ہاتھوں کو تولیہ سے پونچھا۔ اندر جا کر سینڈل پہنیں۔ الماری سے چادر نکالی۔ سر اور بدن کو چھپا کر، پرس بغل میں دبا کر سیڑھیوں سے اُتری۔ تینوں باہر نکل آئے۔

''کون کہے گا کہ اس ملک میں کچھ بدلا ہے۔ بازاروں میں وہی چمک دمک ہے، لیکن دلوں کے چراغ تو بجھ رہے ہیں۔ دل کی تاریکی کو کون دیکھتا ہے......؟ بچے گا کوئی ان چیزوں کو خریدنے کے لیے؟ سب تو قبر کے اندھیرے میں گم ہو رہے ہیں۔''

''قنادی آ گئی۔'' بیٹی نے ماں کو روکتے ہوئے مٹھائی کی دُکان دِکھائی۔ ملیحہ بیٹی کی اس بات سے چونکی اور سامنے پیسٹری اور آئس کریم کی دُکان میں داخل ہوئی۔ بسکٹ، مٹھائی، چاکلیٹ کا ڈھیر لگا تھا۔ دیواروں سے لگے نمکین پھلوں کے بیچ بڑے بڑے برتنوں میں سجے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ہمیشہ کی طرح شادی کی مٹھائیاں سجی تھیں۔ دونوں بچے اندر جا کر خاموش ہو گئے۔ پوری چمک دمک سے ان کا ننھا منا دل متاثر ہو گیا تھا۔ ملیحہ بچوں کا چہرہ دیکھتے ہی سمجھ گئی کہ وہ چکا چوند سے گھبرا گئے ہیں۔ اسی چمک دمک کی وہ بچپن سے عادی تھی، لیکن وہ اس کے موجودہ شور و شرابہ و شلوغ سے گھبرائی ہے جو آج ایران میں پھیلا نظر آتا ہے۔ وہ آگے بڑھی۔ بسکٹ، مٹھائی خریدتی ہوئی آئس کریم لینے پہنچی۔ بچے آئس کریم کھانے لگے۔ اس کا پیکٹ بندھ رہا تھا۔ پرس کھول کر اس نے پیسے نکالے اور کاؤنٹر پر رکھنے لگی۔ تبھی پیکٹ باندھتی ہوئی ادھیڑ سی عورت کی نظر ملیحہ کے ہاتھوں پر پڑ گئی۔ کہنے لگی۔ ''اب عورتوں کو اپنے ٹوٹے ناخنوں کا بھی ہوش نہ رہا۔ کہاں گیا ایرانی عورت کا جمالیاتی شعور اور حسین لگنے کا وہ احساس؟''

ملیحہ کا چہرہ تو ہین، حیا اور دکھ سے تمتما اُٹھا۔ اس کو پتہ ہی نہ چلا تھا اتنے دنوں سے کہ اس کے ناخنوں اور ہاتھوں کی کیا حالت ہے۔ نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ واقعی کچھ عجیب حالت ہے ہاتھوں کی۔ باقی پیسے اُٹھاتے ہوئے بولی۔ ''ایرانی عورت کی زندگی سے حسن و احساس کب کا چھن گیا ہے۔ جب اندر کی زمین خشک ہو جاتی ہے تو پھولوں کی تمنا کرنا ناانصافی ہے۔''

اس جواب سے ادھیڑ عورت کے ہونٹ لرزے مگر خود کو سنبھال کر وہ بولی۔ ''باغ کو اجڑتا دیکھ کر ہار جانا کہاں کی عقلمندی ہے؟ میں بھی زندگی میں سب کچھ ہار بیٹھی ہوں، لڑکے، لڑکی، شوہر...... لیکن دوسروں کے لیے جی رہی ہوں...... اس پورے ایران کو سرسبز و شاداب دیکھنے کے لیے جی رہی ہوں...... تمہیں بھی جینا چاہیے، ورنہ......'' بات ادھوری رہ گئی۔ پیچھے سے کسی نے آواز دی۔ کاؤنٹر سے وہ ادھیڑ عورت اندر کمرے میں چلی گئی۔ ملیحہ ڈبے اُٹھائے دُکان سے باہر نکلی۔

شام ڈھل گئی تھی۔ چراغ روشن ہو چکے تھے۔ ملیحہ چادر میں بدن لپیٹے اپنی گلی میں داخل ہو رہی تھی، تبھی تسبیح نچاتے ہوئے کسی لڑکے نے فقرہ کسا۔ ''کون سا مبارک موقع ہے جو مٹھائی خریدی گئی ہے؟''

''باپ کا فاتحہ ہوگا۔'' دُوسرے لڑکے نے ایک اور فقرہ کسا۔ دونوں بچوں نے حیرت سے ماں کو دیکھا۔ ان کے چہرے سے خوشی غائب ہوگئی تھی اور اہانت و خوف اپنا زَرد رَنگ ان کے چہروں پر پوت گیا، جو سڑک کی پیلی روشنی میں زیادہ گاڑھا لگ رہا تھا۔ اِدھر اُدھر لڑکے جمع ہونے لگے۔ ملیحہ کے دِل میں پہلی مرتبہ بغاوت کا طوفان اُٹھا۔ دل میں آیا کہ ان سب کو یکا یک منھ توڑ جواب دے۔ کیا اسے بچوں کے ساتھ نکلنے اور کچھ خریدنے کی بھی آزادی نہیں ہے۔ دل کا خوف کہیں غائب ہوگیا اور سوال اُٹھا کہ مذمّت اور ملامت کا جذبہ آخر اس کے دل کو ہر لمحہ کیوں مسلتا رہتا ہے؟ اس نے کیا گناہ کیا ہے؟ اور کون سا گناہ حسین نے کیا ہے؟ اس نے بچوں کے ہاتھ سے پیکٹ لے لیا اور دروازہ کھولنے لگی۔ اس نے آج جواب دینے کی ٹھان لی تھی، حد ہے بدتمیزی کی۔

''جشن منا رہے ہیں ہماری موت کا، مگر نہیں جانتے ہیں کہ ہم ان کی موت کے

منتظر ہیں۔" پیچھے سے آیا یہ طنز درحقیقت چسپاں تصویر کی طرف تھا، لیکن اس کا ذرا بھی اثر ملیحہ پر نہیں ہوا، بلکہ بچوں کو آگے کر اس نے ذرا اونچی آواز سے کہا۔ "دیواریں خراب کر کے کیا ثابت ہوتا ہے! وطن پرستی؟ یہ بھی ملک کی دولت ہے جس کو خراب کیا جارہا ہے۔" اتنا کہہ کر اس نے دروازہ بند کرلیا۔ اُوپر جا کر اس نے ٹی۔وی کھولا۔ سماور روشن کیا، پھر بچوں کو کپڑے بدلنے کے لیے کہہ کر وہ کمرے میں گئی۔ چادر اُتار کر اس نے آئینے میں خود کو دیکھا۔ ماتھے پر شکنیں، آنکھوں کے نیچے کی ملائم سفید جلد سے چھانکتی نیلی نسیں، آنکھوں، کانوں کے پاس کنپٹی پر بیشمار سلوٹیں، تھکا، اداس چہرہ...... بہت دیر تک وہ اپنے چہرے میں پہلے والی ملیحہ کو تلاش کرتی رہی۔ چمکتا سفید چہرہ، یاقوتی لب، بڑی بڑی شربتی آنکھیں، اسی رنگ کے بال...... کتنے زمانے گزر گئے......؟ یا اللہ! دو سال میں اتنی بوڑھی اور تھکی ہوئی لگنے لگی ہوں! کیا باقی بچا ہے مجھ میں؟ گرم آنسوؤں کا اُبلتا ایک سوتا اس کے وجود سے پھوٹتا ہوا اور باہری طعنوں کی ہر روز پڑتی مار...... اندر کا سب کچھ ڈھ گیا ہے، کچھ نہیں بچا ہے۔ نہ اُمنگ نہ خوشی، نہ آرزو نہ امید۔ بچا ہے تو صرف خوف، روح کو نچوڑتا ہوا، رنج و ملال کے کوڑے برساتا ہوا۔ اس نے اپنے بال درست کیے۔ بالوں میں الجھی انگلی دیکھی تو معاً کاؤنٹر پر کھڑی بل بناتی اس ادھیڑ عورت کی شکل آنکھوں میں گھوم گئی۔ غور سے ناخنوں کو دیکھنے لگی ٹیڑھے میڑھے، آڑھے ترچھے۔ اسے کچھ یاد آنے لگا۔

شادی کے بعد حسین نے اس کے ہاتھوں کو دیکھ کر کہا تھا۔ "یہ ناخن تمہارے طبعی ہیں؟"

"تو پھر کیا بناوٹی ہیں؟"

"ہو سکتے ہیں!"

"کیوں؟"

"بیرونی ممالک میں زیادہ تر عورتیں نقلی چیزیں لگاتی ہیں، ناخن بھی۔ تمہارے ناخن بھی...... اُدھر لاؤ ہاتھ...... میں ذرا ٹھیک سے چھو کر دیکھتا ہوں۔" اتنا کہہ کر حسین نے اس کے ایک ایک ناخن کو کھینچ کر دیکھا، پھر بڑے جوش سے بولا۔ "واقعی......

بڑے خوبصورت ہیں تمہارے ہاتھ اور یہ ناخن، اِن کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔'' پھر ایک ایک ناخن پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے بولا۔ ''ہمیشہ انھیں یوں ہی رکھنا۔ کیسے نوکیلے اور خوبصورت ہیں...... جیسے لال پھول کی پتیاں ہوں!''

آج یہ ناخن ٹوٹے، اکھڑے، کسی دوسری عورت کے لگ رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ کس نے ان کا حسن چھین لیا؟

''ماماں! سماور ابل رہا ہے۔'' بیٹی کی آواز سے وہ چونکی۔ کمرے سے نکل کر، اس نے کچن میں جا کر چائے دم دی اور ٹرے میں فنجان سجانے لگی۔ سینی چائے کے چھوٹے چھوٹے گلاسوں سے بج گئی تو اس نے قند دان اٹھایا۔

''ماماں!''

''ہوں۔''

''کچھ نہیں۔''

ملیحہ نے ٹرے لاکر سماور کے پاس رکھی۔ کیک اور مٹھائی کا ڈبہ کھولا اور دونوں بچوں کو بلایا۔ خود باتھ روم میں گئی۔ کافی دیر تک منہ دھوتی رہی، پھر تولیے سے خشک کر کے باہر نکلی۔ بچے کھانے میں مشغول تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے جا کر اس نے کریم اُٹھائی، چہرے پر ملی، خوشبو لگائی۔ ہونٹوں پر لپسٹک لگائی۔ بالوں میں برش کیا پھر منی کیور کا سامان لے کر بچوں کے قریب آ گئی۔ دونوں بچوں نے ماں کو حیرت سے دیکھا۔ منہ کھولا، لیکن کچھ پوچھا نہیں۔ اس نے فنجانوں میں چائے ڈالی۔ بچوں کے آگے بڑھا کر خود گھونٹ بھرا۔

''ماماں!''

''ہوں۔''

''ماماں!''

''ہوں...''

''کچھ بولو تو؟'' ملیحہ نے ناخنوں کو برابر کرتے ہوئے پوچھا۔

''ماماں!''

"ہوں۔"

"ماماں! کیا سچ مچ بابا آرہے ہیں؟"

"کیا......؟"

ملیحہ کو یہ آواز، یہ جملہ اندر تک جھنجھوڑ گیا...... سمجھتے دیر نہیں لگی کہ بچوں نے ایسا سوال کیوں کیا ہے۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں، ہونٹ کانپنے لگے۔ دونوں بچے سہم گئے۔ جیسے ان سے کوئی بہت بڑی غلطی ہو گئی ہو۔ ملیحہ نے بچوں کا منھ تاکا، پھر اچانک بولی۔ "!لیکن، کبھی بھی آ تو سکتے ہیں نا؟"

"ہاں، وہ تو ہے!" لڑکے نے کھلے چہرے سے کہا۔

"رات کو آئیں، ماماں تو مجھے جگانا نہ بھولیے گا۔" لڑکی نے چھوٹی سی گردن ہلاتے اور آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہا۔

ایک جملے نے پورا ماحول بدل دیا تھا۔ عالیہ اور مہران پہلی مرتبہ دل کھول کر ہنس رہے تھے اور تکیہ مار مار کر کھیل رہے تھے۔

ملیحہ نے چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے خود سے پوچھا۔ "اُمید کی خوشی کے ساتھ بھی تو انتظار کیا جا سکتا ہے۔ مجھے اپنی زندگی کا فلسفہ بدلنا ہوگا" چائے کا فنجان رکھ کر اُس نے پھر ناخنوں کے کناروں پر پالش کرنا شروع کر دیا۔

جانے طیبہ کہاں ہوگی! آج ملتی تو ضرور میرا حوصلہ بڑھاتی۔ میرے دل کا سہارا بنتی۔ بیچاری جانے کس کال کوٹھری میں چھپی ہوگی۔ سوسن کو اس کا گھر مل گیا اور پری کو بھی۔ سوسن کا خط کل ہی ملا تھا، جس میں اس نے تحریر کیا تھا، "بار بار زندگی اُجڑ کر بس رہی ہے، شاید یہی میری قسمت میں لکھا ہے، لیکن اس مرتبہ قسمت کو جیتنے نہیں دوں گی، کئی بار شکست تسلیم کی اور سر جھکایا۔ شاید اس کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا، مگر اس جنت کو جو میں نے پائی ہے، کسی قیمت پر نہیں کھوؤں گی...... تمہارے لیے ایک خبر...... اکتوبر تک...... دل میں نئے مہمان کا انتظار ایک ہزار ایک کلیاں کھلاتا ہے۔ رات کو حسین خوابوں کے ساتھ سوتی ہوں، صبح اسے زندگی میں مجسّم پاتی ہوں۔ کچھ کھو کے پانا اسی کو کہتے ہیں! سچ ملیحہ، میں نے بہت کچھ پایا ہے۔ اُن کی بانہوں میں میرے لیے صرف

محبت ہے، صرف محبت...... محبت کے آبشار میں میں شرابور ہوں......"

ملیحہ نے اپنا ہاتھ دیکھا۔ ہتھیلیوں پر کھنچی لکیریں...... اچانک فالگیرن یاد آ گئی۔ اس نے کیا کیا کہا تھا، کیا وہ سب کچھ سچ بتا رہی تھی؟ اس وقت ملیحہ کو سوسن کے خط کا ایک ایک لفظ یاد آ رہا تھا۔ پھر اُسے ایک دم سے پری کا خیال آیا، وہ کہاں ہو گی، کوئی خبر نہیں۔ کوئی فون نہیں۔ وہ فون کرے لیکن کہاں......؟

وہ سر جھکائے ناخنوں کو خوبصورت شکل دینے میں مشغول رہی۔ دماغ بہت دُور، بہت پیچھے لے جا رہا تھا اور اس کے چہرے کے تاثرات طلوعِ آفتاب کی طرح تاریکی کو چھانٹ رہے تھے۔

حسین کی سالگرہ تھی، وہ کیک اپنے ہاتھوں سے بنا رہی تھی۔ اس دن اس کے گھر والے صبح سے آ گئے تھے۔ گھر میں بہت رونق تھی۔ سب حسین کے آگے پیچھے گھوم رہے تھے۔ دونوں بچے بہت چھوٹے تھے۔ بیٹی ایک سال کی اور بیٹا صرف دو ماہ کا تھا۔ ماں بہت سے تحائف لے کر آئی تھیں۔ کھانے پینے کے علاوہ کپڑے، گہنے اور حسین کے لیے سوٹ اور گھڑی۔ اس کی بیٹی بیرونِ ملک پیدا ہوئی تھی اور بیٹا ایران میں۔ اس کے بعد سے ماں پہلی مرتبہ اس کے گھر آئی تھیں۔ بابا بھی طبیعت کی خرابی کے باوجود آئے تھے۔ شام کو کیک کاٹتے وقت کیا رونق تھی! پورے گھر میں رنگ برنگی شمعیں جل رہی تھیں۔ کیک پر لگی شمع کو حسین نے پھونک مار کر بجھایا تھا، ایک دم سے ساری شمعیں بجھ گئی تھیں۔ ایک لمحہ کے لیے تاریکی چھائی، پھر جھک سے گھر کی ساری لائٹیں جل گئیں۔ یہ انتظام بھی جانے کب اس کے گھر والوں نے کر دیا تھا۔ ایک عجیب اہمیت اور مسرّت کا احساس ہوا تھا۔ روشنی سے بھرے کمرے میں صرف بجھی ہوئی شمع سے اُٹھتا مہین دھواں تھا۔ کیک کھاتے ہوئے اسے لگا کہ خوشی جب ملتی ہے تو دامن اِتنا بھر دیتی ہے کہ دامن سمیٹنا مشکل ہو جائے۔ ماماں اور بابا بھی دل سے حسین سے محبت کرتے ہیں اور میں......

رات کے کھانے پر اس کی سب سہیلیاں آئی ہوئی تھیں۔ سب مل کر حسین کو چھیڑ رہی تھیں۔ حسین صرف ہنس رہا تھا۔ مزاج سے وہ شرمیلا اور کم گو ہے۔ پری نے اس کو

سب سے زیادہ پریشان کیا تھا۔ رات زیادہ گزر گئی تھی۔ وہ سب کو رُخصت کر کے جب حسین کے پاس لوٹی تھی تو وہ آنکھیں...... صرف محبت کا سمندر تھیں، جو اُسے تک رہی تھیں۔ اس رات کی باتیں، حسین کا لمس، سب کچھ جیسے ان کے تعلقات کو زیادہ معنی خیز بنا گیا تھا۔ لیکن کتنا کم وقت رہا وہ دلکش تعلق! حسین آہستہ آہستہ اس سے دُور ہوتا چلا گیا تھا...... پہلے اسے عجیب سا لگا تھا۔ شکایت کی عادت نہ تھی، اس لیے کبھی حسین سے لڑی بھی نہیں۔ یہ تبدیلی تو اس میں اس وقت سے شروع ہوئی تھی جب وہ دوبارہ ایران میں قیام کی غرض سے بیرونِ ملک سے لوٹی تھی۔ حسین ایرانی تاریخ کا ایک باب بننا چاہتا تھا۔ ایسا باب جو عوام کی زندگی میں جذبات اور محبت کے ساتھ سکون اور خوشحالی کی عبارتوں سے پُر ہو۔ اس آگ میں کیسے دھوں دھوں کر کے جل رہے ہیں...... جذبے، محبت سب مفقود ہوتے جا رہے ہیں۔ بس خوف، سنسنی، بغض، نفرت، بدلہ یہی جذبات ہیں جو جھنڈا اُٹھائے ایران کے گلی کوچوں میں پھر رہے ہیں۔ انسان سے زیادہ اہم ہتھیار ہو گئے ہیں۔ ملک کے باشندوں سے زیادہ اقتدار پیارا ہو گیا ہے۔

تیز خطرے کے سائرن نے ملیحہ کو چونکا دیا۔ عراقی حملہ کہیں آس پاس ہوا ہے۔ کہتے ہیں، آبادان سے کوسوں دُور تک سڑے ہوئے گوشت اور خون کی بو بسی رہتی ہے۔ کہاں تک گڑھے کھود کر وہ انہیں گاڑیں! ہائے ری زمین، تمہارا دل کتنا بڑا ہے! بچا ہوا، پھینکا ہوا، دنیا سے ٹھکرایا ہوا، تم ہی اپنی آغوش میں چھپا لیتی ہو۔ سب کو اپنے سینے سے لگا لیتی ہو...... ملیحہ بچوں کے قریب گئی۔ کہیں سائرن کی آواز سے اُٹھ کر ڈر نہ جائیں، وہیں ان کے پاس لیٹ گئی اور آنکھیں بند کر لیں۔

۱۱

طیبہ کو جگہ کا جو پتہ دیا گیا تھا، اس کے مطابق وہ اس عمارت کے سامنے پہنچ گئی تھی۔ پٹرول پمپ سامنے تھا۔ عمارت کی پانچویں منزل پر اسے پہنچنا تھا۔ سامنے نہ کوئی دُکان تھی، نہ ہی بھیڑ بھاڑ۔ بس تیز چلتی کاریں اِدھر سے اُدھر آجا رہی تھیں۔ اس نے راحت کی سانس لی مگر چوکیدار سے نپٹنا ہوگا۔ اس سے کچھ نہ کچھ تو کہنا ہوگا۔ جھوٹ تو وہ بول نہیں سکتی، کیونکہ چوکیدار نیچے سے اس کے بتائے نمبر پر فون کر کے مطلع کرے گا کہ آپ کا مہمان نیچے کھڑا ہے، وہ کچھ سوچتے ہوئے آگے بڑھی۔ اس نے دل ہی دل میں پلان بنایا۔

جیسے ہی وہ آگے بڑھی۔ چوکیدار نے ٹوکا۔ ''کہاں جانا ہے؟''

''پانچویں منزل پر پانچ سو بارہ میں۔'' طیبہ بولی۔

سن کر چوکیدار نے کندھے اُچکائے پھر بولا۔ ''فون تو خراب ہے، لفٹ بھی بند پڑی ہے، کیا کیا جائے؟''

طیبہ خاموشی سے حفاظتی کاؤنٹر پر کندھا ٹکا کر سڑک پر گزرنے والی کاروں کو دیکھنے لگی۔ اس کی لاپرواہی دیکھ کر چوکیدار دل ہی دل مطمئن ہو گیا۔ ایک دو بار فون کھٹکھٹایا۔ لفٹ پر نظر ڈالی، پھر بولا۔ ''خانم! اپنا نام اور پتہ یہاں پر لکھ دیں، اگر چاہیں تو سیڑھی سے جاسکتی ہیں۔''

طیبہ کے دل کا بوجھ ہلکا ہو گیا۔ فوراً رجسٹر میں اپنا نام تسنیم اور غلط پتہ لکھا اور شکریہ کہتی ہوئی سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

فلیٹ نمبر پانچ سو بارہ سے ساز و آواز کی مدھم صدائیں آرہی تھی۔ اس نے گھنٹی بجائی، مگر کوئی جواب نہیں آیا۔ طیبہ کو گھبراہٹ سی ہونے لگی کہ آخر اندر کیا چل رہا ہے؟ اندر سے عورتوں کے قہقہوں کی آوازیں اُبھر رہی تھی۔ اس نے ٹھہر کر پھر گھنٹی

بجائی۔ اس بار ایک دم سے موسیقی رک گئی اور اندر خاموشی چھا گئی۔ کچھ وقفے بعد اس نے پھر گھنٹی بجائی۔ اس بار اندر سے مذہبی انقلابی ترانہ کی صدا بلند ہوئی۔ اسے لگا، دروازے کے شیشے سے کوئی اسے دیکھ رہا ہے۔ دو سکنڈ بعد دروازہ ہلکے سے تھوڑا سا کھلا اور ایک عورت نے سر نکال کر اس کی طرف گھبرائی نظروں سے دیکھا۔ طیبہ نے جھٹ پرس سے ایک کارڈ نکال کر اس عورت کو دکھایا۔ اس نے کارڈ کو غور سے دیکھا، پھر دروازہ کھول کر بولی۔ ''تسنیم خانم بفرمائید!''

طیبہ نے سر ہلایا اور قدم آگے بڑھایا۔ پورا کمرہ دھوئیں سے بھرا تھا۔ اس وقت ہاتھ میں اُدھ جلے سگریٹ پکڑے عجیب حیرت زدہ حالت میں بوڑھی عورتیں کھڑی تھیں۔ چہرے پر گہرا میک اپ تھا، بال سیٹ تھے، بدن پر صرف گرڈل تھی۔ کچھ نے تو صرف جالی کی برا اور انڈر ویئر پہن رکھے تھے، جو نہیں کے برابر تھے۔ طیبہ اس غیر متوقع منظر سے تھوڑی گھبرائی اور ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ تبھی اس عورت نے، جس نے دروازہ کھولا تھا، باقی عورتوں سے طیبہ کا تعارف کرایا۔

''تسنیم خانم۔ مہناز کی سہیلی۔ میری بیٹی اور تسنیم، ان دونوں نے جرمنی میں رہ کر انجینئرنگ کی تعلیم مکمل کی تھی۔ کبھی کبھی، مجھ سے ملنے آجاتی ہیں۔ آؤ، ادھر آؤ، تسنیم۔ میں اپنی سہیلیوں سے تمہیں ملواؤں۔'' اتنا کہہ کر اس عورت نے، جو لگ بھگ، پچپن سال کی ہوگی، تسنیم کا ہاتھ پکڑا اور آگے بڑھی۔ اس نے خود کو سنبھال لیا تھا جس سے طیبہ کو بھی راحت سی ملی۔

''یہ زرینہ خانم ہے۔ پڑوس میں رہتی ہے۔''

زرینہ خانم کا حلیہ ٹھیک پندرہ/ سولہ سال کی لڑکی جیسا تھا۔ گہرا میک اَپ، بدن پر ٹوپیس بکنی تھی۔ بالوں کی دو چوٹیاں سینے پر ربن کے ساتھ بندھی تھیں۔ سارا بدن خمیر والے آٹے کی طرح ڈھلک کر مختلف شکلوں میں بٹ گیا تھا۔ ان کی عمر لگ بھگ پچاس/ پچپن کے بیچ ہوگی۔ بڑے جوش سے انہوں نے طیبہ سے ہاتھ ملایا اور کہا۔ ''میری دو بیٹیاں ہیں اور ایک بیٹا۔ بیٹیاں تمہاری ہی عمر کی ہوں گی۔''

''یہ محسنہ، میری بچپن کی سہیلی۔''

یہ عورت بھی میک اَپ سے پتی ہوئی تھی۔ پتلی تھی، بدن پر صرف برا اور انڈر ویئر پہنے تھی۔ بالوں کو سنہرا رنگ کر ماتھے پر گرا رکھا تھا، جیسے سونے جاگنے والی گڑیا ہو۔ اس نے طیبہ سے مسکرا کر صرف ہاتھ ملایا۔ اس کی عمر ساٹھ سال ہوگی۔ چہرے پر بے شمار لکیریں تھیں۔

''یہ یاسمین ہے، امریکا میں رہتی ہے مگر دو سال سے یہیں ہے، ویزے کا انتظار ہے۔'' طیبہ نے مسکرا کر ہاتھ ملایا اور سوچا، کتنا دلچسپ ہے یہ چہرا پینٹنگ بنانے کے لیے، جھریاں کتنی عمدگی سے چہرے کو گول ٹکڑوں میں بانٹ رہی ہیں۔ وہ تیزی سے سگریٹ پی رہی تھی، جسے دیکھ کر لگ رہا تھا کہ وہ صرف دھواں نکالنے کے لیے پی رہی ہے۔ اس کے بال پونی ٹیل کی شکل میں بندھے تھے۔ بدن پر کالی گرڈل تھی۔ تبھی کسی نے کہا۔ ''ٹیپ آن کرو۔'' اس آواز کے ساتھ موسیقی کی آواز کمرے میں گونجنے لگی۔ ساری عورتیں تھرکنے لگیں۔ باقی عورتوں سے تعارف باقی رہ گیا۔

طیبہ کو سارا منظر قابلِ اعتراض طور پر دلچسپ نظر آرہا تھا۔ اس عمر میں یہ کیا کر رہی ہیں؟ بیشتر عورتیں دولت مند اور بڑے گھر کی لگ رہی تھیں۔ اسے لگا باہر خون اور پہرا ہے، سانسوں کا حساب ہے اور اس گھر میں بہروپیاپن ہے۔ ہماری بوڑھی نسل کیا کر رہی ہے! دل نے چاہا، اُٹھ کر چلی جائے، مگر اسے تو اصغر کا انتظار کرنا تھا۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ جس عورت نے دروازہ کھولا تھا۔ وہ اصغر کی ماں فریبہ خانم ہیں۔ مگر ماں بیٹے میں اتنا فرق؟

طیبہ صوفے پر کونے میں بیٹھ گئی۔ کمرہ رنگین پھیکی لائٹ سے بھر گیا تھا۔ طیبہ کے ہاتھوں میں فریبہ خانم نے چائے کا گلاس تھمایا اور مٹھائی، میوے کے کٹورے اس کی طرف کر کے انہوں نے کمرے کا بلب روشن کیا اور عورتوں نے رقص کرنا شروع کیا۔

اصغر نے دس سال انگلینڈ میں گزارے تھے۔ شاہ کے دَور میں ملک بدر ہوا تھا۔ تہران یونیورسٹی میں ہوئے ہنگامے میں اس کا نام تھا۔ جنہوں نے معافی مانگ لی وہ چھوڑ دیے گئے، اصغر نے نہ معافی نامہ لکھا، نہ ہی زبانی معافی مانگی، لہٰذا جیل کی ہوا کھانی پڑی۔ چند ماہ بعد کسی طرح باہر نکلا تو سیدھا انگلینڈ چلا گیا۔ ڈاکٹری کی ڈگری

کے ساتھ ساتھ وہیں شادی بھی کرلی۔ انقلاب کے شروع میں، جب دنیا بھر کے انقلابی ایرانی، ایران لوٹ رہے تھے، ان میں اصغر بھی تھا۔ چلتے وقت بیوی نے منع کیا تھا اور طلاق کی دھمکی دی تھی۔ حب الوطنی کے جوش میں اس نے سچ مچ طلاق لے لیا۔ پانچ سال کی ازدواجی زندگی سے وہ خوش نہیں تھا، نظریاتی طور پر وہ صرف انگریز تھی، طبعاً ریاضی کی اُستاد، جمع۔تفریق کی عادت نے اصغر کو یوں بھی توڑ رکھا تھا۔ اوپر سے ایران نہ جانے دینے کی ضد اور طلاق کی دھمکی۔ اصغر کی شخصیت میں اچانک ایسی تبدیلی آئی کہ اس نے حالات سے سمجھوتہ نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ آخر پابندیوں کی قدیم دیواریں گری ہیں۔ اس لیے وہ نہ صرف طلاق پر رضامند ہوگیا، بلکہ گھر بیچ کر، نوکری سے استعفیٰ دے کر ہمیشہ کے لیے ایران جا بسنے کی ٹھان لی۔ اسی دن کے لیے تو وہ ملک سے نکلا تھا۔ دَر دَر کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ جب آزادی کا دن آیا تو وہ بیوی اور خانہ داری کے چکر میں اپنا فرض بھول جائے۔ حب الوطنی تو ایسا جذبہ ہے جو تمام جذبوں پر حاوی ہے۔ بار بار انسان اپنا ملک نہیں بدل سکتا، نہ ایمانداری مگر بیوی اور خوشی تو بار بار حاصل کی جاسکتی ہے۔ یہ سب سوچ کر اصغر ایسے وقت ایران آیا جب انتخابات کا دَور دَورہ تھا۔ یہ ساری باتیں اصغر نے ایک دن پارٹی کے دفتر میں جانے کس موڈ میں بتائی تھیں۔

وہ جب ایران آیا تو لگا، دس سال میں ایران کتنا بدل گیا ہے۔ مستی اور خوشی میں شرابور، فخر کے جذبے سے مخمور وہ اپنے آزاد وطن کی سیر کو نکل پڑا۔ شیراز، اصفہان، مشہد، تبریز جیسے بڑے شہروں، دیہاتوں اور ہوٹلوں، ہر مقام کو سونگھا، دیکھا اور روح میں بسا لیا۔ جب وطن کو دیکھ کر دل بھر گیا تو وہ دو ماہ بعد تہران لوٹ آیا، تاکہ آرام سے بیٹھ کر موجودہ حالات کا جائزہ لے اور کسی پارٹی کی رُکنیت اختیار کرلے۔ ویسے تو وہ پہلے بھی تودہ پارٹی کا ممبر تھا، مگر اب حالات دُوسرے تھے۔ فہم و فراست کا دائرہ وسیع ہو چکا ہے۔ تہران آتے ہی اسے کسی کام سے بازار جانا پڑا، کیمرہ کندھے پر ڈال کر نکل پڑا کہ ریل ڈلوالوں گا اور تصویریں کھینچ لوں گا۔ مگر راستے میں ہی اسے پکڑ لیا گیا۔ وجہ لاکھ پوچھی، مگر جواب صرف ایک تھا...... شبہ! مگر اس پر کیسا شبہ! جیل

میں اس کی طرح کے بہت سے لوگ تھے جو اپنی غلطی نہیں جانتے تھے۔ دو ماہ بعد بنا کچھ کہے سنے ان سب کو چھوڑ دیا گیا۔ مئی جون کی گرمی اور جیل کی کوٹھری میں بہتے پسینے نے پہلی بار سوال کیا کہ کہیں کچھ گڑبڑ ہے، مگر کیا؟ باہر نکل کر پتہ چلا کہ یہ دَور ایسا ہے کہ جو بھی فیشن سے صاف ستھرا نکلتا ہے، کیمرہ وغیرہ لے کر، غیر ملکی صحافی یا امریکی ہونے کا شک کیا جاتا ہے۔

انتخاب کے دَوران دُوسری چوٹ کھا کر اصغر ہوش میں آیا کہ جمہوریت کے نام پر دھوکہ ہوا ہے۔ اس کی طرح بہت سے لوگ حسین خوابوں سے جاگے، مگر تب تک دیر ہو چکی تھی۔ جد و جہد کرنی تھی، منزل پانی تھی اس لیے ایک بار پھر وہ موت کے کنوئیں میں آنکھ بند کر کے کود گیا۔ اس بار فدائن گوریلا بن کر اور تو وہ پارٹی کا سخت ناقد بن کر۔

طیبہ اور اصغر کی سیاسی ہمکاری تقریباً دو سال رہی، پھر انڈر گراؤنڈ ہونے کے باعث چھ ماہ سے وہ صرف اس کی خبریں سنتی رہتی تھی۔ پرسوں فرید نے اسے خبر دی تھی کہ پانچ سو بارہ میں اصغر سے ملنا پانچ بجکر پچاس منٹ پر، مگر یہاں اصغر کی جگہ ڈسکو دیکھنے کو مل رہا تھا۔

اچانک اس نے اپنے کندھے پر کسی کا ہاتھ محسوس کیا۔ وہ چونکی۔ فریبہ خانم آنکھ کے اشارہ سے اسے بلا رہی تھیں۔ وہ اُٹھ کر رقص کرتی ہوئی عورتوں کے درمیان سے ہوکر ان کے پیچھے چل پڑی۔ وہ باتھ روم میں چلی گئیں۔ وہ بھی اندر گئی۔

"اس سے قبل کہ موسیقی ختم ہو، میں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"بولیے، لیکن اصغر کہاں ہے؟ سات بج رہے ہیں۔"

"اصغر کو بھول جاؤ!" ان کا ہنستا چہرہ ماند پڑ گیا۔

"کیا ہوا؟"

"یہاں میں تنہا دس بارہ سال سے رہ رہی ہوں۔ اصغر کو کوئی میرے بیٹے کی شکل میں نہیں پہچانتا ہے۔ میں نے سب سے کہہ رکھا ہے کہ وہ میرا بھائی ہے...... اس کی وجہ یہ ماحول ہے۔ یہاں پر لڑکا کہنے کا مطلب ہے پورا کچا چٹھا...... بہرحال، اصغر پر شک ہوگیا ہے، اس لیے وہ یہاں سے کل ہی چلا گیا، مشرقی جنگلوں کی جانب...... ہاں یہ

پیکٹ ہے، اسے سنبھالو...... میں چلتی ہوں۔"

فریبہ خانم کے جانے کے بعد اس نے باتھ روم کا دوسرا دروازہ، جو ٹب باتھ کی طرف کھلتا تھا، اسے کھولا اور اندر جا کر دروازہ بند کرلیا۔ پیکٹ کھولا اور کاغذ دیکھنے لگی، پھر پیکٹ میں کاغذات واپس رکھ کر اس نے وہ چھوٹا سا پیکٹ کپڑوں کے اندر چھپا لیا اور باتھ روم سے باہر نکل آئی۔ کمرے میں گہرا دھواں بھرا ہوا تھا، کچھ عورتیں تھک کر صوفے پر بیٹھی سگریٹ پی رہی تھیں، کچھ اب بھی رقص میں مگن تھیں۔ لیکن ان کے تاثرات سے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ تھک چکی ہیں۔ طیبہ نے سوچا، موقع اچھا ہے، خاموشی سے نکلنے کا، اس لیے وہ فریبہ خانم کی طرف بڑھی، لیکن تبھی ایک بڑی اسمارٹ بوڑھی عورت نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈالا اور اسے صوفے پر بٹھانے لگی۔ "آؤ ادھر بیٹھو، تم جوان ہو کر بھی تھکی تھکی سی لگ رہی ہو۔ موسیقی تمہیں اچھی نہیں لگتی ہے؟ نفرت کے جذبے تمہیں پاگل نہیں بناتے ہیں؟ جو ایران میں آہ و بکا بن چکا ہے۔ اس ماحول سے تمہیں اکتاہٹ نہیں ہوتی؟ آخر تم اتنی سرد کیوں ہو؟ بولو؟"

"جوالا مکھی جب تک نہیں پھوٹتا ہے تب تک لوگوں کو پرسکون دکھائی دیتا ہے لیکن انہیں کیا معلوم کہ اس کے اندر کیسے شعلے بھڑک رہے ہیں! کون سا لاوا پک رہا ہے!" طیبہ نے انتہائی نفرت سے کہا۔ اسے یہ عورت اس عمر میں صرف ایک حوس زدہ گوشت کا لوتھڑا لگی۔

"عالیہ، بالکل تمہاری بیٹی والی باتیں ہیں۔" قریب بیٹھی ہوئی ایک عورت نے کہا۔

"ہاں، زینب! میری بیٹی، میری جوان بیٹی، کیسی گہری نیند میں ڈوب گئی۔ دیوانی! کہیں اس عمر میں کوئی یوں سوتا ہے!" عالیہ نے طیبہ کی کمر سے ہاتھ نکال کر منھ ڈھک لیا۔ موسیقی بند ہو چکی تھی۔ عورتیں آہستہ آہستہ ستاتی ہوئی اپنے کپڑے پہن رہی تھیں۔ پندرہ منٹ بعد کھڑکی کھول دی گئی۔ کمرے کا دھواں چھٹنے لگا اور اسلیکس، فراک، اسکرٹ پہنے بوڑھی عورتیں، جو اپنے جسمانی میک اپ اور اداؤں سے زیادہ جوان لگ رہی تھیں، بڑے اطمینان سے بیٹھ گئی تھیں۔ فریبہ خانم کسی کو چائے۔ کسی کو شربت دے رہی تھیں۔ تبھی کسی نے کہا۔ "آٹھ بج رہے ہیں۔ ٹی۔وی کھولنا، خبریں آ رہی ہوں گی۔"

''کیا کرنا ہے خبریں سن کر!'' کسی نے اُکتا کر کہا۔
''وہی داڑھی والے چہرے دکھائی دینگے۔'' کسی نے جھنجھلا کر کہا۔
''رنگ میں بھنگ پڑ جائے گا۔'' نہ چاہنے پر بھی ٹی۔وی کھل گیا۔ خبریں شروع ہونے میں دیر تھی، کسی نے کہا، خبروں اور ملک کی ترقی کے پروگراموں سے اچھا ہے، کوئی فلم لگا دو۔''

ویڈیو فلم لگائی گئی۔ رنگین رنگوں نے سب کا دھیان ٹی۔وی اسکرین کی طرف کھینچ لیا۔ منظر اُبھرا۔ چیخ پکار اور برستے کوڑے۔
''ارے، یہ تو فلم 'اسپارٹکس' ہے!''
''یا خدا! بند کرو۔ جدھر دیکھو اُدھر ہی ظلم وستم۔''
''دیکھنے دو!'' کسی دوسری آواز نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

اسپارٹکس سولی پر چڑھا تھا۔ اس کی بیوی اپنے نوزائیدہ بچہ کے ساتھ گاڑی پر بیٹھ کر جا رہی ہے۔ گھوڑا گاڑی روکی جاتی ہے۔ اس پر سے طاقت کے زور پر اس کی بیوی کو اُتارا جاتا ہے۔ پھر وہ چلتی ہوئی، شوہر کو پہچان کر آگے بڑھتی ہے۔ اسپارٹکس کی آنکھیں، چہرہ بیوی کو نہارتی نظریں، بچے کا چہرہ اور بیوی کی تاکتی آنکھیں اور پھسپھساتے الفاظ۔''میں اپنے بیٹے کو بتاؤں گی اس کا باپ کون تھا۔ میں اسے بتاؤں گی اس نے روم کے لیے کیا خواب دیکھے تھے۔''

بیوی کی باتوں کو سنتے اسپارٹکس کے کان اور اس کے پیر سے ہٹتا بیوی کا ملائم ہاتھ اور جاتی ہوئی گاڑی۔ تبھی کسی کی دلدوز آواز گونجی۔''بس کرو!''
ویڈیو بند کر کے ٹی۔وی کی خبریں شروع ہوئیں۔

''پتہ نہیں یہ فلم کیسے لگ گئی۔ میں نے تو دوسری لگائی تھی!'' فریبہ خانم کچھ متفکرانہ انداز میں بولیں۔''یہ شاید اصغر نے بدل دی ہو۔ اُوپر کیسٹ پر تو جمیلہ کا نام لکھا ہے، پھر جمیلہ کا بیلے ڈانس والا کیسٹ کہاں گیا!'' ابھی فریبہ خانم اسی ادھیڑ بن میں تھیں کہ شور سے چونک اُٹھیں۔

ٹی۔وی پر مجاہدین پر حملے اور انہیں ختم کرنے کی خبریں آرہی تھیں۔ ساتھ ہی

بندوق، کارتوس اور کنٹراسپٹک کی تصویریں تھیں اور بار بار اعلان ہو رہا تھا کہ یہ جوان لڑکے اور لڑکیاں صرف ان غلط کاموں کے لیے آزادی چاہتے ہیں اور اس طرح سے سیاست کے نام پر یہ گل کھلاتے ہیں۔

"اس ذرا سے عیش کے لیے کوئی جان گنوائے گا؟" ایک عورت نے نفرت سے کہا۔

"غلط تشہیر تو کوئی ان سے سیکھے۔ صحیح تنقید کا جب جواب نہیں دے پاتے تو ذاتیات پر حملہ کرتے ہیں اور ایسا حملہ، جسے ہمارا دقیانوسی معاشرہ سب سے برا کام سمجھتا ہے۔"

"سب واقف ہیں کہ حقیقت کیا ہے، اب کوئی اس پر یقین نہیں کرتا، سننے کو تو سب سن لیتے ہیں۔"

ٹی۔وی کی خبریں میدان جنگ کی جانب مڑ جاتی ہیں، 'دشمنوں کے پانچ ہوائی جہاز گرائے۔ تین ہوائی جہاز پائلٹوں کو قیدی بنایا اور پانچ سو عراقی مارے گئے۔ اس جنگ میں صرف ایک ایرانی جہاز آگ لگنے سے تباہ ہوا۔ مرنے والے شہید پائلٹ کا نام جاوید میخ چی تھا۔ اس کی بہادری پر......'

طیبہ کے قریب بیٹھی عورت بیہوش ہوگئی۔ تمام عورتیں غم زدہ ہوگئیں۔ جاوید میخ چی شیرین میخ چی کا اکلوتا بیٹا تھا۔ بار بار جذباتی سطح پر بدلتے مناظر طیبہ کو پوری طرح سے جھنجھوڑ رہے تھے۔

"ہم تھوڑی دیر تک اپنے دکھ بھولنے کے لیے اور لمحہ بھر کی خوشیاں خریدنے کے لیے کیا کیا کرتے ہیں!"

"لیکن اس کے بعد......!"

"یہاں کس کی کوکھ اُجڑنے کو بچی ہے! ہر گھر سے ایک ایک لختِ جگر قبر میں جا کر سو گیا ہے۔"

"مگر کس لیے؟"

"مُلا کی ضد کے باعث۔"

"مسلمان مسلمان کو مار رہے ہیں، یا خدا! یہ کون سا اسلام، کون سا مذہب ہے؟ مذہب تو محبت کرنا اور معاف کرنا سکھاتا ہے، لیکن اس ملک میں......"

پانی ڈالنے سے شیرین میخ چی کو ہوش آ گیا۔ پہلے انہوں نے آنکھیں پھاڑ کر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر چیخ مار کر اپنے بال اور چہرہ نوچنے لگیں۔

چہرے پر خون چھلک آیا تھا، لیکن وہ دیوانہ وار خود کو کوٹ پیٹ کر نوچ کھسوٹ رہی تھیں۔ باقی عورتیں بھی پریشان تھیں۔ کچھ اپنے بچوں کی یاد میں آنسو بہا رہی تھیں۔ کچھ بُت بنیں بس ایک ٹک سامنے دیکھے جا رہی تھیں، جیسے ان کی آنکھوں کے سامنے کوئی ایسا اہم منظر چل رہا ہو جس سے آنکھیں نہیں ہٹائی جا سکتیں۔ طیبہ کو لگا، اس ماحول میں اس کا اُٹھنا اور گھر جانے کی اجازت مانگنا مشکل ہے۔ فریبہ خانم نے چائے دم دی اور فنجانوں میں اُنڈیلنا شروع کر دیا۔ شیرین میخ چی بھی کچھ سنبھل گئی تھیں۔ سب کے دلوں پر چھ فٹ لمبی قبریں بنی تھیں۔ باری باری سب ایک دُوسرے کے کندھے پر سر رکھ کر رو چکی تھیں۔ شیرین خانم کا کندھا بھی زہرا، بتول، عالیہ، زینب جانے کتنی سہیلیوں کے آنسوؤں سے تر ہوا تھا۔ کسی کا بیٹا مجاہد ہونے کی وجہ سے گولی سے اُڑا دیا گیا تھا تو کوئی مارکسی نظریات کی وجہ سے۔ بس شیرین کا بیٹا تھا جو جنگ میں شہید ہوا تھا۔ اس کا کوئی مقصد لگ رہا تھا، لیکن دیگر لڑکے...... لڑکیاں...... ان کی موت......؟ صرف اس وجہ سے کہ وہ اپنے نظریات پر اَٹل رہے؟ کیا اس لیے......؟ کیا ہو رہا ہے؟ کیا حقیقت ہے؟ کیا ہوگا آگے؟

تھوڑی دیر بعد فریبہ خانم نے کھانا لگانا شروع کر دیا۔ طیبہ ان کی مدد کے لیے اُٹھ گئی۔

"پہلے اگر ایک ماہ کا بچہ بھی مر جاتا تھا تو سال بھر غم مناتے تھے۔ کالے کپڑے پہنتے تھے، لیکن اب......"

"اب تو روز مرتے ہیں، اپنے یا پرائے، کہاں تک غم منائیں۔ اب تو سمجھو کہ ہر روز کا لائحہ عمل یا کہہ لو ہر دن کا معمول سا بن گیا ہے...... کوئی دل سے پوچھے جو ہر لحہ رِستا رہتا ہے۔"

"مگر پھر بھی ہم جی رہے ہیں۔ ہنسنا نہیں بھولے ہیں۔"

"پیٹ بھرنا نہیں بھولے ہیں۔ سونا اور جاگنا نہیں بھولے ہیں۔"

"کچھ بھی نہیں بھولے ہیں۔ یہ بھی نہیں بھولے ہیں کہ ہم پر اذیتوں کے پہاڑ

ٹوٹ رہے ہیں اور ہم...... اور ہم......" باقی الفاظ سسکیوں میں ڈوب گئے۔

"اس بڑھاپے میں ہم زندہ ہیں اور گود میں کھلائے ہوئے ہمارے کھلونے موت کی نیند سو رہے ہیں۔ اس سے بڑی عبرتناک بات کہیں دیکھی ہے! پالا ہم نے، تخلیق کی ہماری کوکھوں نے اور اسے، اس پھول کو کس نے، کن ہاتھوں نے توڑ کر مسل ڈالا ہے، کون پوچھے جا کر کہ کیا تم مردہ جسموں میں جان ڈال سکتے ہو؟ کیا جنم دے سکتے ہو کسی کو دوبارہ؟ پھر مارنے کا حق کس نے تم کو دیا ہے؟"

"خدا بھی جانے کہاں ہے جو ہماری مدد کو نہیں پہنچ پاتا ہے۔"

طیبہ کا دل کر رہا تھا کہ کچھ بولے، ایسا کچھ بولے جس سے ان کی تکلیف میں کمی واقع ہو۔ کھانا لگ گیا تھا۔ شیرین خانم کے حلق سے ایک نوالہ بھی نیچے نہیں اُترا۔ باقی عورتوں نے بھی بڑی مشکل سے ایک، دو لقمے کھائے، سب کے چہرے اذیتوں کی کہانی بیان کر رہے تھے۔ برتن سمیٹ کر فریبہ خانم نے سب کے لیے چائے بنائی۔ طیبہ نے سب کو چائے دی، پھر وہیں ان کے قریب بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر بعد آہستہ سے بولی۔

"میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔"

"کہو! تم کچھ بولی تو سہی۔" عالیہ خانم نے کہا۔

"فرار اور رہائی کا فرق میرے نزدیک بہت وسیع اور مفصل ہے۔ ہمارا اور آپ کا غم ایک ہے۔ ہمارے بزرگ دُکھ سے فرار ڈھونڈتے ہیں اور ہم رہائی کے لیے راستہ تلاش کر رہے ہیں۔ رِہائی موت بھی ہے اور فانی جسم کو چھوڑ کر نکل جانے والی روح کی پرواز بھی۔ رہائی آزادی کی منزل کو پانے کے لیے زندگی کی قربانی بھی ہے۔ یہ رہائی، یہ زندگی کی قربانی، یہ نجات کا راستہ موت کے پُل سے گزرتا ہے۔ پُل کے نیچے خشک ندی کی گود لاشوں سے پَٹ رہی ہے، ہماری اپنی لاشوں سے، مگر روح سماج سے نجات، سماج کی رہائی کے راستے میں بڑھ رہی ہے۔ آنے والی نسل آپ کے پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیاں اس رہائی کا، اس آزادی کا ذائقہ چکھیں گے، اسے بھرپور طریقہ سے جئیں گے، اس لیے موت پر آنسو بہانا، خاص کر اس وقت جبکہ ایران کی تاریخ بن رہی ہو، صرف رہائی کی اہانت و تذلیل ہے۔"

طیبہ کے چہرے کو وہ تمام عورتیں حیرت سے دیکھ رہی تھیں جو تقریباً گزشتہ پچاس برسوں سے دُنیا کی ہر نعمت، ہر راحت سے لطف اندوز ہو چکی تھیں اور اس حالیہ ایران کو لعنت سمجھ کر ویرانی کے تصور سے خوفزدہ تھیں، مگر یہ سمجھنے کو تیار نہیں تھیں کہ یہ جو ہوا ہے وہ وقت کا تقاضا تھا، آج جو ہو رہا ہے وہ بھی اسی نظام کا خمیازہ ہے۔

دس بج گئے تھے، سب کو جانا تھا۔ قریب میں رہنے والی عورتیں پیدل ہی ٹہلتی ٹہلتی نکل گئیں۔ دُور جانے والوں میں سے ایک نے طیبہ کو لفٹ دے دی کہ وہ راستے میں اس کے گھر کے قریب اسے چھوڑ دے گی۔

جب ایک ایک کر کے تمام عورتیں بلڈنگ سے نکل کر، سیڑھیاں اُتر کر نیچے سڑک کے کنارے کھڑی کاروں میں بیٹھ گئیں تو چوکیدار نے موٹی سی گالی دے کر کہا۔ ''بُرا ہو اِس نئے قانون کا جو بنا دیا گیا، ورنہ ان سب کی کاریں پلک جھپکتے چور چور کر دیتے۔ انقلاب کی ابتدا میں تمام امریکی کاروں کا بھوسہ بھر دیا تھا۔''

اس کے ساتھی نے اس کی بات سنی اور تلخی سے کہا۔ ''کپڑے دیکھو، زیور دیکھو، کھانا پینا دیکھو، جانے ان کو خدا نے اتنا کیوں دے رکھا ہے!''

''کچھ ترکیب لگانی چاہیے۔ ذرا دھمکا کر کچھ پیسے تو اینٹھے ہی جا سکتے ہیں...... دماغ لڑاؤ!''

''وعدہ تو بہت کچھ کا کیا تھا ہمیں حکومت نے دینے کا، مگر ملا کچھ بھی نہیں، اوپر سے اس مہنگائی نے کمر توڑ رکھی ہے۔''

''اس سے بھلے تو پہلے ہی تھے، کم سے کم خوشی خوشی سوتے اور پیٹ بھر کر کھاتے تو تھے۔ لیکن اب تو دماغ بھی مشل سا رہتا ہے۔''

''معلوم نہیں آگے کیا ہوگا۔ جنگ نے الگ پریشانی بڑھا دی ہے۔ جانے کب یہ لعنتی جنگ خاتمہ پر پہنچے گی؟''

''چھوڑو! کچھ ترکیب نکالو...... میں پانچ سو بارہ والی سے کچھ پیسے اینٹھنا چاہتا ہوں تاکہ کچھ راحت ملے، مگر کیسے...... ترکیب سوچنی پڑے گی۔''

''میں تو ان باتوں پر یقین نہیں رکھتا اور تم سے بھی کہتا ہوں، ایسی باتیں

ذہن میں مت لاؤ۔"

"کیوں نہ لاؤں؟ جانتے نہیں ہو کہ اپنے ساتھی کیا بن گئے ہیں! کیا تھا ان کے پاس؟ اور آج سب کچھ ہے، جو چاہتے ہیں حاصل کر لیتے ہیں۔ تم سمجھتے ہو یہ سارا مال ایمانداری سے حاصل کیا ہے۔ خدا کی قسم، میں سب کا کچا چٹھا جانتا ہوں۔"

"بس! بس! چھوڑو یہ باتیں۔ میں آگے نہیں سننا چاہتا، خواہ تم کچھ بھی کہو۔"

خاموشی چھا گئی۔ چوکیدار تیزی سے پیر ہلاتا ہوا سوچ میں ڈوب گیا۔

صنوبر کی آج شادی ہے۔ گھر مہمانوں سے بھرا ہے۔ شوروغل کی جگہ ایسا سکون ہے جیسے گھر میں کسی کا جنازہ رکھا ہو۔

"بہت دل پذیر لگ رہی ہو۔" شہناز نے صنوبر کے سر پر سفید پھولوں کا تاج رکھ کر سامنے آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

"کپڑے غضب کے سلے ہیں، خاص کر یہ لیس دیکھو...... کتنی باریکی ہے اس کے کام میں!" طیبہ نے تاج کے پیچھے کمر تک جھولتی جالی کی تعریف کرتے ہوئے اس کو صنوبر کے شانوں پر پھیلایا۔

"ہماری صنوبر کی تو کسی نے تعریف ہی نہیں کی۔ اے طیبہ، تم ہمیشہ مردہ چیزوں میں حسن دیکھتی ہو۔" ملیحہ نے زندہ دلی سے کہا۔ آج وہ بہت خوش تھی۔ برسوں بعد اس کے چہرے پر نور کا حالہ تھا۔

"حالت تو بگاڑ کر رکھ دی ہے بیچاری کی...... جیسے صنوبر نہ ہو، رنگ سے پتا کوئی کھوٹا ہو۔ رنگ کے تال میل کی تعریف کروں کیا؟" طیبہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میں منع کر رہی تھی، اتنا میک اَپ مت تھوپو، لیکن میری سنتا کون ہے!" صنوبر کا منہ اُتر گیا تھا۔

"اس پاگل کو رہنے دو! بغیر میک اَپ کے تصویریں اچھی نہیں آتی ہیں۔ دُوسرے اس تیز روشنی میں چہرہ بھی پھیکا لگنے لگتا ہے۔" شہناز نے کہا اور صنوبر کے گلے میں

یاقوت اور ہیروں سے بھرا ہار پہنانے لگی۔
''بہت خوبصورت ہے تمہارا یہ ہار، صنوبر!'' شہناز نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں چھپی حسرت کسی سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی۔
''ہیں بھی تو دو سو سال پرانے زیور...... خاندانی ہے، پرنانی کی پرنانی کا ہے۔ اب ایسی چیزوں کو خریدنے کی حیثیت ہماری کہاں؟'' صنوبر نے ہنستے ہوئے کہا۔
''یہ بھی کوئی شادی ہوئی، نہ گانا نہ بجانا۔'' صنوبر کی خالہ غصے سے بڑبڑاتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔
''کیا ہوا خالہ؟'' صنوبر نے پوچھا۔
''کچھ بھی نہیں۔ ہونے کو کیا ہے؟
خدا ان موت کے فرشتوں جیسی شکل والے پاسداروں کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے، جو ہماری ہر بات کا حساب رکھتے ہیں...... سیدھے جنت میں جائیں گے...... بھول ہی گئے ہیں کہ ہماری شادیوں میں کیا ہوتا تھا۔ ہم نہ ہوئے، لاشوں پر رونے والے بوڑھے گدھ ہوئے! لڑکی کی شادی ہے اور موت کا سناٹا، یہ بھی کوئی بات ہوئی!'' خالہ کالی چادر سمیٹتی بڑبڑاتی وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں۔
''سروش نے گانا شروع کیا تھا، بچوں نے اس پر تالیاں بجا کر تال دی، اس میں کون سی آفت ٹوٹ پڑی!'' صنوبر کی پھوپھی غصے میں بھنبھناتی ہوئی کمرے میں آئیں۔ صنوبر کو سجتا دیکھ کر اس کے قریب گئیں اور اس کے رُخساروں پر پیار کیا۔
''کیا پھوپھو، سارا روز آپنے پونچھ ڈالا۔'' طیبہ نے شرارت سے کہا۔
''کچھ سنا، تم لوگوں نے؟'' صنوبر کی نانی بدحواس سی بولیں۔
''کیا؟'' سب نے ایک ساتھ کہا۔
''کہتے ہیں، شادی دس بجے تک ختم ہو جانی چاہیے...... پڑوس میں کوئی مولوی آ کر ٹھہرے ہیں، انہیں دل کی بیماری ہے۔ شور سے اختلاج بڑھے گا۔'' نانی بولیں۔
''یعنی......؟ ان کو دل کی بیماری ہے تو ہم سے مطلب؟'' صنوبر نے چڑھ کر کہا۔ شہناز اس کے ہونٹوں پر لپسٹک لگانے جا رہی تھی، وہ ہل گئی۔

''یہ کیا! لپسٹک پھیلا دی نا۔'' شہناز نے اس کے ہونٹوں کے کناروں کو پونچھتے ہوئے کہا۔

''تم دلہن ہو، شرمائی خاموش بیٹھی رہو۔'' طیبہ نے کہا۔

''پڑوس والا مکان تو محقق آقا کا ہے۔ انہیں گئے تو دو سال ہو رہے ہیں۔ کیا لوٹ آئے؟'' خالہ نے پوچھا۔

''ارے! وہ تھوڑے ہی لوٹے ہیں...... وہ گھر کمیٹی کے قبضے میں ہے۔ وہیں پر کوئی کمبخت مردہ کرمان شہر سے آ کر ٹھہرا ہے۔'' پھوپھو نے پھولدار چادر کمر کے پاس سے کستے ہوئے کہا۔

''کوئی نہیں سمجھتا ہے کہ ہم نے کون سی آزادی کھو دی ہے...... مجھ سے پوچھو، میں نے تو ہر حکومت کو دیکھا ہے، رضا شاہ کبیر کا، شہنشاہ آریا مہر کا اور اب یہ امام خمینی کا...... کہا نہیں تھا کہ ایک دن شاہ کی مخالفت کرنے والے اپنا سر پیٹیں گے...... لو، وہ دن جلد ہی آ گیا، میرے جیتے جی ہی...... پہلے سیاسی باتوں پر منہ پر قفل لگے تھے، آج ہماری ہر بات پر پہرہ ہے۔ ان سے پوچھ کر ہاتھ رُوم جاؤ، ان سے اجازت لے کر چھینکو...... اور لگاؤ نعرے......'' نانی غصہ سے کانپ رہی تھیں اور نقلیں اُتار کر ہاتھ ہوا میں نچا رہی تھیں۔

''ارے! آپ کے شاہ نے کون سی راحتیں دیں ہمیں، اسی کی دین ہے سب کچھ نانی!'' طیبہ نے نانی کے گلے میں بانہیں ڈالتے ہوئے کہا۔

''تم خاموش رہو! بڑی آئی انقلابی سورما۔ میں نے یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے ہیں۔'' نانی نے اپنے سنہرے بال دِکھاتے ہوئے کہا۔

''نانی طیبہ کو سمجھائیں۔ یہ بہت بگڑ گئی ہے۔ کہتی ہے کہ حکومت کی برائی کرنے والا حکومت کا دشمن ہوتا ہے، اسے فوراً کمیٹی کے......'' شہناز نے شرارت سے کہا۔

''میں نہیں ڈرتی تمہاری طیبہ سے، نہ سرکاری پاسداروں سے۔ صنوبر کے بابا ڈرے بیٹھے ہیں، ورنہ میں تو گانا، ناچ سب کرتی۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہوئی؟ ہم سے ہمارے رسم و رواج، ہمارا اپناپن، سب کچھ چھنا جا رہا ہے۔'' نانی نے چڑھ کر کہا۔

''کہتے ہیں نوروز شاہی تیوہار ہے، بھلا ہم ایرانی نہ ہوئے احمق ہو گئے......

ہمارے قدیم رسم و رواج ہمارے نہیں بلکہ پہلوی عہد کے ہوئے۔ اپنی آپسی دشمنی کو یہ یوں ہم سے بدلہ لے کر نکال رہے ہیں۔'' پھوپھو نے کمرے سے نکلتے ہوئے کہا۔

''جنگ ہے پھوپھو، اس لیے کہہ رہے ہوں گے، اتنا برا کیوں مان رہی ہیں! آپ خود سوچیں، موت کے گھر کے آس پاس گانا بجانا کیا اچھا لگے گا؟'' شہناز نے کہا۔

''تم نے بھی بہت اچھی بات کہی۔ بچوں کو لیمن چوس دے کر بہلانے والی۔ میں سمجھتی نہیں ہوں کیا کہ موت پر شہادت کے ترانے گائے جاتے ہیں تو کیا وہ گانا بجانا نہیں ہوا؟'' خالہ بھی الجھتی ہوئی بولیں۔

اس بات پر سب خاموش ہو گئے۔

''خدا رسول کا نام طبلے، سارنگی، ستار پر گاتے بوٹوں کے ساتھ مارچ کرتے ہوئے یہ ایرانی کون ہیں؟ یہ کون سا مذہب ہے؟ مذہبی ترانے گاؤ لیکن مبارک موقعوں پر بھی خوشی کے گیتوں کا گلا گھونٹ دو، بھلا کیوں؟'' نانی نے شگون کی سینی کو ٹھیک کرتے ہوئے کہا۔

''خیر چھوڑیے! خوشی کا دن ہے، دل جلا کر کیا ملے گا؟'' شہناز نے کہا اور صنوبر کے اُتارے ہوئے کپڑوں کو ہینگر پر ٹانگنے لگی۔

''اپنی لاڈلی کو دیکھیں۔'' شہناز نے کہا۔

تینوں بوڑھی عورتوں نے ایک ایک کر کے صنوبر کے سر پر سے صدقے کا روپیہ نچھاور کر کے میز پر رکھی پلیٹ میں ڈالا۔ ملیحہ دو میٹر لمبی میکسی کے پھیلاؤ کو بڑی خوبصورتی سے صنوبر کے پیروں کے پیچھے پھیلا رہی تھی۔

''صرف آدھا گھنٹہ باقی ہے، نانی، پھر تو نکاح کے بعد ایئر فورس کا افسر آپ کا داماد ہو جائے گا۔ حکم دیجئے گا وہیں پر بم گرائے گا۔'' طیبہ نے ماحول کے بوجھل پن کو کم کیا۔

''آپ کو بھلا کیا دکھ...... چُن چُن کر نام بتایئے گا!'' شہناز نے پھولوں کا گلدستہ صنوبر کے ہاتھوں میں تھماتے ہوئے کہا۔

''فوٹوگرافر آ گیا ہے، صنوبر تیار ہو تو بھیج دوں۔'' صنوبر کے چچا نے کہا۔

''صنوبر تیار ہے، عمو!'' ملیحہ نے کہا۔

”تم لوگ بھی اپنے چہروں کو پینٹ کرلو، ورنہ صنوبر کے سامنے سب کے چہرے فیوز بلب لگیں گے۔“ طیبہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”اس کی بدتمیزیوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔“ ملیحہ نے طیبہ کی پیٹھ پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

”سچی بات ہمیشہ کڑوی لگتی ہے۔“ شہناز کے چہرے پر لکوڈ میک اَپ لگاتے ہوئے طیبہ نے کہا۔

فوٹوگرافر نے کمرے میں آتے ہی اپنا کیمرہ ٹھیک کیا اور اسٹینڈ پر جما دیا۔ صنوبر کو درمیان میں کھڑا کر کے، تمام سہیلیاں اسے گھیر کر کھڑی ہو گئیں۔

باہر مہمانوں کی بھیڑ بڑھ گئی تھی۔ دولہا کے ساتھ آئے ہوئے زیادہ تر مہمان ایئرفورس کے افسر تھے۔ نکاح کے بعد کھانا شروع ہو گیا۔ صنوبر کے والد بار بار گھڑی دیکھ رہے تھے۔ ساڑھے نو ہو گئے تھے اور آدھے سے زیادہ مہمانوں نے کھانا شروع نہیں کیا تھا۔ بار بار کہنے پر بھی لوگ باتوں میں مشغول تھے۔

صنوبر اور جمیل اُوپر تخت پر کھڑے تھے۔ آنے جانے والے ان سے ہاتھ ملاتے، تحائف دیتے اِدھر سے اُدھر آ جا رہے تھے۔ رات زیادہ نہ ہو جائے اس وجہ سے شہناز نے جانے کی اجازت مانگی۔ پری اس کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو گئی۔ دونوں سہیلیاں ابھی باہر نکل ہی رہی تھیں کہ دروازے سے گھستے بندوق لیے پاسدار نظر آئے۔

”یوسف آقا! دس بجکر پانچ منٹ ہو گئے ہیں۔“ ایک پاسدار نے گھڑی دیکھتے ہوئے بہت سخت الفاظ میں کہا۔

”بس! ذرا......“ یوسف آقا نے لجاجت سے کچھ کہنا چاہا۔

”بس، وَس کچھ نہیں! روشنی دس منٹ کے اندر بجھ جانی چاہیے، جبکہ آپ کے داماد ماشاءاللہ ایئرفورس افسر ہیں!“

اس کے اس طنز سے سب کے چہرے سفید پڑ گئے۔ کچھ کے کھاتے ہاتھ منھ اور پلیٹ کے درمیان ہی تھم گئے۔ کچھ نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ میز پر رکھ دی اور فوراً چلنے کی اجازت مانگنے لگے۔ یوسف آقا کا چہرہ دُکھ اور ذلت سے تمتما رہا تھا۔ کنپٹی سے بہتی

پسینے کی دھارا گردن سے ہوکر قمیص میں جذب ہو رہی تھی۔ پاسدار وہیں ایک طرف کھڑے کھڑے پہلے اِدھر اُدھر اپنی شکاری نظر سے کچھ دیکھتے رہے، پھر یوسف آقا کی طرف دیکھ کر بولے۔ ''صرف آٹھ منٹ!''

''چشم، آپ کا حکم سر آنکھوں پر جناب۔'' یوسف آقا نے ادب سے سر جھکائے، غصہ سے کانپتے جسم کو سنبھالتے ہوئے کہا۔

''شادی کا گھر ہے، آپ آئے، ہمارے مہمان ہوئے۔ منھ تو میٹھا کرتے جائیں۔'' پیسٹری کی پلیٹ اُٹھاتے ہوئے صنوبر کے چچا جمال آقا نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''ہم ڈیوٹی پر ہیں، شاہ کا دَور گیا جب رشوت کے ساتھ کام ہوتا تھا۔'' ہنستے ہوئے پاسداروں نے کہا اور چلے گئے۔ اس بات کو سن کر نہ صرف جمال آقا کی آنکھیں نہیں بلکہ سب کی آنکھیں نیچے جھک گئیں۔ خاطر تواضع، عزت و تکریم جو ایرانی معاشرہ کا گہنا تھا، کیا ہوا اس کو! یا اللہ!!

مہمانوں نے ایک ایک کر کے وداع لی۔ یوسف آقا کے گلے میں کچھ گولے جیسا اٹک گیا تھا۔ ان کی پوچھنے کی ہمت نہیں پڑ رہی تھی کہ آیا، آپ نے کھانا کھایا یا نہیں؟ انہیں علم تھا، بہت سے لوگ باتوں میں وقت کو بھولے ہوئے تھے اور اس وقت ان کی چوکھٹ سے شادی کا کھانا کھائے بغیر جا رہے ہیں۔ ایسی حالت میں، جب وہ اصرار نہیں کر سکتے، تو پوچھنے سے فائدہ بھی کیا؟ صنوبر اور جمیل اپنی سجی کار میں بیٹھ کر رُخصت ہو گئے تھے۔ کسی بھی قسم کی بدمزگی کے ڈر سے خوفزدہ گھر کے لوگ ٹھیک سے بیٹی کو وداع بھی نہیں کر پائے تھے، جبکہ چہروں پر آنسوؤں میں ڈوبا غم تھا جس کو خوف اور ناراضگی نے جذب کر لیا تھا۔

۱۴

سرحد سے کافی فاصلے پر خالد اور پری ایک کار میں بیٹھے خبر کے منتظر تھے کہ کب سرحد پار کرنے کا اجازت نامہ آتا ہے۔ کچھ فاصلے پر ایک دھبہ سا نظر آیا۔ کچھ قریب آنے پر معلوم ہوا کہ شلوار کرتا پہنے ایک بلوچی ہے۔ خالد کار سے اُتر کر اور آگے بڑھا۔ بلوچی کے پیچھے دو اور ایرانی نظر آئے۔ ایک جگہ پر جا کر چاروں مل گئے۔ کچھ دیر گفتگو ہوئی۔ خالد کے چہرے کا رنگ بدل گیا تھا۔ پہلے وہ سمجھتا رہا، پھر اُداسی سے مڑا۔ اس کی آنکھیں کچھ عجیب وغریب تاثر لیے ہوئے تھیں، جس میں درد بھی تھا اور دُکھ بھی، مگر ان سب سے اوپر ایک مجبوری بھی رقص کر رہی تھی۔ اتنے سارے تاثرات کو ایک ساتھ خالد کی آنکھوں میں دیکھ کر پری کچھ سمجھ نہیں پائی۔ پری کی آنکھوں سے ٹپکتی سوالیہ بے چینی کو دیکھ کر خالد نے اس کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیا اور اسے آہستہ سے لبوں اور آنکھوں سے لگایا۔ جب سر اُٹھایا تو پری نے اس کی آنکھوں میں موسم پائز کی بارش کی بوندوں کی نمی دیکھی۔

''کیا بات ہے؟ بولو تو؟ میرا تو دل بیٹھا جا رہا ہے؟''

خالد خاموش رہا، ایک دو بار منہ کھولا پھر خاموش رہ گیا۔ اس کی ان حرکات سے پری اور زیادہ بیقرار سی ہو گئی۔

''کچھ تو بولو۔ خالد! تمہیں بچوں کی قسم ہے۔''

''کیا بولوں! جو بات خود حلق سے نہیں اُتار پا رہا ہوں، وہ تم سے کیسے کہوں!''

''کہہ کر تو دیکھو۔ میں نے آج تک کبھی تمہارا کہا ٹالا ہے؟''

''لیکن یہ بات میری خواہش کے برخلاف ہے، تم سنوگی تو تمہارے نسوانی احساس کو گہرا صدمہ لگے گا۔''

''میں تم سے کیا کہوں! تم نے شاید مجھے پوری طرح سمجھا ہی نہیں۔ موقع ہی

کب ملا ہے تمہیں؟"

"مجھے شرمندہ مت کرو! زندگی بھر تمہاری پھٹکار اور سرزنش کا منتظر رہا تو تم خاموش رہیں، آج جب مکمل وجود کے ساتھ تمہارے جذبات کی قدر کر رہا ہوں تو طعنہ دے رہی ہو۔ میرے تئیں ہمیشہ غیر منصفانہ سلوک کیا ہے تم نے۔"

"شکوہ کرنے کا میرا حق بھی تم نے چھین لیا، میں اشتعال اور خوف سے مری جا رہی ہوں اور تم ہو کہ میری رگوں کی مضبوطی کا امتحان لے رہے ہو۔"

"کیا کہہ رہی ہو؟"

"بغیر کہے بھی تو کچھ سمجھا کرو۔ مجھے سمجھو۔ اپنی بیوی، اپنی ہمسفر کو۔ مجھ سے ایسا سلوک کرتے ہو جیسے کوئی مہمان سے کرتا ہے۔ یا پھر دشمن سے راز چھپاتا ہے۔ اپنوں کے درمیان کوئی جذبہ، کوئی خیال چھپانا میں جرم سمجھتی ہوں۔ اس وقت بھی تم مجھ پر بہتان تراشی کر رہے ہو کہ تم سے ہمیشہ غیر منصفانہ سلوک کیا ہے میں نے......؟ زبردستی چیزیں چھینی جا سکتی ہیں، لیکن جذبے نہیں۔ جذبات کی کلیاں خود پھوٹتی ہیں...... میں تم سے اپنی محبت قانون کے ذریعے مانگ کر کرتی بھی کیا، جب تم میرے پہلو میں رہ کر بھی میرے نہ بن پاتے!" ہمیشہ کی کم سخن پری بے تکان بولے جا رہی تھی۔

"خیر! سنو، ہم واپس چلتے ہیں، تمہاری طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔" خالد نے پری کا چہرہ محبت سے دونوں ہاتھوں سے تھپتھپایا۔

"کیوں واپس چلیں؟ اچانک کیا ہو گیا؟"

"ہوا یہ ہے کہ وہ جو شرط لگا رہے ہیں یا سمجھو ترکیب بتا رہے ہیں اس کے بغیر سرحد پار کرنا ناممکن ہے، میرے لیے اور خاص کر تمہارے لیے، اس بات پر عمل کرنا بہت مشکل ہے۔"

"سنوں تو آخر ہوا کیا؟" پری نے کہا۔

اسی درمیان وہ تینوں چلتے ہوئے ان کی طرف آئے اور آدھے فرلانگ کی دُوری سے بولے۔ "ہاں جی! کیا سوچا؟"

خالد نے اشارے سے پانچ منٹ کا وقت مانگا، پھر اچانک بول پڑا۔ "ان کا کہنا

ہے کہ آج کل سرحد کے پار وہ ہی جا سکتے ہیں، جن کا شوہر پاکستان میں ہو۔ اس لیے عورت کو کسی فرضی نام سے شادی کرنی پڑتی ہے، اس پار جا کر طلاق ہو جاتا ہے، مگر اس سے سرحد پار کرنے والی خانہ پُری ہو جاتی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس درمیان اتنے ایرانی گئے ہیں کہ اب پابندی لگا دی گئی ہے۔"

خالد ایک سانس میں تمام باتیں کہہ کر، سیٹ سے ٹک کر بیٹھ گیا۔ جبڑے کی اُبھری ہڈی کے ہلنے سے ایسا لگ رہا تھا کہ وہ حالات کے اس بے رحم موڑ پر اور اپنی بے بسی پر دانت پیس رہا ہے۔ پری کو تو جیسے سکتہ ہو گیا۔ منھ کھولے وہ کبھی خالد کو تکتی تھی تو کبھی سامنے چٹیل میدان میں کھڑے ان تین بندوق والوں کو۔ پانچ منٹ گزر گئے، دونوں اپنی اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ وہ تینوں بندوق بردار آگے بڑھے اور آہستہ آہستہ چلتے ہوئے کار کے قریب آ کر کھڑے ہو گئے۔ ان میں سے ایک زور سے کھنکارا جس کی آواز سے خالد نے چونک کر سر گھمایا، پھر پری کی جانب دیکھا، جس کی آنکھوں سے بے شمار آنسو گر کر کالی چادر میں جذب ہو رہے تھے۔

"حاجی آقا! اس کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے، آپ کی بیوی ہماری بہن۔ ہمارا ایمان اسلام ہے، کوئی قابلِ اعتراض اور غیر مہذب اقدام نہیں اُٹھائیں گے۔ ہماری ایک زبان ہے۔ پیسہ آپ سے لیا ہے، پورا کام جان پر کھیل کر کریں گے، آخر یہ ہماری روزی روٹی کا سوال ہے۔"

اس کی باتوں سے پری چونکی۔ دل کو تسلی سی ہوئی جیسے کوئی کہہ رہا ہو، وقت کی یہ ستم ظریفی بھی سہہ لو۔ جو کبھی نہ سوچا وہ بھی کرنا پڑ رہا ہے۔ پری نے ہاتھ بڑھا کر خالد کا ہاتھ چھوا اور کہا۔ "جواب دے دیں کہ ہم راضی ہیں۔"

سوسن کا گاؤں والا گھر مرمت کے بعد رہنے کے لائق ہو گیا تھا۔ آنگن بھی پھولوں کے پودھوں سے بھر گیا تھا۔ اس کی گود بھی دو ماہ بعد بھرنے والی تھی۔ پورا دن وہ چھوٹے موٹے کپڑے سینے اور ننھی رضائیوں پر لیس لگانے میں گزارتی تھی۔ عباس آغا

نے بھی زراعت کا کام اچھا خاصا جما لیا تھا۔ فصل کٹنے کو تیار تھی۔ باپ دادا کی جمی جمائی عزت حاصل ہو گئی تھی۔ لوگوں سے محبت ملی۔ محنت سے زمین نے بھی سونا اُگلا۔ ہر طرح سے دونوں خوش تھے۔ اس وقت بھی گھر کے آنگن میں بیٹھے ہوئے چائے پی رہے تھے۔

''چلیے، ستاروں والا کھیل کھیلتے ہیں۔''

''یہ کیا ہوتا ہے؟ مجھے تو معلوم نہیں ہے، پہلے بتاؤ تو مجھے؟''

''دیکھیے، اپنی پسند کا ستارا آپ منتخب کر لیں، میں آسمان پر بکھرے ستاروں میں سے آپ کی پسند کا ستارا ڈھونڈوں گی، ڈھونڈ لیا تو آرزو پوری، نہ ڈھونڈا تو......''

''یہ تو......''

''آپ منتخب کریں۔''

''ہوں! اچھا......لو کر لیا منتخب......''

سوسن پانچ سیکنڈ تک سر اُٹھائے آسمان کا معائنہ کرتی رہی، پھر مشرق کی جانب سب سے روشن اور بڑے ستارے کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ''وہ دیکھیے! وہ رہا آپ کا ستارا!''

اس کی اس ادا پر عباس کھلکھلا کر ہنس پڑے۔

''کیوں؟ کیا میں نے ٹھیک نہیں بتایا؟''

''بالکل صحیح بتایا ہے، وہی ہے میری پسند کا ستارا۔''

''اب یہ بھی بتا دوں، کیا آرزو کی تھی؟''

''اگر بتا دو تو میں مان جاؤں گا کہ یہ لڑکیوں والا کھیل نہیں ہے، بلکہ علم نجوم کی عالمہ ہو تم!''

''آپ نے اپنے آنے والے بچے کا تصور لڑکے کی شکل میں کیا ہے۔ کیوں ٹھیک ہے؟''

''ایک دم! لیکن یہ کیسے جانا؟''

''بس جان لیا۔ تھوڑا سا بھی انسانی نفسیات کا علم ہو تو انسان کڑیاں جوڑتا

چلا جاتا ہے۔''

اسی درمیان باہر سے کسی نے آواز لگائی اور عباس 'ابھی آیا' کہہ کر باہر نکلے۔

سوسن نے سارے جھوٹے برتن سمیٹے اور کچن میں جاکر رکھے، پھر اپنے کمرے میں جاکر اُس نے ٹی۔وی کھول دیا۔ تصویر دھندلی نظر آرہی تھی۔ جلوس کا منظر تھا۔ بچے نعرے لگارہے تھے۔ ہاتھوں میں بڑے بڑے پوسٹر تھے، پھر میدان جنگ کی خبریں آئیں۔ گرتے مکان، روتے بلکتے لوگ، بکھری لاشیں۔ اس کے بعد آیت اللہ خمینی کی تقریر شروع ہوئی۔ سوسن نے ٹی۔وی بند کردیا اور ریڈیو کھول کر موسیقی سننے لگی۔

''کہاں ہوگی پری اس وقت؟ جانے ملیحہ کا کیا حال ہے؟ طیبہ تو جانے کن بھول بھلیوں میں پھنسی ہوگی، خدا کرے زندہ ہو، ہم میں سب سے اچھی مہناز نکلی، کم سے کم ملک سے دُور بیرونِ ملک میں خوشی سے تو رہ رہی ہے۔ اس طرح فکر و خوف سے اَدھ مری تو نہیں رہتی ہوگی۔ کیوں نہ مہناز کو خط لکھا جائے، شاید کل کوئی شہر جائے تو وہیں سے پوسٹ کردے گا۔' یہ سوچ کر سوسن بستر سے اُٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی اور خط لکھنے لگی۔ دل کی بہت ساری باتیں لکھیں۔ ماضی کی شیریں یادوں کا ذکر کیا۔

''کیا لکھ رہی ہو؟ آج کھانا نہیں کھاؤ گی؟''

''اوہ، آپ آگئے۔ ابھی کھانا لگاتی ہوں، آپ کپڑے تبدیل کرلیں۔ کہاں چلے گئے تھے؟ بڑی دیر میں لوٹے؟ میں نے بور ہوکر مہناز کو خط لکھنا شروع کردیا۔'' کہتی ہوئی سوسن کچن کی جانب چل پڑی۔

کھانے کے بعد دونوں ہمیشہ کی طرح باہر ٹہلنے نکلے۔ راستے میں رُک رُک کر باتیں اور سلام کرتے ہوئے وہ کھیت کی جانب چل پڑے۔

''جنگ نے خوفناک شکل اختیار کرلی ہے۔ جنوب کی طرف حالات خطرناک ہیں۔''

''جانے یہ جنگ کب ختم ہوگی! ہر بہانے سے ایرانی جوان مر رہے ہیں۔ کیا ہوگا آگے؟''

''خدا جانے۔''

ٹہل کر جب وہ لوٹ رہے تھے تب انہیں کسی نے خبر دی کہ پچھڑے علاقوں کی

ترقی کے لیے بنی تنظیم 'جہادِ سازندگی' اس گاؤں میں حمام خانہ تعمیر کروانے والی ہے۔ خبر اچھی ہے، لیکن حمام خانہ گاؤں کے درمیان بنے گا۔ سن کر عباس کے کان کھڑے ہوئے۔ سمجھ گئے کہ جاسوسی کا نیا انداز شروع ہونے والا ہے، تاکہ وہاں سے پورے گاؤں پر نظر رکھی جاسکے کہ کون آرہا ہے، کیا کر رہا ہے وغیرہ وغیرہ، ورنہ حمام ہمیشہ آبادی سے تھوڑا فاصلے پر بنتا ہے تاکہ لوگوں کو جھجک نہ ہو۔ اس خبر پر عباس آغا کچھ بولے نہیں۔ بس سر ہلا کر رہ گئے۔

رات کو سوسن گہری نیند میں ڈوب گئی، لیکن عباس کی آنکھوں میں نیند نہ تھی۔ وہ چُپ چاپ تکیے پر سر رکھے مستقبل میں ظہور ہونے والے خطرات کا تصور کر رہے تھے۔ انہیں لگ رہا تھا کہ عام آدمی کب اس زمین پر اپنی مرضی سے جئے گا؟ کب تک یہ سائے اس کا تعاقب کرتے رہیں گے؟ آخر کب تک؟

تہران یونیورسٹی کے پاس سے گزرتی ہوئی طیبہ نے ٹھنڈی سانس بھری، دروازہ بند تھا۔ دروازے کے اُوپر نیلے، لال الفاظ سے لکھا تھا کہ یونیورسٹی تہذیبی انقلاب کے بعد کھلے گی، یعنی ابھی ایک اور انقلاب آنا باقی ہے۔ دو سال سے پورے ایران کی یونیورسٹیاں بند ہیں۔ صرف جمعہ کو نماز ادا کرنے کے لیے لاکھ ڈیڑھ لاکھ عورت و مرد جمع ہوتے ہیں۔ دروازے کے دونوں طرف بالو کی بوریوں کے پیچھے بیٹھے مسلح فوجی کس دہشت کے لیے؟ کسے نشانہ بنانا چاہتے ہیں؟ جو تھے وہ تو بھاگ گئے، مارے گئے یا زمین دوز ہوگئے پھر......؟ دو سال قبل یہیں، اس یونیورسٹی کے سامنے شاہ کے خلاف مظاہرہ کرنے والے لڑکوں پر شاہی فوج نے مشین گنیں چلائی تھیں، جو دُنیا کی پانچویں طاقت سمجھی جاتی تھی۔ اپنے ہی ملک کے طلباء کے سینے چھلنی کیے تھے۔ نالیوں، فٹ پاتھوں اور سڑکوں پر لاشیں ہی لاشیں تھیں۔ چار سولڑ کے دو گھنٹے میں دم توڑ گئے، البرز کی پیشانی سے ٹپکتا پانی، جو چنار کی جڑوں کو سینچتا بہتا رہتا تھا، جس سے تھکے راہ گیر ہاتھ منھ دھوتے تھے، اس روز خون سے لال ہوگیا تھا۔ لگ رہا تھا جیسے خون کی ندی بہہ

رہی ہو اور وہی تاریخ اس کیمپس میں کچھ عرصہ بعد پھر دہرائی گئی۔ موجودہ حکومت نے سڑکوں کے اس پار سے دھواں دھار مشین گنوں کے ذریعہ یونیورسٹی کے اندر لڑکوں کو بھون کر رکھ دیا تھا۔ پھر سب کچھ منتشر ہو گیا، ختم ہو گیا۔

آج اسی یونیورسٹی کی سلاخوں پر لوگ بڑے بڑے رنگین پوسٹروں کی دُکان لگائے اسے فروخت کر رہے ہیں۔ سامنے ہی مذہبی کتابیں تخت پر سجی ہیں۔ پہلے بھی یونیورسٹی کے سامنے کتابوں کی دُکانیں بھری رہتی تھیں۔ انقلاب کے بعد تو جیسے پڑھنے والوں کا سیلاب تھا جو کتابیں خریدنے اور پڑھنے کے لیے اُمڈا چلا آتا تھا۔ کیسی اہم کتابیں شائع ہوئی تھیں! گزشتہ پچاس برسوں سے دُھول میں اَٹے مسودے شائع ہو کر دُکانوں میں بھر گئے تھے۔ مگر یہ نور کتنے وقت کے لیے تھا؟ ایک سال بعد ہی سب کچھ ختم ہونے لگا۔ آج اس سرزمین پر پڑھا لکھا ہونا سب سے بڑی گالی ہے۔ اب نہ کتابیں بچی ہیں، نہ مسودے، نہ مصنف۔ سب کیسے سازشی طریقے سے ہوا ہے؟ طیبہ خیالوں میں ڈوبی چلتی جارہی تھی۔

ایک وقت تھا، جب ہر بدھ کو تمام ادیب و شاعر 'کانون نوسندگان' کی انجمن میں جمع ہوتے تھے۔ کیا غضب کے مضامین پڑھے جاتے تھے! پھر ان ادیبوں اور شاعروں کو، جو موجودہ حکومت کے تئیں نرم تھے، نکال دیا گیا۔ کچھ آزاد ہو کر، گھر میں بیٹھ کر مضامین تحریر کرنے لگے اور کچھ نے 'تودہ' جماعت کی انجمن مصنفین کو قبول کر لیا اور اس انجمن مصنفین نے موجودہ حکومت کی تعریف میں زمین و آسمان کے قلابے ملا دیے! کیا دانشوران اتنے موقع پرست ہو سکتے ہیں! کیا کیا سازشیں نہیں کیں اُن لوگوں نے! ایک ایک کر کے ترقی پسند کانون نوسندگان کے ممبروں ظلم و ستم بڑھنے لگے۔ ملازمت پچھلے دو سال سے سب کی کمیونسٹ ہونے کی وجہ سے ختم ہو چکی تھی۔ پہلے جمع کیا ہوا کھایا گیا، پھر اشیا فروخت ہونے لگیں، پھر فاقے شروع ہوئے، لیکن...... اپنی کلاس کی دھاندلی اور مکاری کتنی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ ایک بار پھر انقلاب کو تباہ کر دیا۔ پھر سب کچھ ختم کر دیا...... کتنے ذلیل ہو سکتے ہیں موقع پرست بھی!

سامنے سنیما ہال تھا۔ غضب کی بھیڑ تھی۔ پولینڈ کی کوئی فلم لگی ہوئی تھی۔ طیبہ کے

لیے سڑک پر چلنا دشوار ہو گیا۔ گرمی کی شدت سے حلق خشک ہو رہا تھا۔ پسینہ اس کے جسم سے بہہ رہا تھا۔ مڑ کر وہ پھلوں کی دُکان کی جانب بڑھی اور ایک گلاس شربت کے پیسے کاؤنٹر پر رکھے۔ شربت پینے کے بعد وہ باہر نکلی۔ ابھی صرف تین بجے ہیں، پندرہ منٹ باقی ہیں مصطفیٰ کے آنے میں۔ آگے جانا بیکار ہے۔ طوس کتاب فروش کے قریب انہیں ملنا ہے۔ آہستہ آہستہ وہ ونڈو شاپنگ کرتی ہوئی چلنے لگی۔ یہی سڑکیں تھیں، انقلاب کے شروع میں کتابوں، پمفلیٹوں، کیسٹوں اور جانے کن کن چیزوں سے دُکانیں بھر گئی تھیں۔ یہ دُکانیں زیادہ تر پڑھے لکھے یا بیرونِ ملکوں سے تعلیم حاصل کرنے والے لڑکوں نے کھولی تھیں۔ ویزا لوٹنے کا ملا نہیں اور یونیورسٹی بند۔ بیکاری، مہنگائی اور ماں باپ پر بوجھ۔ کتنوں کے تو والد بھی وقت سے پہلے رٹائر کر دیے گئے تھے، لیکن کچھ دن بعد وہ دُکانیں بھی میونسپلٹی نے زبردستی بند کرا دیں...... ہر لمحہ سانس لینے کی جدوجہد کتنی مشکل، کتنی دشوار ہے! حکومت ہر طرح سے طالب علموں اور ترقی پذیر جماعت کو توڑنا چاہ رہی ہے۔ پیسے، بیکاری، موت، جیل، ہر طرح کی پریشانیاں ان کے لیے موجود ہیں۔ مارکسی خیالات کے اظہار پر پابندی...... اس کا کہنا ہی کیا!

طیبہ کی جان پہچان کے کئی لوگ نظر آئے، لیکن انہوں نے طیبہ کو پہچانا نہیں۔ طیبہ کو اطمینان ہوا کہ سر پر اسکارف باندھ کر اور ڈھیلا ڈھالا کوٹ پہن کر واقعی وہ بدل گئی ہے۔

اس نے دُور سے ہی طوس کتاب فروش کے سامنے فٹ پاتھ پر لگی اخبارات کی دُکان پر مصطفیٰ کو کھڑا دیکھ لیا تھا۔ وہ تیزی سے آگے بڑھی اور دُکان پر پہنچ کر آہستہ سے بولی۔ ''سلام۔''

مصطفیٰ نے کن انکھیوں سے اُسے دیکھا۔ طیبہ نے اخبار کی ایک کاپی اُٹھائی پھر پیسوں کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا اور کاغذات نکال کر اُنہیں اخبار کے درمیان رکھا اور موڑ کر اخبار کو بازو کے بیچ دبا کر وہ دوسری میگزین دیکھنے لگی۔

مصطفیٰ نے بڑی پھرتی سے طیبہ کے بازو کے بیچ سے وہ مڑا اخبار نکالا اور آگے بڑھ گیا۔ طیبہ خاموش کھڑی میگزین دیکھتی رہی۔ پھر بڑے اعتماد سے مڑی اور سڑک پار کر کے بس اسٹاپ پر جا کر کھڑی ہو گئی۔ اس کا دل ہلکا ہو گیا تھا۔ کل اس مضمون کو اس

کے اخبار میں شائع ہونا تھا۔ پوری رات بیٹھ کر اس نے لکھا تھا، پھر فون کا انتظار کرنے لگی تھی۔ تقریباً دو بجے رات کو فون کی گھنٹی بجی تھی۔ اُٹھاتے پر صرف کوڈ دہرایا گیا تھا،
''دس مصطفیٰ تو سی، یاعلی!''

اس نے رانگ نمبر کہہ کر رکھ دیا تھا۔ زیادہ بات کرنا تو دُور، آج کل وہ صرف الفاظ کی ادائیگی کرتے تھے۔ اس کی وجہ تھی کہ زیادہ تر پرائیویٹ فون ٹیپ ہوتے تھے۔ جنگ کے تمام معذورین اسی کام پر تعینات تھے۔

طیبہ گھر سے صبح نو بجے نکلی تھی۔ دس بجے ملنا تھا۔ پوری گلی پاسداروں سے بھری تھی۔ اسی گلی میں دو ایسے لوگوں کے گھر تھے جو حقیقتاً اہم تھے۔ کیونکہ ہمیشہ رات کے بارہ بجے کے بعد وہاں پر کاروں کی آمد و رفت شروع ہوتی تھی۔ کون تھے، کیا تھے، معلوم نہیں ہوسکا تھا۔ ابھی کچھ دنوں سے یہ سلسلہ شروع ہوا تھا۔ پہلے یہ دونوں مکان خالی تھے۔ اس کے دونوں مالک شاہی فوج میں افسر تھے اور موجودہ حکومت کے اقتدار میں آتے ہی پھانسی پر چڑھا دیے گئے تھے۔ خاندان کا کیا ہوا تھا کچھ پتہ نہیں چل پایا۔ بس ایک خبر کافی دنوں تک لوگوں کی بحث کا موضوع بنی رہی، کہ ان میں سے ایک افسر کی جوان لڑکی زہرا، جو بہت حسین تھی، انہیں مولویوں میں سے کسی کے گھر میں ہے۔ سچ یا جھوٹ، مگر لوگوں کا غصہ اکثر ظاہر ہوتا رہتا تھا، جس سے واقعہ کی حقیقت کا یقین ہونے لگتا تھا۔ ان کا خالی مگر سجا سجایا گھر سیاسی اڈہ بن چکا تھا۔ ایسے خالی گھر تہران کے ہر محلے میں بھرے پڑے تھے۔ کچھ رئیس لوگ تو نقدی وغیرہ سمیٹ کر انقلاب کے شروع میں ہی بھاگ گئے تھے۔ کچھ کے پاس کئی کئی مکان ہونے کے باعث ان سے مکان اور کوٹھیاں چھین لی گئی تھیں۔ طیبہ دل ہی دل میں سوچ رہی تھی۔ اس جیسے لوگوں کے پاس نہ گزرے کل، نہ آج اور نہ آنے والے کل میں کچھ ہوگا۔ شاید کل یہ جسم بھی نہ رہے۔ کچھ بھی معلوم نہیں...... ایک ایک کر کے تمام ساتھی ٹوٹی مالا کے موتی کی طرح بکھرتے جا رہے ہیں۔

اس وقت دوپہر کے بارہ بج رہے تھے۔ گلی میں سنّاٹا چھایا ہوا تھا۔ صرف نان بائی کی دُکان پر روٹی کے لیے بہت بڑی قطار لگی ہوئی تھی۔

سیڑھیاں چڑھ کر وہ اُوپر پہنچی۔ کمرے کا دروازہ کھول کر وہ اندر داخل ہوئی۔ دھوپ کی شعاعیں پڑھنے والی میز پر پڑ رہی تھیں۔ اس نے چھت کی جانب کھلنے والے دروازے کے پردے کھینچے اور دروازہ کھولا۔ کمرہ روشنی سے منور ہوگیا۔ 'کتنا گندا ہو رہا ہے یہ کمرہ۔' سوچتے ہوئے طیبہ نے جوتے اُتارے، چپلیں پہنیں، پھر برش ہاتھ میں لے کر قالین کو صاف کرنے لگی۔ اس سے فارغ ہو کر کرسی، میز، الماری کی دُھول صاف کی۔

چھت پر دھوپ پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے لحاف، کمبل اور کچھ گرم کپڑے دھوپ میں ڈال دیے، پھر پانی سے جگ بھر کر، سیڑھیوں پر رکھے گملوں میں پانی ڈالنے لگی۔ سوکھی، مرجھائی پتیوں کو ہری بھری پتیوں کے درمیان سے توڑ کر الگ کر رہی تھی اور دِل ہی دِل میں سوچ رہی تھی، 'ان کی نہ آنکھیں، نہ زبان، لیکن احساس کی آنکھیں، محسوس کرنے کی زبان کیسے پورے جسم پر ریشے اور نسوں کی شکل میں پھیلی ہوئی ہے۔'' اس نے محبت سے پتیوں پر ہاتھ پھیرا۔ جیسے کسی بچے کے سر پر، اس کے گھنے بالوں میں ہاتھ پھیر رہی ہو۔ ربر کے اُونچے پودھے بڑے بڑے پتوں کو رومال سے صاف کرتی ہوئی بولی۔ ''کاش! تمہارے کان اور زبان ہوتی تو میری یہ تنہائی کٹ جاتی۔ میں بولتی، تم احساس کی آنکھوں اور کانوں سے سنتے، لیکن اس کا جواب، تمہارے خیالات تو میں نہیں سن پاتی۔ کتنا اچھا ہوتا، تم سب مجھ سے باتیں کرتے، اپنی دُنیا کی، اپنے غم و خوشی اور جذبوں کی! لیکن میں اِن بے جان دیواروں، خالی الماری کے بیچ بالکل اکیلی ہوں۔ بس ایک احساس سے تقویت ملتی ہے کہ میری طرح کوئی دوسرا ہے جو سانس لیتا ہے۔ رات دن کے ساتھ اپنی پہلی حالت سے آگے بڑھتا ہے، بڑا ہوتا ہے، حرکت ہی تو زندگی ہے، وہ زندگی تم میں ہے، ان دیواروں میں نہیں ہے۔ یہ تو ایسی دیواریں ہیں جو محل اور جیل خانہ بناتی ہیں۔ سرحد کی نگرانی کرتی ہیں، آسمان سے خود کو الگ کر کے اندر سمٹتی ہیں، لیکن تم سب آسمان کی جانب بڑھتے ہو، سر اُونچا کر کے، اور کبھی کبھی اتنے

باغی ہو جاتے ہو کہ چھتیں توڑ کر ان کے اوپر سے اپنی شاخیں نکال لیتے ہو۔ میرے بے زبان ہمسفر! تم بھی دوسروں کو زندگی دینے والے ہو، پرواز کی تمنا، آزادی کی تمنا سے لبریز تمہارا وجود ہمیشہ پتیاں گرا کر پھر کونپلیں پھوڑتا ہے۔ پھر...... نئی زندگی، نئی اُمنگ، نیا جوش تمہارے اندر کتنی گہرائی میں بیٹھا ہوا ہے!''

طیبہ نے صفائی ختم کر کے ہاتھ دھوئے، پھر ریفریجریٹر کھولا۔ پانی کی ایک بوتل نکالی۔ بھوک کس کر لگ رہی تھی۔ پانی پی کر وہ تھوڑی دیر تک چھت پر ٹہلتی رہی۔ سامنے البرز کی برفیلی پہاڑیاں نظر آ رہی تھیں اور ان کے نیچے مکان۔ یہ مکان حقیقتاً مکان ہیں یا جیل خانے! ان کے اندر رہنے والے واقعی خوش ہیں؟ اپنی زندگی جیتے ہیں؟ اپنے جذبوں اور خیالوں کے ساتھ سانس لیتے ہیں یا خود کو اپنے وجود کے تہہ خانے میں چھپا کر، وقت کا نقاب لگا کر جیتے ہیں۔

کبوتروں نے آ کر منڈیروں پر بیٹھنا شروع کر دیا، جنہیں دیکھ کر طیبہ کو خیال آیا کہ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا ہے، لیکن اس نے تو کچھ پکایا ہی نہیں ہے۔ یہ کبوتر چاول کھانے روز پہنچ جاتے ہیں، وہ پتیلے میں تھوڑے سے چاول ہمیشہ چھوڑ دیتی تھی۔ الماری کھولی، چاول کا ڈبہ خالی تھا۔ فریج کھول کر روٹیوں کا تھیلا نکالا۔ تھیلے کا منہ کھولا۔ ہفتہ بھر پہلے کی روٹی تھوڑی سی بچی ہوئی تھی۔ ایک بڑا ٹکڑا توڑ کر اس نے اس کے ننھے ننھے ٹکڑے کیے اور مٹھی میں بھر کر چھت پر بکھیر دیے۔ پر پھیلا کر سات آٹھ کبوتر منڈیر سے اُترے اور روٹی کے ننھے ننھے ٹکڑے گردن ہلا ہلا کر کھانے لگے۔ قریب رکھے کوزے میں طیبہ نے پانی بھر دیا اور جا کر دھوپ میں پھیلے ہوئے لحاف پر دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ پاؤں سامنے پھیلائے بڑی توجہ سے وہ کبوتروں کو دیکھنے لگی۔

چھت سے دھوپ آہستہ آہستہ جا رہی تھی۔ کبوتر کھا پی کر پھر منڈیر پر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر غٹرغوں کرتے رہے۔ چونچ سے ایک دُوسرے کو گدگداتے رہے، پھر ایک دم پھڑ پھڑا کر اُڑ گئے۔ طیبہ نے گردن اُوپر اُٹھائی اور بولی۔ ''امن کی علامت! پھر آنا اس مردہ ماحول میں مجھے اُڑان کا پیغام دینے۔''

طیبہ کے پیٹ میں بھوک کی وجہ سے درد شروع ہو گیا تھا۔ وہ اپنی جگہ سے اُٹھی

اور انڈے نکال کر تلنے لگی۔ کھانا کھا کر اس نے چولہے کی صفائی کی، برتن دھوئے، پھر بستر لپیٹ کر کمرے میں پلنگ کے نیچے رکھا۔ کپڑے الماری میں ٹانگے، پھر کمرہ بند کرکے وہ خاموشی سے بستر پر دراز ہوگئی۔ معاً اُس کے دماغ میں ایک ماہ قبل کا وہ منظر گھوم گیا، جو اس نے اس دن پانچ سو بارہ نمبر کے فلیٹ میں دیکھا تھا۔ کیسا تھا اس کا شروع اور آخر! ہنسی کے پیچھے رونا، میک اَپ کے پیچھے دُکھ کا پیلا رنگ اور موسیقی، اور رقص کے پیچھے موت کے بین، لیکن اس کے باوجود تنہائی کا سانپ انہیں نہیں ڈستا ہے۔ جیل کی گھٹن جیسا دباؤ بھی ان کا دم نہیں گھوٹتا ہے۔ وہ خود کے جذبات کو جیسے تیسے عیاں کرلیتی ہیں مگر ہم لوگ! ہم جیسوں کے اظہار پر تلواروں کی نوک رکھی ہے۔ قلم کاغذ جن سے سب سے گہرا رشتہ تھا وہی چھین لیے گئے۔ خیال و افکار کے ابراز و اظہار کی آگ گزشتہ دو برسوں سے جل رہی ہے جس میں ہر مصنف کے خیالات بھسم ہوکر دُھویں کی لکیر میں تبدیل ہوکر فضا میں تحلیل ہو گئے ہیں۔

سوچتے سوچتے طیبہ کو نیند آگئی۔ گہری نیند میں ڈوبا اس کا دماغ حال سے جدا نہیں ہو پایا تھا۔ خواب کی شکل میں وہ اس وقت سڑک پر تیزی سے بھاگ رہی تھی اور پیچھے مشین گن سے نکلتی گولیاں اس کے اِدھر اُدھر سے نکل رہی تھیں، اچانک سامنے سے بھی مشین گن لے کر پاسدار آگئے اور دونوں طرف کی گولیوں کی بوچھار کے بیچ اس کا جسم چھلنی ہوکر وہیں زمین پر لوٹ رہا تھا۔

گھبرا کر وہ خواب سے بیدار ہوئی۔ پورا جسم سُن تھا۔ بہت دیر تک وہ نیم خوابیدہ سی پڑی رہی۔ پھر اس کا ذہن بیدار ہوا کہ وہ اپنے کمرے میں اپنے بستر پر لیٹی ہوئی ہے۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ وہ کافی دیر تک سوئی تھی۔ لیمپ جلانا چاہا تو ہاتھ نہیں ہلا۔ ایسا محسوس ہوا کہ پورا جسم لکڑی کا ہوگیا ہے۔ پاؤں بڑی مشکل سے ہلائے۔ کسی طرح کروٹ بدلی۔ دل جیسے کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ پورا بدن پسینے میں تر تھا۔ ہاتھ بڑھا کر لیمپ جلایا۔ تھوڑا سا اُٹھی اور ٹیک لگا کر بستر پر بیٹھ گئی۔ شریانوں میں اب بھی ایک کپکپی سی تھی، جو دراصل اس کے اشتعال کے سبب ہو رہی تھی۔

بڑی مشکل سے وہ پلنگ سے نیچے اُتری۔ غسل خانے میں جا کر منھ ہاتھ

دھوئے۔ ٹھنڈا پانی پی کر چائے کا پانی گیس پر رکھا، گھڑی دیکھی، سات بج رہے تھے، یعنی وہ پورے تین گھنٹے سوتی رہی۔ تبھی فون کی گھنٹی بج اٹھی۔ وہ تیزی سے کمرے میں گئی۔ فون اٹھایا۔

"ہیلو۔"

"ساتھی چل بسا۔"

"نام؟"

"سعید۔"

"شہادت کا وقت؟"

"ٹھیک سے علم نہیں۔"

"دن؟"

"آج۔"

طیبہ کا ہاتھ کانپا۔

"تاریخ ۲۲رجون۔" آنکھیں جو کلینڈر پر جمی تھیں، آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ اُدھر سے فون رکھ دیا گیا، لیکن طیبہ فون پکڑے ویسے ہی بیٹھی رہی۔ گیس پر چڑھا پانی کھولتے کھولتے خشک ہوگیا تھا۔

پری تھوڑی دیر بعد محترمہ جلیس خان بن گئی تھی۔ کاغذ اسٹامپ سب کچھ تیار ہو گیا۔ نکاح نامہ موڑ کر پرس میں رکھ لیا۔ گاڑی خالد چلا رہا تھا، لیکن اس کے پاس پری نہیں...... بلکہ بندوق لیے بلوچی یعنی ایرانی سرحد کا محافظ بیٹھا تھا۔ پیچھے پری اپنے موجودہ بلوچی شوہر کے ساتھ بیٹھی تھی۔ ایک عجیب تجربے کی سرنگ سے دونوں میاں بیوی گزر رہے تھے۔

ایک میل چلنے کے بعد سرحد پوسٹ پر ایرانی اور بلوچی اُتر گئے اور جا کر بات چیت کی۔ خالد کی دی ہوئی پوٹلی میز کی دراز میں رکھتے ہوئے اس آدمی نے رجسٹر

میں نام لکھا...... "محترمہ اور محترم جلیس خان۔" پاسپورٹ نمبر وغیرہ ساری خانہ پوری کر کے وہ تینوں پھر کار میں بیٹھ گئے اور پسینے سے تر، ہوائیاں اڑتے چہرے کے ساتھ خالد نے کار چلائی۔ ایرانی سرحد سے نکل کر خالد نے لمبی سانس بھری۔ دل و دماغ کی تھکن جسم کی تھکن سے کہیں زیادہ تکلیف دہ ہوتی ہے۔

ایک میل چلنے کے بعد ان تینوں نے کار رکوائی۔ سب لوگ پری کو چھوڑ کر کار سے اترے۔ جلیس خان نے پری سے معافی مانگتے ہوئے کہا۔ "بہن، معاف کرنا، یہ رہا میرا طلاق نامہ۔" ساتھ ہی اس نے اس مصنوعی نکاح نامہ کو پری سے لے کر پھاڑ ڈالا اور دوسرے کاغذات ان کے سپرد کر دیے۔ تینوں نے خالد سے ہاتھ ملایا۔ خالد نے ان کا شکریہ ادا کیا اور پری کے قریب آ کر بولا۔ "آؤ، آگے آ کر بیٹھو!" پری نے کار سے اتر کر جلیس خان کی طرف اپنے ہاتھ میں پڑا کنگن اتار کر بڑھاتے ہوئے کہا۔ "بھائی، اپنی بیوی کو میری طرف سے یہ حقیر سا تحفہ دینا۔ جو احسان آپ لوگوں نے آج کیا ہے وہ آپ کے بچوں کے آگے آئے...... اچھا بھائی، خدا حافظ۔"

کار دھول اڑاتی ہوئی آگے بڑھنے لگی۔ پری اور خالد دونوں پُرسکون تھے۔ خیالات میں غرق تھے یا پھر بولنے کے لیے کون پہل کرے، اس کے منتظر تھے یا پھر آنے والی نئی مشکلات کو جھیلنے کے لیے نئی قوت پیدا کر رہے تھے۔

سوسن بیٹا پا کر خوشی سے پاگل ہو اٹھی تھی۔ دن رات اس کی دیکھ بھال اور پرورش میں لگے رہنے کے باعث وہ عباس کی طرف سے بھی لاپرواہی برتنے لگی تھی۔

عباس خود خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ شہر جا کر دُکان دُکان بھٹک کر ان مشکل بھرے دنوں میں بھی کار بھر کر کھلونے، کپڑے ماں بیٹے کے لیے لے آئے تھے۔ اس وقت وہ کسی بچے کی طرح سوسن کو دکھا رہے تھے۔

''یہ دیکھا سیٹ، پانچ دُکانوں کی خاک چھاننے کے بعد ملا۔ ہر دُکاندار یہی کہتا کہ ایک سال سے سامان آنا بند ہو گیا ہے۔ کویت اور پاکستان کے ذریعہ بھی مال نہیں آ رہا ہے۔ یہ سب دو سال پہلے والے اسٹاک سے بچی چیزیں ہیں...... لیکن دیکھو میں کیسے ڈھونڈ کر لایا ہوں۔''

''لیمن کلر تو میری جان ہے۔ سچ کتنا پیارا، کتنا خوبصورت ہے......!''

''یہ رہے تمہارے کپڑے اور یہ ہار۔'' کہہ کر عباس آغا نے زمرد کے ہرے نگوں کا ہار، جس کے بیچ میں امریکن ہیرے بھی چمک رہے تھے، سوسن کی سفید گردن میں پہنایا اور اپنے گرم ہونٹ وہیں رکھ دیے۔ سوسن کا چہرہ خوشی، محبت اور اطمینان کے جذبات سے سرخ ہو گیا تھا۔

''ایسی راحت کا تصور کون کر سکتا تھا، میرے خدا!'' سوسن نے جذباتی ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔

بچے کے رونے کی آواز سن کر وہ اپنی جگہ سے اُٹھی اور عباس کے سینے پر سر رکھ کر آہستہ سے بولی۔ ''شکریہ کے الفاظ نہیں ہیں۔'' پھر بچے کو گود میں اُٹھا کر وہ اسے بہلانے لگی۔

''آپ کپڑے تبدیل کر لیں۔ حمام گرم ہے، میں کھانا لگواتی ہوں۔''

بچہ ماں کی آغوش کی گرمی پا کر سو گیا۔ سوسن نے اسے آہستہ سے لٹایا۔ کچن میں جا کر کھانا لگانے کو کہا، پھر کمرے میں آ کر آئے ہوئے نئے کپڑوں میں سے ہری اسکرٹ اور اسی رنگ کا ٹاپ اس نے پہنا، میک اپ کیا۔ خوب گہرا مسکارا لگایا۔ رخسار کی سرخی اور لپسٹک ٹھیک سے، آئینے میں دیکھ کر، برابر کیں۔ بالوں کو کلپ سے آزاد کر کے شانوں پر بکھیر دیا۔ گلے میں جگمگاتا ہار اس کی سفید گردن میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔ تیار ہو کر اس نے عباس کے کپڑے نکال کر کمرے میں ایک طرف رکھ دیے اور

کھانے کے کمرے کی جانب چل پڑی۔

میز کو خاص طرح سے سجا کر، وہ کرسی پر بیٹھ کر عباس کا انتظار کرنے لگی۔

عباس بیوی کو دیکھ کر بڑے والہانہ انداز میں بولے۔ ''خوشی اور خوبصورتی کی کوئی تعریف نہیں ہے، وہ صرف محسوس کی جاتی ہے۔''

دونوں نے کھانا ختم کیا اور اپنے بیڈروم میں آگئے۔ سوسن نے کپڑے سمیٹ کر الماری میں رکھے اور کھلونے سجا دیے، پھر صوفے پر بیٹھ گئی۔ چائے آگئی تھی۔ ٹی۔ وی کھول کر عباس آغا بھی بیٹھ گئے تھے۔

پولینڈ کے ملازمین کا جلوس تھا، جو خبروں میں دکھایا جارہا تھا۔ اس کے بعد افغانستان کے مجاہدین اور پھر ہندوستان کے سرداروں کے احتجاج کے منظر کے بعد وہی ایران کی روز والی باتیں اور پھر آیت اللہ گلانی کی تقریر تھی۔

''ہر ملک میں ہنگامہ برپا ہے۔'' سوسن بولی۔

''لیکن ایران جیسے حالات کہیں بھی نہیں ہیں۔ ایرانی تاریخ کا یہ سب سے خونی دُور ہے۔ ہر انقلاب میں ایسا ہوتا ہے۔ ایک مخصوص وقت، ایک خاص زمانے تک۔ لیکن یہاں پر مارکاٹ دو سال سے چل رہی ہے۔ دشمن کون ہے، حقیقتاً اس کا بھی پتہ نہیں چل رہا ہے۔ کبھی کوئی گروہ دوست بنتا ہے، پھر وہی دشمن بن جاتا ہے۔ اتنا بڑا الجھاؤ ہے معاشرے میں کہ پوچھو مت۔ ریڑھ کی ہڈی ٹوٹ رہی ہے بیچارے عام انسانوں کی۔''

''چائے ڈالوں؟'' سوسن نے پوچھا۔

''ہاں، تمہاری ایک سہیلی تھی طیبہ، اس کی کوئی خبر ہے کہ آج کل وہ کہاں ہے؟''

''نہیں...... پری اور ملیحہ کو بھی اس کا پتہ نہیں ہے۔ جہاں بھی ہوگی، کچھ تخلیقی کام میں ہی لگی ہوگی۔'' سوسن نے اُداس ہوکر کہا۔

''آج معلوم ہوا کہ اس کے گروہ کا کوئی شاعر مار دیا گیا ہے۔'' عباس نے آہستہ سے کہا۔

''کون؟ کیا نام ہے؟''

''سعید سلطانپور! تم جانتی ہو؟''
''ہاں! ان کی نظمیں طیبہ کبھی کبھی ہمیں بھی سناتی تھی۔''
''اچھا!''
''آہ! کیسے کیسے دماغ ختم ہو رہے ہیں!''
''معلوم ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں میں سعید کی شہادت سے اشتعال ہے۔ بازار میں جہاں بھی گیا وہیں یہ مباحثہ۔ ایسا لگتا ہے کہ بہت اچھا شاعر تھا۔''
''لیکن شہید کب ہوئے؟''
''ماہ جون کے آخر میں بتاتے ہیں۔ یہاں ہم تک تو خبریں پہنچتی ہی نہیں ہیں۔ چار ماہ بعد تو میں ہی شہر گیا تھا۔ بہت سی باتوں کا علم ہوا۔''
''کوئی اچھی بات سننے میں نہیں آتی، صرف مار کاٹ، خون خرابہ۔''
''تم اب آرام کرو۔ کوئی ویڈیو فلم دیکھنی ہے، لگاؤں؟''
''نہیں۔ اب لیٹوں گی، سعید کی شہادت کی خبر نے مجھے غمگین کر دیا ہے۔ بیچاری طیبہ جانے کہاں ہوگی؟'' سوسن نے کپڑے تبدیل کیے اور بستر پر لیٹ گئی۔ عباس بہت دیر تک اس کے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

پری اور خالد کو پیرس کا ویزا مل گیا۔ دو دن بعد ان کی پرواز تھی۔ پری بچوں کے لیے سامان خرید رہی تھی۔ خالد اطمینان سے اس کی ہر بات پر ہاں ہاں کر رہا تھا۔ وہ پری کا دل نہیں دکھانا چاہتا تھا، یہ کہہ کر کہ سامان یہاں سے پیرس تک ڈھو کر لے جانے سے کیا فائدہ ہے۔ وہاں پر تو کافی اچھا سامان ملتا ہے۔ ویسے تو پری خود پیرس، لندن، اور روم دو بار ہو آئی ہے، لیکن اس وقت وہ سب کچھ بھول کر صرف اس خوشی میں مست ہے کہ وہ دو دن بعد بچوں کے پاس ہوگی۔

پاکستان میں اتنے ایرانی ہوں گے، وہ تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ ہر بازار، ہر سڑک پر گھومتے یا کچھ خریدتے ہوئے ایرانی نظر آ رہے تھے۔ کچھ سے گفتگو ہوئی تو

معلوم ہوا کہ انہوں نے تو شادی بھی پاکستانی لڑکیوں سے کرلی ہے۔ پری سوچ رہی تھی کہ گھر کے دائرے کے باہر صرف تجربے ہی تجربے ہیں۔ اچھا ہو یا برا، یہ دوسری بات ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ انسان کے مشاہدے کا دائرہ بڑھتا ہے۔ کار کا خریدار بھی مل گیا۔ دام اچھے مل گئے اور سارا کام بڑی آسانی سے یکے بعد دیگرے ہوتا چلا گیا تھا۔ اب وہ دونوں ہوائی اڈے پر تھے۔

''کیسا محسوس کر رہی ہو، پری؟''

''تم بتاؤ، تمہیں کیسا لگ رہا ہے؟''

''بُرا...... جانے کب ایران لوٹنا ہو!''

''مجھے اچھا اور برا دونوں لگ رہا ہے۔''

''شاید اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی دوسرا چارا بھی نہ تھا۔''

''ایک واقعہ یاد آرہا ہے...... آج سے تقریباً آٹھ نو سال پہلے کی بات ہے، جب ہم بی۔اے میں تھے۔ چھٹیوں میں شیراز گئے تھے۔ ہم سب ہی سہیلیاں تھیں۔ ایک دن اردو بازار گئے، پھر وہیں سے قہوہ خانہ چلے گئے۔ قوالی سنتے رہے۔ اسی درمیان جانے کہاں سے ایک فالگیرن آگئی۔ ہم لوگوں نے تفریحاً اسے بلایا۔ طیبہ کی ڈانٹ کے باوجود ہم سب باری باری سے اسے ہاتھ دکھاتی رہیں۔ اس نے اچھی بری جانے کتنی باتیں بتائی تھیں۔ طیبہ الٹے اس کی کھنچائی کر رہی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ قسمت پر یقین رکھنا تو ہم پرستی ہے۔ جو سچ ہے وہ فرض ہے۔ ہاتھ کی لکیریں اگر سچ کہتیں تو جانے کتنے حادثات نہ ہو پاتے...... تب یہ بات ہم نے اتنی گہرائی سے نہیں سوچی تھی۔ لیکن اب سوچتی ہوں کہ اگر فرض اور ذمہ داری ہی سب کچھ ہے تو پھر قابل اعتبار اور فرض کی ادائیگی کرنے والے کیوں مارے جا رہے ہیں؟ کیوں تکالیف اُٹھا رہے ہیں؟ تم کیا سوچتے ہو؟ تم قسمت پر یقین رکھتے ہو یا فرض پر؟''

''دونوں پر! کبھی کوشش کا پلہ کہیں بھاری ہو جاتا ہے، تو کہیں قسمت کا، اس لیے کہنا بڑا مشکل ہے کہ پختہ یقین کس پر ہے۔ میں اندر سے اتنا غیر ذمہ دار اور کمزور بھی نہیں کہ سب کچھ قسمت پر چھوڑ دوں، لیکن ہاں جب محنت کے بعد پھل کی جگہ پر ناکامی

ونامرادی ملتی ہے تو لگتا ہے کہ یہاں قسمت طاقتور ہے۔''

''مجھے تو اب قسمت کا پلہ زیادہ بھاری لگتا ہے۔ میری زندگی میں میری قسمت کا لکھا پورا ہو رہا ہے۔ ورنہ جو کچھ ہو رہا ہے، نہ وہ میرا حصہ ہے نہ تمہارا، بلکہ وہ دوسروں کا کیا دھرا ہے جو ہم بھگت رہے ہیں۔''

''وہ کیسے؟''

''ہم کب کس سیاسی جماعت میں تھے، کس جماعت کے مقلد تھے! لیکن آج ہم چُھپ کر ملک سے نکلے ہیں، جبکہ پوری زندگی اکڑ کر رہے ہیں۔ ہمیشہ دوسروں کی مدد کی ہے۔ آج ہم دوسروں سے مدد مانگ رہے ہیں...... دیکھو قسمت اور کیا کیا کراتی ہے!''

خالد نے جیسے ہی اپنی بات ختم کی آس پاس کے مسافر اپنی جگہوں سے اٹھنے لگے۔ اعلان ہو رہا تھا۔

''چلو۔ پرواز کا وقت ہو گیا ہے۔'' خالد یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔ دونوں قطار میں جا کر شامل ہو گئے۔

پوری دُنیا کے اخبارات نے جب کھل کر تنقید کرنی شروع کی اور انسانی حقوق تنظیم نے اپنی غیر اطمینانی ظاہر کی تو موجودہ اسلامی حکومت نے دو ہزار قیدی آزاد کرنے کا اعلان کیا۔ لیکن افسوس! وہ سیاسی قیدی نہ تھے، بلکہ عام قسم کے چور، ڈاکو، شرابی وغیرہ تھے، جو انہیں جرائم کی وجہ سے پکڑے گئے تھے۔ تھوڑے دنوں تک تمام اخبارات حقیقت کا پتہ لگانے کے باعث خاموش رہے، لیکن انہیں جب علم ہوا تو پھر چالیس ہزار سیاسی قیدیوں کو آزاد کرانے کی مانگ جاری ہو گئی۔

ریڈ کراس، ایمانانسٹی انٹرنیشنل کی تمام کوششیں بیکار گئیں۔ وہ ایران کے اندر قدم نہ رکھ سکے۔ اخبارات جتنا لکھتے، ایران کا دائرہ باہری دُنیا سے اتنا ہی کٹتا اور تنگ ہوتا چلا گیا۔

سب انگشت بدندان تھے، جب صدر 'بنی صدر' نے میدانِ شہداء پر دِل دہلا دینے والی تقریر کی کہ ان جوان سیاسی قیدیوں کی پیشانی پر سگریٹ سے جلے داغ کس طرف اشارہ کر رہے ہیں؟ جو شدت پسند ہیں، قدامت پرست ہیں، وہ درحقیقت اپنی ذہنی

پیچیدگی اور جہالت سے اپنے مذہب اور ملک کو بدنام ہی نہیں، بلکہ برباد بھی کر رہے ہیں۔ اسلام میں 'توبہ اور معافی' کا دروازہ خدا نے کھلا چھوڑا ہے، لیکن آج تک ایسا کوئی قیدی، ایسا کوئی نام ہمارے سامنے نہیں آیا جس کو ازالہ کا موقع اور معافی کا تحفہ دیا گیا ہو۔ آخر یہ روز روز کی پھانسی ہمیں کہاں لے جارہی ہے؟

پورے میدان میں، لاکھوں افراد کی بھیڑ میں ایسا سناٹا چھا گیا کہ سوئی بھی گرتی تو آواز سنائی پڑتی۔ لوگ سانس روک کر سن رہے تھے کہ کل تک شاہ ظالم تھا، لیکن آج خود صدر ان کی آنکھیں کھول رہے ہیں۔ تقریر ختم ہوئی تو 'بنی صدر' کی مقبولیت میں چار چاند لگ گئے۔ ان پر جان نچھاور کرنے والوں کی تعداد ان کے مقلدین سے کہیں زیادہ بڑھ گئی۔ اس کھلے پن سے جماعت کے کچھ لوگوں کو خطرہ لاحق ہوا اور انہوں نے اس میں اپنی بے عزتی سمجھی کہ صدر اپنی ہی حکومت کے مبینہ افراد کے خلاف مشت بند کر چکے ہیں۔ ان کی حمایت میں دیے گئے نعرے درحقیقت بغاوت کی بو دے رہے ہیں۔

مجاہدین لیڈر مسعود رضوی جب ایران چھوڑ کر بھاگے تو 'بنی صدر' بھی حکومت کے اندر بڑھتی کشیدگی سے گھبرا کر جان بچا کر پیرس چلے گئے۔ جو عکس وہ اپنا چھوڑ گئے تھے وہ تاریک تو ضرور ہوا کہ وہ مسعود کا ساتھ دے رہے ہیں، لیکن وہ باتیں، جو انہوں نے کہیں تھیں، وہ لوگوں کے دماغ میں پتھر کی لکیر کی طرح کھنچ گئیں۔ انقلاب کا بھرم بہت سے لوگوں کے دماغ میں چکنا چور ہو گیا۔

امام خمینی کے ساتھ آئے نئے نئے لوگ جس طرح اقتدار کے حصہ دار بنے تھے، اسی طرح اقتدار سے ہی نہیں، بلکہ دُنیا سے غائب ہونے لگے۔ روز بم کے دھماکے ہوتے۔ جب اخبارات انہیں سی۔ آئی۔ اے کا ایجنٹ اور امریکہ کا غلام بتاتے تو قارئین بیچارے ششدر سے رہ جاتے کہ کل تک یہی پاک و صاف تھے اور اب؟ اخبارات کی خبروں پر سے لوگوں کا یقین جاتا رہا۔ اپنے ریڈیو کی جگہ وہ بی۔ بی۔ سی اور وائس آف امریکا سننے لگے تھے۔

لوگوں نے اپنی کشیدگی کم کرنے کی راہ نکال لی تھی۔ سیاسی لطیفوں اور سستے مذاق کی بھرمار ہوگئی تھی۔ آیت اللہ خلخالی کو گربہ نر (بلاؤ) کا نام دے دیا گیا تھا جو انگریزی

کارٹون فلم کا ایک کردار تھا۔ آیت اللہ روح اللہ خمینی کے لیے مشہور تھا کہ ایک فرنچ لڑکی نے ان سے پیرس میں ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''میں آنجابیلا ہوں۔''

اس کے جواب میں خمینی نے مسکرا کر کہا۔ ''اور میں روہلا ہوں۔''

پارلیامنٹ کے چیئرمین رفت سنجانی جب کبھی خارجی ملک کے سفر پر جاتے تو ان کی داڑھی کے نہ بڑھنے کا مذاق اڑایا جاتا اور کہا جاتا کہ وہ آپریشن کے لیے بیرون ملک گئے ہیں، تاکہ باقی ملاؤں کی طرح ان کی بھی داڑھی نکل آئے۔

کبھی کبھی اُکتا کر لوگ کہتے کہ یہ حکومت کب اقتدار سے ہٹے گی، جو ہم کھل کر کھا پی سکیں، سیر و تفریح کر سکیں؟ اس کے جواب میں کوئی کہتا۔ ''اسی کو بلاؤ جس نے گدھے کو دیوار پر چڑھایا ہے، وہی آکر اُتارے گا۔''

جب رفت سنجانی صدر بنے تو لوگوں کے درمیان تیس کلوگرام کے بم پھوٹنے کی بات موضوع بحث بن گئی، جس میں پورا پارلیامنٹ ایک ساتھ اُڑ گیا تھا، اور بم بھی تب پھٹا جب کسی ضروری کام سے رفت سنجانی کمرے سے باہر نکل آئے تھے۔ اسلامی کورٹ کے چیئرمین اور پارٹی کے صدر ڈاکٹر بہشتی، وزیر اعظم رضائی سمیت سبھی اُڑ گئے تھے۔

ایران کے سبھی ہم سایہ ملک، جو شاہ کے وقت چوہے بنے ہوئے تھے، اب شیر کی طرح دہاڑ رہے تھے۔ ان کے سر پر دُنیا کی عظیم طاقتوں کے ہاتھ تھے۔ ایران کے بڑھتے اثر اور طاقت، جو اس علاقے میں عظیم طاقتوں کے لیے چیلنج بن گیا تھا، کو ہلانے کے لیے ملک کے اندر کی بے اطمینانی باہری دشمنوں کی مدد کر رہی تھی۔

ایران کا بازار، جو امام کا سب سے بڑا مرید تھا، ان سے ناراض ہو گیا۔ ہر جگہ غیر مطمئن افراد کا اظہار ہو رہا تھا۔ اب جو اسلام مذہب تھا وہ انسانیت سے بڑھ کر تھا۔ انسانیت زنجیریں پہنیں سسک رہی تھی اور اقتدار کے کوڑے نے، جو درحقیقت مذہبی لباس میں ملبوس تھا، انسانیت کی پیٹھ کو لہولہان کر دیا تھا لیکن ظلم تھا جو اپنی انتہا پر پہنچنے

کے لیے بے چین تھا۔ انسان کے اندر بیٹھا وحشی درندہ برہنہ ہوکر رقص کر رہا تھا۔
اسی درمیان کچھ دیگر مذہبی لیڈران انسانیت کے نام پر اقتدار سے الگ ہو گئے۔ کچھ پہلے سے مخالف تھے۔ سیاسی خیالات نے، اقتدار اور طاقت کی حرص نے جماعتوں کو منقسم کر دیا۔ ایرانی ہزاروں گروہوں میں بٹتا نظر آ رہا تھا۔ لیکن جو اس جنگ سے نبرد آزما تھے وہ تو بامقصد شہادت دے رہے تھے۔ لیکن عام آدمی کیا کر رہا ہے جو امن کے نام پر، روٹی کے نام پر موت کو گلے لگا رہا ہے، اس بے مقصد ہدف کے لیے تو وہ سڑک پر نہیں نکلا تھا؟
اس وقت بھی میدان جنگ کی طرف جانے والی 'بسیز' فوجیوں کی قطار نعرے لگاتی، حب الوطنی کے گانے گاتی ہوئی گزر رہی تھی۔ سب کے ہاتھوں میں امام کی تصویریں تھیں۔ سب گاؤں اور قصبوں کے لوگ تھے جنہوں نے کچھ ہفتوں کی ٹریننگ لی تھی اور بسیز میں شامل ہو گئے تھے۔ بسیز والوں کو کرنا ہی کیا تھا، صرف دشمن کے سینے پر نشانہ لگانا تھا۔ بچے اور بوڑھے سب لڑنے مرنے کو تیار تھے۔ کس لیے؟ دُوسرے بھائی کو مارنے کے لیے؟ ان کا جواب تھا۔ ''خدا کی راہ میں، مذہب کی خاطر یہ جنگ ہے۔ شہادت ہماری آرزو ہے!''
یہ تمام باتیں بہت دیر سے احسان کو پریشان کیے ہوئے تھیں۔ وہ جتنا سوچتا تھا اس کا دل اتنا ہی گھٹتا جاتا تھا۔ وہ بھی میدان جنگ جا کر لوٹ آیا تھا۔ دشمنوں کی لاشوں سے ہم آغوش اپنے ہم وطنوں کو خون سے لتھڑا بھی دیکھ آیا تھا، لیکن دل سوال کرنے سے باز نہیں آتا تھا۔ آخر یہ جنگ بند کیوں نہیں ہو رہی ہے؟ مرتو ایرانی بھی رہے ہیں! مرتو مسلمان بھی رہے ہیں! ایک اہلِ کتاب دُوسرے اہلِ کتاب کا دشمن کیسے ہوا؟ ایک مسلمان انسان مسلمان ہوکر کافر کیسے ہوا؟
احسان ان تمام سوالوں کے جواب کس سے مانگے؟ اس کی بہن اُنہیں جوابوں کو تلاش کرتی ہوئی گولی سے اڑا دی گئی تھی۔ پورے گھر میں کسی کو دُکھ نہیں تھا۔ سب کو ذلت محسوس ہوتی تھی، اس کا نام لیتے ہوئے۔ اسے سب بُری لڑکی کہتے تھے۔ گھر کے تمام لوگ حزب اللہ ہی ہیں، امام کے دیوانے ہیں، انہوں نے تو بیٹی کی لاش لینے سے

انکار کر دیا۔ بہت صاف الفاظ میں ماں نے کہا۔ ''ہمارے مہر انگیز نام کی کوئی لڑکی ہی نہ تھی، یہ ہوگی کوئی، ہم تو اسے پہچانتے نہیں۔''

''ہم نے اس انقلاب میں ایسی خدمات انجام دی ہیں، گردن شرم سے جھک رہی ہے۔'' باپ نے طنز بھرے لہجہ میں کہا تھا۔

قانون پزشکی والے حیرت زدہ تھے۔ آخر میں لاوارث لاشوں میں اسے ڈلوا دیا تھا۔ 'ڈاکٹروں کی تنظیم' بھی ان حالات میں اور کیا کرتی؟

مہر انگیز صرف سولہ سال کی تھی۔ دو سال سے وہ مجاہدین کے ساتھ مل گئی تھی۔ ماں باپ دولتمند اور سنّتی قسم کے مذہبی لوگ تھے۔ اپنی خواہش کے بر خلاف اسے اکیلے امریکا پڑھنے کو بھیجنا چاہ رہے تھے۔ لیکن مہر انگیز کے دل و دماغ پر تو دوسرا سودا سوار تھا۔ اس نے جانے سے انکار کر دیا۔ گھر میں دیر سے آتی تو اُدھم مچتا۔ اس ڈانٹ پھٹکار کا وہ کوئی جواب نہیں دیتی تھی۔ امریکا کا ویزا ملنا بند ہو گیا تھا۔ بڑی کوششوں سے جرمنی بھیجنے کا انتظام کیا، تاکہ اس ماحول سے دُور رہے گی تو خود سدھر جائے گی۔ لیکن وہ نہیں مانی۔

ایک دن باپ نے غصہ میں آکر اسے گھر سے نکلنے کو کہہ دیا۔ پورے گھر نے منہ پھلا لیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا تھا کہ وہ ڈر جائے گی، سدھر جائے گی، لیکن اس پر الٹا اثر ہوا۔ اس دن تو وہ خاموشی سے سوگئی۔ احسان ایک ہفتے کے لیے اصفہان گیا ہوا تھا، ورنہ یہ واقعہ پیش نہ آتا۔ رات کو سب نے سوچا کہ لڑکی سہم گئی ہے۔ لیکن صبح انہیں معلوم ہوا کہ مہر انگیز صبح ہوتے ہی گھر سے نکل گئی ہے۔

شام تک انتظار ہوا۔ رات کو دو بجے تک سب انتظار میں جاگتے رہے، لیکن وہ نہیں لوٹی۔ باپ کو غصہ تھا۔ ''میں نے پرورش کی میرا کوئی حق سرزنش کرنے کا نہ تھا اس پر؟ وہ اتنی عقلمند ہوگئی تھی کہ اپنا بھلا برا خود سوچنے لگی تھی؟''

''نہیں بیٹا! وہ لڑکی تو سونا تھی۔ اس کو بہکایا ہے کسی نے، تم نے بھی جانے کیوں اتنی سختی کی۔ مجھ سے کہلایا تو ہوتا، میری بات وہ کبھی نظر انداز نہیں کرتی تھی۔ میں اسے راضی کر لیتی۔'' مہر انگیز کی دادی نے کہا۔

''بھیجا تو تھا احسان کو آپ کو لینے، جانے کیوں اتنی دیر لگا کر آئیں آپ؟'' مہر انگیز کے والد بولے۔

''بلایا تب، جب پانی سر سے اوپر ہو گیا تھا۔ دو دن جلدی بھی آجاتی تو کیا ہوتا! وہ تو اسی دن گھر چھوڑ کر چلی گئی جس دن احسان وہاں پہنچا تھا۔ میں ضعیفہ ہو کر یہ بات عمر کے تجربہ سے جانتی ہوں کہ زمانہ بدل رہا ہے۔ بچوں سے سختی سے کام لینا ٹھیک نہیں ہے...... ہم تو ٹھہرے معمولی سے تاجر...... ذرا ان مولویوں کے دل سے پوچھو، جن کی اولادیں اُنہیں کے خلاف سازشیں کر رہی ہیں۔ کوئی مجاہد بن گیا تو کوئی خدا کے وجود سے انکار کرنے والا کمیونسٹ...... اولاد سے ہی آدمی ہارتا ہے...... اپنا وقت بھول گئے، تمہارے والد کیا چاہتے تھے، تم نے کیا؟ ہم نے تو کبھی تمہیں گھر سے نکالنے کی بات نہیں سوچی تھی۔ یہ شدت پسندی باپ اور اولاد کے رشتے میں کب سے پیدا ہونے لگی ہے؟ قیامت کے آثار ہیں قیامت کے۔'' مہر انگیز کی دادی نے تکلیف سے کہا۔

ان کی آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ اتنی منت اور مرادوں کے بعد تو ایک لڑکی خاندان میں پیدا ہوئی تھی۔ ان کے پانچ بیٹے تھے، پانچ رنگ کے۔ سب بیٹوں کے گھر شادی کے بعد بیٹے ہی پیدا ہوئے تھے۔ لڑکی کے لیے ان کا دل ترس گیا تھا۔ مشہد جا کر حضرت رضا کے حرم میں ایک ہفتے تک رہی تھیں۔ پورے دن بیٹھ کر دُعائیں پڑھتی اور خدا سے ایک عدد بیٹی کی مانگ کرتی تھیں۔ مہر انگیز ان کی منتوں کا پھل تھی۔ وہ اس کا اس طرح جانا کیسے برداشت کر سکتی تھیں۔ بیٹے کے مزاج سے وہ بچپن سے ہاری ہوئی تھیں۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا تھا۔

دس روز وہ تہران میں رہیں۔ روز جانماز پر سجدے میں گر کر خدا کے آگے گڑگڑاتی تھیں، لیکن ان دس دنوں میں مہر انگیز پلٹ کر نہ آئی۔ وہ غمگین دل سے اصفہان لوٹ گئیں، لیکن انہوں نے اُمید نہیں چھوڑی تھی۔ اصفہان میں بھی وہ اپنی عبادت میں لگی رہیں۔

چار ماہ بعد جب والدین کو مہر انگیز کے مرنے کی اطلاع ملی تب انہوں نے لاش

لینے سے انکار کر دیا۔ ایسے نازک حالات میں احسان پھر دادی کے پاس بھاگا، لیکن جب تک دادی آتیں اور بیٹے کا فیصلہ بدلتیں، اتنی دیر ہو چکی تھی کہ سوائے رونے اور ہاتھ ملنے کے کچھ باقی نہیں رہ گیا تھا۔ دادی نے صرف اتنا کہا۔ ''ناشکروں کے لیے میں نے خدا کے دربار میں اپنی جھولی پھیلائی تھی...... پھول سی لڑکی...... خدا کو بھی بُرا لگا ہوگا کہ میں ان کی بخشش کو سنبھال نہ پائی...... ظالموں کے گھر لڑکی ہونا گناہ ہے...... یا خدا! مجھے معاف کرنا...... اپنی اس حقیر بندی کی غلطیوں کو نظر انداز کرنا......''

احسان کو جانے کیوں باپ کے تئیں ایک انجانا غصہ اپنے اندر پیدا ہوتا محسوس ہوا...... بہن کی جدائی...... بہن کی موت کتنی بھیانک ہے! اس گھر کی چھت شیشہ کاری سے بجی ہے۔ بجلی جلنے سے عجیب سا جھماکہ ہوتا ہے۔ روشنی کے تکونے ٹکڑے پورے گھر کے ہر کمرے میں بکھر جاتے ہیں، لیکن...... اس روشنی کے پیچھے کتنی تاریکی ہے! کتنا بے رحم دل ہے! بابا پانچوں وقت نماز پڑھتے ہیں، قرآن پڑھتے ہیں تو بھی اتنے سخت مزاج ہیں!

مجھے کیا ہوتا جا رہا ہے، حقیقتاً مجھے کچھ ہو رہا ہے، مجھے کچھ ہو رہا ہے۔ احسان نے اپنا سر دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

پیرس پہنچ کر جیسے پری کو پوری دنیا کی دولت مل گئی تھی۔ دونوں بچوں کو بہت دیر تک سینے سے چپکائے کھڑی رہی۔ آخر میں خالد سے نہ رہا گیا تو بولا۔ ''پری! سب انتظار میں کھڑے ہیں۔ مجھے لگا کہ کسی نے 'اِسٹیچو' کہہ دیا ہو، تینوں جنبش بھی نہیں کر رہے ہیں۔''

سب ہنستے مسکراتے کار میں بیٹھ گئے۔ بچوں کو پیار کر کے نہ پری تھک رہی تھی نہ اس کا دل ہی بھر رہا تھا۔ دونوں بچے ضرور پریشان ہو گئے تھے۔ پری کی ہمشیرہ تمام باتیں، ساری شرارتیں بچوں کی بتا رہی تھی۔ بچے اپنی جانب سب کو متوجہ پا کر کچھ شرما رہے تھے۔ گھر پہنچتے ہی پری نے اٹیچی اُلٹ دی۔ تحائف سے بچوں کو لاد دیا۔ ماں

بچوں کا پیار دیکھ کر خالد اپنے کو ایک دم اجنبی محسوس کرنے لگا۔ رات کو پری دونوں بچوں کو اِدھر اُدھر سلا کر خود اُن کے بیچ میں سوئی۔ کبھی ایک کی طرف مڑ کر اسے لپٹا کر پیار کرتی تو کبھی دُوسرے کی طرف کروٹ بدل کر اُسے پیار کرتی۔

"مجھے بھی تو موقع دو۔ بچوں کو ایسے لپٹائے ہو جیسے مرغی اپنے پروں کے نیچے چوزوں کو چھپاتی ہے۔" خالد نے دل کی بات کہہ دی۔

"میں بہت خوش ہوں۔" اتنا کہہ کر پری نے رونا شروع کر دیا۔

"خوشی میں رونا؟ عجیب! کھلی دھوپ میں جیسے بارش شروع ہو جائے!" خالد ہنس پڑا۔

"سچ ...... یہ خوشی تمہاری وجہ سے مجھے ملی ہے، میری ممتا کی پیاس بجھ گئی ہے ورنہ مجھے ملک کی محبت جکڑے ہوئے تھی۔" پری نے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا۔

ملک جب اپنا ہو تب نا۔ محبت تو مجھے اپنے ملک سے کیا کم ہے، لیکن جب ہمارے لیے وہاں کی زمین تنگ ہوگئی تو کیا کرتا......؟ بچوں کو بلا نہیں سکتا تھا، خیر...... بہت طویل فہرست ہے شکوے اور غموں کی...... آرام سے سو جاؤ...... صبح بچوں کے اسکول چلیں گے۔"

"آج کم از کم ایک سال بعد میں چین کی نیند سوؤں گی، میری اپنی دُنیا میری بانہوں میں آگئی ہے۔"

"خوشی کی بات ہے۔ لیکن مرد کی دنیا......؟"

پری کو جواب دینے کا ہوش کہاں تھا، وہ تو واقعی نیند میں ڈوب گئی تھی۔ خالد کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔ وہ خاموشی سے دُنیا کی وسعت اور اس میں پیدا پریشانیوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ آنے سے قبل اسے احسان کے ذریعہ تمام باتیں معلوم ہوگئی تھیں۔ مہر انگیز اس کی اکلوتی چچازاد بہن تھی۔ ایک ماں پری ہے، دوسری ماں چچی ہے! باپ اتنا ظالم ہو سکتا ہے، لیکن ماں......؟ وہ بھی توہم پرستی اور بیکار کے جوش کے پیچھے...... کیا ہوگیا ہے ہم لوگوں کو؟ کیا گھول کر پلا دیا گیا ہے جو یوں آنکھیں بند کر کے اس اندھے کنویں کے مرید ہو گئے ہیں......؟

ایرانی بینک پیسے سے خالی۔ کارخانے کچا مال نہ آنے سے بند۔ تقریباً ہر ملک سے ڈپلومیٹک تعلقات خراب۔ ڈاکٹر، انجینئر غیر ممالک میں جا کر بس گئے۔ پڑھا لکھا طبقہ کتنا جا رہا ہے یا مر رہا ہے۔ کیا ہوگا؟ کل کیا ہوگا؟ پیداوار ختم، جان اور مال کا نقصان، یہ بھی کوئی انقلاب ہوا؟ جس کو چاہا مار گرایا...... درحقیقت یہ ایک سرپھرا شکاری ہے جو انسانوں کے جنگل میں آگیا ہے۔ ہر انسان کو اپنی غلیل کا نشانہ بنا رہا ہے اور جواب میں یہ صفائی پیش کرتا ہے کہ میں نہ مارتا تو وہ مجھے کھانے کو دوڑ رہا تھا۔ جان کے بچاؤ کے لیے ہتھیار اُٹھانا ہی تھا۔

صبح ہوتے ہوتے خالد کی آنکھیں جھپک گئیں۔

تقریباً سات بجے پری نے اسے جگایا۔ ''اُٹھیے، دیر ہوجائے گی، بچے تیار ہوگئے ہیں۔''

خالد کے جوڑ جوڑ میں درد ہو رہا تھا۔ ایک بھرپور انگڑائی کے ساتھ وہ اُٹھا اور باتھ روم میں شاور کے نیچے جا کر کھڑا ہوگیا۔ نہا کر نکلا تو پری تیار ہو چکی تھی۔ بچے جا چکے تھے۔ اس نے کپڑے تبدیل کیے، ناشتہ کیا اور باہر نکل گیا۔ اسکول قریب ہی تھا۔ پری کی بہن روحی کا شوہر دونوں کو چھوڑتا ہوا آگے آفس کی جانب نکل گیا۔ روحی، پری اور خالد اسکول کے احاطے میں داخل ہوئے اور پرنسپل کے آفس میں گئے۔

طے ہوا تھا کہ لنچ باہر کریں گے، اس لیے تھوڑا بہت گھومتے ہوئے وہ ایک ریسٹورنٹ میں گئے۔ کھانے کا آرڈر دے کر وہ تینوں باتوں میں منہمک ہوگئے۔ ان کا خیال نہیں گیا کہ پیچھے کچھ ایرانی لڑکے بیٹھے کھانا کھا رہے ہیں۔ خالد کی آواز روحی اور پری سے کچھ بلند تھی۔ کھانے کے بعد جب وہ اُٹھ کر چلنے لگے تو پیچھے سے آواز آئی۔

''انقلاب کے دشمن۔''

خالد نے پلٹ کر دیکھا۔ جانے کیوں داہنا ہاتھ اُٹھ گیا، لیکن فوراً ہی اسے نیچے کر کے بولا۔ ''انقلاب کے حامی پیرس میں کیا کر رہے ہیں؟''

اس طنز سے لڑکے کچھ چونکے، پھر میز سے اُٹھتے ہوئے بولے۔ ''خواہ ہم موجودہ اقتدار کے مخالف ہوں، لیکن انقلاب کے نہیں ہیں اور آپ انقلاب کو ہی......''

''کون سا انقلاب؟ یہی جو ایران میں جبراً لایا گیا ہے۔ اسی کی جانب اشارہ ہے تمہارا شاید؟'' خالد نے تلخی سے کہا۔

''زبردستی لایا گیا ہو یا محبت سے، ہے تو تبدیلی ہی......''

''لیکن جو صحیح انقلاب ہم لانے والے ہیں وہ دیکھئے گا کیا ہوتا ہے۔ تب بھی آپ کی جگہ ایران میں نہیں ہوگی، کیونکہ شاہ پر عاشق لوگوں کے لیے ایران کی زمین آج بھی تنگ ہے۔''

''یہ دوسرا انقلاب لانے والے آپ کون ہیں؟''

''مجاہد!''

''خوب!''

''جی۔''

''مل کر خوشی ہوئی۔''

''ملتے رہیں گے، تاکہ آپ کے خیالات میں تبدیلی لا سکیں۔''

''مثلاً آپ کس قسم کی تبدیلی لانا چاہتے ہیں؟''

''تاکہ آپ ایران کے بارے میں سوچیں، دُوسرے ملکوں سے ہمدردی چھوڑیں۔''

''آپ نے کیسے جانا میری ہمدردی غیر ممالک سے ہے؟''

''کیونکہ آپ یہاں ہیں۔''

''تو پھر آپ کیسے ہیں پیرس میں؟''

''ہمارا تو کام ہے۔''

''ہماری مجبوری تھی، چونکہ میں شاہ کا مدّاح نہ تھا، اس لیے اوّل درجہ کا تاجر نہیں بن پایا۔ اب موجودہ حالات میں حکومت کا اندھا مقلد نہیں ہوں اس لیے اپنی سرزمین میرے لیے تنگ ہوگئی۔''

''کہاں رہ رہے ہیں؟'' لڑکے نے پوچھا۔

''ہوٹل میں ہوں ابھی۔'' خالد نے قصداً دروغ گوئی سے کام لیا۔

''ہمیں آئے ابھی ایک ہفتہ ہوا ہے۔ پہلے ہم ایران میں تھے، پھر ہندوستان میں

رہے، اب یہاں آئے ہیں۔''

''مجاہد کب سے بنے ہیں؟''

''جی......؟''

''یہی کہ کب سے آپ تنظیم میں شامل ہوئے ہیں؟''

''چھ ماہ ہو گئے۔''

''پہلے کیا تھے؟''

''حزب اللّٰہی۔''

''سمجھا۔''

''کیا؟''

''یہی کہ آپ کے سوالات مجاہدین والے کم اور حزب اللّٰہی کے کسی پاسدار والے زیادہ تھے۔''

لڑکا کچھ کھسیا کر ہنسنے لگا۔

''تم لوگ وطن سے جڑنے کی کوشش کرو، پارٹی بدلنے اور مختلف پارٹیوں کے نظریہ کی تبدیلی سے بدلاؤ نہیں آئے گا۔ بس وحشیانہ رقص جاری رہے گا۔'' خالد نے یہ کہہ کر پری اور روحی کو اشارہ کیا، پھر لڑکوں سے بولا۔ ''بہت خوشی ہوئی اپنے ہم وطنوں سے مل کر...... خدا حافظ!''

''خدا حافظ!'' لڑکوں نے کہا۔

جب تینوں سڑک پار کر کے دوسری جانب پہنچے تو خالد نے کہا۔ ''عجیب مصیبت ہے۔ میں سمجھا پیرس ہے، اپنی زبان کون سمجھے گا...... لیکن یہ لڑکے تو گاؤدی ہیں۔ خود نہیں پتہ کیا ہیں اور کیا کرنا چاہتے ہیں؟ جس طرف کو ہوا چلی، اُدھر ہی ہو گئے۔''

''فرانس میں ایرانیوں کی تعداد روز بہ روز بڑھتی ہی جا رہی ہے۔ جب سے مجاہد لیڈر مسعود رضوی آئے ہیں مجھے ایران پیرس کے مقامی اخبارات میں کسی نہ کسی مسئلہ کی شکل میں موجود رہتا ہے۔ شروع میں ٹی۔وی، ریڈیو اور دیگر ذرائع ابلاغ دیوانے ہو رہے تھے، ان کے انٹرویو کے پیچھے۔ اب ذرا بخار کم ہوا ہے۔''

"ادھر سے ٹیکسی لے کر گھر چلتے ہیں، بچوں کے آنے کا وقت ہو رہا ہے۔"
تینوں ٹیکسی میں بیٹھے۔ پورے راستے خاموشی رہی، لیکن دماغ ایران سے دُور رہ کر بھی ایران کے متعلق ہی سوچ رہا تھا۔ پیرس میں ایک نئے انقلاب کی تیاری ہو رہی ہے۔ ایران کے زیرِ زمین ایک آتش فشاں تڑپ رہا ہے۔ وہ کس سمت کی جانب پھوٹ کر بہے گا؟ اس خدشہ سے کلیجہ منہ کو آنے لگتا ہے۔

۱۴

کئی روز سے طیبہ کو تیز بخار تھا۔ اکیلے کمرے میں لیٹی کراہ رہی تھی۔ جب گلا خشک ہونے لگتا تو اُٹھ کر پانی کا ایک گھونٹ پی کر گلا تر کر لیتی تھی۔ کئی بار سوچا، کسی دوست کو فون کر لے، لیکن ہر بار محسوس ہوتا کہ انہیں پریشان کر کے کیا حاصل ہوگا؟ اپنا تو کوئی تھا نہیں۔ دُور کے رشتہ دار دُوسرے شہروں میں تھے۔ تین سال قبل، انقلاب کے ابتدائی دن تھے۔ تب ہی ٹرک سے ٹکرا کر کار حادثے میں چھوٹے بھائی اور والدین کو طیبہ کھو چکی تھی۔ گزشتہ تین برسوں سے کتنی تنہائی سہی تھی، یہ اسے ہی معلوم تھا۔ اس وقت ماں کی کمی اسے شدت سے محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ ماں کے لیے بلک بلک کر روئے، جیسے بچپن میں روتی تھی، ضد کرتی تھی کسی بھی چیز کے لیے اور اسے حاصل کر کے ہی دم لیتی تھی۔
سورج کب طلوع ہوتا ہے، کب غروب ہوتا ہے اور کب رات ہوتی ہے اسے کچھ بھی محسوس نہیں ہوتا۔ بخار کی شدت نے اس کے حواس کو اتنا متاثر کیا تھا کہ وہ غفلت میں ڈوبی رہتی تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ پیٹ میں چار روز سے گندم کا

ایک دانہ بھی نہیں گیا تھا۔ نہ دودھ، نہ پھل، قوت آتی بھی تو کہاں سے؟ بس پانی پی پی کر وہ زندگی سے جوجھ رہی تھی۔

اس کا خیال بار بار ملیحہ کی طرف جا رہا تھا، لیکن بخار اور کمزوری کسی بھی بات کو دماغ میں پوری طرح سے صاف صاف ٹکنے نہیں دے رہی تھی۔ بڑی مشکل سے وہ اٹھی اور ٹٹول ٹٹول کر دیوار کا سہارا لے کر دروازہ تک گئی اور کسی طرح باہر نکل کر باتھ روم کا دروازہ کھولا۔ اسے چکّر سا آ رہا تھا۔ بہت سنبھال کر اس نے خود کو گرنے سے روکا۔

کمرے میں جب واپس آئی تو پسینے میں شرابور تھی۔ ایک ٹھنڈی سنسناہٹ پورے جسم میں پھیل رہی تھی۔ تھوڑا سا پانی پیا اور پاؤں اُٹھا کر پلنگ پر بیٹھ گئی۔ پیچھے مسہری پر سر ٹکا دیا۔ بخار شاید اُتر رہا تھا۔ کمرے میں تاریکی پھیل رہی تھی۔ طیبہ نے لیمپ کا بٹن دبایا اور بے دم ہو کر بستر پر لیٹ گئی۔

جب طیبہ کی طبیعت تھوڑی سی سنبھلی تو وہ اٹھی اور فون ملانے لگی۔ نمبر اسے یاد تھا۔ ادھر گھنٹی بجتی رہی۔ تھک کر اس نے ریسیور رکھ دیا اور پھر لیٹ گئی۔ آدھے گھنٹے بعد وہ پھر اُٹھی اور فون ملانے لگی۔ دو بار ہی گھنٹی بجی تھی کہ کسی نے فون اُٹھا لیا۔

''ہیلو۔'' اس نے کمزوری سے ڈوبتی آواز میں کہا۔

''ہیلو۔'' اُدھر سے کچھ گھبرائی ہوئی سی آواز تھی۔

''سلام! میں...... کون بول رہا ہے؟'' طیبہ نے اس حالت میں بھی ہوش پوری طرح نہیں کھویا تھا۔

''کون؟ طیبہ؟ میں ملیحہ ہوں جانم۔'' ملیحہ نے کہا۔

''ہاں، میں طیبہ ہوں، ملیحہ! میں بیمار ہوں...... مجھے لگتا ہے کہ...... خیر، موت سے میں کیا ڈروں گی...... لیکن مجھے یہاں سڑنے مت دینا...... تم کیسی ہو......؟ بچے......'' کمزوری نے پھر اسے نیم بیہوش سا کر دیا۔ اُدھر ملیحہ 'طیبہ! طیبہ!' کرتی رہی، لیکن اُسے جواب نہ ملا۔ گھبرائی سی وہ اُٹھی اور بچوں سے بولی۔

''سنو! طیبہ خالہ کے گھر چلنا ہے۔ ان کی طبیعت بہت خراب ہے۔''

دونوں بچے جلدی جلدی کپڑے بدلنے لگے۔ ملیحہ نے اس درمیان جلدی سے

کچھ چیزیں بیگ میں ڈالیں۔ چادر لپیٹی اور کنجی کھونٹی پر سے اُتار کر، دروازہ بند کر کے نیچے سیڑھیاں اُترنے لگی۔ وہ تینوں سامنے والی دُکان پر گئے۔ ملیحہ نے کچھ چیزیں خریدیں، پھر گلی پار کر کے سڑک پر آئی اور پھل کی دُکان سے کچھ پھل خریدے۔ وہیں سامنے سے ٹیکسی کی اور دھڑ کتے دل سے اس پر سوار ہوئی۔ اس کا پورا جسم جانے کس خدشہ سے کانپ رہا تھا۔

شام کو سلیمان نے آفس سے لوٹ کر بتایا۔ ''مجھے فرم کے کام سے شاید امریکا جانا پڑے گا۔ فیملی کا خرچہ بھی مل رہا ہے۔ میرا دل اکیلے جانے کا ویسے بھی نہیں ہے۔''

''آپ تو تمام دن کام میں مشغول رہتے ہیں۔ میں اکیلی ہوٹل کے کمرے میں تنہا رہ جاتی ہوں۔ پیرس والا سفر یاد ہے۔ بغیر سیر کیے لوٹ آئی تھی۔''

''وہ تو اچانک سب کچھ بدل گیا تھا۔ سویڈن تو پورا گھمایا تھا۔ بھول گئی میری حسین محبوبہ؟''

''تب اکیلی تھی، لیکن اس بار ایک کے بجائے دو دو ریڈیو ساتھ ہیں۔ پیرس میں بچی چھوٹی تھی تو نکلنا کتنا مشکل تھا۔''

''اچھا، وعدہ کرتا ہوں، ہر روز شام کو چار بجے فائل بند کر کے ہوٹل لوٹوں گا، اب تو خوش ہو؟''

''جانا کب ہے؟''

''جتنی جلدی ممکن ہو سکتا ہو! مہینے بھر کا ٹور ہے، سردی بڑھنے سے پہلے ہی کام ختم ہو جائے تو اچھا ہے۔ ابھی وہاں موسم بھی سہانا ہوگا۔''

''ٹھیک ہے۔''

''کچھ خریدنا ہو تو بتاؤ، میں گاڑی نکالوں۔''

''کل بتاؤں گی۔ اتنی جلدی تو آپ کا کمپیوٹر بھی جواب نہیں دیتا ہے۔''

سلیمان اسٹڈی روم میں جا کر فائلیں دیکھنے لگا۔ کچھ نقشے عمارتیں اور پارکوں کے

تھے۔ کافی دیر تک ان کا معائنہ کرتا رہا۔ مہناز نے شربت کا گلاس سلیمان کی میز پر رکھا اور خاموشی سے کمرے سے نکل گئی۔

دونوں بچے کھیل رہے تھے۔ اس نے کاغذ پینسل نکال کر کچھ لکھنا شروع کیا۔ پھر چھوٹی بڑی چار اٹیچیاں کھول کر لائن سے رکھ دیں۔ سب سے پہلے سلیمان کی اٹیچی ٹھیک کی۔ کچھ کپڑے دُھلنے اور پریس ہونے والے تھے، انہیں تھیلے میں بند کر کے اٹیچی بند کر دی۔ پھر اپنی اٹیچی ٹھیک کی اور اسے بند کر دیا۔ دونوں چھوٹی اٹیچیاں کسی وجہ سے پوری طرح سے سج نہیں پائیں۔ اس لیے اس نے انہیں یوں ہی چھوڑ کر میلے کپڑوں کا تھیلا اُٹھایا اور واشنگ مشین میں الٹ دیا۔ مشین آن کر کے وہ ڈنر کی تیاری میں لگ گئی۔ سلیمان ابھی تک اپنے اسٹڈی روم سے نکلا نہیں تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کام زیادہ اور مسائل دقیق ہیں۔ سیف کی رونے کی آواز سن کر وہ کمرے میں گئی۔ بے بی کو 'کاٹ' سے اُٹھا کر اس کی نیپی بدلی اور دُودھ کی بوتل کو فریج سے نکال کر بوتل وارمر گرم کرنے کے لیے رکھ دیا۔ مہوش راکنگ ہارس پر بیٹھی 'نرسری رائم' پڑھ رہی تھی۔ تبھی سلیمان کمرے میں داخل ہوا۔ بیٹی کو پیار کر کے بیٹے کی طرف بڑھا، اسے گود میں اُٹھا کر اُوپر اُچھالا، پھر کہنے لگا۔ ''تم نے کیا کیا؟ میں تو کافی اُلجھ گیا تھا نئے نقشوں میں۔''

''تھک گئے ہوں گے، کچھ لیں گے؟''

''نہیں۔''

''میں نے اٹیچیاں تو تقریباً ٹھیک کر لیں ہیں۔''

''ونڈر فل!''

''بیٹے کو مجھے دیں، اس کا دُودھ کا وقت ہو گیا ہے۔''

''لو بھائی، اپنی امانت۔ ذرا سا کسی کو پیار کرتا ہوں حسد سے سلگ اٹھتی ہو، میری جان! اسے پہچانو، یہ تمہارا بیٹا ہے، بلکہ ہمارا بیٹا ہمارے جگر کا ٹکڑا، کیوں مہوش؟''

مہوش نے گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے چھوٹی سی گردن ہلائی، جیسے اس نے پوری بات سمجھ لی ہو۔

''سنبھالو اپنے چھوٹے سلیمان کو۔'' سلیمان نے بیٹے کو بیوی کی گود میں ڈال دیا

اور بیٹی کو گھوڑے سے اٹھا کر کندھے پر بٹھا لیا۔

''نو بج گئے ہیں۔ میں کھانا لگاتی ہوں۔''

''میں میز ٹھیک کرتا ہوں۔'' کہہ کر سلیمان کمرے سے باہر نکل آیا۔ پیچھے مہوش بھی بھاگتی ہوئی آئی۔ بیٹا سیف سو گیا تھا۔ اسے اُٹھا کر مہناز نے چار پائی پر لٹا دیا اور بیڈ لائٹ جلا کر دوسرا سوئچ آف کر دیا۔

کچن میں لگی چھوٹی سی میز پر باپ بیٹی پلیٹ وغیرہ سجا کر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ مہناز نے پلاؤ پر کا پلگ نکالا، سماور روشن کیا، اور فرج سے سلاد اور اچار نکال کر میز پر سجایا۔

''کل کیا کیا خریدنا ہے؟''

''کچھ بھی نہیں، جب ایک ماہ رہنا ہے تو وہیں خریداری کر لیں گے۔ یہاں سے کیا کریں گے اتنا سامان لے جا کر!''

''ٹھیک ہے۔ کب تک چل سکتے ہیں ہم۔ تا کہ کل میں آفس میں بتا دوں۔''

''پرسوں چلئے۔'' کھانا لگاتے ہوئے مہناز نے کہا۔

''ٹھیک ہے، ٹکٹ وغیرہ سب تیار ہیں، تاریخ دینا باقی تھا۔''

''سالن اور لیں۔''

''ہوں۔ سنو، یہ اسلم عطا پور بھی تو شاید امریکہ میں ہی ہے نا؟''

''ہاں!''

''مجھے ایک دم سے یاد آیا کہ کون کون اپنا دوست وہاں مل سکتا ہے، تو کئی دُوسرے ناموں کے ساتھ اسلم عطا پور کا نام بھی دماغ میں آ گیا۔''

''چاول اور دوں؟''

''بس، بہت کھا لیا۔ تمہارے پاس پتہ ہے؟''

''نہیں، بس اتنا پتہ ہے کہ لاس اینجلس میں ہے۔ یہ بھی پری نے ایک سال پہلے تحریر کیا تھا۔''

''تم بھی عجیب ہو، جس کی کتابیں اتنے شوق سے پڑھتی ہو، اس کا اتا پتہ بھی نہیں معلوم۔''

"اس کی شاعری مجھے پسند ہے۔"

"میں کب کہہ رہا ہوں کہ وہ تمہیں پسند ہے۔ خیر، ملاقات ہوئی تو اس کی شاعری پر میں جم کر تقریر کروں گا۔"

"تالی بجانے کے لیے کرائے پر لوگ بلانے پڑیں گے۔" مہناز نے ہنستے ہوئے کہا۔

"ہو سکتا ہے۔" سلیمان بھی ہنسنے لگا۔

سلیمان بیٹی کے ہاتھ، منہ دُھلانے باتھ روم کی طرف لے گیا اور مہناز کچن اور برتنوں کی صفائی میں لگ گئی۔

ٹیکسی سے اُتر کر ملیحہ نے پیسے دیے اور خاموشی سے پیدل چلنے لگی۔

"ماماں! ماماں! طیبہ آنٹی کی تو یہی گلی ہے۔" بیٹے نے ماں کی چادر کھینچتے ہوئے کہا۔

"معلوم ہے بیٹے! میں بھولی نہیں ہوں، لیکن اگلی گلی سے مڑ کر پھر اس طرف آجائیں گے۔"

"لیکن کیوں، بہت دُور پڑے گا۔" بیٹی بولی۔

"سب سوالوں کے جواب ابھی نہیں دے سکتی۔ خاموشی سے چلتے رہو۔"

بچے خاموشی سے چلنے لگے۔ پیچھا کرنے والوں کے شک کی بنا پر کئی گلیوں کے چکر لگا کر آخر طیبہ کے گھر کے قریب جا کر ملیحہ نے گھنٹی بجائی، صدر دروازہ بند تھا۔ اوپر سے کسی نے کچھ نہ پوچھا۔ ہمت کر کے اس نے طیبہ کی مکان مالک کی گھنٹی بجائی۔

دروازے پر لگے ریسیور سے آواز آئی۔ "کون ہے؟"

"آپ کے کرایہ دار کی مہمان! شاید اس کی گھنٹی خراب ہے۔ معاف کریں، تکلیف ہوئی، شکریہ۔" منہ اوپر کر کے ملیحہ نے کہا۔ اس کے ساتھ ہی دروازہ کھل گیا۔

ملیحہ بچوں کے ساتھ اندر آئی۔ دونوں آگے آگے تیزی سے سیڑھیاں چڑھ رہے تھے۔

"آہستہ آہستہ سنبھل کر۔ گر مت جانا۔" ملیحہ پیچھے تھیلے اُٹھائے چڑھ رہی تھی۔

بچے دروازے کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے تھے۔ ملیحہ نے اوپر پہنچ کر دروازہ

تھپتھپایا۔ اندر سے کوئی آواز نہیں آئی۔

ملیحہ نے گھبرا کر، انگلی موڑ کر کھٹ کھٹ کی، لیکن اندر سے کسی طرح کی کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ ملیحہ کو ایسا محسوس ہوا، کہیں...... اس کی آنکھوں میں گھبراہٹ کی وجہ سے آنسو جمع ہو گئے تھے۔ اس نے چابی سے ذرا زور زور سے دروازہ کھٹکھٹایا اور آواز دی۔

''طیبہ! طیبہ! طیبہ، میں ملیحہ ہوں۔''

بچے وہیں سیڑھی پر، گملوں کے قریب رُخساروں پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ گئے تھے۔ ملیحہ نے بھی ہاتھ میں پکڑے سارے تھیلے وہیں دروازے کے قریب رکھ دیے اور سوچنے لگی کہ اب کیا کرنا چاہیے! نیچے جا کر مدد مانگنی چاہیے؟ چند سیکنڈ کھڑی رہی، پھر دروازے کے قریب جا کر زور سے کھٹکھٹایا اور بولی۔ ''طیبہ! دروازہ کھولو، میں ملیحہ ہوں۔''

''ملیحہ......!''

اندر سے کچھ گرنے کی آواز آئی، پھر کراہنے کی۔ ملیحہ نے راحت کی سانس لی۔ دل کا خدشہ ختم ہو گیا تھا۔ کافی مشکل سے چابی گھومی اور دروازہ کھلا۔ سامنے ایک بے کفن کا مردہ کھڑا تھا۔ ملیحہ کی چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ یہ طیبہ ہے! اس نے آگے بڑھ کر طیبہ کو سنبھالا۔ طیبہ اس کے شانوں پر جھول گئی۔ دونوں بچے ماں کی مدد کے لیے دوڑے۔

ملیحہ نے سنبھال کر طیبہ کو بستر پر لٹایا۔ چہرے پر پسینے سے چپکے بالوں کو پیچھے ہٹایا۔ دونوں بچے میز پر تھیلے رکھ کر پلنگ کے پائینتی کی طرف کھڑے ہو گئے۔

''کب سے بخار تھا؟''

''معلوم نہیں۔'' طیبہ نے بڑی مشکل سے کہا۔

ملیحہ اسے آرام سے لٹا کر فریج کی جانب بڑھی۔ اسے کھولا، جو اوپر سے نیچے تک خالی تھا۔ صرف ایک بوتل پانی سے بھری رکھی تھی۔ ملیحہ نے ڈبڈبائی آنکھوں سے مڑ کر طیبہ کو دیکھا، پھر بچوں سے کہا۔ ''پھلوں کا تھیلا لانا۔'' اس میں سے دو سیب بیٹی کو دے کر بولی۔ ''اندر باتھ روم سے دھو کر لے آؤ۔ پلیٹ معلوم ہے نا کہاں رکھی ہے؟''

''ہاں، ماماں!''

''کچھ کھایا پیا بھی ہے، طیبہ تم نے؟''

طیبہ نے صرف گردن ہلا کر 'نہ' کہا۔ ملیحہ نے بیٹے کو روپے نکال کر دیے اور کہا کہ وہ کونے والی دُکان سے دودھ لے آئے۔ بیٹی نے پلیٹ میں دھلے سیب اور چاقو لا کر رکھا۔ ملیحہ نے سیب کا چھلکا اُتارا اور اس کی پتلی پتلی قاشیں کرنی شروع کر دیں۔

''تم۔نے مجھے اتنا غیر سمجھا کہ......''

''غیر سمجھتی تو......'' باقی الفاظ منہ ہی میں رہ گئے۔ آنسوؤں نے گلے کو کچھ کہنے سے روک دیا۔ باقی باتیں اب آنسوؤں سے ہو رہی تھیں۔

سیب کاٹنے کے بعد ملیحہ، طیبہ کے قریب آئی اور کانٹے سے ایک ایک کر کے سیب کی قاشیں اس کے منہ میں ڈالنے لگی۔

''کتابوں سے خالی یہ کمرہ تمہارا نہیں لگ رہا ہے۔'' ملیحہ نے آہستہ سے کہا۔ طیبہ اس بات پر صرف تلخی سے زیرلب مسکرا دی۔

''کب سے نہیں کھایا، خود بھی یاد نہیں ہوگا، پوری کی پوری پگلی ہو!''

طیبہ نے مسکراتی آنکھوں سے ملیحہ کو دیکھا اور اپنے پیلے کمزور ہاتھوں سے اس کا رخسار بڑے پیار سے تھپتھپایا۔

''یوں بھی کوئی جان دیتا ہے! تھوڑے دن آرام کرتی، خیال رکھتی اپنا۔ جدوجہد تو پوری زندگی کی ہے، ایک دو دن کی بات ہو تب نا، ڈھائی سال پلک جھپکتے گزر گئے۔''

''بالکل صحیح کہا ہے تم نے، زندگی کا نام حرکت اور حرکت کی شکل جدوجہد ہے۔''

''پیٹ میں چارا جاتے ہی چہکنے لگی۔ اب تو لگتا ہے، ہمیشہ کی طرح تم ہی بولو گی اور ہم تینوں سنیں گے۔''

''بولنے کو کیا رہ گیا ہے۔ ہمارا منہ ہی سی دیا گیا ہے۔''

''تو لکھ کر آفت مچاؤ گی، تم رکنے والی تو ہو نہیں۔''

''قلم، کاغذ، آواز اور خیال سب کو، ملیحہ انہوں نے صلیب پر چڑھا دیا ہے۔''

''وقت بدلے گا، طیبہ۔''

''بدلے گا...... لیکن ہم نہ ہوں گے اس بدلے وقت کے لمس کو محسوس کرنے کے لیے...... تب یہ...... آنے والی نسل ہوگی جو ہماری جدوجہد کا پھل چکھے گی... کتنی خوشی کا

دن ہوگا... لیکن کب آئے گا وہ دن؟" طیبہ نے ملیحہ کی بیٹی عالیہ کو قریب بلا کر اسے اپنے سینے سے لگایا۔" یہ ہے ہماری جدوجہد کی سند...... ان کی آنکھیں، ان کے دماغ ہمارے سارے درد کے شاہد ہوں گے...... کتابیں، مسودے سب کچھ تو جل کر راکھ ہو گیا...... جس پر ہمیں ناز تھا ہمارے یقین کا مرکز تھے۔ ہم سے ہماری روح کو جدا کر دیا گیا...... قلم خواب بن گیا، کاغذ تمنا اور الفاظ تصور... تصورات میں اب ہم تخلیق کرتے ہیں۔"

"زیادہ بول کر خود کو تھکاؤ مت۔"

"برسوں بعد تو آج بات کر رہی ہوں۔ سچ پوچھو تو زندگی کا مزا لے رہی ہوں۔"

"تمہارا فلسفہ ہمیشہ سے عجیب رہا ہے۔"

"تبھی تو اتنی تکلیف جھیل گئی، ورنہ کتنوں نے ہتھیار ڈال دیے ہیں، میں بھی ڈال دیتی۔"

"کسے بنا رہی ہو؟" طیبہ اتنا کہہ کر ہنس پڑی۔

"اچھا، یہ بتاؤ کہ کھاؤ گی کیا؟" ملیحہ نے موضوع بدلا۔

"کچھ بھی، جو تم کھلاؤ گی وہ مجھے اچھا لگے گا۔"

"دودھ ٹھنڈا پیو گی یا گرم؟"

"کھانا کیا دودھ ہی ہے؟"

"کھانے میں تو کافی دیر ہے، تم ابھی دُودھ لے لو۔"

"پیٹ تو بھرا لگ رہا ہے، سچ پوچھو تو دل نہیں چاہ رہا ہے۔"

"دل تو تمہارا ہمیشہ سے شوخ رہا ہے، دل کی چھوڑو، دماغ کہتا ہے کہ کمزور جسم میں مقوی غذا ہی طاقت پیدا کرتی ہے۔"

"ٹھیک ہے، جیسے ہوم سائنس کی استانی صاحبہ کہیں۔" دونوں ہنس پڑیں۔

ملیحہ نے گیس پر دودھ چڑھا دیا اور الماری کھولی۔ سارے ڈبے خالی پڑے تھے۔ سبزی کی ٹوکری میں پرانے موزے اور جھاڑن بھرے تھے۔ فریج کھولا تو اس میں نہ گوشت تھا نہ قیمہ۔ کیا کرے وہ؟ دُودھ اُبال کر اس نے گلاس میں اُنڈیلا اور طیبہ کے قریب لائی۔ "شکر ملاؤں؟"

"نہیں دُودھ کی اپنی مٹھاس ہوتی ہے۔"

ملیحہ نے بیٹے اور بیٹی سے کہا کہ وہ دونوں طیبہ خالہ کے پاس بیٹھیں۔ وہ ابھی آئی۔ ملیحہ کھانے کا سامان لینے چلی گئی، طیبہ بچوں سے باتیں کرنے لگی۔ چھوٹی چھوٹی معصوم باتیں، جنہیں سن کر طیبہ مستقل ہنسے جارہی تھی۔ وہ دونوں بھی جانے کہاں کہاں کے لطیفے اور کہانیاں سنا رہے تھے۔ طیبہ دودھ پینا بھی بھول گئی۔ یہ بھی بھول گئی کہ وہ بیمار ہے اور پانچ دن تیز بخار میں تپتی رہی تھی۔

"خالہ، آپ ہماری طرح دُودھ سے بھاگتی ہیں؟" مہران نے کہا۔

"نہیں۔"

"تو پھر پی جیے نا، ممی آتی ہوں گی، بھرا گلاس دیکھ کر...... مزہ آئے گا جب وہ خالہ کو ہماری طرح ڈانٹیں گی۔" عالیہ تالی بجاتے ہوئے بولی۔

"شیطان!" اتنا کہہ کر طیبہ نے گھونٹ گھونٹ کر کے دُودھ پینا شروع کر دیا اور گلاس خالی کر کے میز پر رکھا۔

"کہاں چلی گئی ملیحہ؟ آٹھ بج رہے ہیں۔"

"آتی ہوں گی ماماں۔" مہران نے کہا۔

"اچھا۔ میں ذرا باتھ روم جاؤں گی۔" طیبہ اُٹھنے لگی۔ دونوں بچے بیساکھیوں کی طرح اس کی بغل کے نیچے آکھڑے ہوئے۔ ان کا نازک سہارا لے کر وہ باہر نکلی۔ باتھ روم کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے وہ بہت تھک گئی تھی۔

"خالہ رُکیے گا۔" کہہ کر بیٹا بھاگا اور کرسی سنک کے قریب لاکر رکھ دی اور کہنے لگا۔ "اب آپ آرام سے بیٹھ کر منہ دھوئیں۔"

طیبہ اس کی اس حرکت پر ہنس پڑی۔ منہ ہاتھ دھوکر جب تیار ہوئی تو ملیحہ کی بیٹی نے اس کے کنگھی کرنا شروع کر دی۔ طیبہ کی طبیعت خاصی سنبھل گئی تھی۔

طیبہ دونوں بچوں سے بولی۔ "مجھے چھت پر لے چلو۔ میں کھلی ہوا میں تھوڑا ٹہلوں گی۔"

"چلیے۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا اور طیبہ کے دونوں ہاتھوں کا سہارا بن گئے۔

آسمان پر تارے بکھرے تھے۔ چاند بھی ڈھلکا سا لگ رہا تھا۔ اس کی پھیکی روشنی چھت پر پڑ رہی تھی۔ پورا شہر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ دو سال سے جنگ کی وجہ سے بجلی جلانا بند ہو گیا ہے۔ لیکن کچھ دنوں سے گھر کی بجلی جلانے کی اجازت مل گئی ہے، لیکن کہاں کل کا جگمگاتا ایران، روشنی کا آبشار، آج کن تاریکی کی گلیوں میں کھو رہا ہے۔ منڈیر سے سہارا لگائے طیبہ کافی دیر تک شہر کی وسعت دیکھتی رہی۔ بچوں کو بھی مزا آرہا تھا۔ تبھی گھنٹی بجی۔

''ملیحہ آگئی۔'' طیبہ نے کہا۔

ملیحہ دو بھاری جھولوں سے لدی اُوپر آئی۔

''کسی کی دعوت کرنی ہے؟''

''جی نہیں! فریج آپ کی کتابوں کی الماری ہی کی طرح خالی پڑا ہے۔''

''ہوں۔''

''میں آج رات یہیں ٹھہرتی ہوں۔ صبح بچوں کی چھٹی ہے، پورا انتظام کر کے جاؤں گی...... یعنی کل شام تمہیں یہاں سے لے جاؤں گی۔''

''میں کہاں جاؤں گی...... میرا وجود تمہیں دُکھ ہی دے گا۔''

''میں ہی کون سی خوشیاں دیکھ رہی ہوں...... کم از کم ایک ساتھ رہ کر غم تو بانٹ لیں گے... ایک دُوسرے کی طاقت اور سہارا بنیں گے۔''

''میرے لیے ایران کی سرزمین بھاری ہوگئی ہے... قبر جتنی جگہ بھی ملنی مشکل ہے۔''

''تم ہر وقت اسّی سالہ ضعیف عورت کی طرح موت موت کی رَٹ کیوں لگائے ہو؟''

''کیونکہ موت ہی ہمارا مستقبل ہے، ایران کی جواں مرگی مشہور ہے۔ کیا تمہیں بھی بتانا پڑے گا۔ گزشتہ باون برسوں میں ہم نے کیسے کیسے جوان دماغ کھوئے ہیں۔ نام شمار کرانے بیٹھوں تو صبح ہو جائے گی۔ جب بھی پرندوں نے پَر پھیلا کر پرواز سیکھی، ان کی گردن اور بازو کاٹ دیے گئے۔ پہلے بیس سے پینتیس سال کے درمیان شہادت ہوتی تھی۔ آج دس سے چالیس کے درمیان... یہ ترقی کی ہے ہم نے گزشتہ دس برسوں میں... نئی نسل کٹ رہی ہے تاکہ کوئی مخالفت کرنے والا باقی نہ رہے...

لیکن ملیحہ، تم نے غور کیا ہے؟ سڑک پر نکلو تو ہر عورت حاملہ نظر آتی ہے۔ جہاں موت روز کے معمول میں شامل ہو جائے وہاں پر نسل آئندہ ایران میں آنکھ کھولنے کے لیے ماؤں کی کوکھ میں پنپ رہی ہیں...... ایران دوسرا ویتنام ہوگا... یہ جنگ آزادی کی منزل تک پہنچائے بغیر ہم ختم نہیں ہونے دیں گے... طوفان کو کون روک سکتا ہے! چڑھتی ندی کسی بھی رکاوٹ کو برداشت نہیں کر پاتی ہے۔ بڑے بڑے پتھروں کا جگر کاٹ کر نکلنے کی راہ بنا لیتی ہے... وقت مشکل ہے، سخت ترین ہے لیکن یہ بھی گزر جائے گا...... یہ بھی ہم گزار لیں گے۔"

"تم آرام کرو، میں کھانا پکانے جاتی ہوں۔"

"تم میری باتوں سے گھبرا جاتی ہو ملیحہ؟ ہم بھی کتنے مجبور ہیں! اتنا کچھ دل میں بھرا ہے، نہ کہیں تو شاید دل کی نسیں پھٹ جائیں۔ اپنے ہم خیال ملتے کہاں ہیں! سب یا تو قبر میں سو گئے یا جیل میں ہیں۔"

"ایسا تم نے کیوں سوچا...؟ میں نہ سمجھوں گی یہ ظلم تو اور کون سمجھے گا! تین برسوں سے جو کچھ جھیلا ہے، اس میں اب کوئی نہ سمجھنے والی بات نہیں رہ گئی ہے...... تمام گلے شکوے حسین سے جاتے رہے ہیں... وہ جو کر رہا ہے، ٹھیک کر رہا ہے۔ ایک انسان صرف بیٹا، شوہر اور باپ ہی نہیں ہوتا ہے، ایک محب الوطن بھی ہوتا ہے۔ انسانیت کا پرستار، آزادی کا عاشق بھی تو ہو سکتا ہے! میں جب سے انسانی جذبات کی گہرائیوں اور خیالات کی وسعت کو سمجھنے لگی ہوں... مر مر کر جی رہی ہوں... میرا آپ حیات... میری زندگی کی قوت یہی میرے دو بچے ہیں، ورنہ ایک معمولی سے خیالات کی عورت، جس کا دائرہ شوہر اور بچے ہوں، اس کے لیے شوہر کے غائب ہو جانے کا غم چھوٹا نہیں ہوتا ہے... میں ان کے بغیر جی رہی ہوں۔ اس بات کی دلیل ہے کہ میں اپنے اندر ایک نئی ملیحہ کو اُگتا دیکھتی ہوں، جو بہر حال حسین کی شخصیت کا ہی عکس ہے... ندی کی قسمت دریا کی گود میں پناہ ملنے میں ہی ہے۔ میں اسی دریا کی تلاش میں ندی میں ڈھل رہی ہوں۔"

طیبہ ملیحہ سے لپٹ گئی۔ "کون کہتا ہے بیداری نہیں آئی ہے! بچہ بچہ جاگ رہا ہے، تم تو پھر ماں ہو۔" طیبہ کی آنکھیں اشکبار ہو اُٹھیں۔

''اچھا، اب تم لیٹ جاؤ۔'' ملیحہ نے اسے سہارا دے کر، کمرے میں لے جا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ خود باہر رکھے گیس کے چولہے کے قریب آ کر کھانا پکانے میں مشغول ہو گئی۔ طیبہ کافی تھک گئی تھی۔ لیٹتے ہی آنکھیں بند کر لیں اور تھوڑی دیر بعد گہری نیند میں ڈوب گئی۔ دونوں بچے چھوٹے کام میں ماں کا ہاتھ بٹا رہے تھے۔

۱۵
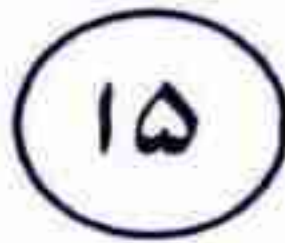
عباس آقا کچھ دنوں سے بہت متفکر نظر آ رہے تھے۔ سوسن کا خیال کافی دنوں بعد ادھر گیا، ورنہ وہ بچوں میں اتنی مشغول ہو گئی تھی کہ اسے آس پاس کی ہر شئے کھلی اور تازہ ہی نظر آتی تھی۔ پوچھنے پر انہوں نے کچھ بتایا ہی نہیں۔

ان کی تفکرات کا مرکز نیا تعمیر ہونے والا حمام خانہ تھا، جو دراصل جاسوسی کا اڈّہ ہوگا۔ وہ منع تو نہیں کر سکتے تھے۔ بنیاد پڑ چکی تھی۔ کام تیزی سے ہو رہا تھا۔ بیچارے دیہاتی، خوشی کے نعرے لگاتے تھکتے نہیں تھے۔ کل ایسی ہی بھیڑ اور تعمیر ہوتے حمام خانے کی تصویریں 'جہاد سازندگی' والے لینے آئے تھے۔ آج انہوں نے اسے ٹی۔وی پر بھی دیکھ لیا تھا۔ پوری رات وہ فکر میں ڈوبے کروٹیں بدلتے رہے۔ اس چھوٹے سے گاؤں کا ماحول بھی خراب ہونے والا ہے۔ وہ روک نہیں پائیں گے...... اتحاد کا مضبوط دھاگہ ٹوٹے گا...... بڑے شہروں کی طرح پڑوسی پڑوسی پر جاسوسی کرنے لگے گا...... وہی گھٹن، وہی تڑپ، وہی استحصال...... یہ اَن پڑھ دیہاتی ان گہرائیوں کو کیا سمجھیں گے، ان کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ گزشتہ سو برسوں سے وہ جانوروں کے ساتھ تالاب میں نہاتے رہے ہیں اور جنگل میں رفع حاجت کے لیے جاتے رہے ہیں۔ آج حکومت ان

کی خبر لینے آئی ہے۔ ان کے لیے گرم پانی کے ساتھ حمام خانہ بن رہا ہے۔ بیت الخلا بن رہا ہے۔ پانی کی پائپ لائن ڈالی جارہی ہے۔

صبح جب عباس آقا اُٹھے تو تھکے ہوئے سے اور اداس تھے۔ ناشتے کے بعد جب کھیت کی جانب جانے کے لیے نکلے تو دیکھا حمام کا کام رُکا پڑا ہے۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ ایک ہفتے کے بعد دوبارہ شروع ہوگا۔ سیمنٹ وغیرہ لینے گئے ہیں۔ عباس آقا نے گہری سانس لی اور آگے بڑھ گئے۔ شام کو چائے پیتے وقت انہیں کچھ شور سنائی دیا۔ باہر نکلے اور آواز کی جانب چل پڑے۔ حمام خانے کی طرف سے شور سنائی دے رہا تھا۔ ادھر ہی تیز تیز قدم بڑھاتے ہوئے پہنچے۔ ادھ بنی چھوٹی چھوٹی دیواروں کی چوبدی پر بھیڑ بیٹھی تھی۔ بلندی پر کوئی کھڑا دکھائی دیا۔ قریب پہنچ کر، وہ بھیڑ میں جا کر شامل ہوگئے۔

''بھائیو! ان مجاہدین اور فدائین نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا ہے...... ہم غریبوں اور ضرورت مندوں تک پہنچنا چاہتے ہیں، ان کی مدد کرنا چاہتے ہیں، لیکن یہ امریکی، زنجیری کتے ہمیں جینے نہیں دیتے ہیں، تعمیراتی کام روک دیتے ہیں...... دفتروں میں بم رکھتے ہیں...... آیت اللہ، مذہب کے محافظوں کو یہ لامذہب بم سے اڑاتے ہیں...... یہ اپنے وطن کو غیر ملک کے ہاتھوں فروخت کر دینا چاہتے ہیں۔ آپ ہماری مدد کریں...... اسلام کی حفاظت...... مذہب کی حفاظت...... ملک کی حفاظت ہر محبّ الوطن کا فرض ہے۔ انقلاب کے دشمنوں کو ناکام کریں۔ اسلامی انقلاب کو بچائیں...... یہ انقلاب غریبوں، مفلسوں، بیکسوں، مظلوموں کا انقلاب ہے، اسے ہم آئندہ بھی خون سے سینچیں گے، لیکن مرجھانے نہیں دیں گے...... ایک آواز بنیں، ایک طاقت بنیں، نعرے لگائیں ایک ساتھ۔''

''مرگ بر امریکہ......''

''مرگ بر منافقین......''

''مرگ بر دشمنِ انقلابِ اسلامی......''

پورا ماحول نعروں میں ڈھل گیا۔ پانچ سیکنڈ کے بعد شور سکون میں تبدیل ہوگیا۔

''کام کب شروع ہوگا، کہا نہیں جا سکتا، لیکن ہوگا...... اس کا ہمیں یقین ہے......
یہ یقین آپ کے اعتماد کی مانگ کرتا ہے۔
پھر تمام ہاتھ آسمان کی طرف اُٹھ گئے۔ فلک شگاف نعرے بلند ہونے لگے۔
''یاد رہے، اُٹھے ہاتھوں کے درمیان گرا ہاتھ دشمن کا ہاتھ ہوتا ہے۔''
گھبرا کر اس مرتبہ عباس کے ہاتھ میں بھی حرکت آ گئی۔ تھوڑی دیر بعد بھیڑ چھٹ گئی۔ تمام بھیڑ صاف الفاظ میں حکومت مخالف جماعتوں کو گالیاں دے رہی تھی۔
گھر پہنچتے ہی گھبرائی ہوئی سوہن نے پوچھا۔ ''کیسا شور تھا؟''
''کوئی خاص بات نہیں ہے، بس یوں ہی......''
تبھی دروازہ کھٹکھٹایا گیا۔
''کون ہے؟''
عباس نے دیکھا، سامنے دو تین لوگ کھڑے ہیں۔ سلام اور مصافحہ کرنے کے بعد انہیں اندر بلایا، بٹھایا۔
''ماشاء اللہ! جنگل میں منگل ہے...... اس دیہات میں تمام سہولیات جمع کر لیں آپ نے۔'' ایک نے داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔
''سب خدا کا فضل ہے۔'' عباس بولے۔
''خدا سب پر اپنا کرم کرے۔'' دُوسرے نے کہا۔
''آپ لوگ ٹھنڈا پسند کریں گے یا گرم؟''
''جو بھی آپ پسند کریں۔''
''پہلے شربت لیں...... تھک گئے ہوں گے۔''
''جیسی جناب کی مرضی۔ ہم تو خدمت گار ہیں۔ خدا کی راہ پر نکلے سپاہی۔ کچھ مل جاتا ہے تو کھا لیتے ہیں، ورنہ صبر کر لیتے ہیں۔''
عباس باہر گئے اور شربت کی ٹرے لے کر اندر کمرے میں آئے۔ بلقیس کو قصداً ان کے سامنے نہیں آنے دیا۔ شربت پی کر وہ بولے۔ ''ہمیں آپ کا پتہ آپ کے دوست جج نے دیا تھا۔ کہا تھا کہ آپ یہاں پر ہماری مدد کریں گے؟''

"حاضر ہوں، بتایئے کس طرح کی مدد آپ چاہتے ہیں؟"

"بس، زیادہ سے زیادہ تشہیر چاہتے ہیں۔ آپ سے کچھ پوشیدہ تھوڑے ہی ہے۔ ہم کس مشکل دَور سے گزر رہے ہیں۔ اس سے ہم ہی واقف ہیں...... بس، اب تو انسانی قوت پر ہی ہمارا اعتماد ہے۔ عراق سے جنگ میں فتح ہماری ہوگی۔ بہت جلد ہمارا جھنڈا وہاں لہرائے گا......"

"ان کے دل میں مذہب کی گرمی لاکر انہیں 'بسیز' میں بھیجنا ہے۔ دو ہفتے ایک ماہ کی ٹریننگ چل رہی ہے۔ آرام سے بندوق چلانا سیکھ لیں گے۔"

"عراق میں گھسنے کا مطلب ہے، دیگر ممالک بھی ہمارے جھنڈے کے نیچے سانسیں لیں گے۔"

"بچے، بوڑھے، جوان تمام لوگوں کا ہم استقبال کرتے ہیں، جو آنا چاہیں آئیں۔"

"نماز کا وقت ہوگیا ہے۔" ایک نے کہا۔

پانچ افراد نے اسی کمرے میں ایک طرف نماز ادا کی اور چلنے کی اجازت مانگی۔

"کھانا تیار ہے، کھا کر جائیں۔"

"شکریہ، اتنی تکلیف آپ نے اُٹھائی وہی بہت ہے۔ اب ہم چلیں گے۔ دو دِن کا راستہ ہے۔"

"کھانا تیار ہے، آرام سے جایئے...... راستہ میں کھانا کہاں ملے گا...... میلوں پتھریلا راستہ ہے۔" کہہ کر عباس اندر گئے اور پھر آکر ان چاروں سے بولے۔

"آیئے، کھانا تناول فرمائیں۔"

کھانے کے درمیان بھی طرح طرح کی باتیں ہوتی رہیں۔ رات کو تقریباً گیارہ بجے وہ لوگ اُٹھ کر گئے۔ عباس ان کو پہنچا کر جب گھر لوٹے تو ان کے چہرے سے لگ رہا تھا کہ جیسے وہ کسی جنازہ میں شامل ہو کر آرہے ہوں۔ آتے ہی کٹے پیڑ کی طرح بستر پر گر پڑے۔

"کیا بات ہے؟ کچھ تو بتائیں؟ اندر ہی اندر اکیلے گھٹنے سے کوئی فائدہ ہے؟"

"بتاتا ہوں۔ مجھے سنبھلنے تو دو۔" عباس نے آہستہ سے کہا۔

شوہر کے سر کو آہستہ آہستہ سہلاتی ہوئی سوسن پاس بیٹھی رہی۔ عباس اسی حالت میں سو گئے۔ سوسن انہیں خاموشی سے بیٹھی دیکھتی رہی۔ خدشات سے اس کا دل کانپ رہا تھا۔ بچہ رو پڑا۔ سوسن اُٹھی۔ عباس بھی چونک پڑے۔ سوسن نے بیٹے کو گود میں لے کر اسے دودھ پلانا شروع کر دیا اور نظریں شوہر کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔ عباس اُٹھ کر بیٹھ گئے، پھر سوسن کی جانب مڑے۔

''بلقیس چلی گئی؟''

''نہیں، برتن دھو رہی ہے۔''

''مجھے چائے چاہیے... ویسے رات کافی ہو گئی ہے۔ اس سے کہہ دو، صبح آ کر کام کر لے گی۔ چائے بھی تب بنوانا جب سماور روشن ہو۔''

''سماور روشن ہو گا، چائے بھی اس نے تازہ دم دی ہو گی اپنے لیے، جانے سے پہلے پی کر جاتی ہے۔'' سوسن نے بیٹے کو عباس کی گود میں لٹایا اور کچن کی طرف چلی گئی۔

چائے لے کر لوٹی تو دیکھا، عباس بجائے بچے سے کھیلنے یا بولنے کے، سامنے دیوار میں جانے کیا تلاش کر رہے ہیں۔ ان کو سوسن کے آنے کی آہٹ کا بھی احساس نہ ہوا۔ چہرے پر غم کا تاثر اور آنکھوں میں گہری سوچ کے بادل تھے۔

''چائے لیں۔'' سوسن نے چائے کی ٹرے میز پر رکھی۔

''آں...... آں...... چائے...... لے آئیں۔ اچھا! اِسے لو تو میں چائے پیتا ہوں۔'' کہہ کر عباس میز کے سامنے والی کرسی پر آ کر بیٹھ گئے۔ سوسن نے بیٹے کو گدّے پر لٹایا اور شوہر کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔

''بات کوئی خاص نہیں جو تمہیں بتاؤں، لیکن احساس اور خیالات کے نظریہ سے تکلیف دہ ہے، اگر اس کے بارے میں سوچا جائے...... یہ لوگ چاہتے ہیں کہ کچھ لوگ میدان جنگ میں جائیں۔ جنگ کو ختم نہ ہونے دیں...... مذہب کا نام لے کر...... خیر، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے، لیکن اس کا خاتمہ آخر ہو گا کہاں؟ میں انجام کے لیے متفکر ہوں۔''

''حمام خانہ......؟''

''ہاں، اب حمام خانہ نہیں بنے گا، ادھورا پڑا رہے گا تا کہ دیہاتی باشندوں کو اس

کا ادھورا پن ستاتا رہے کہ اس کے ختم نہ ہونے کی وجہ حکومت مخالف گروہ ہے، کینہ کا بیج بو دیا ہے سمجھو۔ ان کا کام ہوگیا، اس لیے ملک کی قسمت، انسان کا مستقبل جائے چولہے بھاڑ میں....۔"

"تم سے وہ کیا چاہتے ہیں؟"

"اپنے مقاصد تک پہنچنے کے لیے میری مدد چاہتے ہیں۔"

"تم کرو گے۔"

"کرنا نہ کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے، زمین وہ خود تیار کر رہے ہیں۔ ایک دو مرتبہ اور آئے تو سمجھو وہ اپنے مقاصد میں کامیاب ہوجائیں گے...... لوگ سر پر کفن باندھ کر گھروں سے نکل پڑیں گے......۔" عباس نے ٹھنڈی سانس بھری۔

"کیا مصیبت ہے! ایران کی زمین پر مسرت اور سکون کی تلاش ناممکن ہوگئی ہے۔"

"بہاؤ ہے بہے گا، غیر سمت ہی سہی، ایک مدت بعد ہی یہ سب کچھ رُکے گا۔"

"تم تھک گئے ہو، لیٹ جاؤ۔"

"لیٹنا ہی ہے اب، کرنا بھی کیا ہے۔"

"بہت کچھ کرنا ہے تمہیں ابھی، یوں مایوس کیوں ہو رہے ہو؟"

"مایوس نہیں، بلکہ سچ کہہ رہا ہوں۔ تمہیں سب کچھ معلوم کہاں ہے، ایک ہفتے پہلے ایک مولوی کا لڑکا، جو افسر بنا دیا گیا تھا، کارخانوں کا معائنہ کرنے گیا تھا۔ سنا ہے ڈگری بھی نہیں ہے اس کے پاس۔ دو ماہ قبل انگلینڈ گیا تھا، وہاں سے لوٹ کر کارخانوں کے دَورے کا شوق ہوا ہے۔ داڑھی رکھ لی تھی۔ بڑے عہدے پر فائز ہوگیا۔ شوگر مل کو دیکھ کر بولا۔ "اسے چپس بنانے کے کارخانے میں بدل دیا جائے تو پیداوار زیادہ ہوگی۔" کام کرنے والے ایسی صلاح سن کر پاگل ہو اُٹھے۔ بول سکتے نہیں اور اب کارخانہ بند پڑا ہے۔ نہ مشین، نہ آلو، نہ پروگرام۔ تمام مزدُور قسمت پر اشک بہار ہے ہیں۔ کچھ نے جلوس نکالا تو دو مزدُوروں کو بغاوت کرنے کے جرم میں پھانسی کی سزا ہو گئی، باقی کی ہمت پست ہوگئی۔ افسر کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ جگہ خالی ہے، لوگوں نے بتایا کہ وہ تو سفیر بن کر آج کل جرمنی گئے ہوئے ہیں۔ ان حالات اور ایسے ماحول میں کوئی

کیا کرے! ہے کوئی سنوائی کہیں پر! جہاں پر حامد اور حمید کے نام میں لوگ فرق نہ سمجھ پائیں اور حامد کی جگہ حمید کو گولی سے اُڑا دیں، پھر غلطی کا احساس ہونے پر حامد کے ساتھ چھوٹے بے گناہ بھائی ساجد کو مار ڈالیں...... پوری انسانی تاریخ میں ایسی رونگٹے کھڑے کر دینے والی باتیں سننے کو نہیں ملیں گی...... اس ماں سے پوچھو، جس نے تین بیٹے ایک ہی دن کھو دیے...... کل اسی دیہات کے تمام لوگ تہران میں جا کر کیا سمجھداری کا سلوک کریں گے، جو حقیقتاً اس دیہات کے علاوہ کچھ نہیں جانتے ہیں۔ اپنے ملک کو نہیں جانتے...... انجانے میں اپنے بھائیوں کا قتل کر رہے ہیں۔ اس سے بڑا مضحکہ خیز منظر اور کیا ہوگا...... کیا ہوگا!" عباس بے دم ہو کر تکیے پر سر رکھ کر لیٹ گئے۔

سوسن نے لائٹ بجھائی اور شوہر کے بالوں کو انگلیوں سے سہلانے لگی۔

طیبہ کی طبیعت کافی سنبھل چکی تھی۔ شام کو جب ملیحہ نے اس سے کہا کہ وہ بھی اس کے ساتھ چلے، اکیلی کمرے میں کیا کرے گی، تو وہ صرف مسکرا کر رہ گئی۔

چائے پینے کے بعد ملیحہ نے سامان سمیٹنا شروع کیا تو طیبہ کو کہنا پڑا۔ "ملیحہ! میں نہیں جا پاؤں گی، چاہ کر بھی نہیں۔ سمجھتی ہوں جس انسان نام کی چیز کو میں اتنا پیار کرتی ہوں، اس سے دُور تھوڑی بھاگوں گی، لیکن میں انسانوں کے درمیان سانس نہیں لے سکتی ہوں، ورنہ ان انسانوں کو صرف پریشانیاں اور مشکلات سے دوچار ہونا پڑے گا۔"

"ہم سب ساتھ سہیں گے۔"

"نہیں ملیحہ جان! میرا یہ سیاسی گھر ہے، کبھی کبھی فون آتے ہیں۔ جدوجہد کا موقع ملتا ہے، کچھ لکھ لیتی ہوں، پھر وہاں تمہارے گھر میں...... میں صرف تمہارے لیے نہیں، بلکہ اپنی جدوجہد کے لیے خطرہ بن جاؤں گی۔"

"میں تمہیں چھوڑوں گی نہیں۔ حالت دیکھو۔ وہ طیبہ جو نہ تھکتی تھی، نہ اداس ہوتی تھی، اس کے چہرے پر پیلاپن اور اُداسی ہے۔ اپنی جدوجہد کے لیے تمہیں مضبوطی سے جینا ہے۔ مر کر جدوجہد کیا کر پاؤ گی...... چلو، بس سامان باندھ لو...... ایک ہفتہ رہ

کر، چست ہو کر لوٹ آنا۔"

"نہیں ملیحہ، مجھے کمزور مت بناؤ...... یہ کمرہ چھوڑنے کا مطلب ہے...... کیسے سمجھاؤں تمہیں!"

"اپنے الفاظ میں...... آج لفظ کم کیسے پڑ گئے؟"

"مذاق نہیں، ملیحہ۔ میرے پاس اب بھی خزانہ ہے، خیالات، جذبات اور الفاظ کے اظہار کا...... وقت آنے دو۔"

دونوں بچے طیبہ سے لپٹ گئے اور ضد کرنے لگے۔ "خالہ چلئے نا۔"

"نہیں، بیٹے، خالہ پر بہت سے فرائض کا بوجھ ہے۔ تم لوگ آنا، خالہ گھر پر رہے گی۔" طیبہ نے دونوں بچوں کو پیار کیا۔

"اب طیبہ بچوں کی بات مت ٹالو۔" ملیحہ نے کہا۔

"آؤ باہر چلیں...... چھت پر چل کر تم سے کچھ باتیں کرتی ہوں۔ تم دونوں یہیں بیٹھو۔" کہہ کر طیبہ نے ملیحہ کا ہاتھ پکڑا اور باہر لے آئی، پھر بولی۔ "یاد ہے ملیحہ...... آج سے کچھ سال پہلے، میں بھی اسی طرح یہی غلطی تمہارے ساتھ کر رہی تھی کیونکہ تمہیں نئی زندگی دینا چاہتی تھی۔ یاد ہے...... تم نے مجھے بنجارن کہا تھا۔ اپنے تعلق سے تم نے واقعی عشق کو محسوس کرلیا تھا۔ حسین تمہارے احساس کا مرکز تھا۔ یاد آیا...... میری زندگی کے بہت سے خوبصورت جذبوں کے حصے تم لوگوں سے پوشیدہ ہیں۔ وقت ہوگا تو شاید تمہیں وہ حصے نظر آجائیں...... آج میں تم سے کہنا چاہوں گی ملیحہ، کہ مجھے میرے عشق کے ساتھ جینے دو، مجھے کسی دشمن کی طرح اس سے جدا نہ کرو۔ اسی میں میری خوشی ہے...... یہ اکیلا پن...... یہ غریبی...... یہ ظلم...... میری قوت ہے۔ نفرت کو اور بڑھاوا دیتے ہیں۔ جدوجہد کو انجام تک پہنچانے کی گرمی فراہم کرتے ہیں...... تم آنا، لیکن صرف ایک بار اور، میرا گھر زیادہ محفوظ نہیں ہے...... تم اکیلی نہیں ہو بلکہ دو بچوں کی ماں ہو...... تمہاری اور بہت ذمہ داریاں ہیں، ان سے آنکھیں بند مت کرنا......" طیبہ نے ملیحہ کو اپنی بانہوں میں بھرلیا، پھر اس کے رخساروں پر پیار کر کے بولی۔ "خدا حافظ۔"

ملیحہ خاموشی سے کمرے میں لوٹی۔ بچوں سے چلنے کے لیے کہا، پھر بڑی

محبت سے طیبہ سے بولی۔ ''میں پرسوں پھر آؤں گی۔ کھانا کھا لینا۔ سب کچھ فریج میں رکھا ہے۔''

ان کے جانے کے بعد طیبہ نے کمرہ بند کیا اور بستر پر لیٹ گئی۔ دماغ میں بہت سی باتیں، جو اس کی اپنی تھیں، یاد آنے لگیں۔ ان کی یاد میں ڈوبی وہ سو گئی۔

مہناز کو ولایت آئے ہوئے ایک ہفتہ گزر گیا تھا۔ روزانہ شام کو چاروں گھومنے نکل جاتے تھے۔ آج بھی وہ پارک میں ٹہل رہے تھے۔ سیف پریم میں سو رہا تھا اور عالیہ کھڑی ہوئی آئس کریم کھا رہی تھی۔ سلیمان نے ایک دم کہا۔ ''کل یہاں کی یونیورسٹی میں اسلم عطاپور کے بارے میں معلوم کروں گا...... مجھے خیال ہی نہیں رہا کہ پوچھتا، تم نے بھی یاد نہیں دلایا۔''

''مجھے بھی خیال نہیں رہا، کل یونیورسٹی گھومنے چلتے ہیں۔ وہیں معلوم بھی کر لیں گے۔'' مہناز نے کہا۔

''یہ ٹھیک ہے، پارک، باغ، ہوٹل، میوزیم کی خاک تو ہماری حسین محبوبہ نے چھان ماری ہے۔ اب اسے کتب خانہ وغیرہ کی سیر کراؤں گا۔'' سلیمان نے کہا۔

''جلدی چلیں گے کل۔'' مہناز نے کہا۔

''ٹھیک ہے۔'' سلیمان نے کہا۔

رات کا کھانا انہوں نے اپنے ہوٹل میں ہی کھایا۔ رات کو سوتے وقت سلیمان نے مہناز کے چہرے کو انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہا۔ ''تم خود کیوں نہیں لکھتی ہو؟''

''کون میں؟'' مہناز چونک پڑی، پھر ہنس دی۔

''ہاں آپ ہی، میری مراد اپنی حسین بیوی سے ہے۔ سچ، کیوں نہیں لکھتی ہو تم؟ جب پڑھنے لکھنے اور ادب سے اتنی محبت ہے تو پھر کچھ نہ کچھ تو تمہارے ذہن میں بھی آتا ہوگا۔ ان جذبوں کا اظہار قلم کے ذریعہ کاغذ پر تحریر کر ڈالو...... سچ مہناز، مجھے اچھا لگے گا...... پھر اب بچے بھی بڑے ہو رہے ہیں، سیف بھی کچھ دنوں بعد نرسری جانے

لگے گا، تمہیں کافی وقت ملے گا۔"

مہناز شوہر کی بات سن کر صرف میٹھی ہنسی ہنستی رہی۔ اسے بہت خوشی ہو رہی تھی۔ ایسی باتیں بابا کرتے تھے۔ ایک دم سے اسے اپنے گھر کا کتب خانہ یاد آ گیا۔ آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بابا کی یاد سے اس کا گلا رُندھ گیا۔ بہت برداشت کرنے پر بھی وہ رو پڑی۔

"یہ کیا؟ مجھ سے کوئی غلطی ہوئی کیا؟" سلیمان گھبرا کر اُٹھ بیٹھا۔

"نہیں، نہیں۔ بابا یاد آ گئے...... وہ مجھ سے ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے۔ برسوں بعد آج...... وہی جملے سن کر میں...... میں اپنے کو روک نہ پائی۔"

"اچھا! یہ تو بڑا مشکل مسئلہ ہے کہ میری باتوں سے آپ کو چچا جان یاد آتے ہیں...... آج سے ہم اشاروں میں باتیں کریں گے۔ ٹھیک ہے؟"

"ہر وقت آپ مذاق کے موڈ میں رہتے ہیں۔" مہناز ہنس پڑی۔

"پھر کیا کروں؟"

"اچھا، اب سو جایئے، صبح اُٹھنا ہے۔"

"ٹھیک ہے، سیف کی طرح خاموشی سے سو جاتا ہوں...... لو......" سلیمان کی بات پر مہناز ہنس پڑی۔

"اب تم شور مچا رہی ہو۔ رات کے بارہ بجے ہنسنے کی کیا تک ہے!"

"خدا کے لیے خاموش رہیے، بچے شور سے جاگ جائیں گے۔"

"اچھا۔ اس مرتبہ مت ہنسنا۔"

"ٹھیک ہے۔"

کمرے میں پھر بھی صرف ہلکی ہنسی اور سانسوں کی مدھم آوازیں جل ترنگ بجاتی رہیں۔

شام کو سلیمان جلدی لوٹ آیا۔ یونیورسٹی پہنچ کر انہوں نے معلومات کی۔ معلوم

ہوا، اس نام کا ایک طالب علم ہے اور اس کا کمرہ نمبر چار سو بارہ ہے، فورتھ فلور پر ہے۔
''کس پروفیسر کے انڈر میں ہیں، تاکہ وہ نہ ملیں تو ان کے پروفیسر سے گفتگو ہو جائے؟'' سلیمان نے پوچھا۔
''اوپر معلوم ہو جائے گا، ڈپارٹمنٹ کا آفس چار سو نمبر میں ہے۔''
''شکریہ۔''
چاروں اُوپر پہنچے۔ چار سو بارہ نمبر کمرے کے دروازے کو کھٹکھٹایا۔ اندر سے آواز آئی۔ ''کم اِن۔''
مہناز نے خود کو سنبھالا۔ سلیمان نے دروازہ کھولا اور مہناز کو ٹھہرنے کا اشارہ کر کے اندر گیا۔
''میں سلیمان، جرمنی میں انجینئر ہوں۔ آپ......''
''میں اسلم عطاپور ہوں، یہاں پر ریسرچ کر رہا ہوں...... بیٹھیے۔''
''اکیلے کیا بیٹھوں جناب!''
''جی۔''
''میری بیوی باہر کھڑی ہے، آپ کی نظموں کی دیوانی ہے۔''
''کون...... مہناز؟''
''جی، مہناز ہی، آپ کی کلاس فیلو۔'' کہہ کر سلیمان آگے بڑھا اور دروازہ کھولا۔
سلیمان اور اسلم عطاپور کو پھر سے اپنی وہ ملاقات اچانک یاد آگئی، جو مہناز کے گھر پر ہوئی تھی۔ لمحہ بھر کی ملاقات تھی، چہرے دھندلا گئے تھے۔
''آؤ مہناز، آخر میں نے شاعر صاحب کو ڈھونڈ ہی لیا ہے۔''
اسلم اور مہناز نے ایک دُوسرے کو دیکھا، سلام کیا، ہاتھ ملایا۔ جذبات کا ایک طوفان دونوں کے دل کے دروازے توڑنے لگا۔ لیکن دونوں نے ہی اپنے کو سنبھالے رکھا تاکہ کہیں چہرہ دل کا آئینہ نہ بن جائے۔ اسلم بچوں سے کھیلنے لگا۔ مہناز خاموشی سے دیوار پر لگی تصویروں کا معائنہ کرنے لگی۔ سلیمان تھوڑی دیر بعد بولا۔ ''اگر آپ پسند کریں تو میں چائے ساتھ پینے کی دعوت دے سکتا ہوں۔''

"ارے! شکریہ! یہ تو میرا فرض ہے۔ چلئے، یہیں کینٹین ہے۔ سروس اچھی ہے۔"
سب اُٹھ کر چل دیئے۔
"آپ کی کوئی نئی کتاب آئی؟"
"نہیں۔ ایران میں اب کتابیں کہاں شائع ہوتی ہیں!"
"آپ کی نظموں کا دوسرا مجموعہ میں نے پڑھا تھا۔"
"ایران گئے تھے آپ؟"
"نہیں۔ مہناز کی دوست پری نے بھیجا تھا، جو چھ ماہ بعد ہم تک پہنچا تھا۔"
"اوہ! پری تو آج کل پیرس میں ہے۔"
"پیرس میں؟ کب آئی؟ آپ کو کیسے معلوم ہوا؟" مہناز نے تڑپ کر پوچھا۔
"ایک ہفتے پہلے مجھے خط ملا تھا۔ خفیہ طور پر پاکستان کے راستے سے بھاگ کر آئے ہیں۔ بچے ایک سال پہلے ہی آگئے تھے۔"
"مجھے اس کا پتہ دیجئے گا...... ابھی ہے آپ کے پاس؟"
"زیادہ بے چین نہ ہوں، لوٹتے وقت پیرس ہوتے ہوئے جرمنی واپس ہوں گے۔"
مہناز خوشی سے سرخ ہوگئی۔ دل چاہ رہا تھا کہ بس جلدی سے پری سے ملاقات ہو جائے، کیسا اتفاق ہے، دُنیا کتنی چھوٹی ہے۔ ایک ایک کر کے سب مل رہے ہیں۔
چائے پر کافی باتیں ہوئیں۔ سلیمان کو اسلم پسند آیا۔ سیدھا، شریف اور بے حد شائستہ۔ اس نے اسلم سے پوچھا۔ "آپ نے شادی کیوں نہیں کی؟"
"یہ کیسے جانا آپ نے؟" اسلم ہنس پڑا۔
"شادی شدہ آدمی دوستوں کو گھر کے بجائے کینٹین نہیں لے جاتا ہے۔"
"خوب۔"
اس بات پر سب ہنس پڑے۔
"جب بھی شادی کرنا چاہتا ہوں تو کوئی نہ کوئی حادثہ ہو جاتا ہے۔" ہنستے ہوئے اسلم نے کہا۔

"خیر جناب! آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی۔ کل شام آپ ہمارے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں۔ جلدی آیئے گا، تا کہ ادبی گفتگو جی بھر کر ہو، یہی کوئی پانچ بجے۔ یہ رہا میرا کارڈ...... اور اس پر لکھ دیتا ہوں ہوٹل کا نام اور فون نمبر......"

ان کے جانے کے بعد تنہا کھڑا اسلم سوچ رہا تھا، مہناز بڑی خوش قسمت ہے۔ شوہر بہت اچھا ملا ہے...... تھوڑی دیر بعد ایک ٹیس اٹھی...... تبھی وہ تمہیں بھول گئی ہے۔ اسلم نے سر جھٹکا اور اندر کمرے کی طرف بڑھ گیا۔

مہنگائی، بیکاری اور خوف ایران میں اپنی آخری حدوں پر پہنچا ہوا تھا۔ جو پیسے والے تھے، ان کے تہہ خانے چیزوں سے بھرے ہوئے تھے اور فریج گوشت سے۔ اُبلی سبزی کے پیکٹ بھی برف کے بیچ میں پھنسے ہوئے تھے۔ پس رہا تھا متوسط اور ادنیٰ طبقہ۔ بیکاری، بھوک انہیں سب سے زیادہ پریشان کر رہی تھی۔ سڑک پر چلتے لوگ دماغی مرض کا شکار نظر آتے تھے۔ دشمنی تھی کہ ختم ہی نہیں ہو رہی تھی۔ حکومت کا کوئی پروگرام زیادہ دن تک نہیں چلتا تھا۔ روز کی اس تبدیلی سے حالت خراب تھی۔ پیٹرول کی کمی سے کاریں سڑکوں پر دھول جمی کھڑی تھیں۔

جمعہ کا دن تھا۔ نماز کے بعد، 'بسیز' نکل رہی تھی۔ دیہاتیوں کی لمبی قطار، ہاتھوں میں بندوقیں لیے ملک پر قربان ہو جانے کے لیے آمادہ 'اللہ اکبر، خمینی رہبر' کے نعرے لگاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ عورتیں چادروں میں لپٹی، فٹ پاتھ پر کھڑی جاتے لوگوں کو دیکھ رہی تھیں۔ اسی درمیان اعلان ہوا کہ عراق، ایران جنگ میں امداد دیں۔ جس کے جسم پر جو بھی گرم کپڑا تھا، اُس نے اُتار کر ٹرک کی طرف پھینکنا شروع کر دیا۔ سب کے کانوں میں امام جمعہ کی تقریر کے کچھ الفاظ گونجنے لگے۔

"اگر جوان لڑکے لڑکیاں اسلام کے زیر روشنی نہیں ہیں تو ماں باپ کا فرض بنتا ہے کہ ان کو راہ راست پر لائیں، ان کے دل میں جنگ کی عظمت کے جذبات جگائیں اور انہیں میدان جنگ میں جانے کے لیے راغب کریں۔ ہماری جنگ مذہبی جنگ ہے۔"

بھیڑ جب منتشر گئی تو سڑکیں پھر سنسان ہو گئیں۔ یہی جمعہ تھا جب باغ اور پارک لوگوں سے آباد ہوتے تھے۔ پھول کھلتے تھے، ریسٹورنٹ اور ہوٹل جگمگاتے تھے۔ ہنسی کے فوارے انار کی طرح چھوٹ چھوٹ کر بکھرتے تھے۔ کیا ہو گیا ہے اس ایران کو! بوڑھا عبدل گھر لوٹتے ہوئے سوچ رہا تھا۔ وہ 'نیشنل' کارخانہ میں مزدور تھا۔ عراقی بم نے میلوں لمبے نیشنل کارخانے کے اسٹور کو تہس نہس کر دیا تھا۔ تب سے چھٹنی ہوتی گئی۔ آخر میں کارخانہ ہی بند ہو گیا، اب بیکاری ہے، صرف بیکاری۔

ہفتے کی ہی تو بات ہے...... کریم اور شریف کھانا کھا رہے تھے...... پاسدار پکڑ کر لے گئے...... رمضان کا مبارک مہینہ، خدا اپنی خواہشات پر قابو کرنے کا حکم دیتا ہے، اور یہ پدرِ سگ...... پیٹ کا دوزخ بھر رہے ہیں...... کتے کے باپ! کریم اور شریف کو پھر کسی نے اس غریب مزدور بستی میں نہیں دیکھا۔

عبدل کو یاد آیا...... دونوں ایک سال سے بیکار تھے۔ مزدوری کبھی کبھی مل جاتی تھی۔ دو دِن سے بھوکے تھے...... کون بھر پیٹ کھا رہا ہے......؟ قاسم کہہ رہا تھا کہ ان کا کام...... میرا دل نہیں مانتا...... جیل میں روٹی تو کھا رہے ہوں گے...... لیکن قاسم کہتا ہے، جس نے یہاں دو دِن کی بھوک کے بعد روٹی نہیں کھانے دی، کیا وہ وہاں...... چھوڑو چاچا...... تم بوڑھے لوگ بیکار کی امید میں جیتے ہو...... پاس کے گھر سے ہمیشہ کی طرح پھر رونے چیخنے اور کوسنے کی آوازیں آنے لگیں۔ عبدل اپنی جگہ سے اُٹھا اور پڑوس کا دروازہ کھٹکھٹایا، دروازہ کھلا۔

"تم سمجھاؤ، عبدل آغا، اسے...... میں تو اسے پیدا کرتے ہی کیوں نہ مر گئی...... بزدل کہتا ہے، میں میدان جنگ میں نہیں جاؤں گا...... کل سے کھانا نہیں کھا رہا ہے...... عورتوں کی طرح بیٹھا رو رہا ہے۔"

تیرہ چودہ سال کا قاسم گھٹنوں میں سر ڈالے ہچکیاں لے رہا تھا، اس کا سوکھا جسم، بڑے گھنے سر کے بال سسکاریوں سے ہل رہے تھے۔ عبدل پاس جا کر بیٹھ گیا۔ محبت سے سر پر ہاتھ پھیرتا رہا۔ منھ سے کچھ نہیں بولا۔ صدیقہ خانم پٹک جھٹک کے ساتھ بڑبڑائے چلی جا رہی تھیں۔ "آخر ناظم، شاہد نے بھی میرا دودھ پیا تھا۔ تب میں روتی

تھی، لیکن وہ جا کر لڑے اس کافر صدام کی فوج سے...... تم تو گواہ ہو، عبدل! دونوں بھائیوں کا رنگین فوٹو شائع ہوا تھا۔ پورے ایران کی دیواریں بھر گئی تھیں۔ پھولوں سے لد گیا تھا جنازہ...۔ ایسی عزت بھلا کس کو نصیب! نصیب والوں کو... لیکن اس بدنصیب کو کون سمجھائے! تم بھی عبدل، خاموش ہو، آخر کیوں؟ کچھ تو اس پدر سوختہ سے کہو۔"

عبدل دوسری ہی سوچ میں ڈوبا ہوا تھا، 'کاش! مہناز خانم یہاں ہوتیں تو ان کے گھر میں اسے جا کر چھپا آتا، لیکن وہ بھی شادی کے بعد پرائی ہو گئیں...... شریفہ جب بھی ان سے کچھ کہتی تھی، اس گھر میں انکار نہ تھا۔ لیکن اب تو نہ شریفہ زندہ ہے نہ اس گھر کے لوگ... ناصر زراعتی کے بعد شیرین خانم کا انتقال... کیا بچا اس گھر میں!'

"میں کس سے اپنا دکھ کہوں؟ ہے کوئی مدد کرنے والا..." یہ کہہ کر صدیقہ خانم سر پر نماز کی چادر ڈال کر تیز قدموں سے سڑک پار کرنے لگیں۔

سڑک کی دوسری طرف محلے کی مسجد سے ہی کوپن، لائسنس، سگریٹ ملنا شروع ہو گیا تھا۔ اس وقت بھی وہاں پر بھیڑ لگی تھی۔ اسی بھیڑ میں صدیقہ خانم بڑبڑاتی ہوئی شامل ہو گئیں۔

١٦

پری کو جب معلوم ہوا کہ تہران کا گھر لٹ گیا ہے تو کلیجہ تھام کر رہ گئی۔ "خبردار، پری! اگر تمہاری آنکھوں سے ایک بھی آنسو گرا۔" خالد نے مستحکم لہجہ میں کہا اور گلاس میں شراب اُنڈیلنے لگا۔

"ورنہ......" اچکچا کر بولی پری۔

"ورنہ کیا! کہاں تک آنسو بہاؤ گی! مال کے لیے، جان کے لیے، عزت کے لیے ! شکر کرو پری، شکر کہ ہم ساتھ جی رہے ہیں...... تم کیا جانو اسی پیرس میں لوگوں پر کیا گزر رہی ہے......! تم جان بھی کیسے سکتی ہو! شام ہوٹلوں اور ریسٹورنٹ میں گزرتی ہے، دن بچوں اور میری دیکھ بھال میں...... ایران تباہ ہو رہا ہے...... پیرس میں ایرانی طوائفوں سے ملو گی؟ شام کو لے چلتا ہوں پیرس کے ان علاقوں میں، جہاں پیسہ ہی حقیقت ہے۔ عزت و آبرو کا لحاظ وہ بھی ہماری...... ہمیں منھ چڑھاتی ہیں...... ان لڑکیوں سے پوچھنا کہ پیٹ کتنا ظالم ہوتا ہے! جان کتنی عزیز ہوتی ہے! ان کی آنکھوں میں آنسو نہیں، جینے کی جدوجہد نظر آتی ہے۔ تم گزرے دنوں کی کچھ سنہری یادوں کے لیے کلیجہ خون کرنے پر تلی ہوئی ہو، آخر کس لیے؟ یہ آنسو، وہ بھی ان بے جان چیزوں کے لیے! کیسے کیسے چہرے، کیسے کیسے دماغ خون میں ڈوب گئے! قبروں کے اندھیروں میں گم ہو گئے ہیں...... خود کو سنبھالو......"

پری کچھ بولی نہیں، ہاتھ میں پکڑا خط موڑ کر لفافے میں رکھا اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔

"کہاں جا رہی ہو؟"

"ابھی آئی۔"

"تمہاری خاموشی...... بے وقت کی خاموشی ہوتی ہے...... کچھ بولو، دل ہلکا ہوگا...... دل پر منوں بوجھ ہے، میں جانتا ہوں۔"

"اب پینا بند کرو، خالد...... کافی رات ہو گئی ہے...... چلو، آرام کرتے ہیں، وہیں پر باتیں بھی ہوں گی۔"

"ٹھیک ہے۔" خالد نے کہا اور دوسرا جام بھرنے لگا۔

"اب بس......" کہہ کر پری نے خالد کے جام پر ہاتھ رکھ دیا۔

دونوں کمرے میں پہنچے۔ پری نے کپڑے تبدیل کیے اور چہرے سے میک اپ اُتارتے ہوئے بولی۔ "کہو کیا کہنا چاہ رہے تھے؟"

"قریب بیٹھو۔"

"کپڑے بدل لو...... میں نے باتھ روم میں رکھ دیے ہیں۔" پری نے روئی سے

چہرہ صاف کرتے ہوئے کہا۔
پری نے بالوں میں برش کیا، آنکھوں کے کونوں پر ہلکی سی کریم ملی، پھر لائٹ بجھا کر بستر کے سرہانے والی بیڈ لائٹ روشن کر دی۔ خالد وہیں ڈریسنگ ٹیبل کے پاس کھڑا ہو گیا۔
''پری! تم ابھی پورا پیرس گھومنے کے بعد بھی اس کے کچھ حصے نہیں دیکھ پائی ہو! میں حبیب سے ملنے گیا تھا۔ وہیں پگال (ریڈ لائٹ ایریا) میں اس کو سر چھپانے کی جگہ مل گئی ہے...... چودہ سو فرانک کی جو خیرات پناہ گزینوں کے نام پر یو۔این۔او کے ذریعہ ایرانیوں کو مل رہی ہے، اس نے اسے لینے سے انکار کر دیا ہے۔ تم نے اس کا بجایا سنتور تو سنا ہے۔ وہی بجا کر لوگوں کو لطف اندوز کر کے پیسہ کما رہا ہے۔ یعنی ایک ماہ میں ہزار فرانک...... جبکہ ہم ایک وقت کے کھانے میں ہزار فرانک یہاں کے ہوٹلوں میں جا کر بغیر کسی درد کے خرچ کر دیتے ہیں۔''
''لیکن یہ حبیب ہے کون؟'' پری نے نظریں خالد کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔
''حبیب اخباری، نفسیات کا پروفیسر، تبریز یونیورسٹی میں تھا۔ مصنف بھی بہت اچھا ہے۔ ہم ساتھ ساتھ پڑھے تھے، پھر الگ الگ کاموں میں مشغول ہو گئے، لیکن دوستی برقرار رہی۔ شاہ کے دور میں کئی بار جیل میں سڑا ہے۔ ہر مرتبہ بھاگ دوڑ کر کے بچایا ہے...... یہاں پر بھی دم توڑنے والا ہے...... میں نے کہا میرے ساتھ آ کر رہو تو بولا، 'کل تک ٹھیک تھا کہ میں تمہاری مدد لے لیتا۔ لیکن اب جدوجہد آخری حد پر پہنچ گئی ہے۔ جنگ، جدوجہد اور ہتھیار سب کچھ آج کے حوالہ سے اپنی ایک مخصوص شکل میں تقسیم ہو گیا ہے۔ کل تک ہم شاہ مخالف تھے، ایک تھے۔ آج خمینی کے مخالف ہیں، لیکن ایک نہیں ہیں کیونکہ آج کی مخالفت، آج کا نیا انقلاب نظریات کے ساتھ منزل تک پہنچنے کی آرزو میں تڑپ رہا ہے۔ تم اقتدار کے مخالف ضرور ہو، لیکن میرے دوست! ہو تو سرمایہ دار ہی، خواہ بڑے یا چھوٹے..... زہر چٹکی بھر کھایا جائے یا مٹھی بھر اثر ایک سا رہے گا۔ دھند چھٹ گئی ہے، وہی دھند جو شاہ کے وقت ہمارے درمیان تھی۔ ہمارے چہرے دھندلے تھے ایک دوسرے کے لیے، لیکن اب یہاں نظریات کی آپسی جدوجہد

ہے۔ سر پر کفن باندھ رکھا ہے۔ خوف کس کا......! تم میری فکر مت کرو۔ میں مرنے والا نہیں ہوں...... تب نہیں مرا، جب بیت اور کوڑوں کی سنسناہٹ نے میری پشت اور تلوؤں کی کھال اُدھیڑ دی تھی۔ یہاں تو دوست! یہ سب کچھ نہیں ہے۔ نہ مار کھا رہا ہوں، نہ جیل میں ہوں۔ پھر کیوں مرنے لگا......۔" اتنا کہہ کر خالد خاموش ہو گیا۔

"آکر لیٹ جاؤ...... کھڑے کھڑے تھک جاؤ گے......" پری نے کھوئے ہوئے خالد سے کہا۔

"ہاں، لیٹتا ہوں، پری......" کہہ کر خالد بستر پر پری کے قریب آکر لیٹ گیا۔

"حبیب اپنے کمرے سے باہر مجھے چھوڑنے نکلا۔ پیرس کی رات اپنے شباب پر تھی۔ کونوں میں کھڑی لڑکیاں گراہکوں کی منتظر تھیں۔ سیکس شاپ میں بھیڑ تھی۔ سیکسی فلمیں، لائف پروگرام چل رہے تھے۔ ایک دُوسرے سے ہم آغوش جوڑے روشنی میں نہائی سڑکوں پر سے گزر رہے تھے...... فرانسیسیوں کی زندگی میں صرف رومانس، وائن اور عورت ہے، یہ تو تم خود بھی دیکھ رہی ہو۔ کیا حال رہتا ہے شام کو...... بہر حال...... ہم جب آگے بڑھے تو حبیب نے کہا، 'دیکھو!' یہ اشارہ ایک لڑکی کی طرف تھا جو چیونگم چباتی ہوئی کھڑی تھی۔ 'دیکھا، ہمیں دیکھ کر اس نے منہ پھیر لیا، یہ مجھے پہچانتی ہے کہ میں ایرانی ہوں۔ اس کے اس کمبخت ملک کا باشندہ جہاں پر طوائفوں کے کوٹھے دو سال قبل ختم کر دیے گئے ہیں، لیکن یہاں پنپ رہا ہے......' حبیب مجھے کافی پلانے قریب کے ریسٹورنٹ میں لے گیا۔ شیشے سے لڑکی صاف نظر آرہی تھی۔ میک اپ تھوپے اُلٹے سیدھے برہنہ ڈریس پہنے......۔"

اتنا کہہ کر خالد خاموش ہو گیا۔ پری کافی دیر تک انتظار کرتی رہی، پھر اس کے بازو کو ہلا کر بولی۔ "آگے تو کچھ کہو۔"

سامنے دیوار کی جانب اسی طرح ٹکٹکی لگائے خالد نے بڑی اداسی سے کہا۔ "وہ غزالہ تھی، ہاں غزالہ...... جب وہ اپنے گراہک کے ساتھ اسی ریسٹورینٹ میں باہر کی طرف بیٹھی تو میں نے اسے پہچان لیا تھا۔"

"غزالہ کون؟"

''افضل کی سب سے چھوٹی بہن۔''

''افضل کون؟''

''امریکن فرم کا منیجر، میرا دوست! ایک بار میرے ذرا سے مذاق کرنے پر وہ ایسے مشتعل ہوگئی تھی کہ افضل نے اسے ڈانٹا تھا۔ عجیب لڑکی تھی۔ گھومنے پھرنے، مذاق کرنے سے ہر وقت ہوشیار رہتی تھی۔ ایک مرتبہ اس کی سہیلی نے کوئی شرارت کر دی تھی، بے حد ناراض ہوئی تھی۔ وہ نک چڑھی، مغرور لڑکی، جو ہر وقت خود کو لیے دیے رہتی تھی، آج...... اچھا ہوا اس نے مجھے نہیں دیکھا...... اپنے ساتھی کے ساتھ، جو عرب تھا، قہوہ پی کر چلی گئی...... مجھے وہ دیکھتی تو کیا پہچان لیتی؟ افضل جانے زندہ ہے یا مر گیا!''

''یہاں اتنی آزادی کے بعد ایسی......؟''

''یہ غیر ملکیوں کے لیے دلچسپی کا سامان ہے پری...... میں تب سے بہت بے چین ہوں، دماغی طور سے پریشان کہ کیا حالات انسان کو اتنا بدل سکتے ہیں! جو لڑکی تمام تجاویز کو ٹھکرا سکتی ہے، وہ آج ایک عرب......'' خالد نے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھنجوڑا۔

''کوئی تو خمینی کو جا کر بتائے...... گولیوں سے گناہگاروں کو بھوننے والے ظالم گناہگار، آ کر دیکھ کہ جس عرب کو دشمن جان کر جنگ کر رہا ہے، وہ عرب...... خوزستان سے وہ دو ملین بھاگی ہوئی بے گھر عورتیں، پیشہ کرتی وہ کمسن لڑکیاں پورے تہران میں ہی نہیں، پورے ایران میں پھیلی ہیں۔ کوئی جا کر اس سفاک وحشی کو بتائے کہ اس خارجی زمین پر کیا ہو رہا ہے!'' خالد جذباتی ہو کر ہیجان سے دیوار پر سر مارنے لگا۔

''تمہیں کیا ہو رہا ہے؟ منع کیا تھا اتنی مت پیو، پچھلے دو دن سے جانے تمہیں کیا ہو گیا!'' پری نے اس کے سر کو پکڑتے ہوئے کہا۔

''اسی لیے پری...... کہتا ہوں ان مردہ بیکار چیزوں کے لیے افسوس کرنا بیکار ہے۔ بہت کچھ لٹ رہا ہے، بہت کچھ تباہ ہو رہا ہے۔ کوئی بھی اپنے جیسا...... جیسا وہ تھا، نہیں رہ گیا ہے، سب حالات اور وقت کے شکنجے میں جکڑے تڑپ رہے ہیں۔

حبیب کو دیکھو۔" باقی جملے ہچکیوں میں تبدیل ہو گئے۔ پری کے سینے میں منہ چھپا کر وہ سسک رہا تھا۔ پری پریشان سی اس کے سر پر ہاتھ پھیر رہی تھی۔ جب رونے کی رفتار کچھ کم ہوئی تو بولا۔ "حبیب کا کمرہ جا کر دیکھو...... اندھیری سیڑھی، پتلی گلی، اُوپر بوسیدہ کمرہ...... کمرہ تو تہران میں بھی اس کے پاس ایک ہی تھا۔ کل کی طرح ہی آج بھی کنوارا اور اکیلا۔ کل بھی ہاتھ میں قلم تھا، آج بھی ہے۔ کل بھی پریشان تھا، آج بھی ہے۔ لیکن پری...... آج گزرے کل سے کافی بدلا ہوا ہے۔ آج جیسے سورج غروب ہو رہا ہے۔ وہ سلیقہ، وہ نفاست، وہ جمالیاتی شعور جو حبیب کا حصہ ہوا کرتا تھا، کہاں کھو گیا! اُکڑوں بیٹھا، اپنے میں کنڈلی مارے، پتلے کمزور ہاتھوں سے سنتور سے دُھن نکالتا ہوا سڑک کے کنارے بیٹھا۔ اپنے سامنے راہ گیروں کے پھینکے فرانکوں سے لاپرواہ...... کیا وہ میرا دوست حبیب تھا......! پری، سچ کہو، وہ حبیب ہی ہے کیا......؟"

"وقت کے ساتھ بہت کچھ بدل جاتا ہے خالد...... بہت کچھ۔ ہمیں دیکھو! ہم کتنا بدل گئے ہیں!"

"ہم نہیں بدلے ہیں...... ہم نے کون سی قربانی دی ہے، کون سی چیز قربان کی ہے! کچھ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں۔ بس اپنا گھر نہیں ہے، اپنا ملک نہیں ہے، ورنہ وہی زندگی ہے جو ہم وہاں جیتے رہے ہیں...... موسیقی، رقص، آرام، گھومنا، پھرنا، لیکن اس حسین شہر میں دُوسرے اپنی موت کو گھونٹ گھونٹ پی رہے ہیں۔ بہت تلخ ہے...... واقعی...... بہت تلخ ہے تاریخ کا یہ دُور، پری! بہت تلخ ہے۔"

وہ اپنی گود میں رکھا خالد کا سر آہستہ آہستہ سہلا رہی تھی، تا کہ خالد کو اس تناؤ سے آزاد کرا دے۔ نشے کی وجہ سے بھی وہ زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ہوا بھی وہی، تھوڑی دیر بعد ہی خالد گہری نیند میں ڈوب گیا۔ اس کا سر تکیے پر رکھ کر پیشانی پر آئے بالوں کو ہٹا کر پری نے خالد کے ماتھے کو بوسہ دیا۔ پھر لائٹ بجھا کر خود بھی لیٹ گئی۔ لیکن اس کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔

اس کی آنکھوں کے سامنے گھر کا نقشہ اُبھر رہا تھا۔ پھولوں اور پیڑوں سے بھرے لان سے گزر کر تین سیڑھیاں چڑھ کر وہ بڑے ہال کا دروازہ، جہاں پر بڑے وزنی دو گلدان رکھے ہوئے تھے، جن پر مینا کاری کا کام تھا۔ اس کے بعد چھت سے لٹکتا بڑا سا جھاڑ فانوس۔ اسی کے نیچے بھاری قیمتی قالین اور چاروں طرف حسین چمڑے کی کرسیاں اور بیچ میز پر رکھا گھر کے باغیچہ کے پھولوں سے بھرا گلدان! پاسداروں نے پہلے وہی حصہ لوٹا ہوگا، یا پھر ہر کمرے کا معائنہ کیا ہوگا۔ سامنے ہی ڈرائنگ روم تھا۔ دُنیا بھر کے حسین مجسموں سے آراستہ، عجیب و غریب فن کی آمیزش...... کچھ چیزیں تو وہ لپیٹ کر ایک کمرے میں بند کر آئی تھی، لیکن فرنیچر اور آدم قد مجسمے کہاں اُٹھا کر رکھتی۔ وہ سب اُٹھا کر لے گئے ہوں گے...... قیمتی تصاویر، دیوار پر نصب پلیٹیں اور لیمپ...... ظالموں نے کچھ بھی نہیں چھوڑا ہوگا...... خط میں لکھا تو یہی ہے کہ پردے تک اُتار لے گئے ہیں، بس آگ نہیں لگائی خالی گھر میں، ورنہ تنکا تنکا چُن کر لے گئے ہیں۔ پورا گھر خالی ہے، باغ سوکھا، اُجاڑ سب۔ باہر کے بڑے دروازے پر قفل لگا گئے تھے۔ دو ماہ بعد جب ہم حسب معمول صفائی کرنے پہنچے تو گھر کا یہ حال پایا......' خالد کے دوست کے خط کا ایک ایک لفظ دماغ میں نقش ہو کر ایک گونج پیدا کر رہا تھا۔ معلوم نہیں، زندگی کے کتنے رنگ ہیں! ہر رنگ کو قبول کرنا پڑتا ہے، خوشی سے یا دُکھ سے، کہا نہیں جا سکتا۔ خالد کہتے ہیں کہ ہم خوش ہیں، کیونکہ ہمارے پاس پیسہ ہے۔ کیا پیسے سے خوشیاں خریدی جا سکتی ہیں؟ یہاں کے ماحول میں کوئی خوش رہ سکتا ہے؟ کتنا کوئی شانجالزا کی حسین روشنی اُگلتی سڑک کو دیکھے...... چارلس ڈگال کی اس یادگار کی شان و شوکت کا دیدار کرے...... چمکتی دُکانوں سے آنکھیں سینکی جائیں...... ریسٹورینٹ کے آگے پڑی بینت کی کرسیوں پر بیٹھ کر کافی کے خالی پیالوں کے ساتھ بوس و کنار میں مشغول بے معنی عشق لڑاتے جوڑوں کو دیکھا جائے۔ ان مناظر میں خود کو کب تک مست رکھے۔ کیا وہ فلم کی طرح

چلتے مناظر سے اُکتا نہیں جائے گی! زندگی ہوا تو نہیں ہے! زندگی کی کچھ اور ضرورتیں، کچھ دُوسرے تقاضے بھی تو ہیں۔ ٹھہراؤ...... یہاں ٹھہراؤ ہے کہاں؟ سب بھاگتے رہتے ہیں کسی نہ کسی چیز کے پیچھے...... شہر حسین ہے، گھوڑا، پتھر کی مورتیاں، پتھر کے سینے کو چیر کر بنائی گئی آنکھیں، چہرہ، جسم، بال، تلوار، پتھر کی مضبوط عمارتیں، پتھر کی سڑکیں... اس حسن کا کرنا کیا ہے! اس پتھر کے حسین شہر میں نہ جذبات ہیں، نہ دل و دماغ نہ نظریات، بس تاریخی عظمت کی دین ہے۔ اس بے جان دین کو پا کر آج مجھ جیسا انسان کیا کرے گا! اس پتھر کے شہر کے انسان۔ وہ بھی خوبصورت ہیں، لیکن پتھر سے تراشے ہوئے... ہم سے کتنے الگ... ان کے پاس ہمارے لیے وقت نہیں ہے... اپنوں کے لیے کب وقت ہے...! یہ تکلیف جو میں جھیل رہی ہوں، وہ خالد نہیں سمجھ رہے ہیں۔ مجھے اُوپر سے خوش دیکھ کر سمجھتے ہیں کہ میں واقعی سب کچھ بھول کر اس شہر میں مست ہوں۔ انسان کی خوبصورتی تو اس کے جذبے میں ہوتی ہے اور یہاں کے انسان... یہ ہمارے جذبات کو کیا سمجھیں گے! جذبہ ان کے لیے ایک لطیفہ ہے۔ لطیفوں پر تو صرف ہنسا جا سکتا ہے۔ اس درد کی تپش سے ان کی آنکھیں پگھلتی نہیں ہیں۔ ایسے حسین پتھر کے شہر میں، میں کیسے خوش رہ سکتی ہوں! ہم سب اپنے اپنے حصے کے دکھ کی گٹھری ڈھو رہے ہیں۔ کوئی سڑک کے کنارے گراہک کی تلاش میں تو کوئی قلم گھس کر، کوئی در بدر ہو کر!

خالد کہتے ہیں، بیکار کی چیزوں کے لیے آنسو مت بہاؤ... میں پتھر نہیں ہوں جو دل پر چوٹ نہ لگے، آنسو نہ نکلے... میرے کتنے گھر ہیں... ایک ہی تو گھر تھا۔ گھر کا لٹنا، گھر کا ٹوٹنا، گھر کا تباہ ہونا خالد کیا جانیں! ان کے سینے میں مرد کا دل ہے۔ عورت گھر سے کتنی جڑی ہوتی ہے، یہ مرد نہیں سمجھ سکتا...

پری کی آنکھوں سے آنسو بہہ بہہ کر تکیے میں جذب ہو رہے تھے۔ خالد کی ہلکی سانسوں کے اُتار چڑھاؤ، گھڑی کی ٹک ٹک اور پری کے آنسوؤں کی خاموش آواز کے علاوہ تمام آوازیں ساکت ہو گئی تھیں۔ صبح کے قریب جا کر پیرس نیند میں ڈوبتا ہے۔ تب ایک ایک کر کے تمام سڑکیں اپنی روشنی کے آبشار کو سمیٹنے لگتی ہیں۔ باہر تاریکی پھیل

گئی تھی۔ اُفق پر صبح کے آثار نمودار ہونے لگے تھے اور اپنے اندر پھیلی تاریکی سے جدوجہد کرتی پری کی آنکھوں سے سفید موتی لڑھک رہے تھے۔

طیبہ کے دوبارہ پکڑے جانے کی خبر چریکِ فدائین خلق پارٹی کے لوگوں میں پھیل گئی تھی۔ پارٹی کی دونوں شاخوں، اکثریت اور اقلیت کو بہت تکلیف پہنچی تھی۔ اس کی شاخ اقلیت کو افسوس ہو رہا تھا کہ طیبہ کو ترکی یا پاکستان کے راستے بیرون ملک کیوں نہ بھیج دیا۔ اس مرتبہ طیبہ کا واپس آنا مشکل ہے۔ اگر بچ گئی تو اسے معجزہ سمجھ کر دھوکا نہیں کھانا ہے، بلکہ اس کے ذریعہ دیگر افراد کو پکڑنے کے لیے اسے چھوڑا جائے گا۔ طیبہ دراصل دُوسرے انقلابیوں تک پہنچنے کا چارا ہوگی۔ کون آتا ہے اس کے پاس...... کہاں جاتی ہے وہ؟ اس خیال سے تمام ساتھی اَدھ مرے ہو رہے تھے۔ ایک دوسرا خیال اور انہیں پریشان کیے ہوئے تھا کہ کہیں تکلیفوں کے درمیان نیم بیہوشی کی حالت میں پوچھے جا رہے سوالات کا وہ صحیح جواب نہ دے بیٹھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوا ہے۔ کامریڈ کاظم کی مثال ان کے سامنے تھی۔ مشرق کے جنگل میں ایک گروہ چھپا تھا۔ کھانے کا سامان لاتے ہوئے کاظم پاسداروں کے ہاتھ پکڑا گیا۔ مرنے سے پہلے، تکلیف سے چور جس بات کو نہ کہنے کے لیے وہ مار کھا رہا تھا، وہی راز جانے کیسے اس نے اُگل دیا۔ شاید موت کی بے چینی میں دم نکلنے کے ساتھ وہ بات بھی منھ سے انجانے ہی نکل پڑی۔

اس دن طیبہ کو گھر سے اُترتے ہوئے پاسداروں نے گھیر لیا تھا۔ تلاشی لینے پر کئی کاغذ ہاتھ لگے تھے۔ ان پر سب کچھ اتنا باریک تحریر تھا کہ اسے پڑھنا ان کے بس کا کام نہیں تھا۔ کمیٹی کی کار باہر کھڑی تھی۔ طیبہ کو دھکیل کر وہ خود اس پر بیٹھ گئے اور کار جیل کی طرف چل پڑی۔

"کیسے فرشتہ جیسی معصومیت چہرے پر برس رہی ہے! جیسے کچھ جانتی ہی نہ ہو۔" ایک پاسدار نے دُوسرے کو کہنی مارتے ہوئے کہا۔

"کھائی کھیلی لگتی ہے۔ ایسی صورتوں کو میں خوب پہچانتا ہوں۔ شاہ کے زمانے کی

طوائفیں آج انقلابی بن بیٹھی ہیں، سیاسی پیچ وخم سلجھاتی ہیں، امام کو خونی جلاد کا القاب دیتی ہیں۔" دُوسرے نے حقارت سے کہا۔

"ہاں، مسعود رضوی نام کے اس جلاد کو دیکھو جو پیرس بھاگا ہوا ہے، یہاں پر بچوں کو کتنے مرنے کے لیے چھوڑ گیا ہے۔" تیسرے پاسدار نے کمر کی بیلٹ کستے ہوئے کہا۔

"اس سے پوچھو کہ اس کمیونسٹ کتیا کو کس خونی جلاد نے بہکایا ہے؟" پہلے نے نفرت سے کھڑکی سے باہر تھوکتے ہوئے کہا۔

"عورت کی عقل گدھی میں ہوتی ہے۔ بھیڑیں کچھ نہیں سمجھتیں۔ جس نے ہُر ہُر کی آواز نکالی اس کے پیچھے چل پڑتی ہیں۔ آگے کنواں ہو یا خندق، اُس میں کود پڑیں گی۔ عقل بٹتے ہوئے سچ پوچھو تو یہ آلو کا مول بھاؤ کر رہی تھی۔" دُوسرے پاسدار کی اس بات پر ملا جُلا قہقہہ بلند ہوا۔ طیبہ جانے کس گہری سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔ ان کی ہنسی کی آواز سے چونک پڑی۔

"لاؤ، ذرا سگریٹ دینا۔" ایک پاسدار نے دُوسرے پاسدار سے کہا۔

"لو، پیو میری جان، پورا سگریٹ کا پیکٹ تمہارا ہے۔" لال منھ والے پاسدار نے ناک صاف کرتے ہوئے کہا۔

"خانم کی آنکھوں پر پٹی باندھ دو۔" ڈرائیور نے ٹھنڈی بھاری آواز میں کہا۔

اب کار پیڑوں سے بھرے خم دار راستے سے گزر رہی تھی۔ بہار کی شروعات تھی۔ گیلی مٹی اور پتیوں کی مہک طیبہ کے نتھنوں میں پہنچ رہی تھی۔ جس بہار کا انہیں انتظار ہے، وہ جانے کب ایران میں آئے گی! اور یہ کیسا مضحکہ ہے کہ اس بہار کے موسم میں وہ ایون جیل میں بند کرنے کو لے جائی جا رہی ہے!

بھیڑ کو چیرتی کار بڑے دروازے کے پاس رُکی۔ ہارن کی آواز سے چھوٹی کھڑکی کھلی۔ ڈرائیور سے بات ہوئی، دروازہ کھلا۔

"لے آئے نیا تحفہ؟"

"ہاں سنبھالو اسے۔"

''ادھر بائیں طرف۔''

''ان کا دیدہ گھر کی چار دیواری میں نہیں لگتا ہے۔ اُلٹا سیدھا لکھ کر جان دینے پر تلی ہیں۔'' ڈرائیور نے نیچے اُترتے ہوئے کہا۔

''تم نہیں سمجھو گے، میرے دوست کہ انہیں کیا ملتا ہے۔'' دروازے پر کھڑے پہرے دار نے آنکھ ماری۔

''مستی!'' پیچھے کار سے اُترتے پاسداروں میں سے ایک نے کہا۔

''لڑکے لڑکیوں میں بہت بھائی چارہ ہے، رات دن سب ایک ساتھ بیٹھ کر کام کرتے ہیں۔'' دوسرے نے آگے کی سیٹ پر سے طیبہ کو دھکیلتے ہوئے کہا۔

ایون جیل کے سامنے بیٹھی بھیڑ کار کے اندر جاتے ہی آگے دروازے کی طرف بڑھ آئی۔

''صبح سے بٹھا رکھا ہے۔ میرے پیٹ میں درد ہو رہا ہے..... خدارا! ذرا بتاؤ تو، کب ملنے دو گے میری بیٹی سے؟'' ایک عورت بے حال سی آگے بڑھی اور دروازہ بند کرتے ہوئے پاسدار سے بولی۔

'' کچھ تو رحم کھاؤ ہم پر، دوپہر ڈھل رہی ہے۔ گھر میں سب بھوکے ہوں گے، میں یہاں صبح سے بیٹھی ہوں۔'' دوسری عورت بولی۔

''ٹھیک سے بتاتے کیوں نہیں ہو؟ آج تو تمہارے کہنے پر میں ڈھیروں پھل لائی ہوں۔'' باسکیٹ اُٹھائے ہوئے ایک ادھیڑ عورت آگے بڑھی۔

''پھل دے دو، تمہارے بیٹوں تک پہنچ جائیں گے۔'' پاسدار نے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ہرگز نہیں! میں اپنے بیٹوں کو اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گی۔ تمہیں کیوں دے دوں؟'' ادھیڑ عورت نے پھل کی باسکیٹ اپنی کالی چادر میں چھپاتے ہوئے کہا۔

''پھر بیٹھی رہو قیامت تک۔'' کہہ کر پاسدار نے دروازے کو دھکا دیا۔

''ٹھہرو، دروازہ بند کرنے سے پہلے 'ہاں' اور 'نہیں' میں جواب تو دیتے جاؤ۔ ہم کب تک بھوکے پیاسے سڑک کنارے بیٹھے رہیں؟'' پہلی عورت پیٹ پکڑ کر وہیں زمین پر بیٹھ گئی۔

''شور مت کرو، پیچھے ہٹو۔'' کہہ کر پاسداروں نے بڑا دروازہ بند کر لیا۔ چالیس پچاس لوگ، جو صبح سے آئے ہوئے تھے، بلبلا گئے۔ کچھ عورتیں تھکان اور بیچارگی سے رونے لگیں۔ کچھ جھنجھلاہٹ اور غصہ سے پاگل ہو کر اپنے سر پیٹنے لگیں۔ کسے کوس رہی تھیں، اولاد کو، خود کو، حکومت کو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کچھ وہیں پر سر پکڑ کر ایسی تھکی اور بے سہارا بیٹھی ہوئی تھیں جیسے بت بن گئی ہوں۔

آگے لے جا کر طیبہ کی آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ دو گھنٹے تک پٹی بندھی رہنے کی وجہ سے اس کو آنکھوں کے سامنے کالے دھبے نظر آ رہے تھے۔ دو پاسدار آگے دو پیچھے، درمیان میں لڑکھڑاتی طیبہ آگے بڑھ رہی تھی۔ پانچوں کئی راہ داریوں سے گزر کر بڑے ہال میں پہنچے۔ دروازہ بڑھا ہوا تھا۔ اسے کھول کر وہ اندر داخل ہوئے۔ سامنے کرسی پر بیٹھے لوہار کو دیکھ کر طیبہ ایک دم سے چونک پڑی، یہ بے چارہ یہاں! یہ کس جرم میں پکڑا گیا ہے! کالے دھبوں کے بیچ وہ لوہار کے چہرے کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔ کہیں اس سے غلطی تو نہیں ہوئی... یہ لوہار ہی تو ہے نا؟ لیکن لوہار نے طیبہ کی طرف خاص دھیان نہیں دیا اور میز کے سامنے کرسی پر بیٹھے افسر سے باتیں کرتا رہا۔ وہ چاروں پاسدار طیبہ کو وہاں اکیلا چھوڑ کر باہر چلے گئے۔

''نام؟'' افسر نے تیوری چڑھا کر پوچھا۔

''طیبہ۔'' طیبہ نے آہستگی سے کہا۔

''عمر؟''

''چھبیس سال۔'' طیبہ نے غصہ پر قابو رکھتے ہوئے کہا۔

''پیشہ؟''

"بیکاری۔"

"جرم؟"

"میں کیا بتا سکتی ہوں! مجھے تو یقین ہے کہ میں نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔" طیبہ نے گردن اونچی کرتے ہوئے کہا۔

"جرم! جرم تو آپ کے ساتھ آیا ہے... یہ کاغذ... یہ سب کیا ہے؟"

"آپ اسے جرم کہتے ہیں؟ لیکن میں تو نہیں سمجھتی کہ یہ جرم ہے۔ یہ تو ہمارا فرض ہے، جو ہم پورا کررہے ہیں۔"

"تو پھر... ہمیں بھی اپنا فرض پورا کرنے دیں۔" افسر کے دونوں بھاری جبڑوں کی ہڈیاں اُبھر آئیں۔ ہونٹ کس کر بند ہو گئے۔ محتاط ہاتھوں سے میز پر رکھی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ کالی چادر میں لپٹی ایک موٹی عورت آکر سامنے کھڑی ہو گئی۔ طیبہ کی طرف اس نے بڑی رکھائی سے دیکھا اور اجازت کے لیے افسر کی جانب دیکھنے لگی۔

"اس نئے مہمان کو سنبھالو۔ اس کی خاطر تواضع کرو۔ اپنے فرض کو پہچانتی ہو نا؟ ہمارا فرض ہے گھر آئے مہمان کی عزت کرنا۔ اس فرض کو پورا کرنے میں کسی قسم کی کوتاہی نہیں برتنی چاہیے۔" افسر نے بڑے مکارانہ انداز سے ایک ایک لفظ کو چباتے ہوئے کہا۔ پھر طیبہ کی طرف منھ گھما کر، اسے گہری نظروں سے گھورتے ہوئے بڑے سخت الفاظ میں کہا۔ "ہمارے فرض کی سچائی کو بھی ذرا پرکھ کر دیکھیں۔"

طیبہ چاہ کر بھی اس کے اس انداز کو نظر انداز نہ کرسکی۔ عورت کے اشارے پر وہ اس کے پیچھے چلنے کو مڑی، پھر کسی خیال کے تحت اس نے اس لوہار پر نظر ڈالی۔ بیچارہ جانے کون سا ظلم سہے گا۔ ان بیچارے غریبوں کی قسمت کب بدلے گی! حکومت کہتی ہے کہ یہ غریبوں کا انقلاب ہے، لیکن حقیقت کیا ہے آج! غریب جیل میں سڑ رہا ہے۔ اس سے آزادی کا وعدہ کرنے والے بھی تو زنجیروں کے بوجھ سے دم توڑ رہے ہیں۔ لوہار بیچارہ بھی...... لیکن وہ یوں آرام سے... آخر وہ یہاں پر...!

آگے بڑھتے ہوئے طیبہ نے سوچا۔ دو سال پہلے گاؤں کی زمین سے اُجڑ کر روزی روٹی کی تلاش میں یہ لوہار اس کے محلے میں آیا تھا۔ بھوکے بچے، بے سروسامانی

کو دیکھ کر سب نے اس کی مدد کی تھی۔ اگر سامان ٹوٹا بھی نہ ہوتا تو بھی اس کو پیسہ دینے کے بہانے وہ جانے کتنی مرتبہ اُلٹی سیدھی چیزیں لے کر پہنچی تھی اور آج آٹھ بچوں کا باپ یہاں جیل میں ہے۔ ماں کو پہلے سے دمے کی شکایت ہے۔ کون بھرے گا ان کا پیٹ! چلتے چلتے دروازے کے قریب پہنچ کر وہ رُک گئی۔ غریبی، فاقہ کشی، پورے خاندان کے چہروں، آنکھوں اور لباس سے ٹپکتی تھی۔ طیبہ نے اچانک چہرہ پیچھے گھمایا۔ لوہار کے چہرے پر ایک مکارانہ مسکراہٹ تھی اور وہ عجیب انداز سے افسر کو آنکھ مار رہا تھا۔ طیبہ کا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جاسوسی کا جو شک اس کے دماغ میں، کمرے میں داخل ہوتے ہی پیدا ہوا تھا، وہ اب یقین میں تبدیل ہو گیا تھا۔ لوہار حکومت کا مخبر بن گیا تھا۔

۱۷

صنوبر روز بنیادِ شہید کے اس بڑے کمرے میں جا کر خاموشی سے بیٹھ جاتی۔ اپنے شوہر جمیل کی تصویر کو نہارتی، پھر نئے شہید لڑکوں کی تصویروں کو غور سے دیکھتی، اس بیچ شہید لڑکے لڑکیوں کے والدین آتے تو ان سے باتیں کرتی تھی۔ اس کو ایک گہرے سکون کا احساس ہوتا تھا۔ چہار سُو دیواروں پر شہید چہرے، ان کے درمیان میں جمیل کا چہرہ... وہ تنہا نہیں ہے۔

سامنے کا دروازہ کھلا۔ کوٹ پینٹ پہنے، ہاتھوں میں بریف کیس لیے ایک آدمی داخل ہوا۔ سیڑھی کے اوپر بیٹھے پاسداروں نے پوچھا۔ "کیا کام ہے؟"

بنا جواب دیے وہ آگے بڑھا اور سیڑھیاں اُتر کر، نیچے جا کر وہ ہال کے بیچ میں کھڑا ہو کر چاروں طرف شہیدوں کی لگی تصویریں دیکھنے لگا۔ اس کا ذہنی تناؤ اس کے

چہرے پر آنکھوں سے چھلکتا معلوم پڑ رہا تھا۔ صنوبر بڑے اشتیاق سے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ رہی تھی۔ تبھی پوچھ تاچھ کی میز پر بیٹھی رضیہ خانم اٹھیں اور قریب جا کر اس مضبوط و توانا ادھیڑ آدمی سے بولیں۔ ''میں آپ کی کیا مدد کر سکتی ہوں؟''

''ہاں...... ہاں،'' چونکتے ہوئے اس نے بریف کیس کھولا اور اس میں سے ایک بہت خوبصورت حسین جوان کی تصویر نکالی۔

''یہ میرا بیٹا ہے۔ ایک ماہ پہلے جنگ میں ڈسفول کے قریب شہید ہوا تھا۔'' کہہ کر اس کی گردن اکڑ گئی اور آنکھوں میں سرخ ڈورے اور بھی گہرے ہو گئے۔

''مبارک ہو! ماں باپ کا غرور بڑھانے والے اس فرزند کو ہمارا ہزار سلام۔'' رضیہ خانم کی اس بات سے اس ادھیڑ کا سینہ چوڑا ہو گیا۔ چہرے کی چمک دوگنی ہو گئی۔ آنکھیں اب زیادہ بے چین اور چڑھی ہوئی نظر آنے لگی تھیں۔

''میں اس تصویر کو بنیادِ شہید میں لگانا چاہتا ہوں۔ اس لیے خراسان سے تہران آیا ہوں۔ وہاں کی سڑکیں، دُکانوں اور دروازوں پر، یہاں تک کہ ہر گھر پر یہ تصویر چسپاں کی ہے ہم نے، لیکن تہران کی بات ہی دوسری......''

''ہم ضرور لگائیں گے، آپ چھوڑ جائیں، کل تک جگہ بنا کر ہم اسے لگا دیں گے۔'' رضیہ خانم نے تصویر لیتے ہوئے کہا۔

''ابھی لگائیے نا، میں کل تک یہاں کہاں رہوں گا!'' اس آدمی کا چہرہ سرخ ہو گیا۔

''لائیے، ادھر کی دیوار پر لگاتی ہوں۔'' رضیہ خانم سوچتی ہوئی بولیں۔

''نہیں، ادھر کونے میں ٹھیک نہیں ہے۔ اس سامنے والی دیوار پر لگائیے نا۔ جو بھی ہال میں داخل ہوگا اسے دیکھے گا۔ اس کے چہرے پر اس کی نظر پڑے گی۔'' اس نے دونوں ہاتھ اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''آپ جب تک اس انجمن کے چیئرمین آیت اللہ کروبی سے ملیں، میں...'' رضیہ خانم نے کہا اور مڑ کر آگے بڑھیں۔

''کس لیے ملوں؟ اس تصویر کے لیے؟ آپ ہی جگہ بنا لیں۔''

''تصویر تو میں لگا دوں گی۔ لیکن مکان، وظیفہ جو بھی آپ کی مانگ ہو، آپ اپنی

خواہش آیت اللہ سے کہیں، تب تک میں اس کے متعلق سوچتی ہوں۔''
''مکان...... وظیفہ؟'' آنکھیں سوالیہ نشان بن گئیں۔
''آپ نے اپنا بیٹا مذہبی جنگ میں کھو دیا ہے۔ معاوضہ بنیاد دیتی ہے۔ تقریباً ستر ہزار خاندان ہماری دیکھ ریکھ میں ہیں۔ خدا نے چاہا تو ہم زیادہ سے زیادہ شہیدوں کے خاندان کا خیال رکھیں گے۔''
''میرا اکلوتا بیٹا کاظم!'' اتنا کہہ کر وہ خاموش ہو گیا۔ پھیلی، پریشان، بیکار آنکھیں اس نے رضیہ خانم پر گڑا دیں۔
''جناب! اس سے زیادہ کی ہماری حیثیت نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں، جنگِ خزستان سے بھاگے ڈیڑھ ملین افراد، عراق سے نکالے گئے ڈیڑھ ملین ایرانی نژاد لوگ، سرخ فوج کے خوف سے افغانستان سے بھاگے تقریباً ملین بھر مجاہد افغان۔ بنیادِ شہید ہر ایک کی دیکھ بھال کرنے کی کوشش کر رہی ہے، آپ ہماری پریشانی سمجھیں۔'' رضیہ خانم اس کے بدلے چہرے کے تاثرات سے بدحواس ہو کر بولے چلی جا رہی تھیں۔
اچانک اس ادھیڑ عمر کے آدمی نے تصویر رضیہ خانم کے ہاتھ سے چھینی اور اسے بریف کیس میں بند کرتے ہوئے بولا۔ ''میں نے اپنا اکلوتا بیٹا امام خمینی کو دیا ہے، فروخت نہیں کیا ہے۔ نہ ہی اس کی قیمت لگائی تھی۔ شکریہ! آپ کا بہت بہت شکریہ۔''
وہ تیزی سے مڑا اور بھاری قدموں سے چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ رضیہ خانم اپنی چادر اور چشمہ سنبھالتی ہی رہ گئیں۔ پریشان سی ہو کر وہ صنوبر سے بولیں۔ ''میں نے... میں نے... کہا کیا تھا؟ آپ تو سن رہی تھیں نا سب کچھ؟''
صنوبر کچھ بولنے ہی والی تھی کہ چار پانچ لوگ رضیہ خانم کی طرف لپکے، جو ابھی ابھی داخل ہوئے تھے۔ وضع قطع سے وہ ایرانی عرب لگتے تھے۔ خزستان کے اُجڑنے کے بعد وہاں سے بھاگے عربی زبان بولنے والے ایرانی۔
''خانم! ہماری کون سنے؟ پانچ ماہ ہو گئے ہیں ہمیں اپنا گھر بار چھوڑے، ابھی تک مکان نہیں ملا۔'' سر پر چار خانے کا کالا کپڑا باندھے ایک بوڑھے نے کہا۔
''خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' رضیہ خانم بولیں۔

"جب ہماری جوان لڑکیوں کی عزت لٹ جائے گی تب سب کچھ ٹھیک ہوگا۔"
بوڑھے نے روتے ہوئے کہا۔

"بات کیا ہوئی؟" رضیہ خانم نڈھال سی کرسی پر بیٹھ گئیں۔

"ایک مہینہ ہو گیا ہمارے پاس کے کمرے میں کچھ لڑکے آکر ٹھہرے تھے۔ کسی کے مہمان تھے۔ اب ان کو وہیں کمرہ الاٹ کیا گیا ہے۔ ہمارا ساتھ تو چار لڑکیوں کا ہے۔ رات دن کی پریشانی ہے۔ ایک چھوٹے کمرے میں ہمیشہ تو وہ رہ نہیں سکتی ہیں... میں پڑوسیوں کو ساتھ لایا ہوں، معلوم کریں ان سے پوچھیں... جنگ نے میرا گھر تباہ کر دیا۔ اب وہ جوان میری عزت خراب کریں گے۔" کہہ کر بوڑھا وہیں پڑی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔

"بابا! میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ کچھ دنوں کی پریشانی ہے۔ نئی بلڈنگیں تعمیر ہو رہی ہیں... آپ صبر سے کام لیں، رات دن کام ہو رہا ہے، نمبر سے سب کو گھر ملے گا۔"
رضیہ خانم نے فون پر کسی کا نمبر ملاتے ہوئے کہا۔

"جب ہم تباہ ہو جائیں گے تو گھر کا نمبر ملا تو کس کام کا ہمارے! کون رہے گا اس میں تب! ہم یا ہماری روحیں؟" بوڑھے نے کہا اور اُٹھنے لگا۔

"میں نے آپ کے لیے وقت لے لیا ہے۔ اُوپر پہلی منزل پر جا کر آیت اللہ سے مل کر اپنی بات کہہ دیں۔ وہ جو حکم دیں گے وہ انجام دیں گے۔" کہہ کر رضیہ خانم نے اس بوڑھے کو راستہ دکھایا اور لفٹ کے قریب پہنچا کر بٹن دبا دیا۔

صنوبر نے گھڑی دیکھی، شام کے چھ بج رہے تھے۔ وہ اُٹھی۔ کالے موزے ٹھیک کیے، جو اس کی سفید پنڈلی پر ڈھیلے ہو گئے تھے۔ کپڑے سنبھالے، چادر پھر سے جسم کے چاروں طرف لپیٹی اور باہر دروازے کی جانب چل پڑی۔ اس کے پیچھے رضیہ خانم بھی آئیں۔ سڑک پر بھیک مانگتی ایک عورت کو دیکھ کر بولیں۔ "یہ کیا؟ بھیک کیوں مانگ رہی ہو؟ اپنی پریشانی ہمیں بتاؤ۔ ہم دُور کریں گے!" رضیہ خانم سے اتنا سنتے ہی اس عورت نے اپنا پھیلا ہوا ہاتھ نیچے گرایا اور بھاگتی ہوئی سامنے گلی میں گھس گئی۔

صنوبر اور رضیہ خانم حیرت زدہ سی کھڑی رہ گئیں۔

رات کے کھانے پر مہناز، سلیمان اور اسلم لال جلتی شمع کے چاروں طرف بیٹھے تھے۔ مہناز شمع کی لپکتی لو کا عکس کبھی سلیمان کی آنکھوں میں تڑپتی دیکھتی تو کبھی اسلم کی پتلیوں میں شعلہ اُگلتی ہوئی اُسے نظر آتی۔

''اب آپ شادی کر ڈالیں۔'' سلیمان نے اسلم سے کہا۔

''بہت دیر ہو گئی ہے اب، شام ڈھلے پھول اپنی پنکھڑیاں بند کر لیتا ہے، کھولتا نہیں ہے۔ سورج ڈوبنے کے بعد پھول کھلنے کا تصور کرنا مذاق ہے۔''

''فلسفہ ہے آپ کی باتوں میں، مگر حقیقت کہاں؟''

''آپ مجھے پری کا پتہ دے دیں، کہیں باتوں میں ہم بھول نہ جائیں۔'' مہناز نے نیپکن سے منھ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''لیجئے۔'' یہ کہہ کر اسلم نے ڈائری نکالی اور پتہ نوٹ کرانے لگا۔

''ہم کب لوٹ رہے ہیں؟'' مہناز نے 'شکریہ' کے ساتھ پتہ لیتے ہوئے سلیمان سے پوچھا۔

''اگر کوئی پلین ہوا تو ابھی چلتے ہیں۔'' سلیمان نے ہنستے ہوئے کہا۔ اس پر اسلم قہقہہ مار کر ہنس پڑا اور مہناز جھینپ گئی۔

''ویسے میں تو پوچھ سکتا ہوں نا کہ کیا پروگرام ہے آپ لوگوں کا؟'' اسلم نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''ایک ہفتے بعد جرمنی جانے کا پروگرام پختہ ہے، دُوسرے ہفتے پیرس جائیں گے۔'' سلیمان نے پیگ ہونٹوں سے لگاتے ہوئے کہا۔

''کاش! میں بھی آپ لوگوں کے ساتھ چل سکتا۔'' اسلم نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''چلئے نا، اس میں 'کاش' لگانے کی کیا بات ہے؟'' مہناز نے پوچھا۔

''آپ ہمیشہ نا اُمیدی کا پہلو دیکھتے ہیں۔ بات کیا ہے آخر؟ آپ کی نظموں میں

بھی اس کی جھلک ہے۔ کسی رشتے نے آپ سے زندگی کے کسی موڑ پر کبھی بے وفائی کی ہے کیا؟'' سلیمان نے مچھلی کو کانٹے میں پھانس کر چاقو سے اسے کاٹتے ہوئے پوچھا۔ انجانے ہی مہناز اور اسلم کی آنکھیں ایک دُوسرے کی جانب اُٹھ گئیں۔

''لفظ بے وفائی... خوب... آج ایران کے حوالے سے بھلا آپ اس لفظ کا کیا مطلب نکالیں گے؟'' اسلم نے ایک دم سے بات کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔

''مجھے سیاست کی سمجھ نہیں ہے۔ ہاں، اتنا ضرور جانتا ہوں کہ سیاست تخلیق کا نام نہیں ہے، جبکہ میرا پروفیشن پوری طرح سے تخلیقی ہے۔ اُکھاڑ پچھاڑ، مار کاٹ...... ان تمام باتوں سے میری طبیعت گھبراتی ہے۔'' سلیمان نے کہا۔

''ہماری ایک کلاس فیلو تھی طیبہ۔ اس کی یاد کبھی کبھی بہت آتی ہے۔ آج آپ کی بات نے اس کی یاد پھر تازہ کردی۔'' اسلم یہ کہہ کر خاموش ہوگیا۔

''میری سب سہیلیاں ایک ایک کر کے جُدا ہو گئیں۔ کون کہاں ہے کچھ معلوم نہیں ہے۔ دو سال پہلے ملیحہ کے بارے میں پری نے کچھ لکھا تھا۔ حسین لاپتہ ہے۔ پھر پری کے خط ملنے بند ہوگئے۔ شہناز، صنوبر، اختر اور سوسن کس حال میں ہیں کچھ پتہ نہیں... طیبہ کا تو کہنا ہی کیا... وہ تو اس وقت بھی خطروں سے کھیلتی تھی۔'' مہناز نے کھوئے کھوئے انداز سے کہا۔

''میرے پاس تو کسی کے خط آتے نہیں، میرے اپنے دوست مراد اور علی یونیورسٹی میں انقلاب کے شروع کے دنوں میں ہی مار دیے گئے تھے۔ چار سو لڑکوں کی لاشوں میں انہیں ڈھونڈنا مشکل تھا۔ ابھی ثقافتی انقلاب کے چکر میں تین سال قبل رضا، یوسف اور بختیار شہید ہوئے۔ اب وہاں کیا ہو رہا ہے، دراصل صاف تصویریں تو نظروں کے سامنے آتی ہی نہیں ہیں۔ خبروں سے لگتا ہے، کہ گلی کوچوں میں صرف بے دھڑ کی لاشیں بھری ہیں۔'' اسلم نے سلیمان کے جام میں شراب ڈالتے ہوئے کہا۔

''گھر سے مجھے جو خبریں ٹیلیفون پر ملتی ہیں وہ ناقص اور اشاروں میں ہوتی ہیں۔ ان سے سچائی کا علم نہیں ہو پاتا، لیکن اس بات کا ضرور احساس ہوتا ہے کہ مہنگائی، بیکاری، بے کسی، بے سروسامانی اور بے برنامہ نے لوگوں کو چکرا دیا ہے۔ شہادت کے

علاوہ مستقبل کا کوئی اقتصادی، سماجی پروگرام نہیں ہے جو نافذ کرسکیں۔ بس شہادت، اسلام کے نام پر عراق کی تباہی۔ عراقی سو مرتے ہیں ہمارے ہزار، اگر اس کا اُلٹا بھی سمجھا جائے تو بھی ہمارے سو جوان کچھ تو قیمت رکھتے ہیں۔ بربادی، صرف بربادی، یہ انقلاب لے کر آیا ہے۔'' سلیمان نے کانٹا چھری پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''ابتدائی شکل ہی عجیب تھی۔ کون جانتا تھا کہ انقلاب کی گاڑی پٹری سے اُتر جائے گی۔'' اسلم نے نیپکن سے منہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

''خیر! آج کی حسین شام کو سیاسی گفتگو سے غارت نہ کریں تو اچھا ہے۔'' سلیمان نے کرسی سے پشت لگاتے ہوئے کہا۔ بیرا پلیٹیں اُٹھانے لگا۔ تھوڑی دیر میں کافی آ گئی۔ سامنے میز پر رکھی شمع پگھل کر ایک ڈھیر میں تبدیل ہوگئی تھی، لیکن اب بھی اس کی لو اسی طرح سے اسلم اور سلیمان کی آنکھوں میں مہناز کو رقص کرتی نظر آ رہی تھی۔

صبح مہناز دیر سے اُٹھی۔ اُٹھتے ہی اسے اسلم کی بات یاد آئی۔ کیا اسلم اسے بے وفا سمجھتا ہے، لیکن کیا اس نے واقعی بے وفائی کی ہے؟ کبھی یہ لفظ اسے اتنا پست لگتا تھا اور آج سستے پن کے ساتھ ایک گندگی کے احساس کو جنم دے رہا تھا۔ بے وفائی کون لوگ کرتے ہیں؟ جن کا کوئی دین ایمان نہیں ہوتا ہے، جن کے پاس کچھ بھی گہرا اور بامعنی نہیں ہوتا ہے۔ لیکن آج کے پس منظر میں وہ اس بات کو اہمیت کیوں دے رہی ہے، وہ تو اب بہت آگے جا چکی ہے۔ پچھلی زندگی کے بارے میں سوچ کر کرنا بھی کیا ہے؟

''جاگ گئیں؟ ناشتہ کمرے میں کرو گی یا نیچے کافی شاپ میں چلنا ہے؟'' ٹائی باندھتے ہوئے سلیمان نے مہناز سے پوچھا، جو چھت پر آنکھیں گڑائے سوچ میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''کہاں ہو تم، مہناز؟ ناشتہ کرنا ہے۔ سیف تو دودھ پی چکے ہیں۔ تمہاری لاڈلی بھوکی بالکونی پر قدرت کے نظاروں سے خود کو بہلا رہی ہے۔''

''نیچے چلتے ہیں، روم سروس میں ہمیشہ دیر لگتی ہے۔'' مہناز نے جھینپ کر

اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ناشتے کے بعد مجھے کام سے جانا ہوگا۔ لوٹتے ہوئے ٹکٹ بک کراتا آؤں گا۔ ایک ہفتے پہلے پہنچ کر، بچی ہوئی چھٹیاں پیرس میں گزاریں گے۔ تم سامان وغیرہ ٹھیک کرنا شروع کردو، کافی پھیل گیا ہے پچھلے تین ہفتوں میں، جیسے برسوں سے ہم یہاں رہ رہے ہوں۔'' سلیمان نے بالوں کو برش سے ایک بار پھر درست کرتے ہوئے کہا۔

''انسان بھی عجیب شئے ہے، جہاں رہتا ہے وہیں سے جُڑتا چلا جاتا ہے۔'' مہناز کہتی ہوئی باتھ روم کی طرف بڑھی۔

''میں بچوں کو لے کر نیچے چلتا ہوں، تم جلدی آنا۔ ویسے تمہارے لیے آرڈر دوں؟ اُبلے انڈے یا فرائی؟'' سلیمان نے سیف کو گود میں اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں صرف کارن فلیکس لوں گی۔'' یہ کہہ کر اس نے باتھ روم کا دروازہ بند کرلیا۔

شاور کے نیچے کھڑی مہناز پھر سوچ میں ڈوب گئی۔ ''اسلم نے شادی کیوں نہیں کی؟ اتنی ساری حسین لڑکیاں پورے امریکہ میں بکھری پڑی ہیں، کیا کسی نے بھی اسلم کو متاثر نہیں کیا؟ پانچ ساڑھے پانچ سال ہوگئے ہیں اسے یہاں رہتے ہوئے، اس درمیان کسی لڑکی سے دوستی ضرور ہوئی ہوگی۔ خیر... مجھے اب کیا مطلب ان باتوں سے!'' سر جھٹک کر اس نے اسلم کو اپنے ذہن سے نکالا اور غسل ختم کرکے اس نے جسم کو تولیے سے لپیٹا۔ 'پری سے جب پیرس میں ملاقات ہوگی تو کتنا مزا آئے گا! وہی لکھے گی اصل بات اسلم کو کہ وقت کیسا بہتا دریا ہے۔ پھر اسلم یہ جان کر... اُف پھر وہی باتیں... اب نہیں سوچوں گی کچھ بھی...' سر جھٹک کر وہ کپڑے پہننے میں مشغول ہوگئی۔ برش سے بالوں کو پیچھے کرکے کلپ لگائی۔ ہلکا سا میک اپ کرکے وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے کھڑی ہوئی اور چاروں طرف سے خود کو، چہرہ موڑ موڑ کر دیکھنے لگی۔ نیلا رنگ اس پر کھل رہا تھا۔ باڈی اسپرے کرکے جب وہ اسپرے رکھنے کے لیے جھکی تو اسے خیال آیا۔ اسلم سے جب وہ پہلی مرتبہ ملی تھی تب بھی نیلا ہی اسکرٹ پہنے ہوئے تھی۔ اسلم کو اس نے پہچانا ہی نہ تھا۔ اس کی بدحواسی... فون کی گھنٹی بجی۔ مہناز چونکی، فون اُٹھایا۔

''ہیلو!''

"مہناز، ناشتہ ٹھنڈا ہو رہا ہے۔"

"اوہ! میں ابھی آئی۔"

"پون گھنٹے سے انتظا کر رہا ہوں۔ سیف صاحب ہنگر اسٹرائک پر جا چکے ہیں، انہوں نے اُلٹی میٹم دے رکھا ہے کہ ممی کے ہاتھ سے ہی انڈا کھانا ہے۔"

"ابھی آئی... ابھی دو سیکنڈ میں۔" بدحواسی سے مہناز نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

ناشتے کی میز پر پہنچی تو سب ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ مہناز کو بڑی شرمندگی ہوئی۔ جھینپی مسکراہٹ کے ساتھ اس نے نیپکن کھول کر سامنے ڈالا۔ سب کو بھوک لگی تھی، اس لیے سب کھانے میں منہمک رہے۔ ناشتے کے بعد مہناز نے کہا۔ "سلیمان، تم لوٹو گے کب؟"

"شام تک، دوپہر کا کھانا تم لوگ کھا لینا۔"

"کیوں نہ میں کوئی فلم دیکھ آؤں؟ کمرے میں اکیلے بیٹھنا نہیں چاہ رہی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، ابھی دیکھتا ہوں شہر میں کون کون سی فلم چل رہی ہے۔" کہہ کر اخبار اُٹھانے وہ ڈیسک کی طرف بڑھا۔

"میں راستے میں تمہیں چھوڑتا ہوا چلا جاؤں گا۔" کہہ کر سلیمان نے اخبار میں فلم والا کالم پڑھنا شروع کر دیا۔ جب فلم طے ہوگئی تو سلیمان نے پوچھا۔ "آج پہلی مرتبہ اکیلے فلم جانے کا کیسے دل چاہا؟ کیا گھومنے پھرنے سے طبیعت بھر گئی ہے یا کوئی اور بات ہے؟"

"کوئی خاص نہیں۔ بس اکیلے رہنا نہیں چاہتی ہوں۔"

آسمان اور زمین دونوں تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے، لیکن تیز آواز کے ساتھ اُڑتے ہوائی جہاز، کمرے میں لیٹی صنوبر کا دل ہلا رہے تھے۔ جسم پسینے میں شرابور تھا۔ شور کی آواز مسلسل بڑھتی ہی جا رہی تھی۔ اسی کے ساتھ صنوبر کی طبیعت بھی بگڑتی جا رہی

تھی۔ کانپتے ٹٹولتے ہاتھوں سے وہ کسی طرح سے بوتل اُٹھانے میں کامیاب ہوئی۔ ٹیبلٹ نکال کر اس نے اسے زبان پر رکھا اور بدحواس سی بستر پر گر پڑی۔ ہاتھ سے چھوٹ کر کھلی ہوئی شیشی نیچے قالین پر بکھر گئی۔

ہوائی جہاز جا چکے تھے۔ اندر باہر خاموشی چھا گئی تھی۔ صنوبر کو ہوش آرہا تھا۔ لیکن بے حسی کی حالت میں اس کے دل و دماغ پر کئی طرح کی پرچھائیاں بن بگڑ رہی تھیں۔

کمرے میں وہ بیٹھی ہے۔ فون کی گھنٹی بجتی ہے، جمیل اُٹھتا ہے۔

''اوہ! ابھی آیا۔'' کہہ کر کمرے میں ٹنگے کپڑے اُتارتا ہے۔

''کہاں چلے؟'' صنوبر نے اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر پوچھا۔

''ڈیوٹی پر، ایمرجنسی ہے۔''

''ابھی نہیں۔'' کہہ کر اس نے سفید یونیفارم کو اپنے ہاتھوں سے پکڑا۔

''دیر ہو رہی ہے۔''

''نہیں! نہیں!''

''مذاق کا وقت نہیں ہے۔''

''تو یہ وقت ڈیوٹی کا بھی نہیں ہے۔''

''میری سنو تو!''

''ابھی نہیں!'' کہہ کر صنوبر دُوسرے کمرے میں بھاگی، جمیل بھاگا، پھسل کر گرا، تب تک صنوبر دُوسرے کمرے میں تھی۔ ہنسی کے مارے اس کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔ پورے گھر میں دونوں آگے پیچھے دوڑ رہے تھے، تبھی فون کی گھنٹی پھر بج اُٹھی۔ بھاگتے ہوئے جمیل رُکا اور فون اُٹھایا۔

''ہیلو...... کیا......؟ ابھی آیا۔'' جمیل کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا۔

''کیا ہوا؟''

''مجھے فوراً جانا ہے۔'' اس نے بشرٹ کے بٹن کھولتے ہوئے گھبرائے لہجے میں کہا۔ صنوبر کی ہنسی کافور ہو گئی۔ سنجیدگی سے اس نے کپڑے جمیل کے حوالے کیے اور خود چائے لینے کچن میں چلی گئی۔

بالکنی میں کھڑے ہوکر اس نے جاتے ہوئے جمیل کو ہاتھ ہلایا، پانچ منٹ بعد ہی جہاز کی آوازوں سے آسمان گونج اُٹھا۔

صنوبر کا جسم ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ اُسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ بہت دَور کا سفر طے کر کے آئی ہو۔ اس نے کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کرلیں۔ پورے جسم میں سنسنی پھیل رہی تھی۔ دماغ میں دوسری پرچھائیں اُبھری۔

جب وہ رات کا کھانا پکا رہی تھی تو اچانک فون کی گھنٹی بجی، اس نے فون اٹھایا۔ پہلے تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا، پھر جو کچھ سمجھا اس کے لیے وہ تیار نہ تھی۔ وہیں بیہوش ہوکر گر پڑی۔

اپنی ہی چیخ سے صنوبر چونک اُٹھی۔ گھبرا کر آنکھیں کھولیں، کون چیخا تھا؟ اس کے کانوں میں بہت بھیانک چیخ سنائی پڑی تھی۔ دوائی اثر کر رہی تھی۔ اس نے کروٹ لی اور سیدھی لیٹ گئی۔ جوڑ جوڑ کی گرہیں کوئی کھول رہا تھا۔

بنیاد شہید سے وظیفہ، مکان، سب کچھ بھی کو ملا تھا۔ اس نے نہیں لیا۔ کیا کرتی یہ سب لے کر؟ اس کے اکیلے کے پاس جمیل کا دیا بہت کچھ تھا۔ جمیل کے تمام ساتھیوں کی بیویوں نے شادی کر کے اپنے گھر بسا لیے تھے۔ ایک شوہر کے عوض انہیں دوسرا شوہر، مکان، روپیہ سب کچھ ملا تھا۔ سب کچھ بھول کر وہ سب نئی زندگی میں گھل مل گئی تھیں، لیکن وہ یہ سب کچھ نہ لے سکی تھی۔ ماں کے سمجھانے پر بھی وہ خاموش رہی تھی۔ بہت زیادہ خاموش... جیسے اس کے اندر کا شور، ولولہ ہمیشہ کے لیے دم توڑ چکا ہو۔

نیند کے خمار میں ڈوبتی ڈوبتی صنوبر گہری نیند میں ڈوب گئی۔ اب مختلف پرچھائیاں دھندلی ہوکر خواب میں سمٹ گئی تھیں۔

بہت بڑا بازار ہے جہاں طرح طرح کی چیزیں فروخت ہو رہی ہیں۔ بھیڑ غضب کی ہے۔ لوگوں کو چلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے۔ سامنے ایک بڑا سا اسٹور ہے، اس میں آنے اور جانے والوں کے چہرے عجیب ہیں! جیسے وہ وہاں کے باشندے نہ ہوں، ان کے نین نقش دیگر بازار میں گھومتے ہوئے لوگوں سے مختلف تھے۔ وہاں آخر کیا فروخت ہو رہا ہے؟ اپنے تجسس کو دبائے وہ تیز قدموں سے لوگوں کے

درمیان سے راستہ بناتی، ان کو دھکیلتی آگے بڑھنے لگی۔ اسٹور کے دروازے پر اندر جانے سے اسے روک دیا گیا۔

''آپ اندر نہیں جاسکتیں۔''

''کیوں؟''

''قانون ہے اس اسٹور کا کہ کوئی بھی زندہ ایرانی اندر نہیں جاسکتا ہے۔''

''یہ تمام لوگ کیا مردہ ہیں جو آجا رہے ہیں؟''

''وہ ایرانی نہیں ہیں۔''

''لیکن یہ بازار، یہ جگہ، عمارت سب کچھ ایرانی ہے، پھر مجھے اجازت کیوں نہیں ملے گی؟''

''کہہ دیا، ہمارا قانون ہے۔''

''اندر ایسی کون سی چیز فروخت ہو رہی ہے، پھر تم کون ہو منع کرنے والے؟''

''ہم بتا نہیں سکتے ہیں۔'' سنتری نے بندوق کی نال اس کے سامنے کرتے ہوئے کہا۔

''تمہیں پتہ نہیں ہے یا نہ بتانا بھی تمہارا قانون ہے؟''

''جو سمجھیں۔ آپ اندر نہیں جاسکتیں۔'' محافظ نے غراتے ہوئے کہا۔

''اچھا!'' کہہ کر صنوبر آگے بڑھی، اس کے دل میں تجسس پیدا ہو رہا تھا کہ آخر ایسا کیا ہے جو وہ دیکھ نہیں سکتی۔ وہ عمارت کے دوسری طرف گئی۔ پوری کی پوری مضبوط اینٹوں کی دیوار۔ کہیں کھڑکی نہ دروازہ، کیا کرے، کیسے پہنچے اندر؟ گھوم پھر کر وہ پھر سے اس دروازے کے قریب جا کر کھڑی ہو گئی۔ سنتری اب وہاں نہیں تھا، وہ کونے میں سگریٹ کے لمبے لمبے کش لے رہا تھا۔ بغیر کچھ سوچے سمجھے اس نے بجلی کی طرح تڑپ کر قدم اُٹھایا اور لمحہ بھر میں اندر تھی۔ کچھ دیر تک اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا، پھر اسے لگا، یہ تو گوشت کا بازار ہے۔ نیچے زمین سے چھت تک گوشت ہی گوشت...... ہر دُکان پر کچھ نہ کچھ لکھا تھا۔

آگے بڑھ کر اس نے لوہے کی ڈولچی اُٹھائی اور بھیڑ کے پیچھے خریداری کے لیے

چل پڑی۔ پہلی دُکان پر کلیجی، گُردا، قیمہ سب کچھ ڈھیر میں سجا تھا۔ کسی نے اس دوکان سے کچھ نہ خریدا اور آگے بڑھ گئے۔ کچھ لوگ رُکے ان کے پیچھے صنوبر کو بھی رُکنا پڑا۔ اس نے گردن اُٹھا کر دُکان پر لکھا پڑھنا چاہا۔ 'ایرانی شاہی گوشت۔' مجھے لینا تو کچھ ہے نہیں۔ وہ بورڈ پڑھ کر آگے بڑھی۔ سامنے کی دُکان پر کم لوگ رُکے۔ اس نے پھر خود کو مشغول دکھانے کے لیے باہر لگا بورڈ پڑھا۔ 'ایرانی نیشنل فرنٹ گوشت۔' جگہ ملتے ہی وہ بھیڑ سے آگے بڑھی۔

یہاں اس دُکان پر بہت بھیڑ تھی، دُکان بھی بڑی تھی۔ بورڈ پر لکھا تھا 'مجاہد ایرانی گوشت۔' اس کے نیچے یہ بھی لکھا تھا 'ہر عمر کا تازہ گوشت ہر وقت ملتا ہے۔' یہاں پر اُسے رانیں بھی نظر آ رہی تھیں، قیمے، گوشت کی بوٹیاں اور کلیجی، گُردے کے ڈھیر چھت تک بھرے تھے، جن سے تازہ خون ٹپک رہا تھا۔ چار پانچ سیلس مین بجلی کی تیزی سے گوشت تول کر پیکٹ بنا رہے تھے۔ تھوڑا آگے جا کر ایک بڑی دُکان تھی۔ یہاں بھی یہی حال تھا۔ گراہک ٹوٹے پڑے تھے۔ کچھ گراہک روسٹ کے لیے پوری پوری رانیں خرید رہے تھے۔ وہ آگے بڑھی۔ اس دُکان میں بھی بڑی بھیڑ، وہی ہنگامہ تھا۔ دُکان پر لکھا تھا۔ 'ایرانی مارکس وادی گوشت شاپ'، یہاں پر لوگ پورا پورا دھڑ خرید رہے تھے۔ قریب گئی، تا کہ اندر دُکان کا حال دیکھے۔ آگے بڑھ کر اس نے بھیڑ کو چیرا اور تولنے والی مشین کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ مشین پر پورا دھڑ رکھا تھا۔ مشین کی سوئی ستر کلوگرام دِکھا رہی تھی۔

صنوبر نے آنکھیں جھپکائیں۔ کیا وہ جو دیکھ رہی ہے ٹھیک دیکھ رہی ہے... مشین پر ایک انسانی دھڑ یعنی ایرانی جسم تولا جا رہا تھا... پیچھے سے کوئی کہتا۔ ''آگے بڑھو، جلدی چلو 'ایرانی فرنٹیر گوشت شاپ' پر، وہاں سستا گوشت ملے گا۔'' صنوبر نے مڑکر دیکھا تو موٹے موٹے لال چہرے والے بڑا سا تھیلا لے کر آگے بڑھ رہے تھے۔ وہ ان کے پیچھے ہولی۔ بڑی سی دُکان جیسے پرانے جوتوں کپڑوں کی چھٹنی ہوتی ہے اور ان کے ڈھیر نظر آتے ہیں، ایسے ہی ڈھیر ہاتھ، پیر، سر، دھڑ کے اسے نظر آئے، وہ قریب گئی۔

"سوپ کے لیے دو کلو گرام پیر۔"

"بچوں کے پیر ختم ہو گئے ہیں۔"

"بڑے کا دے دو تین کلو گرام۔"

صنوبر آنکھیں پھاڑے دیکھ رہی تھی۔ ایرانی جسم! جسم کے مختلف حصے۔ ہاتھ، پیر، سر وغیرہ۔ تبھی اس ڈھیر میں اسے جمیل کا ایک ہاتھ دوسرے رکھے ہاتھوں میں الجھا دکھائی دیا...... ہیرے کی انگوٹھی، اس کی شادی کی نشانی اس میں چمک رہی تھی۔ ایک زندہ ہاتھ، جو تیزی سے گوشت کے اچھے ٹکڑے چھانٹ رہا تھا، نے جمیل کا ہاتھ اُٹھایا اور کہا۔ "تولنا ذرا۔"

"نہیں! نہیں! بند کرو یہ تجارت... بند کرو یہ بازار..." صنوبر چیخ پڑی... جمیل کا ہاتھ اس سے چھین کر وہ چیختی ہی جا رہی تھی۔ اس کی چیخوں سے گاہک منتشر ہونے لگے۔ "یہ میرا ہے یہ میرا جمیل ہے۔" تبھی اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ جمیل کی ماں اس کے دونوں ہاتھوں کو زور سے پکڑے تھیں۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔

"بند کرو ایرانی گوشت کی فروخت!" وہ اُچھل کر بستر پر بیٹھ گئی۔ "بند کرو..." پھر چیخی اور بیہوش ہو کر گر پڑی۔

بخار سے جسم تپ رہا تھا۔ رشیدہ خانم بہو کا ہاتھ آہستہ سے چھوڑ کر کھڑی ہوئیں اور صنوبر کے بھائی کا نمبر ملانے لگیں۔

تھوڑی دیر بعد ہی جعفر ڈاکٹر کو ساتھ لے کر آ گیا۔ بہن کو سنبھالنے کے لیے وہ قریب ہی بیٹھ گیا۔ ڈاکٹر جانچ میں مشغول ہو گیا۔

جعفر کی بیوی نے اپنی ساس یعنی صنوبر کی ماں کے گھر کا فون ملایا۔

"ماماں! صنوبر بیمار ہے!"

"کیا ہوا؟" شاہدہ خانم نے گھبرا کر پوچھا۔

"ابھی ڈاکٹر معائنہ کر رہا ہے۔ گھبرانے کی بات نہیں ہے۔ آپ اور لطیف چلے آئیں... رشیدہ خانم اکیلی ہیں، آپ کے آنے سے ان کا دل سنبھل جائے گا۔"

"ابھی آئی! لطیف بھی گھر پر ہے، بس میں ابھی پہنچتی ہوں۔"

"اچھا! ماماں، میں فون بند کرتی ہوں۔" فون رکھ کر فیروزہ کمرے میں لوٹی۔

"کوئی گہرا صدمہ لگا ہے۔ میں انجکشن دے رہا ہوں۔ لیکن طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ ٹینشن بہت لگ رہا ہے۔ دماغ کی نس پھٹ جائے تو حیرانی نہیں۔" ڈاکٹر نے جعفر کو کونے میں لے جا کر کہا۔

"پھر!" جعفر بے چین ہو کر بولا۔

"ان کو تو ٹینشن کی پرانی بیماری ہے... خیر، میں گھر پر ہی ہوں۔ فون کر دیجیے گا، میں آجاؤں گا... ویسے چاہیں تو نرس کو بھیج دوں۔"

"نرس آجائے تو اچھا ہے۔" جعفر نے رندھے گلے سے کہا۔

"ایسے دل چھوٹا مت کرو، جعفر۔" ڈاکٹر نے جعفر کے کندھے تھپتھپاتے ہوئے نکل گیا۔

صبح سے کسی نے چائے بھی نہیں پی تھی۔ فیروزہ نے اصرار کر کے رشیدہ خانم اور جعفر کو چائے کے ساتھ روٹی کے ٹکڑے میں پنیر لپیٹ کر کھلایا۔ کچھ دیر بعد لطیف اور شاہدہ خانم بھی پہنچ گئے۔ نرس آگئی تھی۔ کمرے کے ایک کونے میں جعفر، لطیف اور فیروزہ ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ رشیدہ خانم جانماز پر بیٹھی تھیں۔ صنوبر اور جعفر کی شادی ادلا بدلی میں ہوئی تھی۔ صنوبر کی نند اس کی بھابی تھی۔
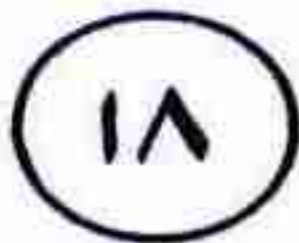
بس کے لیے غضب کی بھیڑ تھی۔ ملیحہ کو بچوں کے ساتھ وہاں پر کھڑے ہوئے ایک گھنٹہ گزر گیا تھا، پیر دکھنے لگے تھے۔ ملیحہ نے بچوں کو قریب کھڑے ٹھیلے سے کچے

پستے دلا دیے تھے۔ وہ اسے کھانے میں مشغول تھکن سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ دھوپ میں آج بلا کی شدت تھی۔ رنگین موٹی چادروں کے نیچے پسینے میں ڈوبی عورتیں حسرت سے بس کے انتظار میں کھڑی سڑک نہار رہی تھیں۔

سڑک پر جاتے ہوئے ایک جوان جوڑے سے ایک بھکارن بھیک مانگنے لگی۔ پہلے وہ 'نہیں ہے' کہتے رہے، لیکن وہ مانگتی مانگتی ان کے پیچھے لگ گئی۔ اچانک لڑکا مڑا اور چڑھ کر بولا۔ ''ہم سے کیا مانگتی ہو، جا کر اپنے امام خمینی سے مانگو!''

بھکارن سکتہ میں آ گئی۔ لڑکے کے غصے سے کانپتے ہونٹ اور چڑھی آنکھیں دیکھ کر۔

''دو سال سے بیکار ہیں ہم۔ ہم دونوں کس سے بھیک مانگیں جا کر! دیکھو کیا ہے!'' کہہ کر اس لڑکے نے دونوں جیبیں باہر نکال دیں۔ بھکارن خوفزدہ ہو گئی۔ بس کے انتظار میں کھڑی عورتیں اور مرد تماشا دیکھنے لگے۔

ساتھ والی لڑکی جو اس کی بیوی تھی، شوہر کا ہاتھ کھینچتے ہوئے بولی۔ ''گناہ ہے علی! یہ بیچاری کیا کرے! اس کو کہنے سے کیا فائدہ ہے! چلو چلو، ہم جا رہے تھے نا، نکہت کے گھر چلو۔''

لڑکا بڑبڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔ عورتوں کے منہ کھلنے لگے۔ ''مہنگائی، بیکاری، اوپر سے مکان کا کرایہ، بچوں کی فیس، پاگل تو بنا دیا ہے پریشانیوں نے ہمیں۔''

''پہلے میاں بیوی کام کرتے تھے، خرچ بھی ویسا ہی تھا۔ اب بیوی تو گھر بیٹھ گئی۔ شوہر کو بھی کٹ کٹا کر جو ملتا ہے اس سے خرچ کہاں چلتا ہے؟''

''کیسا تباہ کیا ہے ہم کو!''

''ہم تو بہت اچھی حالت میں ہیں، عراقیوں سے پوچھو جا کر۔''

''ہم اپنی جانتے ہیں کہ بری کٹ رہی ہے، عراق کی وہ جانیں، جو وہاں گئے ہوں۔ جب ہم نے دیکھا نہیں تو کہیں کیا! یہاں تو ہم جہنم کی آگ میں جھلس رہے ہیں۔''

''جنگ نہ ہوتی تو کچھ نہ ہوتا۔''

''معلوم نہیں۔''

بس آ گئی تھی۔ پژمردہ دکھی سواریاں خاموشی سے بس پر چڑھنے لگیں۔ بس چل

پڑی۔ پیچھے سے کسی سواری نے کچھ پوچھا۔ ڈرائیور نے غصہ سے جواب دیا۔ ''معلوم نہیں مجھے، جب بس میں چڑھنا آتا نہیں تو چڑھے کیوں؟''

پوری بس میں خاموشی چھا گئی۔ لوگوں کو بہت بُرا لگا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھی سواریوں میں سے دو جوان لڑکوں نے کہا۔ ''ڈرائیور صاحب، سواریوں سے ایسے بات کی جاتی ہے؟''

''تو پھر کیسے؟''

''بتائیں کیسے؟''

''یہ بسیں آخر تمہارے لیے چلتی ہیں یا مسافروں کے لیے؟''

''اس وقت میرا جو دل چاہے گا وہی کروں گا۔''

''تو پھر ٹھیک ہے، بس روکو، نیچے اترو، حساب بیباک ہو جاتا ہے کہ کس کے لیے بسیں چلتی ہیں۔''

باقی سواریاں بھی بڑبڑانے لگیں۔ ڈرائیور گھبرا گیا۔ پیچھے سے آوازیں آ رہی تھیں۔

''بس روکو! بس روکو!''

کچھ عورتیں گھبرانے لگیں تھیں۔

''چھوڑیے بھی، ڈرائیور کے منھ کیا لگنا!''

''ڈرائیور ہمارے منھ کیوں لگا؟ بس کس کے آرام کے لیے چلتی ہے؟''

ڈرائیور نے بس روکی۔ لڑکے پیچھے سے آگے بڑھے۔ کچھ دُوسرے ادھیڑ عمر کے مرد بھی کھڑے ہو گئے۔ ڈرائیور کا جسم کانپ رہا تھا۔ آنکھوں میں پانی جمع ہو گیا تھا۔ چہرے پر ہوائیاں اُڑنے لگیں تھیں۔ اچانک وہ گڑگڑاتے ہوئے بولا۔ ''میرے ہاتھ پاؤں میرے قابو میں کب ہیں۔ نروس سسٹم تو اس ملک نے بیکار کر دیا ہے۔ تمہاری بہن کو گولی سے اُڑایا جاتا تو تم شاید بس بھی نہ چلا پاتے۔'' آنسو لڑھک کر اس کے گالوں پر بہنے لگے۔ آستین چڑھاتے لوگ ٹھگے سے رہ گئے۔ وہ دونوں نوجوان مڑ کر اپنی نشستوں پر بیٹھ گئے۔

''ٹھیک ہے بابا! چلو، بس چلاؤ۔ سب کے سینے میں تازہ قبر بنی ہے۔'' ایک

عورت نے خاموشی توڑی۔
''جو ہوا سو ہوا۔ اب چلاؤ بس۔''
ڈرائیور نے کانپتے جسم پر قابو پالیا تھا۔ آنسو صاف کرتا ہوا سیٹ پر بیٹھ گیا۔ پھر دو منٹ بعد بس اسٹارٹ کی۔
ملیحہ اور دونوں بچے خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہے تھے۔
ملیحہ بس سے اُتر کر طیبہ کے گھر کی جانب چل پڑی۔ کب سے اس نے فون نہیں کیا ہے۔ کہیں پھر بیمار نہ پڑ گئی ہو۔ آج نیچے والا صدر دروازہ کھلا مل گیا۔ وہ اُوپر چڑھ گئی۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ جواب ندارد۔ 'باہر گئی ہوئی ہے شاید! بہتر ہوگا، اگر میں نوٹ چھوڑ جاؤں، لیکن لکھوں کیسے، قلم کاغذ تو ہے نہیں!' ملیحہ یہ سوچ کر کہ مکان مالک سے قلم کاغذ لے کر نوٹ لکھ کر دروازے میں ڈال دے گی، نیچے اُتری۔ بچوں سے کہا۔ ''تم یہیں بیٹھو، میں ابھی آئی۔''
تین منزل اُتر کر وہ سیدہ خانم کے دروازے پر کھڑی ہوئی۔ گھنٹی بجائی۔ دروازہ کھلا۔
''سلام! میں طیبہ کی دوست ہوں۔ طیبہ ہے نہیں، اگر آپ.....''
''طیبہ یہاں کہاں ہوگی! اس کمرے میں کوئی اور آگیا ہے۔'' سیدہ خانم بولیں۔
''طیبہ کہاں گئی؟'' خود سے جیسے ملیحہ نے پوچھا، پھر اونچی آواز میں بولی۔ ''آپ کو معلوم ہے، کہاں گئی ہے، کب گئی ہے؟''
''کب گئی ہے۔ یہی تقریباً دو ماہ ہونے کو ہیں۔ کہاں گئی ہے، بتانا مشکل ہے، کیونکہ پاسدار کسی کو بتا کر تو لے نہیں جاتے ہیں کہ کون سے جیل لے جا رہے ہیں!''
''طیبہ کو پاسدار لے گئے؟'' ملیحہ آہستہ سے بڑبڑائی۔
''ہاں!''
''یا اللہ! جانے کیا ہوگا اس کا!'' ملیحہ کی آواز بلند ہوگئی۔
''ہونا کیا ہے! جو سب عورتوں اور لڑکیوں کا ہو رہا ہے۔ بس اتنا کرنا کہ اسے مانع حمل گولیاں ضرور دے آنا، جو ہر ماں اور بہن کرتی ہے... ہماری عورتوں کا نصیب ہے... ان کی گندگی بھی اپنے میں خالی کرو... ان کی گندگی کا بوجھ بھی اُٹھاؤ، پھر طعنوں کی

بوچھار بھی سنو۔"

"آپ..." ملیحہ کے ہونٹ کانپ رہے تھے۔ جو بولنا چاہ رہی تھی، بول نہیں پارہی تھی۔ گلا رُندھ گیا تھا۔ آنسوؤں نے تمام الفاظ کو بہا دیا تھا۔

"گھبرانے سے بیٹی حاصل کچھ نہیں ہوگا۔ میں یہی کام کر رہی ہوں۔ سب ملا کر میرے خاندان میں چالیس لڑکیاں ہیں۔ گولیاں بھی آسانی سے نہیں ملتی ہیں... مصیبت کے وقت عقل سے کام لو، کون سا قدم ہے جس سے ہم نئی مصیبت کو روک سکیں۔"

"جی......" ملیحہ اتنا کہہ کر چلنے کو ہوئی۔

"اچھا بیٹی، دل مضبوط رکھو۔" کہہ کر سیدہ خانم نے دروازہ بند کرلیا۔ ملیحہ کو ایسا لگا کہ اس کی کمر کے ٹانکے ٹوٹ گئے ہیں۔ اس کے پیر بے جان ہوتے جارہے ہیں۔ بڑی مشکل سے بولی۔ "بچوں نیچے آؤ۔" اتنا کہہ کر وہ سیڑھیوں پر بیٹھ گئی۔ بچے تیزی سے کودتے ہوئے نیچے اُترے۔ ماں کو یوں گھٹنوں میں منہ ڈالے، سیڑھی پر بیٹھے دیکھ کر گھبرا گئے۔ "ماماں! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" مہران نے پوچھا۔

"بھیا، ماماں کو پانی پلانا چاہیے۔" عالیہ نے جھک کر ملیحہ کا چہرہ دیکھتے ہوئے کہا۔

"پانی کہاں سے آئے گا؟" مہران نے پریشانی سے کہا۔

"سیدہ خانم کے گھر سے لیتے ہیں۔" عالیہ آگے بڑھی۔

"نہیں......نہیں......" غافل سی ملیحہ ہوش میں آکر کہہ اُٹھی۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں پھر وہ کوئی دل دہلا دینے والی بات بڑے ٹھنڈے انداز سے نہ کہہ دے کہ عورت کی یہی ابتدا ہے اور یہی آخر ہے۔

"آپ کا سر سہلاتی ہوں۔"

"نہیں بیٹی! میں ٹھیک ہوں۔ تم لوگ نیچے چلو۔ میں آہستہ آہستہ اُترتی ہوں۔"

"ہم آپ کو پکڑ کر لے چلتے ہیں۔"

تینوں آہستہ آہستہ نیچے اُترے۔ سامنے جاتی ٹیکسی کو ملیحہ نے ہاتھ دکھایا اور ٹوٹے درخت کی طرح اس میں جاگری۔ ڈرائیور نے اس کی حالت دیکھ کر پوچھا۔

"ہسپتال۔"

"نہیں! گھر! خیابانِ تالغانی چلو۔"
ٹیکسی چل پڑی۔ ملیحہ نیم بیہوش سی پڑی تھی۔ بچے راستہ بتا کر خاموش سڑک کا معائنہ کر رہے تھے۔

دو دِن سے صنوبر بیہوش تھی۔ ڈاکٹر برابر صبح، دوپہر، شام آکر اس کا معائنہ کر رہا تھا۔ جعفر اور لطیف دو دِن سے نہ سوئے تھے، نہ داڑھی بنائی تھی۔ شاہدہ اور رشیدہ خانم کو چُپ کراتے کراتے خود فیروزہ بے حال ہوگئی تھی۔
تیسرے دن صنوبر نے آنکھیں کھولیں، پھر بند کرلیں۔ سب کے چہرے کھل اُٹھے تھے۔ اُمید بندھ گئی تھی۔ رات تک صنوبر کی طبیعت آہستہ آہستہ کر کے سنبھلتی چلی گئی۔ اس وقت سب کمرے میں جمع تھے۔ خوش ہو کر باتیں کر رہے تھے۔ نرس بھی تھوڑی دیر کی چھٹی لے کر چلی گئی تھی۔
"تین دن سے کسی نے کچھ کھایا نہیں ہے۔ کیسا چھوٹا سا منہ نکل آیا ہے، جیسے برسوں کے بیمار ہوں۔" رشیدہ خانم بولیں۔
"آپ نے تو رو رو کر بُرا حال کرلیا تھا۔" شاہدہ خانم بولیں۔
"تم اپنی کہو، تمہارے آنسو میرا بھی دل دکھاتے تھے۔" رشیدہ خانم بولیں۔
"اب ذرا رات کا کھانا عمدہ ملنا چاہیے۔" لطیف نے ہنستے ہوئے کہا۔
"ضرور، جو کہو گے وہی پکاؤں گی۔" فیروزہ نے چائے کے برتن سمیٹتے ہوئے کہا۔
"لو، صنوبر بھی اُٹھ گئی۔" جعفر نے خوشی سے کہا۔
"کیسا ٹکر ٹکر خاموشی سے ہمیں تاکتی ہماری باتیں سن رہی ہے۔" فیروزہ بولی۔
"چائے لوگی بیٹی، کہ دودھ یا جوس؟" رشیدہ خانم پاس جاکر بیٹھ گئیں۔
"دودھ لاؤں بیٹی؟" شاہدہ خانم پلنگ کی پائینتی بیٹھتی ہوئی بولیں۔ صنوبر بغیر کچھ کہے سب کو تاکتی رہی۔
"رات کے کھانے کے بارے میں معلوم کریں۔" لطیف نے شرارت سے کہا۔

پکانے کو گوشت ہے خالہ، یا لانا پڑے گا؟" جعفر بولا۔

"گوشت کہاں ہے بیٹا، ایک مہینہ ہوگیا... لائن میں جا کر کون کھڑا ہو... سعداللہ جان پہچان کا قصاب ہے، جب وہ دے دیتا ہے ایک کلو یا دو کلو، تو سمجھو ہم کھا لیتے ہیں۔"

"سامنے یہاں پر کوئی گوشت کی دُکان نہیں ہے کیا؟" لطیف نے بے چینی سے کہا۔

"میں گھر سے لے کر آتا ہوں۔ پچھلے ہفتے ہی تو لیا تھا نا فیروزہ؟"

"ہاں یہ لو کنجی... گھر جا ہی رہے ہیں تو میرے لیے کپڑے بھی لیتے آنا اور راستے سے کچھ پھل بھی۔"

"نہ اب گوشت کی وہ دُکانیں رہیں، نہ پھل کی، ایران ایران نہ رہا۔" رشیدہ خانم نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

صنوبر کے کمزور دماغ میں 'گوشت کی دوکان' لفظ چپک گیا، پھر تین روز پہلے والا خواب دماغ میں چلنے لگا۔ لفظ 'قصاب' بھی گونجنے لگا۔ دانتوں سے بوٹی نوچتا۔ چیرتا پھاڑتا قصاب لاشوں کا ڈھیر لگا رہا ہے۔ صنوبر نے بے دم ہوکر آنکھیں بند کرلیں۔ 'فرنٹیر گوشت شاپ' اس کے سامنے اُبھری۔ مردانے ہاتھ، کم عمر پیر، کٹے سر، ایک دُوسرے سے اُلجھے، جیسے بچا مال ہو۔ اس میں سے جھانکتا بالوں سے بھرا ایک ہاتھ، چھنگلی کے پاس والی انگلی میں ہیرے کی انگوٹھی... وہ تیزی سے آگے بڑھ کر ٹٹولتی ہے، ڈھونڈتی ہے۔ اس ہاتھ کے علاوہ کوئی دوسرا حصہ... ہاتھ... کہیں اسے کوئی خرید نہ لے گیا ہو!

"میرے جمیل کو کون مجھ سے چھین لے گیا؟ جمیل کی لاش کا تو پتہ بھی نہ تھا۔ جہاز کے ساتھ ساتھ وہ بھی ٹکڑے ٹکڑے ہوکر بحر عرب کی گہرائیوں میں سما گیا تھا، پھر یہ ہاتھ آیا کہاں سے؟"

"دُکاندار تو ایسا بے ایمان ہوگیا ہے اب کہ پوچھو مت۔" رشیدہ خانم چاول دھوتے ہوئے بولیں۔

"تاجر ڈھونڈ کر سامان تھوڑے ہی لاتا ہے، اسے پیسہ چاہیے۔ کوڑا بھی آج کل

سونے کے بھاؤ بیچ رہا ہے۔"
"گوشت... فرنٹیر گوشت شاپ..." صنوبر کے دماغ میں ہتھوڑا برس رہا تھا۔
"لو، میں گوشت لے آیا ہوں۔" جعفر یہ کہہ کر غسل خانے میں گھس گیا۔
فون کی گھنٹی بجی۔ لطیف نے اُٹھایا۔ "ہیلو"
"صنوبر خانم کا حال کیسا ہے؟"
"بہتر لگ رہا ہے، ڈاکٹر صاحب!"
"مجھے ایک سیریس کیس دیکھنے جانا ہے، اگر صنوبر کی طبیعت ٹھیک ہو تو میں کل صبح آجاؤں؟"
"میں معلوم کر کے بتاتا ہوں۔" کہہ کر لطیف نے پوچھا، پھر لوٹ کر بولا۔
"ٹھیک ہے، ڈاکٹر صاحب، آپ صبح آجایئے لیکن نرس کب آ رہی ہے؟"
"رات کو نو بجے تک پہنچ جائے گی۔"
"بہت اچھا! صبح ملاقات ہوگی۔"
"شب بخیر!"
دستر خوان پر کھانا لگ گیا تھا۔ گوشت کے سالن کی خوشبو سے کمرہ مہک گیا تھا۔ لطیف اور جعفر آلتی پالتی مارے بیٹھے تھے۔ ان کے سامنے کی طشتریوں میں شاہدہ خانم کھانا نکال رہی تھیں۔ فیروزہ نہا کر ابھی نکلی تھی۔ سر پر تولیہ باندھے باندھے ہی وہ دستر خوان کے قریب آ کر بیٹھ گئی۔ رشیدہ خانم صنوبر کے قریب گئیں۔
"کچھ کھاؤ گی، صنوبر؟"
"گوشت بہت مزیدار بنا ہے۔ گوشت کا شوربا اور روٹی دے دیں۔" جعفر بولا۔
"ڈاکٹر سے معلوم نہیں کیا ہے!"
"ارے ٹینشن کی بیماری ہے۔ کوئی پیٹ تھوڑے ہی خراب ہے۔" لطیف بولا۔
"کچھ کھاؤ گی؟" شاہدہ خانم قریب آئیں۔
"ہاں۔" سر ہلا کر صنوبر نے جواب دیا۔
بہت ہلکا شوربا اور روٹی اُس میں ملا کر شاہدہ خانم نے صنوبر کا کھانا تیار کیا۔ تھوڑا

سا بٹھا کر شاہدہ خانم چمچے سے اسے پتلے پتلے سوپ جیسے شوربے سے روٹی کھلانے لگیں۔ کھانا کھلا کر اس کا منھ صاف کیا اور خود کھانے کے لیے دستر خوان پر بیٹھ گئیں۔
ہنسی مذاق کے ساتھ کھانا ہو رہا تھا۔ ان کی باتیں صنوبر بھی کچھ کچھ سمجھ رہی تھی۔ ہلکے سے مسکرا بھی دیتی تھی۔ لیکن جو سنسناہٹ اس کے دماغ میں دوڑ رہی تھی وہ اسے اس بیچ کئی مرتبہ بیہوشی تک لے گئی تھی جیسے دماغی سطح پر کچھ نہ ہو۔ اس کے دل و دماغ پر کیا گزر رہی ہے، کسی کو معلوم نہیں ہو رہا تھا۔ صرف اس بات کی خوشی تھی سب کو کہ صنوبر دو دِن کی بیہوشی کے بعد اب ہوش میں آ گئی ہے اور بیٹھی مسکرا رہی ہے۔

''ایرانی کمبخت کھانے کے بہت شوقین ہیں۔ دو روز کھانا نہیں کھایا ٹھیک ہے، تو دیکھو ذرا، دو کلو گوشت میں سے ذرا بھی جو بچا ہو۔'' شاہدہ خانم دستر خوان پر سے روٹیوں کے ٹکڑے اُٹھاتی ہوئی بولیں۔

''خوشحالی بھی تو رہی ہے ہمیشہ اس سر زمین پر، انگریز تو ٹھہرے نہیں کہ 'ٹن فوڈ' کھولا، ڈبل روٹی لی اور کھانا کھا لیا۔'' شاہدہ خانم دستر خوان تہہ کرتے ہوئے بولیں۔

''کیسی ہو صنوبر؟'' لطیف صنوبر کے قریب بیٹھ گیا۔

''اچھی ہوں۔''

''کھانا کیسا لگا؟''

''اچھا تھا...... تمھیں؟''

''مجھے اچھا لگا، آج فیروزہ نے گوشت بہت غضب کا بنایا تھا۔''

''کیا؟''

''گوشت۔''

''کیا؟'' سر میں سنسناہٹ بڑھ گئی۔

''گوشت ... گوشت۔'' اتنا کہہ کر شرارت سے لطیف نے اپنا ہاتھ دکھایا پھر دُوسرے ہاتھ سے اس پر چھری چلائی اور ہنس پڑا۔ ہاتھ کی طرف صنوبر کی نظر جم گئی۔ کٹے ہاتھوں کے درمیان جمیل کا ہاتھ بالوں سے بھرا ہوا۔ سفید انگلی میں شادی کی انگوٹھی جھلملا رہی ہے۔

اچانک صنوبر چیخ پڑی۔ ”نہیں، نہیں۔ یہ میرے جمیل کا ہاتھ ہے، میں اسے تمہیں نہیں لے جانے دوں گی... کبھی نہیں، کبھی نہیں... گوشت کی دُکان بند کرو... یہ خریداری بند کرو... یہ میرے جمیل کا ہاتھ ہے... یہ میرے...“ باقی کے لفظ منھ میں ہی رہ گئے۔ صنوبر بیہوش ہوکر گر گئی اور اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ سب پریشان سے پلنگ کے چاروں طرف آکر کھڑے ہوگئے۔ خوش قسمتی سے اسی وقت نرس آگئی۔ سب کے چہرے پر اطمینان چھا گیا۔ اس نے نبض دیکھی۔ آنکھیں کھول کر دیکھیں، پھر پیر کے قریب رکھی چادر کو صنوبر کے چہرے تک ڈھانک دیا۔ پورا خاندان بُت بنا کھڑا رہ گیا کہ آخر اچانک سے ہوا کیا......؟

سوسن اور عباس کی خوشیوں کی جگہ ہر روز نئی فکرات نے لے لی تھی۔ شہر سے آنے والا ہر آدمی ان کے گھر کی کنڈی ضرور بجاتا تھا۔ گاؤں کا ماحول بھی تبدیل ہو رہا تھا۔ کیسے، یہ وہ بتا نہیں سکتے تھے۔ صرف محسوس کر سکتے تھے۔ گرمی کی شام کو وہ دونوں گھومنے باہر نکلتے تھے۔ لیکن اب نکلنا بھی چھوڑ دیا تھا۔

”سنو، عباس، ہم کیوں نہ کسی اور ملک چلیں؟“

”لیکن کیسے؟“

”جیسے سب جارہے ہیں۔“

”بچہ چھوٹا ہے، راستہ پُر خطر ہے۔ خطرہ ہی خطرہ ہے۔“

”خطرہ تو اب یہاں بھی کم نہیں ہے۔ یہاں سے نکلے، کہیں جاکر بسے بھی تو کچھ دن بعد پھر وہی پریشانی۔ اس جھنجھٹ سے تو اچھا ہے اجنبی ملک کا اکیلاپن۔ اس بیگانے ماحول میں سکون سے ہم تینوں ساتھ ساتھ تو رہیں گے۔“

”ایک دو لاکھ تو صرف رشوت کے رکھ لو، پھر دُوسرے خرچ... باہر رہنا، پیسہ کیسے لے جائیں گے وہاں؟“

”کون سا ملک ہے تمہارے دماغ میں؟“

"امریکہ نہ جا سکتے ہیں، نہ میں جانا چاہتا ہوں۔ رہا لندن، وہاں ایرانیوں کی دُرگت کیا بنی ہے وہ تم خود جانتی ہو۔ پیرس جاؤں تو مہنگا بہت ہے، پھر ویزا نہیں ملے گا۔ پاکستان میں جانا نہیں چاہتا۔ وہاں جا کر بھی ماحول نہیں بدلے گا۔ لے دے کر ایک ہندوستان بچتا ہے۔"

"ہندوستان میں نہیں جانا چاہتی۔ ایک تو گرمی، اوپر سے سانپ! مجھے تو ڈر لگتا ہے۔"

"لیکن سب سے سستا اور اچھا ملک ہے، سب تعریف کرتے ہیں۔"

"معلوم نہیں! تم دیکھ لو۔"

"دیکھو! تہران گیا تو ہندوستان کے متعلق معلومات کروں گا۔"

"میں نے سنا ہے، وہاں غریبی بہت ہے۔ لوگ فٹ پاتھ پر ننگے پیدا ہوتے ہیں اور اسی پر ایک دن بھوکے مر جاتے ہیں۔"

"کچھ بھرے پیٹ بھی مرتے ہوں گے۔"

"وہاں بولنے والا طوطا ملتا ہے، پہاڑوں پر اب بھی عابد و زاہد رہتے ہیں، عجیب ملک ہے وہ!"

"ہاں، عجوبہ ہے، قدیم تہذیب ہے، بہت کچھ ہے وہاں۔"

"فلمیں دیکھنے کو ملیں گی۔ راجکپور اور راجندر کمار کی تم نے 'سنگم' دیکھی تھی؟"

"اس وقت کس نے 'سنگم' نہیں دیکھی ہوگی۔" عباس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مور بھی ہوتے ہیں۔"

"وہاں بہت کچھ ہوتا ہے۔ اب مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ کچھ کھانے کو ملے گا؟"

"بس، ابھی دو منٹ میں کھانا لگاتی ہوں۔" کہہ کر سوسن کچن کی طرف بڑھ گئی۔

ابھی عباس کو لیٹے دو ہی منٹ گزرے ہوں گے کہ باہر سے شور کی آواز آئی۔ وہ خاموشی سے سنا اَن سنا کیے پڑے رہے۔ جا کر کیا کرتے۔

"کھانا لگ گیا ہے!" سوسن نے آواز دی۔

میز پر بیٹھے، کھانا نکالا، تبھی گھر کی گھنٹی بج گئی۔ اُٹھا نوالہ بیچ میں ہی رہ گیا۔ بلقیس نے بتایا کہ عبداللہ آیا ہے، گاؤں میں دو تین لوگوں کو گولی لگ گئی ہے۔

منھ تک پہنچنے والا نوالہ وہیں پلیٹ میں رکھ کر عباس اُٹھ کر دروازے تک گئے۔

''کیا بات ہے، عبداللہ بھائی؟''

''بہت کچھ ہو گیا، عباس! آپ کا کہا سچ نکلا، آج تین لوگوں کو گولی ماردی گئی۔ کہتے ہیں جاسوس تھے۔ آپ تو نوید کو جانتے تھے، اللہ میاں کی گائے تھا۔ مُشدی کو آپ کیا، پورا گاؤں جانتا تھا۔ ماں باپ کے زمانے سے مزدوری کرتا دو روٹی کھاتا تھا۔ یہی حال ہاشم کا تھا، لیکن اب ہمیں بتایا جارہا ہے کہ وہ مجاہدین سے ملے ہوئے تھے۔ ہم زمین کے رکھوالے، محنت سے اناج اُگانے والے یہ سب کیا جانیں!''

''ان سب کے گھر والے...؟'' عباس نے پوچھا۔

''غمگین اور خوفزدہ دونوں ہیں۔'' عبداللہ بولا۔

''افسوس ہے!'' عباس نے سر جھکا کر کہا۔

''کچھ لوگوں نے ابھی سے کہنا شروع کر دیا ہے کہ انہیں ہم اپنے قبرستان میں دفنانے نہیں دیں گے۔ یہ کافر ہیں۔''

''کیا کہوں میں؟'' عباس نے کہا۔

''آپ چل کر سنبھالیں۔''

''تم چلو، میں آتا ہوں۔''

اندر آکر وہ خاموشی سے بیٹھ گئے۔ انہیں تھوڑی دیر تک سوسن دیکھتی رہی، پھر بولی۔ ''کھانا تو کھایئے نا!''

''اب کھانا حلق سے نیچے نہیں اُترے گا، سوسن۔ تم ضرور کچھ کھالو۔'' کہہ کر وہ اٹھے۔ سوسن کے چہرے پر محبت سے ہاتھ پھیرا، پھر باہر کی طرف نکل گئے۔

گاؤں سنسان تھا۔ دُور سے خاموشی توڑتی رونے کی آواز آرہی تھی۔ ایک دو گھروں میں چراغ جل رہے تھے۔ باقی تمام محلے تاریکی میں ڈوبے ہوئے تھے۔ لیمپ پوسٹ کی پھیکی روشنی کچی سڑک پر پھیل رہی تھی۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے ان تینوں شہیدوں کے محلے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ وہ تینوں اس گاؤں کی طاقت تھے۔ عباس سب کچھ سمجھ رہے تھے، لیکن کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ کہتے بھی تو کون سنتا اُن کی؟

جیسے ہی وہ محلے میں داخل ہوئے، کتے بھونکتے ہوئے ان کے پیچھے لگ گئے۔ انہیں دیکھ کر عورتوں کے رونے کی آواز زیادہ اونچی ہوگئی۔ چبوترے پر حقہ پیتے لوگ چلم رکھ کر کھڑے ہوگئے اور انہیں لینے آگے بڑھے۔

انجیر کی بیلوں کے پاس تینوں جنازے ایک کے بعد ایک رکھے ہوئے تھے۔ انہیں گھیرے عورتیں بیٹھی رو رہی تھیں، بالوں اور منہ کو نوچ رہی تھیں۔ سر جھکائے عباس گاؤں والوں کے ساتھ چلتے ہوئے چبوترے پر جا کر بیٹھ گئے۔

"عباس آغا!" ایک نے حقہ عباس کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

"کیا سوچا آپ نے ان جنازوں کے بارے میں؟" دُوسرے نے سوال کیا۔

"گاؤں والوں کو مل کر فیصلہ کرنا ہوگا!" عباس نے کہا۔

"کیسا فیصلہ؟"

"لاش جس گاؤں کی ہے، اسی کے قبرستان میں دفن ہوگی۔ یہ اصول رہا ہے۔" عباس نے فیصلہ کن آواز میں کہا۔

"لیکن؟" ایک نے پریشان ہو کر کہا۔

"وہ کہتے ہیں، خون کی ندی بہہ جائے گی اگر یہ کافر مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوئے۔" بزرگ نے حقہ کا کش لیا۔

"وہ کون؟" عباس نے کہا۔

"ظہیر نیازی اور ان کے ساتھی۔" ایک جوان لڑکے نے کہا، جو کھمبے سے لگا کھڑا تھا۔

"جب سے گاؤں میں آئے ہیں، سکون غارت ہوگیا ہے۔" بزرگ نے کہا۔

"وہ ہوتے کون ہیں ایسا کہنے والے! اس گاؤں کے بزرگ آج تک جھگڑے سلجھاتے آئے ہیں۔" عباس نے کہا۔

"وہ کمر کسے ہیں۔" ایک نے لقمہ دیا۔

"قبرستان کے دروازے پر جا کر سب جمع ہیں۔ کہتے ہیں، جس نے ہمت کی آگے بڑھنے کی، ٹانگیں چیر کر چیل کوؤں کو کھلا دیں گے۔" اسی نوجوان نے ذرا تیز آواز سے کہا۔

"آپ اس قصے کو اتنا آسان نہ سمجھیں!" ادھیڑ عمر کے ایک مزدور نے کہا۔
"اس قبرستان کو بھول جائیں تو اچھا ہے۔ اب تو یہیں کہیں ان کی قبریں کھود دیتے ہیں۔" یہ کہہ کر وہ بوڑھا اُٹھا۔
"آپ کفن دفن کا انتظام کریں، میں قبرستان تک ہو کر آتا ہوں۔" کہہ کر عباس چلے گئے۔
"اپنے سکون اور اطمینان کے لیے ہو آیئے۔" جوان نے راستہ دیتے ہوئے کہا۔
"خدا کو ماننے والا کافر کیسے ہو سکتا ہے؟" عباس نے سوچا، پھر دل ہی دل میں کہنے لگے۔ "ان کی طرح سوچ نہ رکھنے والا کافر ہوا کیونکہ یہ تو اپنے کو خدا مان بیٹھے ہیں۔"

۱۹

شہناز کے رات دن بہت اچھے نہیں گزر رہے تھے۔ جاسوسی، خدشہ اور حفاظت کے نام پر روزانہ اس کی ڈیوٹی بدل جاتی تھی۔ کبھی رپورٹنگ کا کام دیا جاتا تو کبھی شہر کا صفحہ دیکھنے کا آرڈر آتا، تو کبھی خواتین کا کالم اور اب غمگین خبروں کی اطلاع والا کام سپرد کیا گیا تھا۔

دوپہر سے قبل شہناز کی میز پر کئی لفافے جمع ہو گئے تھے۔ آج کل تعزیتی خبروں کا تانتا بندھ گیا ہے۔ لوگ ایک دوسرے کو فون کرنے سے کترانے لگے ہیں۔ کون جانے اس کے رشتے کا ماموں، چچا، پھوپھا، بھائی کس سیاسی جماعت کا ہو اور آواز ٹیپ ہو جائے، اور بیٹھے بٹھائے نئی مصیبت سر پر آن گرے۔ اس لیے آسان طریقہ یہی ہے کہ اپنے احوال کی اطلاع اخبارات کے ذریعہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں کو دے دی جائے۔

شہناز نے میز سے پہلا لفافہ اُٹھایا۔ کھولتے ہی بڑی سی تصویر گری۔ اس نے چونک کر دیکھا اور اس کے منہ سے نکلا۔ ''ارے، یہ تصویر تو صنوبر کی لگتی ہے!'' بیتابی سے اس نے ساتھ آیا مواد ایک سانس میں ہی پڑھ ڈالا اور تصویر پر نظریں جما دیں۔

''سات سہیلیوں میں سے ایک اور چل بسی۔'' اتنا کہہ کر شہناز اپنی جگہ سے اُٹھی اور باتھ روم میں جا کر اپنا چہرہ ٹھنڈے پانی سے دھونے لگی۔ اس کی بھیگی آنکھیں کسی نے دیکھ لیں تو فوراً چہ میگوئیاں شروع ہو جائیں گی۔ بات کا بتنگڑ بننے میں دیر نہیں لگے گی۔ صنوبر اس کی سہیلی نہ سہی، لیکن اس کی سہیلی کی تو سہیلی تھی۔ اوپر سے اس کا میاں ائیر فورس میں تھا۔ اس جنگ زدہ ایران میں فوجی لوگوں سے اپنا تعلق جتانا بھی ہزار مصیبتوں کو دعوت دینا ہے۔

شہناز جب میز پر واپس آ کر بیٹھی تو اس کا دل و دماغ سنبھل چکا تھا۔ اپنے اندر کی اُتھل پتھل پر قابو پا چکی تھی۔ لاکھ صنوبر پری کی دوست سہی، لیکن وہ بھی تو اس سے گھل مل گئی تھی۔ اب اس تعزیتی خبر کو باقی خبروں کی طرح غیر جانبدار ہو کر لینا ہے۔ اپنا ذہنی توازن برقرار رکھنا ہے۔ اس نے تیزی سے دیگر لفافے کھولنے شروع کر دیے تھے۔

شہناز کا کام روز بہ روز مشکل ہی ہوتا جا رہا تھا۔ اپنی بات سننے والا کوئی باقی نہیں بچا تھا۔ نہ پری، نہ طیبہ، نہ صنوبر، رہی ملیحہ کی بات۔ اس کے گھر جانا آفت کو بلاوا دینا تھا۔ پورے محلے میں یہ مشہور ہے کہ یہ منافقین کا گھر ہے۔ وہاں پر ایک صحافی کا تعلق کیسا؟ اگر دوستی کو اہمیت دیتی ہے تو ماں اور خالہ کا پیٹ کہاں سے بھرے؟ خالہ بھی بیوہ ہو گئی ہیں۔

اخبار کے آفس میں پچھلے دو دنوں سے سب کو سانپ سونگھے ہوئے ہے۔ ان کے ساتھیوں میں سے ایک کو کمیٹی پکڑ کر لے گئی تھی۔ خطا کیا تھی، مانو تو غلطی نہ مانو تو کچھ بھی نہیں۔ ہمیشہ سے غیر ملکی صحافیوں کو تصویریں وغیرہ دی جاتی رہی ہیں۔ کبھی کبھی صحافیوں کو دعوت نامے دے کر بلایا گیا کہ وہ جو تصویر چاہیں منتخب کر سکتے ہیں۔ لیکن محمود پر ستم ٹوٹ پڑا۔ فرنچ صحافی کو دو تصویریں دی تھیں۔ وہ پھانسی پر لٹکائے گئے لوگوں کی تھیں۔ بس یہی بحث کا موضوع تھا۔ اس صحافی نے اس تصویر کا جو استعمال کیا اس

سے ہنگامہ کھڑا ہوگیا۔ حکومت کی بدنامی ہوئی۔ پورا غصہ محمود پر اُترا۔ کچھ ساتھیوں کا کہنا ہے، وہ اتنی جلدی نہیں چھوٹے گا۔ تمام پرانے ایرانی صحافی ایران سے بھاگ کر غیرممالک میں بس گئے۔ جو ہیں، وہ سب نئے ہیں یا پھر مجبوری کے سبب صحافی بنے ہیں۔ ڈاکٹری، انجینئرنگ کی پڑھائی درمیان میں چھوڑ کر انقلاب کے شروع میں خوشی خوشی ملک لوٹے کہ آزادی کا سورج چمکتا دیکھ کر آتے ہیں۔ کچھ دن بعد ہی معلوم ہوگیا کہ وہ تو قید ہوگئے ہیں۔ باہر جانے کا راستہ ہی بند ہوگیا ہے۔ کرتے کیا؟ کسی نے پھلوں کی، کسی نے کیسٹ، ٹیپ کی، اور کسی نے رومال، کلپ کی دُکان کھول لی۔ انہی لوگوں میں محمود بھی تھا۔ امریکہ میں ڈاکٹری پڑھ رہا تھا۔ انگلش اچھی تھی۔ غیرملکی صحافیوں کے ساتھ گائڈ کا کام کرنے لگا۔

''قم جانا ہے، بھول گئی؟'' فریدہ نے کہا۔

''کس لیے؟'' احمد نے پوچھا۔

''آیت اللہ موتنظری کا انٹرویو لینا ہے۔''

''کوئی خاص موقع ہے؟''

''اگلے ہفتے 'اتحادی ہفتہ' ہے۔ سنّی۔ شیعہ کے آپسی اتحاد کا۔'' فریدہ نے کہا۔

''چلو، میں تیار ہوں۔'' شہناز نے کہا۔

''کب تک لوٹنا ہوگا تم لوگوں کا؟''

''شام تک پہنچیں گے قم، رات کو آٹھ بجے ملاقات کا وقت ہے۔ وہیں رات بسر کرکے صبح چلیں گے۔ یہاں تقریباً بارہ بجے تک پہنچ جائیں گے۔'' فریدہ نے کہا۔

چپراسی نے آکر بتایا کہ فریدہ کو مدیر صاحب بلا رہے ہیں۔ بات کا سلسلہ درمیان میں ہی چھوٹ گیا اور وہ تھیلا کرسی پر رکھ کر طالبی آقا کے کمرے کی طرف بڑھی۔

''بیٹھیے! قم کب جارہی ہیں؟''

''آج، ابھی، میں اور شہناز جارہے تھے۔''

''آپ رُک جائیں، شہناز اور ضمیر کو بھیج دیں۔ آپ سے مجھے کام ہے۔''

''بہت اچھا!'' کہہ کر فریدہ گھبرائی سی باہر نکلی۔

''میں اب نہیں جارہی ہوں، شہناز! تمہارے ساتھ ضمیر جائے گا۔ میں اُسے بتا کر آتی ہوں۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟ پھر میں بھی نہیں جاتی ہوں۔'' شہناز نے کہا اور دھم سے کرسی پر بیٹھ گئی۔

''جانا تو پڑے گا تمہیں۔ پسند ہو یا نہ ہو، نوکری کی یہی بات تو یاد دلاتی ہے کہ ہم کسی کے نوکر ہیں۔'' فریدہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ضمیر کو تم جانتی تو ہو؟'' شہناز نے کہا۔

''ارے ٹھیک ہے، ہر طرح کے لوگوں سے نبھانا سیکھو۔ ضمیر تو پھر بھی اچھا ہے۔ طاہر کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' فریدہ بولی اور آگے بڑھ گئی۔ تھوڑی دیر میں لوٹی تو اس کے ساتھ ضمیر بھی تھا۔

''آپ تیار ہیں؟ چلئے! میں حاضر ہوں چلنے کے لیے۔'' ضمیر نے کہا۔ اس کے بولنے کے انداز اور بات کرنے کے طریقے سے شہناز کو بہت چڑھ تھی۔

''چلئے۔'' شہناز نے مردہ سی آواز میں کہا۔

دونوں لفٹ سے گراؤنڈ فلور پر پہنچے، ڈیوٹی کارڈ باکس میں ڈال کر وہ باہر آئے۔ ضمیر نے کار کا دروازہ کھولا۔

''آپ کو کار کے طویل سفر سے پریشانی تو نہیں ہوتی ہے؟'' ضمیر نے پوچھا۔

''سر میں درد ہوجاتا ہے۔'' شہناز نے بہانہ کیا۔

''یہ تو بڑی تکلیف دہ بات ہے۔'' ضمیر نے کہا اور کار اسٹارٹ کی، تبھی دفتر کا چپراسی ہاتھ ہلاتا بھاگتا ہوا آیا۔

''طالبی آقا بلا رہے ہیں آپ دونوں کو!'' وہ پھولتی سانسوں کو قابو میں کرتے ہوئے بولا۔

''اچھا!'' ضمیر نے تعجب سے کہا۔

دونوں خاموشی سے کار سے اترے، پھر لفٹ کے قریب جا کر کھڑے ہوگئے۔ دونوں کے چہروں پر سوالیہ نشان تھا۔ لفٹ آئی، اس پر سوار ہوکر چوتھے فلور پر پہنچے۔ انہیں

دیکھتے ہی چپراسی نے مدیر طالبی آقا کے کیبن کا دروازہ کھولا۔ وہ دونوں اندر داخل ہوئے۔

''بیٹھیے!'' طالبی آقا نے کہا۔

''شکریہ!'' دونوں تھوڑا گھبرائے سہمے سے بیٹھ گئے۔

''آپ دونوں ساتھ جا رہے تھے؟'' طالبی نے دونوں کو گھورا۔

''جی۔''

''شاہ کا دَور سمجھا ہے؟ رات کا سفر اور لڑکے لڑکی کا ساتھ...... یہ اسلامی جمہوری ملک ہے، مذاق نہیں!'' طالبی نے ہاتھ میں پکڑی کتاب زور سے میز پر پٹکتے ہوئے کہا۔

''جناب! فریدہ نے مجھے اپنی جگہ جانے کو کہا تھا۔'' ضمیر نے صفائی پیش کی۔

''لیکن مجھے یہ تو بتانا چاہیے تھا کہ وہ دو کون صحافی ہیں جو قم جا رہے ہیں! مجھے تو ابھی رحیم نے بتایا۔ کمال کے ہیں آپ لوگ! جائیے، جا کر سلیم سے بات کریں۔ شہناز کی جگہ پر سلیم کو لے جائیے۔'' طالبی آقا نے بُرا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ان کی اس بات سے شہناز کا چہرہ خوشی سے کھل اُٹھا۔

''تم کہاں جا رہی ہو! بیٹھو، مجھے تم سے کچھ کام ہے۔'' طالبی نے جاتی ہوئی شہناز کو روکا۔ شہناز پھر کرسی پر بیٹھ گئی۔

''تمہیں میں تمہارے علاقے میں بھیجنا چاہتا ہوں۔ مہا آباد پر اسٹوری کرنی ہے، لیکن یہ بھول کر کہ تم کُرد ہو۔ جو سچ ہو وہی لکھنا! سچا صحافی اپنا بھی سگا نہیں ہوتا ہے، سمجھیں!''

''جی، کب جانا ہوگا؟'' شہناز نے پوچھا۔

''بس یہی ایک ہفتے میں...... تیاری کر لو۔ جانے سے پہلے مجھ سے مل لینا۔''

''جی۔''

''اب جاؤ، فریدہ کو بھیج دینا۔''

''جی۔'' شہناز باہر نکلی۔ فریدہ کچھ لکھنے میں مشغول تھی۔

''سنو فریدہ، تمہیں طالبی آقا یاد کر رہے ہیں۔'' شہناز نے مسکراہٹ دبائی۔

''لگتا ہے، آج پھر بلڈ پریشر ہائی ہے ان کا۔'' فریدہ نے کاغذ سمیٹتے ہوئے کہا۔

''میں تو چائے پینے جا رہی ہوں، چل رہی ہو؟'' شہناز نے شبنم سے پوچھا۔

''چلتی ہوں۔'' شبنم بولی اور کاغذ سمیٹ کر ڈیسک میں رکھنے لگی۔

تبھی اذان کی آواز گونج اٹھی۔ تمام لوگوں نے سر اُٹھا کر ایک دُوسرے کی طرف دیکھا، پھر خاموشی سے اُٹھ کر نماز والے ہال میں اکٹھا ہونے لگے۔ نماز شروع ہوگئی۔ پورا دفتر اس وقت نماز پڑھ رہا تھا۔ نماز کے بعد نعرے لگے۔

روس پر لعنت

امریکا پر لعنت

امام کے دشمنوں پر لعنت

زندہ باد اسلامی انقلاب!

شہناز خاموش بیٹھی سوچ رہی تھی کہ کردستان کی تحریک شاہ کے وقت سے ہے۔ اس کی مذمت مناسب ہے کہ اس نے کردوں کی اپنی حکومت کی منظوری نہ دی، لیکن موجودہ حکومت کی ڈفلی بجانا کہاں کی عقلمندی ہوگی۔ اس نے بھی تو کردوں کے ساتھ وہی سب کیا، لیکن یہ سب کھل کر لکھتی ہے، تو نوکری جاتی ہے۔ سرکاری زبان میں پبلسٹی کرتی ہے تو اپنے لوگوں سے، اپنی زمین سے ناتہ ٹوٹتا ہے۔

''تمہارا دل بہت گھبرا رہا ہے تو کہیں گھوم کر آتے ہیں۔ انگلینڈ، جرمنی، اٹلی جہاں کہو۔'' خالد نے پری کے اُداس چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ان ملکوں میں مجھے کیا اپنا پن مل جائے گا! جیسے یہاں، ویسے وہاں... ہر ملک میں کچھ تاریخی عمارتیں اور کھنڈر، کچھ پرانی پینٹنگس اور مورتیاں۔ چمچماتے بازار، جن میں سجی چیزیں کہیں مہنگی، کہیں سستی نظر آئیں گی۔ کیا ہوگا وہاں نیا! راستے میں ہوٹلوں میں بیٹھے چلتے پھرتے سفید چہرے، جن کی زبان ہماری سمجھ میں آتی ہے اور نہ ان کا برتاؤ ماما!'' پری نے تھکے ہوئے لہجے میں کہا۔

''پھر کیا کروں میں، جو تمہاری اُداسی دُور کرسکوں...... تمہارے دماغ میں ہے ایسی کوئی ترکیب جس سے تمہاری یہ اداسی، یہ سُستی ٹوٹ جائے؟'' خالد نے پوچھا۔

''بس، اب دل اپنے ایران کے لیے تڑپ رہا ہے۔ چھتوں پر جاڑے کی دھوپ میں پھیلی ٹماٹر کے رس کی چٹنی کی سینی، گاجر اور کھیرے کے اچار، سنترے، انجیر کے مربے کے مرتبان، سکا خانہ، مشہد کا حرم، شاہ چراغ مجھے جانے کیوں مجھے آواز دے رہے ہیں۔ البرز کا ٹھنڈا پانی، پھلوں سے لدے درخت، سڑک گھر، آنگن...... سب یاد آرہا ہے، اب میں یہاں گھٹ رہی ہوں۔ اتنا سلیقہ، جو یہاں نظر آتا ہے، مجھے تھکا رہا ہے... مجھ سے اب یہ بیگانہ پن برداشت نہیں ہوتا ہے... ایک دم برداشت نہیں ہوتا ہے۔'' اتنا کہہ کر پری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ خالد خاموش کھڑا رہا، پھر کچھ سوچ کر، دُوسرے کمرے میں جا کر، فون پر پری کی بہن روحی کا نمبر ملانے لگا۔ فون پر بات ختم کر کے دوبارہ پری کے قریب آ کر کھڑا ہو گیا۔ کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھا۔

''اپنے کو سنبھالو، پری!''

''یہ ملک ہے یا جہنم! کہاں آ کر پھانسی پر چڑھی ہوں... چاروں طرف سے ڈستا اکیلا پن... ہم نے کون سا ایسا گناہ کیا ہے، جس کی اتنی بڑی سزا ہمیں ملی ہے۔ غریب الوطنی کیا ہوتی ہے، اس کا دکھ بیان کیا جا سکتا ہے تم کہتے ہو، میں اپنے کو سنبھالوں... میں خود کو سنبھالنے کی کوشش میں ٹوٹتی بکھرتی جا رہی ہوں۔ پل پل کی موت سے تو اچھا تھا کہ ہم وہیں ختم ہو جاتے... پھانسی پر چڑھا دیے جاتے... وہاں لوگ روز مر رہے ہیں... ہم بھی سہی، کم سے کم بہشتِ زہرہ کے ایک کونے میں سکون سے آنکھیں بند کیے دفن پڑے تو رہتے... مجھ سے اب شہر نہیں سہا جاتا ہے۔'' پری نے کسی ضدی بچے کی طرح روتے ہوئے کہا۔

دروازے کی گھنٹی بجی۔ خالد نے دروازہ کھولا۔ سامنے پری کی بہن اور بہنوئی کھڑے تھے۔ خالد نے ان کو خوش آمدید کہا پھر ٹھہر کر کہنے لگا۔ ''باہر چلنے کا موڈ ہو تو کسی پارک میں گھوم کر آتے ہیں۔ پری کا موڈ بھی بدل جائے گا۔''

''گھومنے کے نام سے جانے کیوں مجھے چڑھ ہو گئی ہے۔'' پری نے تڑپ کر کہا۔

''گھر پر بیٹھ کر ہی گپ مارتے ہیں۔'' کہہ کر خالد پیگ بنانے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا، پری پچھلے ایک سال میں کتنی بدل گئی ہے، کتنی چڑچڑی ہوتی جا رہی ہے۔

''ایران لوٹنے کی اُمید تو ہم بھی چھوڑ بیٹھے ہیں۔'' پری کے بہنوئی نے کہا۔
''ایسا بھی نہیں کہ آدمی اُمید ہی چھوڑ دے۔ وقت بدلے گا۔'' خالد بولا۔
''سفید روسی، اکتوبر کے انقلاب کے وقت سے بھاگے آج بھی پیرس میں اس اُمید کے ساتھ رہ رہے ہیں کہ کل مونارکی لوٹے گی تب وہ روس لوٹیں گے اپنے پیارے ملک کو۔ پیرس میں پورا محلہ سفید روسی لوگوں کا بسا ہوا ہے۔ ویتنامیوں کو دیکھو... وہ بھی بھاگ کر آئے تھے اس جنگ اور جدوجہد سے کہ ایک دن لوٹیں گے، لیکن یہاں وہ بھی رچ بس گئے ہیں۔ سسلی والوں کا وہی حال ہے۔ وہی کمپوچیا کا ہے۔ سیکس شاپ کن کی ہے! انہی کمپوچیا اور چینی لوگوں کی ہے۔ کمپوچیا میں بھوک اور غریبی سے ہڈی اور کھال ایک ہو رہی ہے۔ یہاں سیکس شاپ میں جسم کے کچے گوشت سے کمائی ہو رہی ہے۔ ہڈی چمڑے کی تجارت... کون لوٹا ہے ایک بار پیرس آ کر اپنے ملک؟'' روحی کے شوہر نے کہا۔
''تم تو بہت نا اُمید ہو، لیکن مجھے یقین ہے، وقت بدلے گا، اتنا ظلم بہت طویل وقت تک جاری نہیں رہتا ہے، ہٹلر کیا قیامت تک زندہ رہا؟''
''ہم تو زندہ نہیں رہیں گے کہ کل اپنے ملک کی خوشحالی دیکھ سکیں۔ امام خمینی اب مرے یا سال بھر بعد، سوال یہ ہے جو اس کے ہاتھوں مارے جا چکے ہیں کل کیا وہ زندہ ہو پائیں گے؟ بہشت زہرہ کی ساری بنی نئی قبریں کس کا گریبان پکڑ کر سوال کریں گی؟ ہم آج یہاں بھٹک رہے ہیں، کس کا دامن پکڑے ہوئے ہیں؟ جو آئے گا نئی حکومت لے کر کیا وہ پرانی حکومت کے لوگوں کی درگتی نہیں بنائے گا؟ انہیں چھوڑ دے گا؟ مجھے تو نا اُمیدی ہی نا اُمیدی نظر آتی ہے۔ جو ایرانی یہاں ہیں، وہ سمجھو دُوسرے انقلاب زدہ ملکوں سے بھاگے ہوئے لوگوں کی طرح اسی ملک میں بس جائیں گے کل کے انتظار میں۔ اس کل کے انتظار میں جو کبھی نہیں آئے گا۔'' روحی کے شوہر نے تلخ قہقہہ لگایا۔
''دوست، تمہیں اور تمہاری بیوی کو میں نے بلایا تھا کہ پری غمگین ہے۔ آ کر دل بہلاؤ، اسے سمجھاؤ اور تم ہو کہ اُلٹا اس کا غم اپنی خطرناک باتوں سے خوف میں بدل رہے ہو۔'' خالد نے برا مانتے ہوئے کہا۔

''پری بچی نہیں ہے جو ٹافی دینے سے بہل جائے گی۔ جب آنے والے خراب دنوں کے بارے میں انسان سوچتا ہے تو اسے حال خواہ کیسا بھی برا ہو، اچھا لگنے لگتا ہے۔ ایران میں کل ہی سولہ لوگ پھانسی پر چڑھائے گئے ہیں۔ ان میں چھ لڑکیاں تھیں۔ جس ایران میں پھانسی لوگوں کی تقدیر بن جائے اس ایران میں لوٹنے کا تصور بھی پری نہیں کر سکتی۔ پری اس ایران کے بارے میں سوچ کر اداس ہے، جو اَب برائے نام ایران رہ گیا ہے۔ روح غائب ہے۔ مردہ جسم پر سو دُرّے لگائے جا رہے ہیں۔ وہ کھویا ہوا ایران پری کا غم ہے، جو ہم تم اور تمام ایرانی ڈھونڈ رہے ہیں۔'' روحی کا شوہر محتاط لیکن اُونچی آواز میں بولا۔

''اب تم فلسفہ جھاڑنے لگے، پہلے ایران میں ہر دوسرا آدمی شاعر ہوتا تھا اور اب ہر دوسرا ایرانی مرثیہ گو ہو گیا ہے۔'' خالد اُلجھ پڑا۔

''تم ٹھہرے تاجر! جذبات اور فلسفہ کا مذاق اُڑا سکتے ہو۔''

''مذاق اُڑاتا ہوں، لیکن سفید کالر کہے جانے والوں کی طرح حیوانی سلوک نہیں کرتا ہوں۔ کسی فلسفے، کسی جذبات کی آڑ لے کر دوسروں کی زندگی جہنم نہیں بناتا ہوں، جیسا کہ آپ کے ایران میں ہو رہا ہے۔ جو ہم تاجروں کا برتاؤ ہوتا ہے، ڈنکے کی چوٹ پر ہوتا ہے۔ نہ امام اور عبا قبا کی اسے ضرورت پڑتی ہے، نہ خوبصورت معنی خیز دقیق خم دار زبان اور الفاظ کی۔''

''آپ لوگ بھی کس بحث میں پڑ گئے! چلو پری، ہم کوئی اچھا سا پروگرام بنائیں۔'' روحی نے اُکتا کر کہا۔

''میں ناشتے کا سامان نکالتی ہوں۔ کل میں نے پنجرے بنائے تھے۔ چائے لیں گے آپ لوگ یا ترکی قہوہ؟'' پری نے صوفے سے اُٹھتے ہوئے پوچھا۔

''ترکی قہوہ۔''

''آج قہوے کا فال دیکھیں گے۔''

''دیکھا جائے گا۔''

''کل کردیوں کا جشن تھا، گئے تھے؟''

''نہیں میٹرو اسٹرائک، ٹیکسی مل نہیں رہی تھی۔ بہت کم لوگ گئے تھے۔ میں تو آفس سے ہی دیر سے نکلا تھا، مگر سنا یہی ہے کہ بھیڑ زیادہ نہیں تھی۔''

''لوموند اخبار نے تو بہت بڑا کوریج دیا ہے۔''

''صحافی تو کافی آئے ہوں گے۔''

''جو کام دانشوران نہ کر سکے وہ کر رہا ہے کردی کلچرل ہاؤس۔ فرنچ شاعر، مصنف سب ان کی جدوجہد میں ہاتھ بٹا رہے ہیں، جبکہ یہاں پر بنی مصنّفین کی تنظیم کا کوئی تعلق فرنچ کی مصنّفین تنظیم سے نہیں بن پایا ہے۔ اور تو اور، فرنچ ڈاکٹر خود ہی کردستان جا کر زخمیوں کی دیکھ بھال کر کے لوٹ آتے ہیں۔ اسے ہی کہتے ہیں دل کا سکون۔''

''اس کی وجہ ہے۔''

''وہ کیا؟''

سوشلسٹ حکومت کمیونسٹوں کو بہت بڑھاوا تو نہیں دیتی ہے نا ایرانی مصنّفین تنظیم ابھی اس طرح بنی نہیں ہے، اگر بن بھی گئی تو بس یوں ہی پھس پھسی رہے گی۔ پھر اس میں ہیں ہی کتنے مصنف؟''

''جو ہیں، وہ ناامید لگتے ہیں۔ پیتے ہیں اور بحث کرتے ہیں۔ اس سے تو اچھے یہ ایران میں ہی تھے۔''

''جان سب کو پیاری ہوتی۔''

''انقلابی بننے کو کس نے کہا تھا، جب جان پیاری ہوتی ہے!''

''ہر انقلابی کی اپنی قوت برداشت ہوتی ہے۔''

''میں تو ان دانشوران کو، جو شاہ اور خمینی مخالف ہیں، بس جلی ہوئی پھلجھڑی سمجھتا ہوں۔ یہاں پیرس میں کون آ کر انقلاب کرے گا! پاس میں پیسہ نہیں ہے، رہنے اور روٹی کی جدوجہد ہی اس پیرس شہر میں دانشوروں کی کمر توڑے ہوئے ہے۔ اسی سے اچھی طرح نبٹ لیں تو غنیمت ہے۔''

''یوں انہیں حقیر مت بناؤ۔''

''وہ خود بن رہے ہیں، میں کہاں بنا رہا ہوں! جو ایسے نہیں ہیں میں ان کا ذکر

عزت اور احترام سے کرتا ہوں۔"

''ایک درجن مصنف تو پگال کے گلی کوچوں میں رہ رہے ہیں اور تنگ حالی کے باوجود قلم تو چلا رہے ہیں نا؟''

''اور وہ جو شام ہوتے ہی ریسٹورنٹ میں بیٹھ کر شراب پیتے ہیں اس کا بل؟''

''ایسے ناامید بہت کم ہیں ان کی بھی مجبوری سمجھو۔''

''ہیں تو نا......''

''ہیں کیوں نہیں، آٹے میں نمک کی برابر۔''

''نمک آٹے کو نمکین تو بنا ہی دیتا ہے، خواہ چٹکی بھر ہی کیوں نہ ہو۔''

''خیر چھوڑو۔''

''نیا موضوع چھیڑتے ہیں۔''

''ان ایرانی لڑکوں کا کیا ہوا جو ترکی میں پکڑے گئے ہیں؟''

''لگتا ہے، تودہ پارٹی کے ہیں۔ ترکی حکومت سب کو ایرانی حکومت کو لوٹانے والی ہے۔''

''سیدھے پھانسی پر لٹکیں گے اگر واپس گئے۔''

''تودہ پارٹی کے صدر قیانوری کی خبر صحیح ہے کہ وہ شوٹ کر دیے گئے ہیں؟''

''معلوم نہیں! یہ بھی ہوسکتا ہے کہ افواہ کی آڑ میں وہ سوویت یونین با حفاظت پہنچا دیے گئے ہوں۔''

''خاندانی لڑائی ہے۔ کہاں تو اسلامی جمہوریت اور تودہ پارٹی میں دانت کاٹی روٹی تھی کہ ان کے ایک اشارے پر مجاہدین فدائی خلق، پیکاری اور راہ کارگر بائیں بازو والے گروہ کے لوگ موت کے گھاٹ اُتارے جاتے تھے۔ اب یہ ہے کہ خود وہ پھانسی پر چڑھا دیے جائیں گے۔''

''دیکھتے جاؤ، آگے آگے کیا ہوتا ہے۔ اور یہ بھی مت بھولو کہ قیانوری امام کے رشتہ دار ہیں اور اتنے بڑے انقلاب میں عوام شہید ہو رہی ہے، لیکن ابھی تک کسی مولوی ملا کا بیٹا شہید نہیں ہوا ہے۔''

''بات تو کھری کہی ہے تم نے۔''

''یہی نہیں، ان رہبروں نے عام انسانوں کے آپسی تعلق ختم ہی نہیں کیے ہیں بلکہ زہر آلودہ کر دیے ہیں۔ بھائی بھائی لڑ رہے ہیں۔ ماں بیٹے میں نظریاتی پھوٹ پڑ چکی ہے۔ میاں، بیوی کے دل پھٹ چکے ہیں۔ ایک گھر کے چار افراد، چار سیاسی نظریہ کے حامی ہیں۔''

''یا خدا، کس گناہ کی سزا دے رہا ہے ہمیں!''

''ہم تو تماش بین ہیں۔ بین کوئی بجا رہا ہے، ناچ کوئی رہا ہے، تماشا ہم تم دیکھ رہے ہیں۔''

''قہوہ تیار ہے، آپ لوگ ادھر آجائیں۔''

''چلو، اُدھر میز پر چلتے ہیں۔''

''چلو!''

''اِٹلی اور جرمنی میں دو تین ایرانی لڑکیاں پکڑی گئی ہیں۔''

''وہ کیوں؟''

''لائسنس نہیں تھا، پولس نے پکڑ لیا۔ یہ ایرانی عورتوں کا مستقبل ہو گیا ہے۔''

''ادھر وہ امام خمینی گناہ کو جڑ سے اُکھاڑ کر ایران کو پاک کرنا چاہتے ہیں۔ دروازے کزوین کی تمام طوائفوں کو شوٹ کر دیا تھا، انہیں جا کر کوئی یہ باتیں بتائے۔''

''فلم گاندھی چل رہی ہے، پری کا موڈ ہو تو چلیں۔''

''چلتے ہیں۔ میں بچوں کو دکھانا چاہ رہی تھی۔ پتہ نہیں ٹکٹ بھی ملے گا یا نہیں؟''

''میں ابھی چلا جاتا ہوں، بکنگ کرا کر لوٹتا ہوں۔ قہوہ آ کر پیوں گا۔''

''ٹھہرو تو، میں بھی چلتا ہوں۔''

''تم اپنی سالی سے باتیں کرو، میں ابھی دو سیکنڈ میں آتا ہوں۔''

خالد کے جانے کے بعد دونوں بہنیں باتوں میں ڈوب گئیں۔ اچانک گھنٹی بجی۔ ڈاکیہ تھا۔ پری نے ڈاک اُٹھائی۔ تحریر جانی پہچانی لگی۔ بے چینی سے خط کھولا۔ مہناز کا خط تھا۔ وہ اگلے ہفتے آ رہی ہے۔ پری کی خوشی کا ٹھکانہ نہ رہا۔ ایک

سانس میں پورا خط پڑھ گئی۔

''کیا بات ہے پری؟'' بہن نے پوچھا۔

''مہناز آرہی ہے۔''

''یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔''

تبھی فون کی گھنٹی بج اُٹھی۔ پری نے ریسیور اُٹھایا۔ ''ہیلو!''

''ٹکٹ مل گئے ہیں، تم لوگ آجاؤ۔ وقت کم ہے۔''

سب لوگ جلدی سے ناشتہ ختم کر کے کار میں جاکر بیٹھ گئے۔ کار سبز اور گھنے درختوں کے سائے کے نیچے سے اور دریائے سین کے قریب سے ہوکر گزر رہی تھی۔ ایفل ٹاور کے پیچھے سے سرمئی بادلوں کی گھٹا تیزی سے آگے بڑھ رہی تھی۔

''ہمارے پاس اگر گاندھی جیسا ایک بھی رہبر ہوتا تو آج ایرانی قوم کی یہ حالت نہ ہوتی۔''

''کہتی تو پری تم ٹھیک ہو۔ ہم ایرانیوں میں فی الحال دوسروں کے لیے قوتِ برداشت صرف نام کی رہ گئی ہے۔ ویسے تمام گروہ ایران کے تئیں عقیدت مند ہیں، محبِ وطن ہیں، جان دینے میں آگے...لیکن...''

''خالد سامنے ہی کھڑے ہیں۔''

''تم لوگوں کو یہیں اُتار دیتا ہوں پھر کار پارک کر کے آتا ہوں۔''

فلم ختم ہونے کے بعد دونوں بہنوں کی آنکھیں نم تھیں۔ دونوں مردوں کے چہرے پر عجیب تاثر تھے۔ چاروں بچے گاندھی سے بہت متاثر لگ رہے تھے۔ کار میں سب بیٹھ گئے۔ پری نے خاموشی توڑی۔

''کاش! ہمیں اتحاد کے دھاگے میں باندھنے والا آجائے۔''

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ بارش شروع ہوگئی تھی۔ شانجالزا پر گھومتے لوگ پناہ لینے دُکانوں میں تیزی سے گھس رہے تھے۔ ایفل ٹاور بارش کی جھڑی میں ڈوبا دھندلا سا خواب نظر آرہا تھا۔

لوور میوزیم کے سامنے صبح سے جمشید اپنی تصویریں لگائے سیڑھیوں پر بیٹھا تھا۔ آتے جاتے چہروں کو دیکھتے دیکھتے جب وہ تھک گیا تو جیب سے سگریٹ نکال کر سلگائی اور سامنے میدان میں جا کر پیڑ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا۔

جوان لڑکیوں اور لڑکوں کا جتھہ آیا۔ سیڑھیوں پر چڑھتے ہوئے اس کی پینٹنگس کے پاس رکا۔ دو لمحے رُک کر دیکھا۔ پھر ایک دُوسرے کو دھکا دیتا ہنستا ہوا میوزیم کے دروازے میں گھسنے لگا۔ جمشید کی آنکھوں میں لحہ بھر کے لیے اُمید کی شمع روشن ہوتی، پھر راکھ کے ڈھیر میں تبدیل ہو جاتی۔ اس نے سگریٹ کا لمبا کش کھینچا۔

آٹھ سال گزر گئے ہیں اس بات کو جب وہ پیرس آیا تھا۔ سب ملا کر وہ دس لوگ تھے۔ پانچ لڑکے اور پانچ لڑکیاں۔ ساتھ میں ٹینٹ اور پکنک کا پورا سامان تھا۔ پورا پیرس گھومے تھے۔ جہاں دل چاہتا خیمہ گاڑ کر خانہ بدوش بن جاتے تھے۔ سمندر کے کنارے، بڑے بڑے ہوٹلوں، کیبروں، جوا خانوں سب کی سیر کی تھی۔ جیبیں ماں باپ کے دیے پیسوں سے بھری تھیں۔ ایک دو ساتھی غریب تھے، جیسے صمد، بہروز۔ ان کا خرچ دوسروں نے اُٹھایا تھا۔ آج صمد اور بہروز جیل میں ہیں۔ شہلا اور نرگس شوٹ کر دی گئی ہیں۔ یاسمین یہیں پیرس میں ہے، اسی کی طرح صبح سے شام تک کام کے لیے دھکے کھاتی ہے۔ نجمہ امریکہ میں شوہر کے ساتھ مست ہے۔ فروغ نے خودکشی کر لی تھی۔ وجہ... وہ وجہ نہیں جانتا ہے۔ شہاب اور محراب کہاں ہیں، کچھ پتہ نہیں۔ سب ساتھ بھاگے تھے۔ تقریباً چالیس لڑکے تھے، لیکن جانے سب کہاں کھو گئے؟ یاسمین کے علاوہ اسے کسی ساتھی کا پتہ نہیں۔ سگریٹ ختم ہو گئی تھی۔ وہ اپنی پہلی جگہ پر لوٹ آیا۔ ایک بوڑھی عورت اس کی پینٹنگس دیکھ رہی تھی، اس نے بڑی اُمید سے پوچھا۔

"کیسی ہے، میڈم، پینٹنگ؟"

''تم ایرانی ہو؟''

''ہاں، میڈم!''

''یہ تخت جمشید میں خواجو دیکھ کر میں رُک گئی۔'' ایرانی تاریخی کھنڈروں کو رنگوں میں اُبھرتا دیکھتے ہوئے اس عور... نے کہا۔

''میرا نام بھی جمشید ہے۔''

''اوہ! میں ایران میں تقریباً دس سال رہی ہوں۔ پورا ایران گھوما ہے میں نے، پورا... میرا... خیر چھوڑو۔ سب کچھ گزر گیا... کتنی قیمت... پچاس فرانک، سو فرانک... بہت سستی قیمت رکھی ہے ان کی؟''

''یہ بھی صبح سے بک نہیں رہی ہے۔ پانچ دن سے روز آ کر قسمت آزماتا ہوں۔''

''پوور چائلڈ! میں تینوں خریدوں گی، لیکن اتنی کم قیمت پر نہیں۔ ایران میں جو بھی ہو رہا ہے مجھ سے اس کا کوئی تعلق نہیں، لیکن تصویروں میں بنی ان جگہوں سے میرا بہت گہرا جذباتی تعلق ہے۔ ان کی قیمت میری نظروں میں بہت ہے...'' پرس کھول کر اس نے ایک بڑا نوٹ نکالا۔

''جی!'' جمشید کے منہ سے نکلا

''رکھو مائی چائلڈ! اگر اصغر کو بے وقت موت کا اژدہا نگل نہ جاتا تو آج میرا بیٹا تمہارے برابر ہوتا۔ میں سال میں دو تین مرتبہ لوور میوزیم صرف ایران کو جینے آتی ہوں۔ اس کے آرٹ میں، اس کے فن میں زندگی پاتی ہوں۔ لیکن اس سال جب بھی انگلینڈ سے پیرس آئی، لوور کا ایرانی حصہ بند رہا۔ آج مجھے دکھ نہیں ہے، یہ تینوں پینٹنگیں میرے پاس ہمیشہ رہیں گی۔'' بوڑھی عورت کی باتیں جمشید کے دل پر لگیں۔

''میں پینٹنگس پیک کر دیتا ہوں۔''

''انہیں میری ٹیکسی تک پہنچا دو، مائی چائلڈ جمشید دی گریٹ۔''

''آپ اندر سے جب نکلیں گی میں یہیں پر آپ کو کھڑا ملوں گا۔''

''اب، آج کہیں نہیں جاؤں گی، چلو مائی ڈیئر چائلڈ۔'' اتنا کہہ کر وہ آگے بڑھی۔ جمشید ہاتھ میں تینوں پینٹنگیں لے کر پیچھے چل رہا تھا۔ گیٹ سے نکل کر جب وہ

باہر جارہا تھا تو سامنے سے اسے یاسمین آتی دکھائی دی۔ بوڑھی انگریز خاتون کو ٹیکسی میں بٹھا کر وہ یاسمین کی طرف لپکا۔ وہ اپنی دھن میں سر اٹھائے لوور کے دروازے میں داخل ہورہی تھی۔ پیچھے سے جمشید نے آواز دی۔ ''یاسمین!''

''جمشید! کہاں سے آرہے ہو؟''

''انگریز خانم کو ٹیکسی پر بٹھانے گیا تھا...تم سناؤ کیا ہوا؟''

''چلو! وہیں سیڑھی پر بیٹھتے ہیں، پھر کچھ بتاؤں گی... سگریٹ ہوگی تمہارے پاس......؟'' یاسمین نے تھکن سے چور الفاظ میں کہا۔

''نہیں! سامنے سے خریدتا ہوں۔''

''نہیں! بے کار میں پیسے ضائع مت کرو۔''

''آج تو خرچ کرنے دو، تین پینٹنگس ایک ساتھ فروخت ہوئی ہیں اور چھ کی قیمت ملی ہے۔'' نوٹ دکھاتے ہوئے جمشید بولا۔

''سچ! مبارک ہو!''

''شکریہ! چلو، کہیں بیٹھ کر کچھ کھاتے ہیں۔''

''چلو!''

''آج میں وہ فرنچ کھانا کھاؤں گا جو فرانس کے حاکم لوئی فورتھ کھاتا تھا۔ چکن وتھ کریم اور پنیر شکر کے ساتھ، شیمپین اور کھانے سے پہلے رشن سلاد لوں گا، تم بتاؤ کیا لوگی؟''

''بس، سلاد لوں گی۔''

''بھلا کیوں؟''

''کھانا کھا کر آئی ہوں۔''

''گیارہ بج رہے ہیں، کھانا کہاں سے کھالیا! تمہیں پیسوں کی فکر ہی رہتی ہے۔''

''نہیں، جمشید، میں نے...''

''خاموش! تم بھی آج لوئی فورتھ کی یاد میں اس کا سب سے پسندیدہ کھانا کھاؤ گی۔'' کہہ کر اس نے ویٹر کو آڈر دے دیا۔

''اب اپنی سناؤ، تمہارے کام کا کیا ہوا؟'' شیمپین گلاس میں ڈالتے ہوئے جمشید

نے یاسمین سے پوچھا۔

''کچھ نہیں!''

''کیوں؟''

''پہلے جو بات فون پر طے ہوئی تھی اسی بھروسہ پر میں گئی تھی۔ جب دروازہ کھولا اور میرا نام پوچھا، تو میں نے بتا دیا۔ پھر پوچھا کون سے ملک سے آئی ہو؟ میں نے بتایا کہ میں ایرانی ہوں۔ اتنا سنتے ہی وہ دروازہ بند کرنے لگی۔ مجھے ایرانی نوکرانی نہیں چاہیے۔ میں کہتی ہی رہی۔ میں سب کام جانتی ہوں، فون پر بات بھی طے ہوگئی تھی۔ آپ مجھے موقع تو دیں، لیکن بند دروازے کے پیچھے سے کڑک سلواتیں ہی سننے کو مل رہی تھیں۔'' یاسمین کی آنکھوں میں آنسو جمع ہوگئے اور گلا رُندھ گیا تھا۔

''بہت نازک دل ہو۔''

''کتنا ہی سخت دل آدمی کیوں نہ ہو جمشید، وطن کی برائی سننا پسند نہیں کرے گا۔ ایرانی وحشی، جنگلی جانور، کیا کیا وہ کہہ رہی تھی!'' یاسمین نے شمپین کا سِپ لیتے ہوئے کہا۔

''سلاد لو۔'' کہہ کر جمشید نے خالی گلاس پھر بھر دیا۔

''حامد نے کہا تھا کہ وہ شام کو دیر سے لوٹے گا، تم انتظار نہ کرنا۔'' یاسمین بولی۔

''حامد سے ضروری بات کرنی تھی، خیر! اس کے یہاں کوئی کام نہیں ہے۔''

''پوچھا تھا، کہہ رہا تھا کہ صفائی کرنے والوں کی ضرورت تھی، وہاں پر دو الجیریائی آگئے ہیں۔''

''یہاں سے مسعود کے گھر چلتے ہیں۔ اس کی بیوی فرنچ ہے۔ کچھ اس سے کہہ کر دیکھتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے۔''

''تم خوش ہوکر کھاؤ نا! روز 'لوئی فورتھ' ایسا موقع نہیں دیں گے۔''

''کھا تو رہی ہوں۔''

''آج مجھے جانے کیوں پہلی پیرس ٹرپ یاد آگئی۔''

''مجھے کچھ اور...'' کہہ کر یاسمین سرخ ہوگئی۔

"کیا؟"
"کچھ نہیں!"
"پھر بھی۔"
"میں کیا بتاؤں! تمہیں بھی کبھی یاد آئے گا، ورسائل پیلس کے پیچھے والا باغ جہاں ہم گھومنے گئے تھے۔"
"اوہ!" کچھ یاد کر کے جمشید آہستہ آہستہ مسکرانے لگا۔
کھانا کھا کر وہ مسعود کے گھر گئے۔ دونوں گھر پر ہی تھے۔
"کیا پیو گے؟"
"کھا پی کر آرہے ہیں۔ شکریہ! جینی کہاں ہے؟"
"آتی ہوگی، میں نے بتا دیا ہے، جمشید آیا ہے۔"
"کہیں نوکری دلوا پائے گی؟"
"معلوم کرتے ہیں۔ ویسے ساجد کا قصہ پتہ چلا تمہیں؟"
"وہی پیکاری جماعت والا نا؟"
"ہاں ہاں وہی، ساربان یونیورسٹی میں ایم۔ اے کے آخری سال میں تھا۔"
"پھر......؟"
"نوکری کی تلاش میں پریشان تھا، جانے کیسے جینی کو معلوم ہو گیا کہ سیکس شاپ میں سیلس مین کی جگہ خالی ہے۔ اس نے ساجد سے کہا۔ ساجد وہاں لگ گیا۔ دو تین ماہ اچھا چلتا رہا، پھر آہستہ آہستہ بگوا تو ہمیں پتہ نہ چل سکا، اور اب، ... کیا کہا جائے، سدھرنے کی کوئی امید نہیں ہے۔"
سرمایہ دارانہ نظام کتنا بیمار ہے! یہ نظام لوگوں کو کن کن باتوں اور کاموں کی طرف لے جاتا ہے۔ پیسہ، پیسہ، قدم قدم پر اسی کی مانگ۔" جمشید نے کہا۔
"اس نظام میں ہم تم نہیں رہ رہے ہیں کیا؟ یہ کہو کہ وہ خود کمزور دل و دماغ کا مالک تھا۔"
"عمر بھی اس کی ہم سے کم تھی، پھر ہمیں تجربہ بھی نہیں ہے رات دن بلو فلموں اور

سیکسی کتابوں کا۔ کہہ نہیں سکتا کہ مجھ پر ان باتوں کا کیا اثر ہوتا۔ تم شاید خود پر اعتماد رکھتے ہو، لیکن میں... میرے خیال سے آدمی حالات کا شکار ہوتا ہے۔"

"ہیلو!" جین نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"ہیلو جین، یہ یاسمین میری دوست ہے اور یہ جین۔" جمشید نے تعارف کرایا۔

"ہیلو، یاسمین!" جین نے آگے بڑھ کر یاسمین سے ہاتھ ملایا۔

"کون سی موسیقی سنو گے؟" مسعود نے پوچھا۔

"جین سے پوچھو۔" جمشید نے کہا۔

"تم ہمارے مہمان ہو، تم بتاؤ؟"

"کوئی نیا کیسٹ آیا ہے؟"

"ہاں کر دی ہے، لو سنو۔" کہہ کر مسعود دُوسرے کمرے میں چلا گیا۔ جین نے سائڈ بورڈ کھول کر کھانے پینے کے ڈبے نکالے اور میز پر سجا دیے۔ مسعود چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوا اور بولا۔ "جمشید! ایک بری خبر سناتا ہوں... طارق اور ایزابیل الگ ہو گئے۔"

"کب؟"

"تقریباً دو مہینے ہو گئے... ایزابیل تو مست ہے، جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ لیکن طارق قبر کا مردہ نظر آنے لگا ہے۔ پچھلے دو ماہ سے تقریباً بیس کلو وزن کم ہوا ہے۔ میرے علاوہ اس کی تکلیف کوئی نہیں جانتا۔ سب یہ سمجھتے ہیں کہ اسے کوئی بُری بیماری لگ گئی ہے۔"

"بات پوشیدہ تو نہیں رہے گی، لیکن ہوا کیا تھا؟"

"دونوں کہتے ہیں، ساتھ رہنا اب مشکل ہے۔"

"عجیب بات ہے!"

"ویسے جمشید، ایک بات ہے دوست...... اپنے یہاں کی لڑکیاں خوبصورت بھلے ہی ہوں، لیکن ان سے نبھاہ بڑا مشکل ہے۔ جو لڑکیاں باہر کی ملتی ہیں، پسند آتی ہیں، بے وفا ہوتی ہیں، خود نبھانا نہیں چاہتی ہیں۔ طارق کے ساتھ بھی یہی ہوا ہے۔ مشرق و

مغرب۔ بہت مشکل ہے ان کا ملاپ۔ ایک بے حد مشینی، دوسرا بے حد جذباتی۔ عجیب المیہ ہے۔ مجھے خود ہی خوف کھائے جا رہا ہے کہ کہیں....۔''

''نہیں، جین ایسی نہیں ہے، پھر پورا فرانس ایسا تھوڑا ہی ہے۔''

''ایزابیل بھی تو پیرس شہر کی تھی۔''

''وہ بہت آزاد خیال تھی۔''

''طلاق ہو گیا؟''

''طلاق نہیں ہوا، لیکن دونوں الگ رہ رہے ہیں۔''

''خیر، جین سے یاسمین کے بارے میں ذکر کرو، تاکہ کچھ کام کی بات ہو۔''

''ابھی نہیں۔ پہلے میں بات کر لوں، پھر کل شام کو تمہاری طرف آؤں گا۔ جو بات ہوگی بتاؤں گا۔ ٹھیک ہے؟''

''جیسا تم مناسب سمجھو۔''

''ابھی دونوں کو ملنے دو۔'' مسعود نے کہا اور چائے بنانے لگا۔ تبھی دروازے کی گھنٹی بجی۔ جین نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ ''اوہ! شاہرام! کیسے ہو؟ بہت دن بعد آئے۔ آؤ، اندر آؤ۔''

شاہرام کے اندر آتے ہی سب کھڑے ہو گئے۔ سب سے ہاتھ ملا کر شاہرام بیٹھ گیا۔ چائے پیتے ہوئے اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر شاہرام نے آہستہ سے کہا۔ ''ایک ضروری بات تھی۔ ایران سے خبر ملی ہے، کہ کامریڈ طیبہ جیل میں ہے۔ ایک ماہ پہلے پکڑی گئی تھیں۔''

''طیبہ خانم جیل میں ہیں؟ بہت مشکل ہے اب ان کا بچنا۔'' جمشید نے فکرمندانہ لہجہ میں کہا۔

''تم جانتے ہو انہیں؟'' مسعود بولا۔

''ہاں! جب میں بی۔اے میں تھا تو وہ ایم۔اے کر رہی تھیں۔ ہمارے وقت کی سب سے تیز اور فاضل کارکن تھیں۔ میں نے چھ سال قبل ایک میٹنگ میں انہیں سنا تھا۔ کچھ دنوں تک وہ میرے دماغ پر چھائی رہی تھیں۔'' جمشید نے کہا۔

"میرے گھر کے سامنے رہتی تھیں۔" یاسمین نے کہا۔

"اور کوئی خبر؟"

"نہیں، لیکن اس خبر سے گروہ کے افراد بہت دکھی ہیں۔" شاہرام نے کہا۔

"اس چمک دمک کی زندگی کے درمیان طیبہ خانم اتنی سادہ رہتی تھیں کہ دل میں ہمیشہ انہیں دیکھ کر ایک پاکیزہ احساس ابھرتا تھا۔" جمشید سگریٹ کے دھویں میں ماضی کو دیکھ رہا تھا۔

"اچھا، اب میں چلتا ہوں۔ آج رات کام بھی بہت ہے۔" شہرام اُٹھتا ہوا بولا۔

"ہمیں بھی اجازت دو، مسعود۔" جمشید بھی کھڑا ہو گیا، اس کے ساتھ ہی یاسمین بھی۔

"یاسمین، پھر آنا۔" جین نے کہا۔

"ضرور آؤں گی۔" یاسمین نے جین کے دونوں گالوں پر پیار کیا۔

باہر سڑک روشنی میں نہائی ہوئی تھی۔ یاسمین اور جمشید خاموشی سے راستہ طے کر رہے تھے۔ دونوں کسی سوچ میں غرق تھے۔

"سنو، یاسمین، زندگی کتنی مختصر ہے! کب کون اپنی زندگی کا سفر ختم کر لیتا ہے، پتہ ہی نہیں چلتا۔"

"ہاں...... موت تو یوں ہمارے سامنے سے گزرتی ہے جیسے انسان کی پیدائش... اتنی ہی آسان اور اہم ہو گئی ہے موت آج ایران میں۔"

"چلو 'شملے' چلتے ہیں۔ وہیں کسی قہوہ خانہ میں بیٹھ کر کچھ پیتے ہیں۔"

"جب تک پیسہ ختم نہیں کر لو گے، تمہیں قرار نہیں آئے گا نا؟"

"نہیں، ایسا کچھ نہیں ہے۔ کافی پینے میں ہم لٹ تو نہیں جائیں گے۔"

"میٹرو سے چلتے ہیں، جلدی پہنچ جائیں گے۔"

"ٹھیک ہے۔" کہہ کر جمشید انڈر گراؤنڈ میٹرو کی سیڑھیاں اُترنے لگا۔ دونوں تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے، تبھی سنتور سے اُٹھتی ایرانی دُھن نے انہیں چونکنے پر مجبور کر دیا۔ دونوں نے ایک دُوسرے کی طرف دیکھا۔ آگے بڑھے، انڈر گراؤنڈ راہداری میں اُگلے موڑ پر ایک ایرانی دیوار کی جانب منہ کیے کھڑا سنتور بجا رہا تھا۔ قریب پڑے سنتور کے خالی ڈبے میں کچھ سکے پڑے تھے۔ دو فرانک، پانچ فرانک کے۔

''مادر قحبہ'' جمشید کے منھ سے اچانک ماں کی گالی نکلی۔ قریب سے ایک عرب گزرا، اس نے خاموشی سے دس فرانک کا سکہ پھینکا، پھر ایک چینی یا جاپانی نے ایک فرانک کا سکہ اُچھالا۔ جمشید کا گلا جیسے کسی نے اپنے مضبوط ہاتھوں سے دبوچ لیا تھا۔ بہت گھٹی سی آواز میں بولا۔ ''یہ منظر کوئی اس پدر سگ کو جا کر دکھائے کہ ایرانی پیٹ کی خاطر کس کس کا نمک حلال کر رہا ہے۔ اس عرب کو دیکھا تھا؟''

''اسلام ایک سیاسی مذہب ہے۔'' یاسمین نے تیکھے انداز سے کہا۔

''ارے، سیاست تو وہ ناجائز بچہ ہے جس کے ماں باپ کا ہی پتہ نہیں۔''

دونوں میٹرو میں جا کر بیٹھ گئے۔ بھیڑ زیادہ نہیں تھی۔ پورا ڈبا الجیریائی لڑکیوں سے بھرا تھا۔ ان کے سروں پر پتلی پتلی پٹیاں گتھی ہوئی تھیں جن کے نیچے کانچ کے بڑے بڑے رنگین موتی لگے ہوئے تھے۔ جب وہ ہلتی تھیں تو اس کے ساتھ اس کی بیسیوں چوٹیاں بھی چہرے کے چاروں طرف لہراتی تھیں۔ میٹرو سے اُتر کر وہ راہداری سے باہر سڑک پر سیڑھیاں طے کر کے نکلے۔

''یاسمین، اس ورسائل پیلس کے باغ میں جو میں نے تم سے وہ جملہ کہا تھا، کیا اس میں تمہیں کچھ سچائی لگی تھی تب؟''

''ہاں! لیکن کچھ دن بعد لگا تھا، وہ میرا صرف وہم ہے۔''

''میں اس جملہ کے تئیں بہت ایماندار تھا، مگر پھر تم آرٹ کالج چلی گئیں، میں یونیورسٹی میں آ گیا۔ لیکن... سچ مانو تو ایک بات کہوں... اس کے بعد وہ الفاظ میں نے کسی سے نہیں کہے۔ نہ موقع ملا، نہ ہوش رہا۔ آج چار پانچ سال بعد اس بوڑھی انگریز عورت نے میرے دل کے اس نرم گوشے کو چھوا جس میں کبھی بہت لطیف جذبے رہا کرتے تھے۔ طیبہ خانم کی یاد نے ان جذبوں میں مزید گہرائی کا احساس دلایا اور تم نے دوپہر میں ایک جملہ یاد دلا کر مجھے آٹھ سالہ یہ مشکل سفر لمحہ بھر میں بھلا دیا۔ کہاں تھا میں ان آٹھ برسوں میں؟ سوچتا ہوں تو یاد آتا ہے...... جیل گیا۔ ساواک پولس کی مار کھائی۔ دو ماموؤں کو شاہی ایئر فورس کا پائلٹ ہونے کے باعث شوٹ ہوتے دیکھا۔ گھر پر حملہ ہوتے ہوئے دیکھا۔ بابا کی پیٹھ کوڑوں کی مار سے لال ہوتے دیکھی۔ ماماں کو ان سے

ملوانے کے لیے کورٹ اور کچہری سے اجازت نامہ لینے کے چکر میں دھکے کھائے، گالیاں سنی۔ جب اجازت حاصل کر کے پہنچے تو ملاقات کی جگہ پر بابا کی تکلیفوں سے چور لاش ملی۔۔ کتنا بھیانک سفر طے کیا ہے میں نے...''

''یہیں بیٹھتے ہیں، جمشید......'' کہہ کر یاسمین فٹ پاتھ پر پھیلی کرسیوں میں سے ایک پر تھکی تھکی سی بیٹھ گئی۔ ان باتوں نے اس کے پیروں کی جان سلب کر لی تھی۔ چہرے پر پسینے کی بوندیں تھیں۔

''کیا پیوگی؟'' اس کے پیلے چہرے کو دیکھ کر جمشید نے پوچھا۔

''جو تم پیوگے میرے لیے بھی منگوالو۔'' افسردہ آواز میں وہ بولی۔

دو تر کی قہوہ آگئے۔ دونوں نے خاموشی سے کیوب کا کاغذ کھولا اور اسے کافی میں ڈال دیا۔ چمچ سے کیوب ہلاتے ہوئے جمشید نے کہا۔ ''یاسمین، آج میں اسی ایمانداری سے وہی جملہ، جو ورسائل کے تاریخی باغ میں کہا تھا، دہرادوں تو کیا میں.....''

یاسمین کے اداس چہرے پر ایک شرمیلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اس نے خاموشی سے، لیکن گہری نظروں سے جمشید کو دیکھا، پھر آہستہ سے بولی۔ ''اتنی پریشانی اور فقدان میں بھی ہم عشق کرنا نہیں بھولے، جبکہ ایران کی زمین سے برکت تک اُڑ گئی ہے۔''

''ہم زندہ ہیں مرے نہیں ہیں، اس کا احساس آج ہوا۔ ہم نارمل ہیں اور عشق کا سوتا ہمارے دلوں میں سوکھا نہیں ہے۔''

''پاک دل میں عشق کبھی مرتا نہیں ہے۔ کبھی وہ چشمہ خشک نہیں ہوتا۔''

''ہوں۔''

''چلو، بہت دیر ہوگئی ہے۔''

''چلو!'' کہہ کر جمشید نے دس فرانک کا سکہ میز پر رکھا اور باہر نکل گیا۔ ''آج کا دن میری زندگی کا سب سے اہم دن ہے۔'' یاسمین جمشید کی باتیں سن کر مسکرا پڑی۔

۲۱

کسٹم سے فارغ ہوتے ہی مہناز پری سے لپٹ گئی۔ دونوں لپٹ کر بار بار ایک دُوسرے کے چہرے کے بوسہ لے رہی تھیں۔

''آپ کے دُوسرے عاشق رو رہے ہیں، انہیں سنبھالیے۔'' سلیمان نے سیف کو گود سے اُتارتے ہوئے مہناز سے کہا۔ سیف دوڑ کر ماں سے لپٹ گیا۔

''کتنے پیارے بچے ہیں!'' پری نے دونوں کو سینے سے لپٹاتے ہوئے کہا۔

''مجھ پر گئے ہیں۔'' سلیمان نے ٹائی ٹھیک کرتے ہوئے گردن پکڑ کر کہا۔ اس پر سب ہنس پڑے۔

''تمہارے کیا کم ہیں، لاڈلی کے گالوں کے گڈھے تو دیکھو۔'' مہناز نے دونوں بچوں کو چومتے ہوئے کہا۔

''تمام فیصلے یہیں کر ڈالوگی تم لوگ۔ گھر بھی چلنا ہے یا نہیں؟'' خالد نے ہنستے ہوئے کہا۔

سب لوگ کار میں بیٹھ گئے۔ پری نے مہناز سے پوچھا۔ ''میرا پتہ کیسے چلا؟''

''اسلم عطاپور، آپ لوگوں کے فیورٹ شاعر سے!'' سلیمان نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تم لوگ ادھر گئے تھے یا وہ جرمنی آیا تھا؟'' پری نے پوچھا۔

''ہم گئے تھے ان سے اپنی حسین بیوی کو ملوانے۔'' سلیمان چہک رہا تھا۔

''جرمنی کے کیا حال چال ہیں؟''

''ٹھیک ہیں۔ سب جگہ ایک سا ماحول ہے۔''

''زبان سیکھی؟''

''مجھے تو سیکھنی پڑی۔ مہناز کو ضرورت نہیں پڑی۔''

''میرے بچے فرنچ بول لیتے ہیں اور ہم لوگ ٹوٹی پھوٹی کام چلاؤ۔'' پری نے کہا۔

''امام خمینی کے گود لیے بیٹے بنی صدر اور ان کے داماد مسعود رضوی کے کیا حال ہیں؟ پورا ایران آپ نے پیرس میں بلا رکھا ہے۔!'' سلیمان نے طنزیہ پوچھا۔

''اور آپ کیا کم ہیں۔ آپ نے تو حسد میں آ کر ایڈمرل ماعدنی کو جرمنی بلا لیا ہے۔'' خالد کی اس بات پر سب ہنس پڑے۔

گھر پہنچ کر دونوں باتوں میں ڈوب گئے۔ بچے ٹی۔وی دیکھنے میں اور پری میز ٹھیک کرنے میں۔ اس کا ہاتھ مہناز بھی بٹا رہی تھی۔ بچوں کو کھانا کھلا کر وہ بھی کونے میں کافی کا پیالہ لے کر بیٹھ گئی۔

''بہت خوش ہو، اس ڈمی کے ساتھ؟'' پری نے چڑایا۔

''ہاں۔'' مہناز نے اقرار کیا۔

''اسلم کیسا تھا؟''

''ٹھیک تھا۔''

''آپ لوگ ہم سے روٹھ گئی ہیں کیا؟ ادھر اس کونے میں چھپ کر بیٹھی ہیں۔'' سلیمان نے باتھ روم جاتے ہوئے کہا۔

''کھانا کھانے کا ارادہ نہیں ہے کیا؟'' خالد نے آواز لگائی۔

''لگاتی ہوں۔'' کہہ کر پری اُٹھ گئی۔

کھانے پر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں، پھر سب سونے چلے گئے تو دونوں سہیلیوں کو تنہائی ملی۔

''ملیحہ کی کوئی خبر ملی؟'' پری نے پوچھا۔

''نہیں! نہ ہی صنوبر اور شہناز کی۔'' مہناز نے کہا۔

''سوسن جانے کس حال میں ہوگی! دوسری شادی کے بعد نئی زندگی اسے کتنی راس آئی ہے؟ میں جب تک تہران میں تھی، وہ خوش اور مطمئن تھی۔ جب سے پیرس آئی ہوں، کسی کا پتہ نہیں چل پایا ہے۔ خط بھیجتے ڈر لگتا ہے۔ پیرس کے تمام خطوط سینسر ہی نہیں ہوتے ہوں گے، بلکہ ان گھروں پر کڑی نگرانی ہونے لگتی ہوگی۔ بیچاری ملیحہ پہلے ہی سے پریشان ہے، اوپر سے یہ نئی مصیبت کیوں اس پر ڈالوں! تم تو جانتی ہو، صنوبر کے شوہر ایئرفورس

میں ہیں۔ اسے بھی اسی وجہ سے خط نہیں لکھا۔" پری نے ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے کہا۔
"تم کم سے کم یہ باتیں جانتی تو ہو، میں تو جرمنی میں بالکل الگ تھلگ رہتی ہوں۔ ہمارے ملنے والے زیادہ تر جرمن ہی ہیں۔ جس شہر میں میں ہوں وہاں پر پاکستانیوں کی اکثریت ہے۔ وہی اُلٹی سیدھی حرکتیں اور ہنگامے پی۔پی کے نام پر مچاتے ہیں۔ ان کی وجہ سے ایشیا کی امیج کو کافی دھکا لگا ہے۔"
"یہاں پاکستانی نہیں ہیں۔"
"میرا مطلب کسی کی خاص تنقید کرنا نہیں ہے، لیکن دُوسرے ملک میں اتنی من مانی کرنا میں مناسب نہیں سمجھتی ہوں، پھر پری! جدوجہد کرنے والے اپنے ملک میں رہتے ہیں!"
"چھوڑو یہ باتیں، یہ بتاؤ کب تک سلیمان کے پاس چھٹی ہے؟ میرا دل لندن جانے کا ہے، تمہارا کیا خیال ہے؟"
"چلتے ہیں۔ تم سلیمان سے بات کرلو۔" مہناز نے کہا، پھر دونوں کے درمیان خاموشی چھا گئی۔
"مہناز، تم نے اسلم سے پوچھا نہیں کہ آخر اس نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟" اچانک اپنی نازک انگلیوں سے بالوں کو چھوتے ہوئے پری نے مہناز سے پوچھا۔
"سلیمان نے پوچھا تھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ وہ مجھے بے وفا سمجھتا ہے۔" مہناز نے اپنی بڑی بڑی آنکھیں اُٹھا کر بڑی معصومیت سے پری کو دیکھا۔
"اسے سمجھنے کا حق ہے۔ ہم میں سے جو بھی سلیمان کو دیکھے گا، باتیں کرے گا، اسلم سے اسے ہر حال میں بہتر پائے گا۔ یہ وجہ بھی ہوسکتی ہے۔ اسلم بھی ایسا سوچ سکتا ہے!"
"اسے ان حالات کا علم نہیں ہے جن سے میں گزری ہوں۔ بابا کی موت، ماماں کا اصرار، بدلتے ایران کے حالات، چچا کا زور۔ میں ان سب کے درمیان تنہا رہ گئی تھی۔ کس کس سے لڑتی۔ کس کس کو جواب دیتی!"
"یہ مجھے پتہ نہیں ہے کہ اسے تمہاری ان تمام مجبوریوں کا علم ہے یا نہیں، مگر تم چاہو تو... مجھ پر چھوڑ دو... میں خط لکھوں گی کچھ اس طرح سے کہ بات بھی صاف

ہو جائے اور.....''

''ہاں، پری! اسلم کو بھی اپنی زندگی سنوارنے کا پورا حق ہے۔ میں اس کی رکاوٹ بننا نہیں چاہتی ہوں۔''

''او ہو، چلو کباب کی خوشبو گلی تک مہک رہی ہے۔ سڑک پر سے سونگھتا ہوا یہاں گھر تک پہنچا ہوں۔'' سلیمان ہنستا ہوا داخل ہوا۔

''آپ آ گئے؟''

''کیا غلطی کی آ کر؟''

''ارے نہیں، سلیمان، قہوہ لیں گے۔'' ہنستی ہوئی پری بولی۔

''یہ لو...... شام کے مولار شو کے ٹکٹ...... خالد کہاں ہے؟'' یہ کہہ کر سلیمان صوفے پر بیٹھ گیا۔

''شاپنگ کے لیے گئے ہیں، دو گھنٹے ہو رہے ہیں۔'' پری نے کہا۔

''یہاں ایرانی بہت ہیں۔ اہلفل کے سامنے، سین کے پُل کے قریب ایک لڑکا آئس کریم بیچ رہا تھا۔ اس کے آگے ایک لڑکا کچھ کتابیں اور اخبار بیچ رہا تھا۔ دوسری سڑکوں پر کچھ لڑکے بیلٹ اور رومال بیچ رہے تھے۔''

''چوری تو نہیں کر رہے تھے؟'' پری نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''پری لندن جانے کا پروگرام بنا رہی ہے۔'' مہناز نے قہوے کا چھوٹا سا پیالہ سلیمان کو دیتے ہوئے کہا۔

''چلتے ہیں، دو تین دن وہاں رہ کر لوٹ آتے ہیں۔'' قہوہ پیتے ہوئے سلیمان نے کہا۔

''خالد آ جائیں تو دن طے کر لیتے ہیں۔'' پری نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

تینوں باتوں میں ڈوب گئے۔ کچھ حال کی کچھ ماضی کی۔

اگلے ہفتے یاسمین اور جمشید شادی کر رہے ہیں۔ یہ خبر فارین کلاس فور ہاسٹل میں پھیل گئی۔ آٹھ منزلہ یہ بلڈنگ پیرس میں جھونپڑ پٹی ختم کر کے بنوائی گئی تھی۔ تا کہ جھونپڑ پٹی کے لوگ ان چھوٹے چھوٹے کمروں میں صاف ستھرے طریقوں سے رہیں۔ ہر فلور پر مختلف ملکوں کے لوگ تھے۔ پانڈیچیری کے ساؤتھ انڈین، ویت نامی، ایرانی اور افریقن اپنے خاندان کے ساتھ رہ رہے تھے۔ سب میں یہ بات پھیل گئی کہ یاسمین اور جمشید شادی کر رہے ہیں۔ ایرانیوں کے پاس پھوٹی کوڑی تک نہ تھی کہ جشن مناتے، اس لیے شادی کی رسم کے بعد صرف چاکلیٹ کے ٹکڑوں سے منھ میٹھا ہوا۔ یاسمین اور جمشید سادہ کپڑوں میں تھے۔

جب ہاسٹل لوٹے تو وہاں پر دوسرے لوگوں نے جشن کی تیاری کر رکھی تھی۔ افریقن، ویتنامی، ساؤتھ انڈین کھانا کامن کچن میں چوتھی منزل پر سجا تھا، تیسری منزل کے کامن روم میں ڈرنک کا تھوڑا بہت انتظام تھا۔ ساتویں منزل کے کامن کچن میں ناچ گانے۔ موسیقی کا انتظام تھا۔ پوری عمارت میں صرف کچن ہی ایک بڑا کمرہ تھا، ورنہ لمبے لمبے پتلے کمرے تھے، جن میں ایک ساتھ صرف دس لوگ ایک دوسرے سے مل کر بیٹھ سکتے تھے۔ جشن رات کے دو بجے تک چلتا رہا۔

''کار سے لندن آنے کا پروگرام بنا کر غلطی کی۔'' سلیمان نے کہا۔

''اب ایرانی ہونا دراصل ایک جرم ہے۔'' خالد نے کہا۔

''یہ ہماری ڈیوٹی ہے۔'' چیک پوسٹ پر تعینات پولس والے نے کہا۔ پری خاموش تھی۔ اس کے دل و دماغ پر دوسرا ہی عکس ابھر رہا تھا۔ مہناز سیف کو بہلا رہی تھی، جو بار بار گود سے اُترنے کے لیے مچل رہا تھا۔

کار کا ایک ایک سامان کھول کر، جھاڑ کر پولس معائنہ کر رہی تھی۔ دونوں

لڑکیاں، مہناز اور پری کی، ایک دُوسرے کی گردن میں ہاتھ ڈالے، لالی پاپ چوستی ہوئی، جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ دونوں کی آنکھیں گھوم رہی تھیں اور گردن ہل رہی تھی۔ بھائی پیچھے کھڑا اُن کے بال کھینچتا پھر منہ گھما لیتا تھا، مگر وہ سر جھٹک کر پھر باتوں میں مشغول ہو جاتیں۔ پورا منظر مہناز کو بہت اچھا لگ رہا تھا۔ وہ ماں باپ کی اکلوتی لڑکی تھی۔ ایسے قیمتی لمحے اس کی زندگی میں ماموں یا چچازاد بہن بھائی کو لے کر بھی نہیں آئے تھے۔

''جا سکتے ہیں۔'' پولس انسپکٹر نے ہاتھ اُٹھا کر شکریہ کے انداز میں کہا۔

''شکریہ۔'' خالد اور سلیمان نے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ سب کار میں بیٹھ گئے۔ اپنے اپنے خیالوں میں ڈوبے تھے۔ بچے الگ چیونگم چباتے کھڑکی سے گھاس کے میدان میں شلغم کھاتی، موٹی موٹی گایوں اور سوروں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔

''کہیں 'لے۔ بائی' آئے تو کار روکنا، خالد!'' پری نے کہا۔

''ہاں، تھوڑا تازہ دم ہو جائے، چائے پینے کا میرا بھی دل کر رہا ہے، تھکا ڈالا ان کم بختوں نے۔'' سلیمان نے کہا۔

''تھکن سے زیادہ جھنجھلاہٹ میری شریانوں میں اشتعال برپا کر رہی تھی۔'' خالد نے کہا۔

''ان کی ڈیوٹی ہے، لیکن یہ قانون بھی خصوصاً ایرانیوں کے لیے ہی بنا ہے کہ انہیں ننگا کر کے اسکریننگ کرو۔'' سلیمان نے جھنجھلا کر کہا۔

''تاریخ شاہد ہے، ایسا برتاؤ ایرانیوں کے ساتھ ان مغلوں نے بھی نہیں کیا جنہوں نے ایران میں کھلا قتل عام کیا تھا۔ نہ ان عربوں نے جو تین سو سال تک ایران میں حکومت کر کے گئے ہیں، لیکن اس دَور کے حاکم نے صرف ایران کی سرزمین کو ہی تنگ نہیں کیا ہے، ایرانیوں کے لیے، بلکہ تمام دُنیا ان کے لیے تنگ کر دی ہے۔ کہیں بھی وہ کھل کر سانس نہیں لے سکتے ہیں۔'' خالد کے لہجے کی تلخی بڑھ گئی تھی۔

''موڈ ٹھیک کرو! یہ تو ہماری تقدیر بن گئی ہے۔'' پری نے کہا۔

''روز ایرانی کسی نہ کسی بہانے سے مارا جا رہا ہے۔ پوری دنیا خاموش ہے۔ مسلم

ملک خاموش ہیں۔ انسانیت خاموش ہے، آسمان وزمین خاموش ہیں اور جسے ہم خدا کہتے ہیں وہ بھی خاموش ہے، خاموش تماشائی بنا ہے۔'' خالد کی تلخی بڑھتی جارہی تھی۔

''خدا بوڑھا ہورہا ہے، اس کے بس کی بات نہیں، اتنے بڑے کاروبار کو سنبھالنا۔ میرے خیال سے اسے اب اپنا نائب مقرر کر دینا چاہیے۔ تمام اسلامی ملکوں کو دیکھو، جہاں پر اسلام اور ذاتی سیاست کے مطابق اس کے مختلف اظہار ملتے ہیں، لیکن نعرہ 'عرب اتحاد کا دیں گے، اسلامی بھائی چارے کی باتیں کریں گے۔ نائب مقرر ہوگا تو انہیں نئی راہ بھی دکھائے گا۔'' سلیمان نے گہرے تھکے لہجہ میں کہا۔

''مجھے تو اب اسی پر شک ہے کہ خدا ہے بھی یا نہیں؟ اگر ہے تو کہاں ہے یا پھر وہ بھی انسانیت کو چھوڑ کر سیاسی داؤں پیچ لڑنے لگا ہے؟ اسے بھی پاور میں رہنا ہے، اپنا اقتدار بنائے رکھنا ہے...'' خالد نے کہا۔

''اب تم کفر کی باتیں نہ کرو۔'' پری نے تھوڑا ناراض ہوکر کہا۔

''ان عورتوں کی باتیں اپنی سمجھ میں تو نہیں آتی ہیں کہ ظلم سہیں گی، لیکن ظالم کو ظالم نہیں کہیں گی۔ جو تصویر ان کے دل میں کسی کی بن جاتی ہے وہ زندگی بھر بنی رہتی ہے۔'' خالد بولا۔

''تمہارا مطلب ہے کہ پری کے دل میں تمہاری نہیں، امام خمینی کی تصویر بنی ہوئی ہے؟ اس پر تمہیں اعتراض کا پورا حق ہے۔'' سلیمان نے مصنوعی غصہ سے کہا۔

''وہ حق بھی مجھ سے چھینا جارہا ہے۔'' خالد نے کہا اور لے بائی کی طرف کار لے جاکر کھڑی کردی۔ جگہ بہت حسین تھی۔ سیب کے باغوں میں سفید کلیاں کھلی ہوئی تھیں۔ درختوں، جھاڑیوں سے ڈھکا پانی کا نالہ بہہ رہا تھا۔ ڈھلان سے اوپر پہاڑیوں تک کھیت ہی کھیت پھیلے تھے۔ ہرے رنگ کے مختلف شیڈ آنکھوں کو سکون بخش رہے تھے۔ بچے ڈھال پر دوڑنے لگے۔ سیف قلابازی کھاکر کھلکھلا رہا تھا۔ مہناز اور پری نے کھانے پینے کا سامان نکالا۔

''میں تو بیئر لوں گا۔ تمہارا کیا ارادہ ہے سلیمان؟'' خالد نے بیئر کے ٹن کا منہ کھولتے ہوئے کہا۔

''تمہارے ارادے سے جدا نہیں۔'' سلیمان نے جواب دیا۔
''تمہاری کوئی جان پہچان ہے لندن میں؟'' سلیمان نے پوچھا۔
''کوئی خاص نہیں۔ چلتے پھرتے اگر ایرانی مل جاتے ہیں تو بات چیت ہو جاتی ہے، ورنہ...'' خالد نے بیئر کا بڑا سا گھونٹ بھرتے ہوئے کہا۔
''یہ چکن سینڈوچ لیں نا۔'' مہناز نے پلیٹ خالد کی طرف بڑھائی۔
''چلو، اب چلتے ہیں۔'' خالد نے کہا۔
''نہیں، بابا ابھی نہیں۔'' بچوں نے کہنا شروع کر دیا۔
''ٹھیک ہے، پانچ منٹ اور کھیل لو، پھر چلیں گے۔'' پری نے کہا۔
''لندن میں بہت اچھے اچھے پارک ہیں۔ جلدی چلیں گے تو جلدی پہنچ کر وہاں کبوتروں کو دانہ ڈالیں گے۔ رات میں پہنچے تو کبوتر سو جائیں گے۔'' سلیمان نے سیف کو بہلایا، جو ہری ہری گھاس پر لگاتار گول گول لیٹتا ہوا، اوپر سے نیچے ڈھلان کی طرف کھلکھلاتا ہوا لڑکتا تھا، پھر کھڑے ہو کر بھاگتا ہوا اوپر ڈھلان پر جا کر لیٹ جاتا تھا۔
''چلو، چلو۔'' تینوں بڑے بچے بھاگتے ہوئے کار کی جانب بڑھے۔ ان کی دیکھا دیکھی سیف بھی کار کی طرف بھاگا۔
''بچوں کو بہلانا خوب آتا ہے تمہیں۔'' پری نے کہا۔
''بڑوں کو بھی خوب بہلاتا ہوں۔ اپنی دوست سے پوچھو نا!'' سلیمان نے شرارت سے کہا۔ مہناز جھینپ گئی۔ خالد ہنس پڑا۔
''اب میں ڈرائیو کروں گا۔ تم آرام کرو۔ کافی طویل سفر طے کیا ہے۔'' سلیمان نے خالد کی کمر پر پیار سے تھپکی دیتے ہوئے کہا۔
کار چل پڑی پیچ دار پہاڑی راستوں سے ہوتی ہوئی۔ اوپر نیلا آسمان صاف تھا۔ دھوپ بڑی خوشگوار لگ رہی تھی۔

''تم نے کبھی سوچا تھا کہ تمہاری شادی ایسے ماحول میں ہوگی جو بیگانہ ہوگا، جہاں سب اپنے نہیں، غیر ہوں گے؟'' جمشید نے یاسمین سے پوچھا۔

''نہیں! شادی کا خیال برسوں پہلے ہی ختم ہوگیا تھا۔ زندگی حالات کا شکار تھی۔ اس کے شکاری پنجوں سے کیسے بچ گئی، مجھے خود تعجب ہے! جہاں روٹی اور جینے کے لیے جدوجہد کرنی پڑ رہی ہو، وہاں پر شادی کا خیال کیسے آئے گا؟'' یاسمین نے بڑی معصومیت سے کہا۔

''تہران میں تمہارا کوئی نہیں بچا۔ جوڑی بھی خوب ملائی ہے خدا نے۔'' جمشید ہنس پڑا۔

''کمیونسٹ ہوکر خدا پر یقین رکھتے ہو۔'' یاسمین نے کہا۔

''تو کیا ہوا! خدا، قرآن۔ یہ ہمارا مذہب نہیں، تہذیب ہے جو ہمیں ہمارے بزرگوں سے ملی ہے۔ ہمارے رسم و رواج کا انہیں پر انحصار ہے۔ اس سے آدمی کیوں کر الگ ہوسکتا ہے!'' جمشید یاسمین کے بالوں سے کھیلتا ہوا بولا۔

''میں ایسا نہیں سوچتی، یہ رسم و رواج صرف چودہ سو سال پرانے ہیں جو ہمارے اُوپر لادے گئے تھے۔ ورنہ ہماری نسل، ہمارا خاندان، ہمارے آباؤ اجداد ہماری تہذیب زرتشتی ہے جو خالص ایرانی ہے۔

''مان لیا۔'' کہہ کر جمشید ہنس پڑا۔ یاسمین بھی مسکرا پڑی۔

''یہیں پیرس میں میرے دَور کے رشتے کے ماموں کی بیٹی ہے!'' تھوڑی دیر بعد یاسمین نے کہا۔

''چلو، ایک دن مل کر آتے ہیں۔'' جمشید بولا۔

''شادی والے دن خیال آیا تھا، مگر پاس میں نہ پتہ تھا، نہ دیگر معلومات، اس لیے خاموش رہ گئی۔'' یاسمین بولی۔

''پھر ملی کہاں تھی؟ کیا اس وقت پتہ لینا بھول گئی تھی؟'' جمشید بولا۔

''ملی کہاں؟''

''پھر کیسے پتہ کہ وہ یہاں ہے؟''

''ایک دن میں بس سے اتر رہی تھی۔ وہ سامنے ڈرگ اسٹور سے شاپنگ کر کے نکل رہی تھیں۔ خالد بھائی اور بچے بھی ساتھ تھے۔ جب تک میں سڑک کراس کر ان تک پہنچتی، وہ کار میں بیٹھ چکی تھیں۔ میں نے بے چین ہو کر آواز بھی دی تھی۔ پری... پری... لیکن آواز ان تک نہ پہنچی، ورنہ کار ضرور روک لیتے خالد بھائی۔ اس بات کو گزرے تقریباً ایک سال ہو گیا ہے۔ پھر ایک دن وہ سنیما سے نکل رہی تھیں اور میں بس میں بیٹھی شاہزادیجا سے گزر رہی تھی۔'' یاسمین آہستہ سے بولی۔

''عجیب اتفاق ہے!'' جمشید نے اس کے بالوں کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''جب بابا کو تریاق اور شراب پینے کے جرم میں پکڑ کر پاسدار لے گئے تھے تب میں گھر کے قریب دکان پر کھڑی کچھ خرید رہی تھی۔ مڑی تو کمیٹی کی گاڑی کو جاتے دیکھا۔ دو لمحے اسے ہی دیکھتی رہی۔ سوچا بھی کہ یہ ہمارے محلے میں کیوں آئی ہے؟ جب گھر لوٹی تو ماماں نے بتایا۔ دوسری صبح بابا کے ساتھ کچھ اور لوگ شوٹ کر دیے گئے تھے۔ وہ بھی عجیب اتفاق تھا کہ میں وہیں کھڑی تھی، بابا وہیں سے گزرے اور مجھے پتہ بھی نہیں چلا۔'' یاسمین کا لہجہ کانپ رہا تھا۔ آنکھیں بھر آئی تھیں۔

''بھول جاؤ، یاسمین، تمام تلخیاں بھولنے کی کوشش کرو۔'' جمشید نے اس کے گال سہلائے۔

''دو ہفتے بعد ماماں کو ہارٹ اٹیک ہوا۔ ایک چچا تھے، وہ انقلاب کی شروعات میں ساواک کی گولیوں کا نشانہ بنے۔ ان کی بیٹی روحی تھی۔ وہ کہاں ہے، کیا کر رہی ہے، کچھ پتہ نہیں۔ دو ماموں تھے، وہ خالہ کے ساتھ عراقی بمباری میں ڈسفول کے قریب بری طرح گھائل ہو گئے۔ سب کچھ چھ ماہ میں ہار کر بیٹھ گئی تھی۔ اکیلے شہر میں، اکیلے گھر میں تنہا رہ گئی تھی۔ بہت ڈر لگتا تھا۔ ایک دن پری کے پاس گئی تو وہاں تالا لٹکا ہوا دیکھا۔ میرے پیچھے کمیٹی والے ہاتھ دھو کر پڑ گئے تھے۔ جب بھی رات میں آتے، گھر کا کوئی نہ کوئی قیمتی سامان اٹھا کر اپنے ساتھ لے جاتے تھے۔ ایک دن اسد سے ملاقات

ہوگئی، اسے جب تمام باتوں کا علم ہوا تو اس نے پیرس تک نکل بھاگنے میں مدد کی۔ گھر کا سامان مکان کے ساتھ بیچ کر پیرس آ گئی۔ اتفاق ہی تھا جو تم سے ملاقات ہوگئی اس دن جلوس میں، ورنہ میرے ساتھ آگے نہ جانے کیا ہوتا؟''

''ارے پگلی! ایسے مت کہو، ہم دونوں کے دل زخموں سے چور ہیں۔ ان پر وقت کا مرہم لگنا ہے، تبھی یہ بھریں گے۔ مگر یوں آنسو بہانا تو کمزوروں کا کام ہے۔ تم تو کمزور نہیں ہو۔ حالات سے لڑ رہی ہو! فوجی کے ہاتھ میں تلوار ہوتی ہے، آنکھوں میں آنسو نہیں۔ ان آنسوؤں کو سنبھال کر رکھو۔ کبھی وقت ضرورت کام آئیں گے۔ بیکار بہانے سے ان موتیوں کی قدر گھٹتی ہے۔'' جمشید کی آواز کانپ رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کا نرم لمس یاسمین کی پشت پر مرہم کا کام کر رہا تھا۔

یاسمین سسکیاں لیتی ہوئی جمشید کے سینے سے لپٹ گئی۔ سسکیوں، آنسوؤں اور جذبات سے اُٹھتے گرتے سینے کی تپش سے خود جمشید کا وجود کانپ رہا تھا۔ اس کے دل میں ہوک اُٹھ رہی تھی، کب تک ایرانی قوم کو اپنی سچائی اور ایمانداری کی قربانی دینی پڑے گی......؟ کب نکلے گا آزادی کا سورج......؟ آخر کب ہوگی صبح... روشنی میں نہائی صبح؟

جھینگروں کی آوازیں رات کے سناٹے میں کسی نقارے کی طرح عباس کے کانوں میں شور مچا رہی تھیں۔ اندھیرے میں لال لال آنکھیں چمکاتے خرگوش اس جھاڑی سے اس جھاڑی میں بھاگ رہے تھے۔ گاؤں سے ایک کوس کی دوری پر قبرستان

تھا۔ قبرستان سے ملحق ایک چھوٹی سی مسجد تھی۔ مسجد کے پیچھے کھیت اور تالاب تھے۔ عباس کے قدموں کی آواز کچی پگڈنڈی پر اُبھر رہی تھی۔ کسی نے آواز دے کر پوچھا۔

''کون ہے؟''

''میں عباس!'' عباس نے آواز پہچاننے کی کوشش کرتے ہوئے جواب دیا۔

''عباس کون؟'' پھر دھمکی بھری آواز سنائی پڑی۔

''آپ کون ہیں؟'' آگے بڑھتے ہوئے عباس نے پوچھا۔

''ہم اسلامی مجاہد ہیں، قبرستان پر پہرہ دے رہے ہیں۔'' دوسری بھاری آواز اُبھری۔

''میں آپ ہی لوگوں سے ملنے آیا ہوں۔'' عباس نے ٹارچ کی روشنی سامنے پیڑوں پر ڈالتے ہوئے کہا۔ کچھ دُوری پر پیڑوں سے گھرا قبرستان نظر آرہا تھا۔ چھوٹے سے دروازے پر تین لوگ بندوق اُٹھائے کھڑے تھے۔ عمر میں کم تھے۔ نوجوان ہی کہے جا سکتے تھے۔ عباس نے ٹارچ کی روشنی پگڈنڈی کی جانب موڑی اور آگے بڑھتے ہوئے ان کے قریب جا کر کھڑے ہو گئے۔

''چلئے، اندر مسجد کے صحن میں بیٹھ کر آرام سے باتیں کرتے ہیں۔'' عباس نے نرم لہجے میں کہا۔

''چلئے۔'' تینوں لڑکے ان کے پیچھے چل دیے۔ مسجد کے پکّے صحن میں جوتے اُتار کر پالتھی مار کر چاروں بیٹھ گئے۔ اندر دالان میں محراب کے نیچے بجھتی شمعوں کی روشنی کا پیلاپن پھیلا ہوا تھا، شاید کسی کی مراد پوری ہوئی تھی۔ اگربتی کی مہک صحن تک پھیلی ہوئی تھی۔

''صبح چار بجے 'نماز جنازہ' پڑھنے لوگ آئیں گے، لیکن قبریں تو رات کو ہی کھودی جائیں گی، ورنہ صبح پریشانی ہو جائے گی، گرمی کے دن ہیں۔ میت خراب بھی ہو سکتی ہے۔''

''وہ تینوں اس قبرستان میں دفن نہیں کیے جا سکتے۔'' ایک نے گردن اکڑا کر کہا۔

''لیکن کیوں؟ وہ یہاں کے باشندے ہیں۔ ان کے آباؤ اجداد کی قبریں اسی قبرستان میں ہیں۔ کیا آپ انہیں نئے قبرستان میں دفنائیں گے؟ اس حساب سے تو

سب کے اپنے اپنے قبرستان بن جائیں گے؟''

''جو بھی ہو! ہم نے ایک بات کہہ دی، اسی پر اٹل ہیں!'' تینوں نے کہا۔

''بات آپ کی ہے، مذہبی کتاب کی نہیں ہے۔ آپ کے پاس کسی قسم کا آرڈر ہے؟ دکھائیں ذرا!'' عباس نے لہجے میں سختی لاتے ہوئے کہا۔

''آرڈر کے کاغذ کی کیا ضرورت ہے جب ہم خود یہاں پر موجود ہیں۔'' ایک نے اکڑتے ہوئے کہا۔

''لاشیں اگر دفنائی نہیں گئیں تو بات بہت بڑھ جائے گی۔ قاتل کو یہ گاؤں والے بخوبی جانتے ہیں۔ قانون کو ہاتھ میں نہ لیں تو بہتر رہے گا آپ لوگوں کے لیے۔'' عباس نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

''آپ انقلاب کے دشمن ہیں۔'' ایک نے غرّا کر کہا۔

''یہاں پر رہنے والے محنت کش مزدور اور کسان ہیں، انہیں سیاست کے داؤں پیچ نہیں آتے۔ انقلاب کب آیا اور کہاں جا رہا ہے، یہ بھی انہیں معلوم نہیں ہے۔'' عباس نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

''تو آپ کا مطلب ہے کہ یہ تینوں بے گناہ تھے؟'' ایک نے تڑپ کر اونچی آواز سے کہا۔

''یہ میں نے کب کہا؟ مگر یہ ضرور کہا ہے کہ وہ سیاسی داؤں پیچ کو نہیں جانتے ہیں۔ زمین کے بیٹے ہیں۔ زمین سے پیدا اناج کھایا ہے۔ مرکر اسی کی آغوش میں آخری نیند سونا چاہتے ہیں۔ مرنے کے بعد ان کے جسموں سے آپ کو کیا سیاسی اختلافات ہوسکتے ہیں؟'' عباس نے دلیل دیتے ہوئے کہا۔

''ہم کافر کو مسلمانوں کے قبرستان میں دفن نہیں ہونے دیں گے۔'' تینوں نے بندوق ٹھونکتے ہوئے اسی ہٹ دھرمی سے کہا۔

''آپ میری بات کا جواب دیں!'' عباس نے روکھے لہجے سے کہا۔

''ہم جواب دینا انہیں باتوں کا ضروری سمجھتے ہیں جو جواب دینے لائق ہوتی ہیں۔'' ایک نے غصہ سے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''جو ہمارے ساتھ ہیں ہم اُن کے ساتھ ہیں، سمجھے۔'' ایک نے کھڑے ہوئے ساتھی کو بٹھاتے ہوئے کہا۔

''یہی ہمارا جواب ہے!'' تیسرا دامن جھٹکتا ہوا کھڑا ہو گیا۔

''لاشیں قبرستان کے دروازے سے اندر نہیں آسکتیں۔'' تینوں نے کہا اور چلنے کو ہوئے۔

''ٹھیک ہے! میں بھی اسی وقت تہران کی طرف جاتا ہوں اور اس ظلم کی وجہ امام سے پوچھتا ہوں۔'' عباس نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

''تینوں لاشیں آپ کا انتظار نہیں کریں گی۔ سڑ کر بو دینے لگیں گی۔ گرمی کا مہینہ ہے۔ سورج آگ کا گولہ ہوتا ہے آج کل!'' ایک نے طنزیہ لہجہ میں کہا۔

''فکر نہ کریں، آس پاس کے گاؤں اور شہر سے برف کا انتظام ہو جائے گا، لیکن ہاں... غور سے سنیں، آپ تینوں اس قبرستان کے دروازے سے باہر قدم نہیں نکالیں گے، ورنہ آپ کے الفاظ میں گولی سے بھیجہ اُڑا دیا جائے گا۔'' عباس نے جوتے پہنے اور دروازے کے باہر نکلے۔

''ہم دیہاتیوں کو شکار کا بھی شوق ہوتا ہے، اس لیے بندوق کی کمی اس گاؤں میں نہیں ہے۔'' کہہ کر عباس غصہ سے بھرے پگڈنڈی پر تیزی سے بڑھنے لگے۔ قصداً انہوں نے ٹارچ روشن نہیں کی تھی۔

تینوں لڑکے پہلے عباس کی اس بات سے گھبرائے، کچھ دیر کھڑے رہے، پھر ایک نے بندوق اُٹھا کر آؤ دیکھا نہ تاؤ، ایک گولی داغ دی۔ اس کی دیکھا دیکھی دوسروں کے ہاتھ بھی بندوق کے دستے پر گہرے دب گئے۔ ماحول گولیوں کی آواز سے گونج اُٹھا۔ پیڑوں پر سوئے پرندے چیختے ہوئے جاگ اُٹھے اور پروں کو پھڑپھڑاتے تاریکی میں ایک دُوسرے سے ٹکرانے لگے۔

عباس کے کان کے پاس سے گولی سنسناتی ہوئی پیڑ کے تنے میں جا کر پیوست ہو گئی۔ عباس اچھلے اور تیز قدم بڑھاتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔

''خون کی ندیاں اس گاؤں میں بہائی جائیں گی۔ اب اُسے کوئی روک نہیں

سکتا۔'' عباس نے سوچا اور قدم تیز کر دیے۔
چیختے پرندے ان کے سر پر سے پھڑ پھڑاتے گزر رہے تھے۔

خرستان کا نام پچھلے دو سالوں سے خونین شہر پڑ گیا تھا اور آج اسی خونین شہر میں گھماسان لڑائی ہو رہی ہے۔ جہاں تک نظر اُٹھاؤ لاشیں ہی لاشیں بکھری ہیں۔ عراقی، ایرانی ایک دُوسرے سے گُتھے اُلٹے سیدھے مردہ پڑے ہیں۔ جب تک زندہ رہے، بندوق تانے رہے۔ جب مرے تو یوں ہم آغوش ہو گئے جیسے اپنا خون پکار اُٹھا ہو۔ مشتاق آقا پتھر کی چٹان پر بیٹھے ہانپ رہے تھے۔ تھکن کے مارے ان کا بُرا حال تھا۔ ابھی کُمک پہنچی نہیں تھی۔ لاشیں جلدی اُٹھائی نہ گئیں تو گدھ حملہ کر دیں گے۔ ہمت کر کے مشتاق آقا اُٹھے اور لاشوں کی کمر سے کارتوس، پیٹی، مشین گن، رائفل وغیرہ جمع کرنے لگے۔

سورج ڈوبنے والا تھا۔ قصرِ شیرین پر شعائیں اپنا آخری لمس بکھیر رہی تھیں۔ اُفق پر آسمان پرندوں سے بھرنے لگا تھا۔ مشتاق آقا کی گھبراہٹ لحہ لحہ بڑھتی جا رہی تھی۔ خون اور گوشت کی بو کو سونگھتے سونگھتے گدھوں کے جھنڈ پہنچنے ہی والے ہوں گے۔

دُور سے دھول اُڑاتی جیپیں اور اُوپر شور کرتے ہیلی کاپٹر آگئے۔ لاشوں کو تیزی سے بھرنا شروع کر دیا۔ اندھیرا ہونے سے پہلے میدان صاف ہو چکا تھا۔ مشتاق آقا نے اپنے خیمے میں جا کر ہاتھ منہ دھوئے۔ وضو کر کے شکرانے کی نماز پڑھی۔

پچھلی مرتبہ گدھوں کو لاشوں سے ہٹانے اور اڑانے میں وہ خود بہت بُری طرح سے زخمی ہو گئے تھے۔ گدھوں نے انہیں چونچ اور پنجے جی بھر کر مارے تھے۔ ان کے دو ساتھی، رمضان اور عبداللہ تو ایک ماہ تک ہسپتال میں بھرتی رہے تھے۔

نماز پڑھ کر انہوں نے ہنڈیا تیل کے چولہے پر چڑھائی اور اس میں گھی، چاول، آلو، نمک، پانی ڈال کر ڈھکن بند کر دیا۔ اس جنگ میں ان کے دو لڑکے شہید ہوئے تھے۔ سب سے چھوٹا لڑکا احمد عراق میں قیدی ہے۔ جانے اس معصوم پر کیا گزر رہی ہوگی؟ اس سردی میں وہ پورے چودہ سال کا ہو جائے گا۔ دو سال ہو گئے ہیں اسے گئے

ہوئے۔ زندہ بھی ہے یا ظالموں نے اسے مار ڈالا ہے؟ ہنڈیا کا ڈھکن بھاپ کی تیزی کے باعث اچھلنے لگا تھا۔ چمچے سے چاول چلا کر آنچ کم کر دی۔ باہر نکل کر تاریکی میں اپنی آنکھیں گڑا دیں۔

یہاں سے عراقی سرحد زیادہ دُور نہیں ہے۔ دل کرتا ہے کہ سرحد پار جا کر احمد سے مل آؤں۔ لیکن وہاں پہنچنے کون دے گا! بندوق کی گولیاں جسم بیندھ کر رکھ دیں گی۔ میں بھی کیسا باؤلہ ہو جاتا ہوں کبھی کبھی؟ احمد کی ماں زندہ ہوتی تو میں آج یہاں ہوتا؟ اپنے شہر، اپنے گھر میں ہوتا۔ مگر اب جینے سے دل اُوب گیا ہے۔ سکون کی تلاش میں یہاں آیا، وہ بھی نصیب نہ ہوا۔

ہوائی جہاز تیز آواز کرتے خیمے کے اوپر سے گزر گئے۔ ہماری طرف پھر حملہ ہوا ہے۔ خدا خیر کرے۔ شور دھماکوں سے پورا ماحول گونج رہا تھا۔ مشتاق آقا نے اُبلے چاولوں کو پلیٹ میں نکالا۔ 'بسم اللہ' کہہ کر پہلا نوالہ منہ میں ڈالا۔

''ماماں! ہماری کلاس ٹیچر نے کہا ہے کہ کل سے تم لوگ اسکول نہیں آؤ گے!'' بیٹی نے آنسو بھری آنکھوں سے ماں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''لیکن کیوں؟'' ملیحہ نے اس کی پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے پوچھا۔

''کہہ رہی تھیں کہ تم لوگ منافقین ہو!'' بیٹے نے ماتھے پر آئے بال پیچھے جھٹکتے ہوئے کہا۔

''کھانا کھاؤ! کل اسکول جا کر معلوم کروں گی۔'' کہنے کو تو ملیحہ نے بڑے ٹھنڈے لہجے میں یہ جملہ ادا کر دیا تھا، لیکن اندر ہی اندر طیش کا ایک طوفان جوش مار رہا تھا۔ توہین کے مارے اس کے گلے میں کوئی گولہ سا پھنسنے لگا۔ آخر اس کے بچوں کو موقع پرست کہنے کا حق کس نے دیا ہے۔

''کلاس کے لڑکے لڑکیوں نے بھی چھٹی کے وقت تالیاں بجا بجا کر ہمیں چڑھایا، 'منافقین، منافقین'۔ میں نے بھی انہیں خوب منہ چڑھایا اور کہا، 'حزب اللہی، حزب

الٰہی۔" بیٹے نے کھڑے ہوکر نقل اُتارتے ہوئے کہا۔ اِتنے دکھ میں بھی ملیحہ اپنی مسکراہٹ نہ روک سکی، ہنس کر بولی۔ "شیطان کہیں کے، بیٹھ کر کھانا کھاؤ۔"

کھانے کے درمیان مذاق چلتا رہا۔ شاید ایسا بھی ہوتا ہے، جب غم بہت بڑھ جاتا ہے تو خود دوا بھی بن جاتا ہے۔ وہی اس گھر میں بھی ہو رہا تھا۔ کھانے کے بعد بچے ہوم ورک کرنے بیٹھ گئے اور ملیحہ نے کچن کو سنبھالنا شروع کر دیا۔

"ماماں، میرا جوتا ایک دم پھٹ گیا ہے۔ اس بار ٹھیک بھی نہیں ہوگا۔ سلائی کرتے کرتے ماماں، پورے جوتے میں چھید چھید سے ہو گئے ہیں۔" بیٹی نے جوتا دِکھاتے ہوئے ملیحہ سے کہا۔

"شام کو چل کر نیا جوتا دلوا دوں گی۔" ملیحہ نے برتن دھوتے ہوئے کہا۔

"ماماں، میرے موزے..." بیٹے نے موزے کے سوراخوں میں سے انگلی نکال کر دِکھائی۔

"تمہیں بھی نئے موزے دلوا دوں گی۔" ملیحہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

کام ختم کر کے ملیحہ کچن سے نکلی اور کمرے میں جا کر اس نے کپڑوں کی الماری کھولی۔ سیف سے زیوروں کا ڈبا نکالا۔ بڑی دیر تک کبھی ایک کبھی دوسرا زیور اُٹھاتی، پھر رکھ دیتی۔ فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی کہ کون سا زیور پہلے فروخت کرے۔ تنگ آ کر اس نے دو زنجیریں اٹھائیں اور ڈبا بند کر کے سیف میں رکھ دیا۔ الماری کے دُوسرے خانے سے پرس نکالا اور زپ کھول کر زنجیر اس میں ڈال دی۔ کپڑے بدلے، پھر بچوں کو آواز دی اور ان کو کپڑے بدلوا کر بولی۔ "بازار چلتے ہیں۔ وہیں کہیں کھانا کھا لیں گے۔"

"بازار میں؟ وہاں تو بہت مہنگا ہوگا کھانا۔" بیٹے نے ملیحہ کی ہزار بار کہی بات کو دہرایا۔

"ہم باہر کھانا کھائیں گے؟ اتنے پیسے کہاں سے آئیں گے؟" بیٹی نے بھی حیرت سے پوچھا۔

"آئیں گے کہاں سے، میرے اپنے ہیں۔" ملیحہ نے کہا اور نیچے اُترنے لگی۔ دونوں بچوں کو بڑی حیرت ہو رہی تھی کہ آج ماماں کو ہوا کیا ہے؟

جمعرات ہونے کی وجہ سے بازار میں کافی بھیڑ تھی۔ ملیحہ کو کسی سُنار کی دُکان کی تلاش تھی۔ آگے جا کر ایک لائن میں کئی سونے کی دُکانیں نظر آئیں۔ ملیحہ نے بچوں کو آئس کریم دِلوائی اور کہا۔ ''تم لوگ یہیں کھڑے رہنا، میں ابھی آئی۔''

بچوں کو وہیں چھوڑ کر وہ پہلی دُکان میں داخل ہوئی۔ کاؤنٹر پر پرس سے ایک زنجیر نکال کر رکھی۔ دُکاندار نے اسے اچھی طرح سے پرکھا پھر تولا۔ جنگ کی وجہ سے سونے کا بھاؤ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ دوسو تومان تولہ سونے کا دام اب دو ہزار روپے تولہ ہو گیا تھا۔ دوسری زنجیر بھی ملیحہ نے پرس سے نکال کر ترازو کے قریب رکھ دی۔

''کل تک سونا خریدنے والوں کی بھیڑ رہتی تھی، آج بیچنے والوں کی۔'' دوکاندار نے فلسفیانہ انداز سے کہا۔

ایک دو لوگ دُکان میں بیٹھے تھے۔ انہیں بات کرنے کا موضوع مل گیا۔ ان میں سے ایک نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا۔ ''کل تک ہم کسی سے خوش ہوتے تھے یا کوئی تحفہ دینا چاہتے تھے۔ شگون سمجھ کر نیم پہلوی یا پہلوی کا آدھے تولہ یا ایک تولہ کا سونے کا سکہ دے دیتے تھے، لیکن اب کہاں سے دیں؟ خوشی کا موقع ہی اب کہاں ہے ہماری زندگی میں؟''

''خوشی تو دل کی ہوتی ہے۔ جب دل ہی خون کے آنسو روتا ہو تو شبنم کی بوند ہیرے کی کنی نہیں، بلکہ پانی کی ایک بوند جیسی ہوتی ہے جسے آنسو کہا جاتا ہے۔ اس میں شاعر کا تصور نہیں، بلکہ کسی دُکھے دل کی کہانی نظر آتی ہے۔''

''لیجئے، ٹھیک طرح اسے گن لیں۔'' دُکاندار نے ملیحہ کو دس ہزار تومان کے نوٹ تھماتے ہوئے کہا۔

''ٹھیک ہی ہوں گے۔'' کہہ کر ملیحہ نے نوٹ گننے شروع کر دیے۔ گننے کے ساتھ ہی وہ سوچ رہی تھی کہ ان دس ہزار تومانوں کی اس کمرتوڑ مہنگائی میں گنتی ہی کیا؟ دو ماہ چل جائیں تو بہت ہے۔ سو تومان کے ایک کلو چاول، بچے بھی آلو ڈلے پلاؤ ہی پسند کرتے ہیں۔ دو روپے میں آنے والی صابن کی ٹکیہ اب پندرہ روپے کی ہو گئی ہے، وہ بھی گلنار صابن کی، جو ایرانی ہے۔ غیر ملکی اوّل تو ملتے ہی نہیں ہیں، ملیں بھی تو چالس

پچاس تومان کے۔ کون خریدے گا؟ نوٹ گننے کے بعد اس نے انہیں تین حصوں میں تقسیم کیا اور پرس کے مختلف حصوں میں رکھ کر زِپ لگائی۔

''بہت بہت شکریہ!'' کہہ کر ملیحہ باہر نکلی۔ بچے آئس کریم کھا چکے تھے اور سامنے دُکان پر رکھی پانی کی ٹنکی سے ہاتھ دھو رہے تھے۔ ماں کو دیکھ کر بھاگ کر آئے۔

''چلو، کفشے ملّی کی دُکان پر چلتے ہیں۔'' کہہ کر ملیحہ نے سڑک پار کی اور سامنے والی جوتوں کی دُکان میں داخل ہوئی۔ جوتوں کی قیمتیں دیکھ کر تھوڑی سی پریشان ہوئی، پھر دل ہی دل میں سوچنے لگی۔ مجھے اب ایک وقت ہی کھانا چاہیے۔ اس کے علاوہ بچت کروں بھی تو کہاں سے؟ بڑھتے جسم کو جوتے، کپڑے، کھانے سب کی ہی ضرورت پڑتی ہے۔ کچھ دن بعد کہاں سے لاؤں گی یہ تمام چیزیں؟

''ماماں، یہ جوتا......'' بیٹی نے ملیحہ کی کالی چادر کو کھینچتے ہوئے کتھئی رنگ کے جوتے کی طرف اشارہ کیا۔

دونوں بچے جوتے موزے خرید کر بہت خوش نظر آرہے تھے۔ تینوں دوکان سے باہر نکلے۔ قریب ہی کھلونوں کی دُکان تھی۔ دونوں کی نظریں اس دُکان پر گڑ گئی تھیں۔ ملیحہ کے دل میں ایک ہوک سی اُٹھی۔ جانے کیا سوچ کر دُکان میں داخل ہوئی۔ ایک گڑیا بیٹی کو اور بیٹری سے چلنے والی کار بیٹے کو دلوائی۔ دونوں بچوں کے چہرے پر ایک عجیب سی خوشی کا تاثر تھا جس میں حیرت اور غیر یقینی کی کیفیت زیادہ تھی۔

''آج کباب روٹی کھاتے ہیں۔'' ملیحہ نے کہا اور داہنی طرف مڑی۔ کل ملازمت کرنی پڑے گی تو کرلوں گی مگر ملازمت ملے گی کہاں، کون دے گا؟ اس شہر میں تو اب بھیک ملنی بھی مشکل ہے۔ گھر کا سامان فروخت ہوگیا۔ اب تو صرف چند زیور بچے ہیں جن سے چھ مہینے گاڑی کھنچے گی، پھر آگے جانے کیا ہوگا؟ ملیحہ کی فکرات میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اس سڑک پر بھیڑ بہت کم تھی۔ سڑک کے دونوں طرف سبیلیں سجی تھیں۔ ہر سبیل کے سامنے شہید لڑکوں کی تصویریں لگی ہوئی تھیں۔ لاؤڈ اسپیکر پر 'روزہ خوانی' پڑھی جارہی تھی۔ آس پاس کہیں کھانا بھی پک رہا تھا۔ سالن اور پلاؤ کی تیز خوشبو سے سڑک بھری ہوئی تھی۔ تیز قدم بڑھاتی ہوئی ملیحہ گلی میں مڑی اور اسے پار کر کے پھر چوڑی سڑک پر

آئی۔ سامنے 'کبابی' کی دُکان نظر آئی۔ بچوں کو لے کر وہ اس چھوٹے سے ریسٹورینٹ میں داخل ہوئی۔ کھانے کا آرڈر دے کر وہ سامنے لگے سنک میں ہاتھ دھونے گئی، کہیں ایسا وقت نہ آپڑے کہ مجھے مکان ہی فروخت کرنا پڑے؟ مکان کی قیمت بھی کیا لگے گی؟ آج کل سب ہی مکان فروخت کرنا چاہ رہے ہیں۔ حکومت زیادہ جائداد والوں کی جائداد ضبط کر رہی ہے۔ گھروں کی قیمتیں روز بروز ان ہی وجوہات کی بنا پر گرتی جا رہی ہیں۔ ہاتھ دھوکر وہ واپس آئی۔ دونوں بچے ہاتھ دھونے اُٹھ گئے۔ سامنے دیوار پر امام خمینی کی بڑی سی تصویر لگی ہوئی تھی۔ 'کبھی اس جگہ شاہ کی تصویر لگی ہوگی۔' ملیحہ نے سوچا۔

نان میں لپٹے کباب کی تین پلیٹیں آگئیں۔ پیاز، دہی، کوکا کولا میز پر سجا کر بیرا چلا گیا۔

''شروع کرو بیٹے۔'' ملیحہ نے کہا اور پہلا نوالہ منہ میں رکھا۔

''کھانا مزیدار ہے۔'' بیٹی نے پھولے گال کے ساتھ چمکتی آنکھیں، جن میں خوشی رقص کر رہی تھی، کو گول گول گھماتے ہوئے بھائی سے کہا۔

''ہاں......'' اس نے حامی بھری۔

ملیحہ کو کباب اپنے ہاتھ سے بنائے کباب سے زیادہ مزیدار نہیں لگ رہے تھے، لیکن بچوں کی خوشی دیکھ کر بولی۔ ''آج مزہ آگیا، کھانے میں۔''

کھانے کے بعد تینوں باہر نکلے۔ سنیما ہال میں پولینڈ کی کوئی فلم چل رہی تھی۔ بھیڑ بہت تھی۔ تینوں بھیڑ کو چیرتے ہوئے دوسری طرف نکلے۔ بیکری سے ملیحہ نے کچھ کیک اور پیسٹری خریدی۔ ان کا ڈبا اٹھا کر جب دوکان سے باہر نکلی، تو سوچ رہی تھی، 'چار گھنٹے میں ایک ہزار تومان کہاں چلے گئے؟'

گھر پہنچ کر سب سے پہلے بیٹے نے کار چلانی شروع کی۔ بیٹی نے اپنے بستر پر گڑیا کو سلایا۔ چائے کے ساتھ پیسٹری کھا کر تینوں اپنے اپنے بستر پر لیٹ گئے۔ بیٹی سینے سے گڑیا کو لپٹائے خوشیوں کے خواب میں ڈوبی تھی۔ بیٹا کار پر ہاتھ رکھے خواب میں جانے کیا کیا دیکھ رہا تھا۔ ملیحہ جاگتے ہوئے سامنے کی بھیانک حقیقت کو دیکھ رہی تھی۔ ''یا اللہ! کل کیا ہوگا؟''

اس بھاری بھرکم عورت نے طیبہ کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی۔ پٹی اتنی کس کر باندھی گئی تھی کہ آنکھیں گڈھوں کے اندر دھنستی محسوس ہوئیں اور آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے دھبے رقص کرنے لگے۔

''سیدھا راستہ ہے، منہ اُٹھائے میرے پیچھے چلی آؤ۔'' عورت نے کہا۔ طیبہ خاموش رہی۔ قدم اُٹھاتے ہوئے اسے جھجک محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ چکر سا بھی محسوس ہو رہا تھا۔ آس پاس کے کمروں سے طرح طرح کی آوازیں اس کے کانوں میں آرہی تھیں۔ کافی دُور چل کر پھر آواز اُبھری۔

''داہنی طرف گھومو... ہاں، چلی آؤ... ٹھیک ہے، اب داہنے ہاتھ پر دروازہ ہے، اس میں مڑ جاؤ......'' اس کے بعد طیبہ کو دروازہ بند ہونے کی تیز آواز سنائی پڑی۔

''کون ہے؟'' کسی نرم سی آواز نے طیبہ سے پوچھا، جو کمرے میں داخل ہو کر بوکھلائی سی اپنے سامنے کچھ ٹٹول رہی تھی۔

''آپ کون ہیں؟'' طیبہ نے ہڑبڑا کر پوچھا۔

''میں ثریا چھ ماہ سے اس کمرے میں قید ہوں۔ میرے ساتھ چار اور تھیں، وہ جانے کہاں لے جائی گئی ہیں!''

''میرا نام طیبہ ہے، آج ہی لائی گئی ہوں۔''

''جرم کیا ہے؟ نشہ، ناجائز تعلقات یا اسلامی قوانین کی خلاف ورزی۔'' ثریا نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔ ان کی نظروں میں کون سا گناہ کیا ہے میں نے؟ اپنی نظروں میں تو میں مجرم نہیں ہوں۔'' طیبہ نے بڑے اعتماد سے کہا۔

اس کے بعد کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ کمرے کے باہر بھاری جوتوں کی تیز آواز گونج رہی تھی۔ اچانک تین فائر گونجے۔ اسی کے ساتھ تین چیخیں، پھر خاموشی چھا گئی۔

''مجھ پر ناجائز تعلقات کا الزام ہے۔'' ثریا نے کہا۔

''جس کے ساتھ تعلقات تھے وہ کہاں ہے؟ جیل میں ہے؟'' طیبہ نے پوچھا۔
''اسے مرے دو سال ہو گئے ہیں۔ میں بیوہ ہوں۔'' ثریا نے تلخی سے کہا۔
''میں کچھ بھی نہیں؟'' طیبہ ٹٹولتی ہوئی اس کے قریب جا کر بیٹھ گئی۔
''آج سے چھ سال پہلے میری منگنی ہوئی تھی۔ ایک سال بعد نکاح۔ نکاح کے بعد حمید ایران سے باہر کسی ڈوسرے ملک چلے گئے۔ پڑھائی کے درمیان جب وہ آتے تو مانی ہوئی بات ہے کہ وہ میرے شوہر تھے، میں ان کے ساتھ گھومنے پھرنے جاتی تھی۔ دو سال بعد ہماری رخصتی ہوئی۔ اسی کے بعد انقلاب ہوا۔ جہاں میں کام کرتی تھی، ان لوگوں نے شکایت کردی کہ حمید نام کے ایک آدمی سے میرے ناجائز تعلقات تھے۔ لاکھ صفائی دی، کاغذات دکھائے، لیکن مجھے یہاں لاکر ڈال دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ دونوں حمید الگ الگ ہیں، تم جھوٹ بولتی ہو۔'' ثریا کی آواز میں غصہ تھا۔
''حقیقتاً تمہارا جرم کیا تھا؟'' طیبہ نے سرگوشی سے پوچھا۔ خاموشی چھائی رہی۔ ثریا کی صرف سانسیں طیبہ کو تیز تیز چلتی سنائی پڑیں۔
''کچھ تو تم نے ضرور کیا ہوگا؟'' طیبہ نے ہنستے ہوئے کہا۔
''تمہاری طرح میں نے بھی اپنی نظروں میں کوئی جرم نہیں کیا ہے۔'' ثریا نے کہا۔
''ان کی نظروں میں تم نے کیا جرم کیا تھا؟'' طیبہ بولی۔
''آفس میں جو نیا افسر آیا تھا وہ مجھ سے صیغہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے انکار کردیا تھا۔'' ڈوبتی آواز میں ثریا نے کہا۔
''بہت خوبصورت ہو؟'' طیبہ نے پوچھا۔
''پتہ نہیں۔ لیکن عورت تو ہوں!'' ثریا نے تلخی سے کہا۔
''یہ بہت اہم بات ہے... تم ٹھیک کہتی ہو، ثریا......'' طیبہ کے لہجے کا اُتار چڑھاؤ ثریا کو اندر تک جھنجھوڑ گیا۔
''حمید نے مرنے سے پہلے اور امام خمینی کے آنے کے بعد داڑھی رکھ لی تھی... ان کے ہاتھوں میری اور حمید کی تصویریں پڑ گئیں، جس میں حمید ٹائی سوٹ میں بغیر داڑھی کے ہے۔ حمید نے دو جگہ نوکری کی تھی۔ دونوں جگہ کے شناختی کارڈ کی تصویریں مختلف

ہیں۔ بہت کہا، سمجھایا، لیکن وہی بات یہ دہراتے رہے کہ وہ دونوں ایک نہیں، دو لوگ ہیں۔" ثریا نے بتایا۔

"تمہاری آنکھوں پر بھی پٹی بندھی ہے؟"

"ہاں، یہ بھی ایک قسم کی سزا ہے... ساٹھ کوڑے کھا کر بھی جب میں 'صیغے' کے لیے راضی نہیں ہوئی تو میرا جرم زیادہ سنگین ہوگیا۔ اس لیے یہ دوسری سزا کا دور کل سے شروع ہوا ہے۔"

اچانک دروازہ کھلا اور کرخت آواز اُبھری، "باہر نکلو!"

دونوں کھڑی ہوگئیں اور آگے بڑھنے لگیں۔ کمرے سے نکل کر وہ ٹٹولتی ہوئی باہر آکر کھڑی ہوگئیں۔

"ناک کی سیدھ میں چلو۔" اسی آواز نے حکم دیا۔

"اب آگے سیڑھی ہے، نیچے اترو... ہاں ٹھیک ہے... اب سیدھی چلتی جاؤ۔" آواز برابر حکم دے رہی تھی۔ طیبہ اور ثریا نے محسوس کیا کہ وہ کسی کھلی جگہ پر ہیں اور دھوپ کافی تیز ہے۔ پیر کے نیچے پختہ نہیں، بلکہ کچی اوبڑ کھابڑ زمین ہے۔

"ان کی آنکھوں کی پٹی کھول دو... سر اونچا... سیدھ میں رکھو۔" پھر حکم ملا۔

طیبہ اور ثریا کی آنکھوں کی پٹی کھولی گئی۔ جیسے ہی پٹی ہٹی، طیبہ نے آنکھیں کھولیں۔ سورج کی لپکتی شعاؤں نے جیسے گرم تیز سلاخیں اس کی پتلیوں میں چبھو دی ہوں۔ درد کی تیز لہر سے اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ پورا جسم پسینے میں شرابور ہوگیا اور شدید تمازت خون میں سرایت کر گئی۔ سر کو دو ہاتھوں نے پیچھے سے آکر زبردست طریقے سے پکڑ رکھا تھا۔ ثریا کا بھی یہی حال تھا۔ آج اس کا دوسرا دن تھا، اس لیے طیبہ سے اس کا حال بدتر نہیں تھا۔

"اندر لے جاؤ انہیں۔" آواز نے حکم دیا۔

طیبہ کی آنکھوں کے سامنے تارے ٹوٹ رہے تھے۔ چکر کی وجہ سے وہ لڑکھڑاتی ہوئی سی چل رہی تھی۔ راستہ اس نے کیسے پار کیا، ثریا اس کے ساتھ تھی یا نہیں، اسے کچھ یاد نہیں۔ اسے تو بس محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بیہوش ہوئی جا رہی ہے۔

کمرے میں لے جا کر پھر آنکھوں پر پٹی باندھ دی گئی۔ بیہوش ہونے سے قبل طیبہ نے دُور سے سنا۔

''اسے پانی دے دو۔''

اس کے بعد اسے کچھ یاد نہیں رہا۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے نرم ہاتھوں کا لمس اپنے گالوں پر محسوس کیا۔ آنکھیں کھل تو نہ سکتی تھیں، پٹی کی جکڑن بہت زبردست تھی۔ پتلیاں گھمانے کی کوشش کی تو درد کی چھریاں چبھتی ہوئی سی محسوس ہوئیں۔

''کیسی ہو، طیبہ؟'' ثریا نے پوچھا۔ اس کے ہاتھوں کا نرم لمس اب بھی طیبہ اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔

''ٹھیک ہوں، اور تم؟'' طیبہ نے پوچھا۔

''میں یہاں کے ماحول میں دو ماہ سے ہوں۔ ہر دن زیادہ رچا بسا محسوس کرتی ہوں خود کو۔'' ثریا نے لمبی سانس کھینچتے ہوئے کہا۔

''اتنی نا اُمید مت ہو، ثریا۔'' طیبہ نے اس کے ہاتھوں کو سہلایا۔

''اُمید بھی کیا کروں؟'' ثریا نے طیبہ سے جیسے پوچھا ہو۔

''آزادی کی ......اور کون سی اُمید۔'' طیبہ نے کہا۔

''اُٹھو، کھانا کھالو... کب سے رکھا ٹھنڈا ہو رہا ہے۔'' ثریا نے تلخ ہنسی ہنستے ہوئے کہا۔

دونوں نے سٹول کرسیٔ آگے کھینچی۔ پانی سے ہاتھ دھوئے۔ کھانے کے نام پر پنیر اور روٹیاں تھیں۔ دونوں چپ چاپ کھاتی رہیں۔ ایک نا اُمیدی میں زندگی کاٹ رہی تھی، دوسری نا اُمیدی کی تمام بیڑیاں توڑنا چاہ رہی تھی۔

''اتنا چھوٹا کمرہ ہے کہ پاؤں پھیلانا بھی مشکل ہے۔'' طیبہ نے کھانے کے بعد لیٹتے ہوئے کہا۔

''میں تو اپنے پاؤں دیوار پر اونچے کر کے رکھتی ہوں، تم بھی وہی کرو... مڑے مڑے گھٹنے اور جانگھیں زخم کی طرح دُکھتے ہیں۔'' ثریا نے لیٹتے ہوئے کہا۔

''ہاں ترکیب تو اچھی ہے۔'' طیبہ نے دیوار پر پاؤں پھیلا لیے۔

''تمہاری شادی ہوگئی؟'' ثریا نے سوال کیا۔

''نہیں۔'' طیبہ نے کہا۔

''کیوں؟ اب تک شادی کیوں نہیں کی؟'' ثریا نے حیرت سے پوچھا۔

''بس، نہیں ہوئی۔'' طیبہ نے لاپرواہی سے کہا۔

''تمہارا جرم ان کی نظروں میں؟'' ثریا نے سرگوشی کی۔

''میرے مضامین...'' طیبہ نے کہا۔

''اوہ... سمجھی!'' ثریا اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔ دونوں کے بیچ سناٹا چھا گیا۔ کوئی کچھ نہیں بولا۔

''کچھ بدلے گا، طیبہ؟'' ثریا نے خاموشی کو توڑتے ہوئے بڑی امید سے پوچھا۔

''بالکل! کیا تم نے سخت برف کو پگھلتے دیکھا ہے، اس کے نیچے دبی جکڑی زمین پر پھوٹتی کونپلیں دیکھی ہیں؟'' طیبہ نے اُمید سے بھرپور آواز میں پوچھا۔

''ہاں دیکھی ہیں۔'' ثریا نے کہا۔

''پھر نا اُمیدی کیسی؟'' طیبہ نے کہا۔

دونوں کے درمیان پھر خاموشی چھا گئی۔ کمرے میں صرف دل کی دھڑکن اور سانسوں کے اتار چڑھاؤ کی آوازیں تھیں اور باہر بھاری قدموں اور کرخت آوازوں کا شور تھا۔

شہناز کو اب اپنے کام میں بہت گھٹن کا احساس ہونے لگا تھا۔ خبروں کے نام پر صرف پروپیگنڈہ ہوتا تھا۔ کچھ لکھ کر مطمئن ہوجانا کب کا بند ہو چکا تھا۔ دل کی خوشیاں

بھی جیسے چھن سی گئی تھیں۔ ادھر کردستان میں جدوجہد نے بڑی خطرناک شکل اختیار کر لی تھی۔ رونگھٹے کھڑے کر دینے والے واقعات دل میں عجیب احساسات جگاتے تھے۔

شہناز' کوملے'نام کے سیاسی گروہ میں شامل تھی، پھر ڈیموکریٹک پارٹی کی ممبر بن گئی لیکن ماں نے بڑی مشکلات، لیکن چالاکی سے اسے تہران بھیج دیا تھا۔ اس وقت شہناز کی عمر تقریباً چودہ پندرہ سال تھی۔ انٹر کے امتحانات اسی سال دیے تھے۔ چونکہ انٹر فرسٹ کلاس سے پاس کیا تھا اس لیے فارم بھر کر یونیورسٹی میں داخلے کے لیے' کنکور' کے امتحان میں بیٹھ گئی۔ وہاں بھی اچھے نمبر آئے۔ تہران کی چمک دمک نے کوملے اور ڈیموکریٹک پارٹی دونوں کا بھوت سر سے اتار دیا۔

شہناز کی ماں کو احساس ہو رہا تھا کہ وہ بھوت جو انہوں نے بڑی مشکل سے اتارا تھا، اب پھر شہناز کے سر پر سوار ہو رہا ہے۔ خصوصاً تب سے، جب سے طیبہ جیل گئی ہے۔ پری جو شہناز کی سب سے اچھی دوست تھی، وہ تہران میں نہیں تھی۔ دوسری سہیلیاں مہناز، سوسن سب جانے کہاں ہیں؟ وہاں تک ان کی پہنچ بھی نہیں ہو سکے گی۔ اچھا ہے وہ خود بیٹی کو سنبھالیں۔ ایک اولاد ہے، وہ بھی شہید ہو جائے یہ انہیں منظور نہ تھا۔ گزشتہ پچاس برسوں سے کردی مر مر کر پہاڑیوں کے ڈھیر میں تبدیل ہو گئے ہیں، مگر کیا کچھ بدلا؟ پہلے سے زیادہ شدید مار پڑ رہی ہے۔ کھانا، پینا ہر چیز کی پریشانی ہے کردستان میں۔ وہاں جا کر شہناز تو بندوق اٹھا لے گی ہاتھ میں، لیکن وہ کیا کریں گی؟ وہ بھی بندوق اٹھالیں؟ رات کے دس بج رہے ہیں، ابھی تک شہناز کا پتہ نہیں ہے۔ یہ بھی کوئی ملازمت ہوئی؟

کاک حسن کو آنے دو، تمام باتیں کھل کر کروں گی۔ تھک گئی ہوں میں۔" وہ بستر پر اُٹھ کر بیٹھ گئیں، گھڑی پر نظر ڈالی، پھر بغیر ضرورت باتھ روم کی طرف بڑھیں۔ کھٹ پٹ سن کر بہن نے پوچھا۔

"کیا نیند نہیں آ رہی ہے؟"

"تم کیسے جاگ رہی ہو؟ دس بج رہے ہیں!"

"شہناز کی طرف دل لگا تھا۔"

''اسی کی وجہ سے مجھے بھی نیند نہیں آ رہی ہے۔''

''کل میں جب شہر کی طرف گئی تھی تو زہرا کے گھر چلی گئی۔ کافی دیر بیٹھی رہی۔ دونوں بچے انٹر کر کے گھر بیٹھے ہیں کہ کیا کریں؟ زہرا رو رو کر کہہ رہی تھی۔ 'بہن میں پاگل ہو گئی ان لڑکے لڑکیوں کے چلتے۔ ہمیشہ اسکول کالج جاتے رہے ہیں، اب جو بے کار گھر میں بیٹھے ہیں تو سر کھاتے ہیں، کیا کریں ماماں؟ کیا کریں، ماماں؟ نہ سنیما، نہ ڈراما، نہ تفریح، نہ پڑھائی اور نہ کتابیں؟ کیا کریں یہ جوان؟ بھائی، بہن بھی ساتھ ساتھ باہر نہیں نکل سکتے۔' اس کی پریشانی سن کر، سمجھ کر واقعی میں پاگل ہو اٹھی تھی۔ کم از کم اس نوکری سے شہناز کے پاس وقت کیسے گزرے، اس کی پریشانی تو نہیں ہے۔ ورنہ ہمارا سر کھاتی۔''

''وہ تو ہے، مگر اور بہت سی ملازمتیں ہیں۔ کیا یہی ایک بچی ہے۔'' بہن کی بات کا جواب انہوں نے دیا۔

''لو، شاید آ گئی ہے۔'' بہن نے کہا۔ گلی میں کسی کے قدموں کی آوازیں اُبھر رہی تھیں۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر دستک ہوئی۔ ماں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا۔ شہناز کے ہاتھ میں پٹی بندھی دیکھ کر وہ چیخ پڑی۔ ''کیا ہوا میری بچی تمہیں؟''

''کچھ نہیں، ماماں! تھوڑی سی چوٹ لگ گئی ہے، خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' شہناز نے تھکے چہرے پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔

''ہوا کیسے؟'' خالہ نے شہناز کے ہاتھ سے پرس لیتے ہوئے کہا۔

''بس! ایک جگہ رپورٹ کے لیے گئی تھی۔ تبھی گھر پر حملہ ہوا تھا۔ اسی میں ایک گولی میرے بازو کو چھوتی ہوئی گزر گئی۔'' شہناز نے سینڈل اتارتے ہوئے کہا۔

''کتنی بار کہا ہے کہ ایسی جگہوں پر مت جایا کرو، لیکن میری سنتا کون ہے؟'' ماں نے بیٹی کے بازو پر بندھی پٹی کو سہلاتے ہوئے کہا۔

''ملازمت میں سب کرنا پڑتا ہے، اسی کا تو پیسہ ملتا ہے۔'' شہناز نے ہنس کر کہا۔

''میں کیسی روتی گڑگڑاتی تھی، لیکن وہ کب سنتے تھے؟ دس سال جیل میں سڑے اور پھر ایک دن گولی سے اڑا دیے گئے۔ وہی ہٹ، وہی باپ والی ضد بیٹی میں بھی

ہے۔'' کہتی ہوئی شہناز کی ماں کچن کی طرف بڑھیں۔

''خالہ! آپ بھی ماماں کو نہیں سمجھاتی ہیں۔ یہ وقت کچھ ایسا ہے کہ آپ چاہیں یا نہ چاہیں، آپ کا حصہ ہوگا ان تمام حادثات و واقعات میں جو بھی اس ملک پر گزر رہے ہیں۔ میں کیسے یہاں پر رہتے ہوئے خود کو دُور کھینچ لوں؟'' شہناز نے خالہ کی جانب بڑی بے بسی سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''سمجھاتی تو ہوں، لیکن جس عورت نے باپ، بھائی، شوہر کھو دیا ہو وہ بیٹی بھی کھودے، بڑا مشکل ہے۔ مجھ سے زیادہ تم اپنی ماں کو جانتی ہو۔ خوشیاں اس نے دیکھی کہاں ہیں؟ غریبی و مفلسی میں ہمیشہ کٹی ہے۔ تم جو خوشیاں دے رہی ہو وہ اپنے ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہتی ہے۔'' خالہ نے شہناز کے سرہانے تکیہ لگاتے ہوئے کہا۔

''لو، گرم دودھ پی لو، جانے کتنا خون بہہ گیا ہوگا۔'' فکر سے شہناز کی ماں نے کہا۔

''آپ کو یہاں اچھا نہیں لگتا ہو تو ہم واپس چلیں۔'' شہناز نے آہستہ سے کہا۔

''کس نے کہا مجھے اچھا نہیں لگتا ہے؟ بس تیری یہ نوکری مجھے پسند نہیں ہے۔ جگہ بدلنے سے تو اچھا ہے کہ نوکری بدل لو۔ کہیں پڑھانے کی نوکری نہیں مل سکتی ہے کیا؟'' بادام کی طشتری بیٹی کے آگے رکھتے ہوئے وہ بولیں۔

''اسکول کی نوکری تبھی آسانی سے ملتی ہے جب کسی نے زراعتی شعبۂ جہاد یا جہادِ زندگی میں تھوڑا بہت کام کیا ہو، وہاں کام کرنے کا مطلب ہے کہ میں ایک سال یا چھ ماہ کے لیے گاؤں جاؤں۔'' شہناز نے بادام منھ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''وہی کرو، کم از کم باقی زندگی سکون سے تو کٹے گی۔ کل شادی ہوئی تو کون مرد پسند کرے گا کہ اس کی بیوی رات کے دس بجے گھر لوٹے!'' ماں نے کہا۔

''اب کوئی اچھی بات کرو۔ لڑکی تھک کر آئی ہے۔'' خالہ نے کہا۔

''تمہاری سب سہیلیاں کہاں گئیں؟ کسی کا پتہ نہیں ہے؟ ماں نے پوچھا۔

''پری ایران سے باہر چلی گئی، کہاں گئی معلوم نہیں! تم جانتی ہو کہ مہناز جرمنی میں ہے۔ اختر کی شہادت کا تمھیں پتہ ہے۔ طیبہ جیل میں ہے۔ ملیحہ دکھ میں بھی اپنی کشتی کنارے لگانے کے لیے کشمکش کر رہی ہے۔ صنوبر کا برین ہیمرج سے انتقال ہوگیا۔''

اتنا کہہ کر شہناز نے آنسو چھپانے کے لیے آنکھیں بند کر لیں۔

''کب ہوا انتقال؟'' خالہ نے چونک کر پوچھا۔

''دو ماہ پہلے آئی تھی، اچھی بھلی تھی۔'' ماں نے اداسی سے کہا۔

''دو ہفتے پہلے ہوا ہے۔ آج اس کا چھوٹا بھائی لطیف مل گیا تھا ہسپتال میں، اس کے بھی پیر میں گولی لگی تھی۔ وہ تو ایک مہینے سے بھرتی ہے۔'' شہناز نے افسردہ لہجے سے کہا۔

''وہ کیوں؟'' ماں نے پوچھا۔

'' فوج میں ہے نا، بصرہ کے قریب عراق میں قید ہوتے ہوتے بچا، مگر بھاگتے ہوئے چار گولیاں ٹخنے میں لگ گئیں۔ پیر کاٹ دیا گیا ہے۔'' شہناز نے لمبی سانس کھینچی۔

''اس کی عمر کیا ہوگی۔ شادی ہوگئی ہے؟'' خالہ نے پوچھا۔

''صنوبر سے پانچ سال چھوٹا تھا۔ آج کل تو خالہ، سب عمر کے لوگ فوج میں جا رہے ہیں۔ بچے بوڑھے، جوان۔ لڑائی کو بھی تین سال گزر گئے۔'' شہناز نے دودھ کا خالی گلاس رکھتے ہوئے کہا۔

''پندرہ سے پچیس سال تک ہمیشہ سے فوجی ٹریننگ ضروری تھی۔ اب تو ضرورت بھی ہے۔ انہیں فوج میں جانا پڑتا ہے۔ ہمارے لڑکے ہوتے وہ بھی جاتے۔ ملک مشکل میں ہو تو جوان ہاتھ پر ہاتھ رکھے تھوڑے ہی بیٹھیں گے!'' خالہ نے جھوٹے برتن اُٹھاتے ہوئے کہا۔

''اس بد بخت علی رضا کو دیکھا تھا اس دن! کیسا پھوٹ پھوٹ کر رو رہا تھا کہ 'میں لڑنے نہیں جاؤں گا، ماماں۔ بابا سے کہو، مجھے کہیں چھپا دیں۔ کہیں بھیج دیں مجھے، دو روز تک لڑائی کے ڈر اور موت کی دہشت سے کھانا نہیں کھایا تھا۔ ماں باپ کیا کرتے، کہاں چھپا کر رکھتے! سرکاری حکم تھا۔'' ماں نے شہناز کے پیروں پر چادر ڈالتے ہوئے کہا۔

''اگر میں لڑکا ہوتی اور مجھے فوج میں جانا پڑتا تو تم کیا کرتیں؟ تب بھی اتنا ہی

بگڑتیں جتنا آج میری اس نوکری کو کوستی ہو؟" شہناز نے ہنستے ہوئے کہا۔
"تب کی تب سوچتی۔" ماں نے بچے بادام ڈبے میں ڈالتے ہوئے کہا۔
"شہناز کو سونے دو۔ رات کافی ہوگئی ہے، اب تم بھی آرام کرو۔" خالہ نے یہ کہہ کر لائٹ بجھا دی۔ شہناز، ماں اور خالہ کو یہ سچ نہیں بتا پائی تھی کہ اس کو نوکری چھوڑے عرصہ ہوگیا ہے۔ اب وہ آزاد صحافی بن گئی ہے اور اس نے پیسوں کی خاطر دوسروں کے لیے لکھنا شروع کردیا ہے۔ لیکن وہ مطمئن ہے کہ اس نے اپنی قلم کا غلط استعمال نہیں کیا ہے۔

پہلی مرتبہ ماہا آباد ٹیلی ویژن پر ان کردیوں کو دکھایا گیا جن کو حکومت نے پھانسی دی تھی۔ اس خبر نے پورے ایران میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ کرد زیادہ منظم ہونے لگے تھے۔ دوسرے علاقوں سے کھانا پینا کب سے آنا بند ہوگیا تھا۔ عراق کے راستے سے جو چیزیں آرہی تھیں وہ بے حد مہنگی تھیں۔ کردی کرتے بھی کیا؟ سردی بہت سخت گزرتی تھی۔ ہر اعتبار سے جدو جہد، خورد و نوش سب طرح کی پریشانی بڑھ جاتی تھی، لیکن پتھر کا سرہانہ، پتھر کا بچھونا، یہی کردوں کی زندگی ہوکر رہ گئی تھی۔ ان کا ایک ہی خواب تھا، کردستان میں کردوں کی اپنی حکومت کا قیام۔
بھوک کے پیٹ پر پتھر باندھے، پتھر کا سینہ تانے کمر میں لٹکتی بندوق لیے کردی اپنی پہاڑیوں پر گھومتا نظر آتا تھا۔ انہیں کردوں میں سے تھا ایک کرد کاک حسن۔ اسے دیکھ کر ہر دماغ میں خیال ابھرتا تھا، چٹان حسن! چوڑا چکلا سینہ، پتلی کمر کے نیچے بھاری کولہے، لمبوترا چہرہ، بڑی بڑی آنکھیں، زندگی سے بھرپور گلابی ہونٹوں پر کالی گھنی مونچھیں۔ شلوار کرتا اور پگڑی، کمر میں چاقو اور کندھے پر رائفل! جو دیکھتا، دیکھتا رہ جاتا تھا۔ نشانہ باز ایسا کہ آنکھ بند کرکے گولی چلائے یا خنجر پھینکے تو وہ سیدھا جاکر دشمن کے دل پر وار کرے۔ کاک حسن شہناز کا چچا زاد بھائی تھا۔
گاؤں میں سناٹا پڑا تھا۔ اوپر آسمان پر تارے بکھرے تھے۔ پھیکے چاند کی روشنی

پہاڑی کی چوٹیوں پر پھیلی تھی۔ کاک حسن انہیں پہاڑیوں کی گود میں لیٹا، اندھیرے میں رائفل کا نشانہ باندھ رہا تھا۔ قریب ہی اس کا چھوٹا بھائی کاک حسین لیٹا تھا۔ دونوں بھائیوں کا جگری دوست مصطفیٰ چٹان سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔

''تاروں پر نشانہ باندھنے سے کیا فائدہ؟ دشمن جب آئے گا تب سینہ چیر کر رکھ دیں گے۔ ابھی تو کاک حسن، بانسری بجاؤ۔'' کاک حسین اٹھ کر بیٹھ گیا۔

''میرے دل کی ایک خواہش بچپن سے مجھے بے چین کیے ہوئے ہے کہ کاش، میں شاہین ہوتا، اپنے بڑے بڑے بازو پھیلا کر اوپر آزاد نیلگوں آسمان کی بلندی کا لمس پاتا۔ جب تک دل چاہتا، اڑتا رہتا۔ اپنے بازوؤں میں سورج کی شعاؤں کی گرمی بھرتا اور...''

''انہیں جذبوں کو بانسری میں بیان کرو، کاک حسن۔'' مصطفیٰ نے کھڑے ہوکر اپنے مچھلیوں سے بھرے مضبوط بازوؤں کو سر کے اوپر سے لے جاکر کمر جھکا کر انگلی کے پوروں سے پیر کے انگوٹھے کو چھوا۔

''بجاتا ہوں، بجاتا ہوں، اتنی جلدی کیا ہے؟'' کہہ کر کاک حسن نے صدری کے اندر سے بانسری نکالی اور اُسے منھ سے لگایا۔ مدھم دُھن نکالتا ہوا وہ اوپری چٹان کی جانب بڑھا اور اس پر بیٹھ گیا۔ دھن نکل چکی تھی، اس لیے آرام سے بیٹھ کر اس نے بانسری کے جگر سے بڑی غمگین تان نکالی۔ پہاڑیوں پر پھیلی روپہلی چاندنی میں شام کے دھند لکے کا تاثر اُبھر آیا۔ ستاروں اور چاند میں ایک نئی روشنی پھیل گئی۔ بانسری کی تان نے پیڑوں سے سرگوشی کرنی شروع کر دی۔ کاک حسین اور مصطفیٰ بانسری کی دھن میں کھو گئے۔ اس دھن کے ذریعہ وہ پتھر پر بیٹھے بیٹھے پورے کردستان کا لمس محسوس کر رہے تھے۔ گیہوں کی سنہری بالیوں سے لدے کھیتوں کے بیچ دوڑتے، اناج سے بھرے کھلیانوں میں لوٹ رہے تھے۔ بارش کی تیز جھڑی میں ہل چلا رہے تھے، بیج بکھیر رہے تھے۔ پھلوں سے لدے درختوں کو ہلا کر لڑکیوں کا دامن بھر رہے تھے۔

بانسری کی آواز پہاڑیوں کی پیشانیاں چومتی آسمان کا سفر طے کر رہی تھی۔

صبح کے وقت گھوڑا دوڑاتے قاصد نے جب کاک حسن کو خط دیا تو اس نے لاپرواہی سے موڑ کر جیب میں رکھ لیا اور اپنی گھیر دار شلوار کے ساتھ وہ پالتھی مار کر وہیں پلنگ پر بیٹھ گیا۔ ماں اُپلے پاتھ رہی تھی۔ گائے کا دودھ دوھ کر کاک حسین نے بالٹی چبوترے پر رکھی، بڑا گلاس تازہ دودھ کا بھر کر بھائی کو دیا اور خود گائے کا چارا ٹھیک کرنے لگا۔

بہن سر پر پانی کا گھڑا رکھے چلی آرہی تھی۔ اسے دیکھ کر کاک حسین نے ماں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''کب تک بٹھائے رکھوگی گل افروز کو۔ کل رات پھر مصطفیٰ اشاروں میں کہہ رہا تھا۔''

''میں کیوں دیر کرنے لگی؟ باپ سے کہو۔'' کہہ کر ماں نے ہودے میں ہاتھ دھوئے۔

''آج بات کروں گا۔'' کاک حسن نے مرغیوں کی طرف دانہ اچھالتے ہوئے کہا۔

''خط کس کا آیا ہے؟ شہناز کی ماں کے خط کا مجھے انتظار تھا۔'' ماں نے سر پر بندھے رومال کو کستے ہوئے کہا۔

''انہیں کا خط ہے، لو۔'' کاک حسن نے کہا اور باہر نکل گیا۔

''پڑھ کر سناؤ، حسین!'' ماں نے ڈربے سے انڈے نکال کر ڈولچی میں ڈالے۔

''چچی پریشان ہیں۔ کاک حسن کو بلایا ہے۔'' کاک حسین نے خط پڑھ کر بتایا۔

''مجھے پتہ ہے، اس کی پریشانی شہناز ہے۔ کاک حسن بتیس سال کا ہوگیا ہے، اب شادی کر لینی چاہیے۔ بڑھاپے کی شادی میں کیا بھید ہے، میں نہیں سمجھ پاتی ہوں جو کاک حسن ہمیشہ اپنی بات ٹالتا ہے اور مصطفیٰ کی باتیں کرتا ہے۔'' ماں دہی بلونے بیٹھ گئی تھیں۔

''تم خود بیچ میں پڑ کر کچھ زبردستی کرادو، ورنہ کاک حسن قابو میں آنے والا نہیں ہے۔'' کاک حسین نے کہا اور بچھڑے کو کھول کر گائے کی طرف ہانک دیا۔

''کاک حسن اور گل افروز کی شادی ساتھ ساتھ کر دیتی ہوں۔'' کہہ کر ماں نے متھنی کی رفتار تیز کر دی۔

''دیکھ لو......!'' کہہ کر کاک حسین گھر سے باہر نکل گیا۔

دھوپ گاؤں کے تالاب تک سرک آئی تھی۔گاؤں کی عورتیں تالاب کے کنارے پانی بھرنے اور کپڑے دھونے میں مشغول تھیں۔ گائیں، بکریاں گھاٹی میں ہری ہری گھاس چر رہی تھیں۔ کچے مکانوں سے دھواں نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ ابھی صبح کے آٹھ ہی بجے تھے، لیکن زندگی ایسی رواں دواں نظر آ رہی تھی جیسے بھری دوپہر ہو۔

کاک حسن اپنی دھن میں چلتا ہوا پہاڑی کے اس پار پہنچ گیا۔ جنگلی پھولوں کو توڑ کر ان کا گلدستہ بنایا، پھر جانے کیا سوچ کر اسے پہاڑی جھرنے میں بہادیا۔

'وہ خط چچی کا ہے۔ مجھے پتہ ہے اس خط میں کیا لکھا ہوگا؟ ایک طرف شادی کا اصرار، دوسری طرف کردستان کے موجودہ حالات سے فرار...! چچی آخر چاہتی کیا ہیں؟ شہناز میرے ساتھ رہ کر کیا جدوجہد سے کٹ کر رہے گی؟ یا پھر چچی یہ چاہتی ہیں کہ میں تہران جا کر رہوں؟'

جھرنے کے کنارے بیٹھا بیٹھا کاک حسن سوچ میں ڈوبا چھوٹے چھوٹے پتھر اٹھا کر پانی میں تیرتی مچھلیوں کو مار رہا تھا، 'مجھ سے کردستان نہیں چھوٹے گا۔ کردستان میری سانسوں میں بسا ہے۔ کردستان کو ہمیں آباد کرنا ہے۔ اس سرزمین کو اب تک خون سے سینچا ہے۔ کتنا خون بہا ہوگا اپنی حکومت کی مانگ کے چلتے اس سرزمین پر؟ مٹی اُٹھا کر اگر کوئی نچوڑے تو خون کی بوندیں گریں گی۔ ایسی حالت میں کردستان کو میں چھوڑ دوں اور اس شہر میں جا کر بسوں جہاں کے لوگ اپنا حق بھی مانگنا نہیں جانتے۔'

''کاک حسن! کاک حسن! گھر چلو، ماں بلا رہی ہے۔'' نیچے سے گل افروز نے آواز دی۔

ہاتھ کے کنکر کو پانی میں پھینک کر کاک حسن اُٹھ کھڑا ہوا۔

''کیا بات ہے، گل افروز؟'' کاک حسن نیچے اترتے ہوئے بولا۔

مجھے کیا پتہ؟''

دونوں جب گھر پہنچے تو آنگن کے اکلوتے درخت کے سائے میں کاک حسنین بیٹھے تھے۔ ماں روٹی پر گھی لگا کر مٹھے کے ساتھ انہیں دے رہی تھیں۔ کاک حسن خاموشی سے باپ کے قریب چٹائی پر جا کر بیٹھ گیا۔ ماں نے اس کا ناشتہ بھی سامنے رکھ دیا۔

''گل افروز کی شادی اگلے ماہ کرنے کی سوچی ہے، ساتھ میں تمہاری ذمہ داری بھی پوری کرنی ہے۔'' گلاس سے مٹھے کا بڑا سا گھونٹ بھر کر کاک حسنین نے بیٹے کی طرف دیکھا۔

''چچی کردستان میں رہنا پسند کریں گی؟ میں تو تہران جا کر رہوں گا نہیں۔'' کاک حسن نے دوٹوک الفاظ میں بات کہہ دی۔

''وہ بات صاف ہے۔'' کاک حسنین نے کہتے ہوئے خالی گلاس چٹائی پر رکھا۔

''کردستان کل آزاد ہوگا تو کام ہی کام ہوگا۔ ملازمتوں کی پریشانی نہیں ہوگی۔'' کاک حسن نے کہا۔

''ہم غریب لوگ ہیں۔ پشت در پشت سے بھوک اور ظلم سے لڑتے چلے آئے ہیں۔ جب زمانہ بدلے گا تب دیکھا جائے گا، ابھی تو جنگ جاری ہے۔'' اتنا کہہ کر کاک حسنین نے اپنا صافہ ٹھیک کیا اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ سامنے دھوپ میں گل افروز گیہوں دھو کر پھیلا رہی تھی۔ یوں تو وہ کام میں مشغول تھی، لیکن اس کے کان بھائی اور بابا کی باتوں کی طرف لگے ہوئے تھے۔

پسینے میں ڈوبے عباس جب اس محلے میں پہنچے تو سب کی نگاہیں ان کی طرف اٹھ گئیں۔ سر جھکائے ہوئے وہ اوپر چبوترے پر جا کر بیٹھ گئے۔ سب کی نظریں ان کے چہرے پر جم گئیں۔

''وہ صلح کے لیے راضی نہیں ہیں، بلکہ مرنے مارنے پر یقین رکھتے ہیں۔ گاؤں میں آٹھ دس بندوقیں ہوں گی، انہیں لے کر جوان تیار رہیں۔ جانے کب کیا ہوجائے؟''

''دفنانے کا کیا ہوا؟''

''ان کا کہنا وہی ہے۔ اگر ان کی یہ ضد ہم مان لیتے ہیں تو آگے جانے کس کس بات کے لیے دبنا پڑے گا۔ مجھ سے جو باتیں ہوئی ہیں وہ میں جوں کی توں سنائے دیتا ہوں۔ آگے کا فیصلہ پنچوں کے ہاتھوں میں ہے۔'' کہہ کر عباس نے جو کچھ گزرا تھا کہہ سنایا۔

سب کچھ سن کر کافی دیر تک خاموشی چھائی رہی، پھر اچانک گاؤں کے بزرگ مشدِ غلام نے زبان کھولی۔ ''لاشیں اپنے قبرستان میں دفنائی جائیں گی۔ ہم تین سو ہیں وہ صرف تین ہیں۔'' پھر منہ دوسری طرف کر کے بولے۔ ''کفنانے دفنانے کا کام شروع کردو۔''

''میں تہران جاؤں یا نہیں؟'' عباس نے پوچھا۔

''پہلے ہم یہیں ان سے نبٹتے ہیں، اگر ضرورت محسوس ہوئی تو تہران چلیں گے۔'' دُوسرے بزرگ شاد محمد نے کہا۔

''مجھے شک ہے کہ اس طرح کا کوئی قانونی حکم اوپر سے ملا ہوگا۔'' کسی نے کہا۔

''تب انہیں بتانا ضروری ہو جاتا ہے کہ اسلام کے نام پر لچے لفنگے شریفانہ نقاب لگا کر کس طرح مذہب کو بدنام کرنے اور ملک کے امن و امان اور تحفظ کے دشمن بن چکے ہیں۔'' عباس نے گہری سانس لی۔

''آپ اب گھر تشریف لے جائیں، رات کافی ہوگئی ہے۔ خانم پریشان ہوں گی!'' مشد آقا نے کہا۔

اتنا سن کر عباس اٹھے اور صبح مسجد میں پہنچنے کا وعدہ کر کے گھر کی جانب چل پڑے۔ راستے میں رائفلیں لیے نوجوان قبرستان کی طرف جاتے دکھائی دیے۔

عباس نے دروازے پر ہلکے سے دستک دی۔ بلقیس نے دروازہ کھولا۔ اسے دیکھ کر عباس نے حیرت سے پوچھا۔ ''ایک بج رہا ہے، تم گھر نہیں گئیں؟''

''خانم کو اکیلا کیسے چھوڑتی؟'' بلقیس نے کہا۔

''سوسن!'' عباس نے آواز دی۔

''جی! سب خیریت تو ہے نا؟'' سوسن ننگے پیر ہی کمرے سے نکل آئی تھی۔

"ہاں، سب خیریت ہے، رات زیادہ ہوگئی ہے، میں بلقیس کو چھوڑ کر آتا ہوں۔"
کہہ کر عباس چلنے کو ہوئے۔
"نہیں، حاج آقا! میں چلی جاؤں گی۔ اپنا گاؤں ہے۔" اتنا کہہ کر بلقیس نے سر پر چادر ڈالی اور دروازے سے باہر نکلی۔
"اتنی رات کو... خیر، میں تھوڑی دُور ساتھ چلتا ہوں۔"
بلقیس کو کچھ دُور چھوڑ کر عباس گھر لوٹے۔ غسل خانہ میں جا کر خوب اچھی طرح سے ہاتھ، منھ، پیر دھوئے، پھر تولیے سے پونچھ کر بستر پر لیٹ گئے۔
"نماز جنازہ صبح آٹھ بجے ہوگی۔ میں صبح سات بجے یہاں سے نکل جاؤں گا۔"
کہہ کر عباس نے آنکھیں بند کر لیں۔ سوسن نے پیشانی پر نرمی سے ہاتھ رکھا۔ پیشانی جل رہی تھی۔
"آپ کو تو بخار ہے!" سوسن اچھل کر بیٹھ گئی۔ لائٹ جلائی اور ڈبے سے بخار اور تھکن دُور کرنے کی ایک گولی نکال کر عباس کو دی۔
"میں بہت تھک گیا ہوں دماغی اور جسمانی طور سے، اب میں سونا چاہتا ہوں۔"
اتنا کہہ کر عباس نے آنکھیں بند کیں اور کروٹ بدل لی۔
ادھر قبرستان سے آدھے کوس کی دُوری پر آٹھ دس جوان مرد رائفلیں سنبھالے پہریداری کر رہے تھے۔
صبح جنازے کے ساتھ پورا گاؤں اُمڈ آیا تھا۔ تکیہ دار کو قبر کے بارے میں پتہ تھا، لیکن وہ قبر کھود نہیں سکتا تھا۔ اسے سارے جھگڑے کا علم تھا۔ جب جنازہ وہاں پہنچا تو سبھی کے دل خدشات سے بھرے ہوئے تھے کہ جانے کیا ہوگا؟ جانے کتنی نئی قبریں بنیں گی؟
قبرستان سے آدھے کوس کی دُوری پر جنازے پہنچ چکے تھے۔ رائفلوں سے لیس مرد، عباس اور مشد غلام آگے بڑھے۔ قبرستان میں کوئی نہ تھا۔ صرف تکیہ دار مسجد کے سامنے خشک پتیوں کو جھاڑو سے اکٹھا کر رہا تھا۔
جنازہ آگے بڑھا۔ مسجد میں پہنچا۔ تین قبروں کے لیے تکیہ دار سے کہہ کر سب نماز جنازہ کے لیے صف میں کھڑے ہو گئے۔ نماز جنازہ کے بعد تینوں جنازے دفنا دیے

گئے۔ بارہ بجے تک تھسب کا لوٹنا ہوا۔

وہ تینوں جوان راتوں رات گاؤں چھوڑ کر چلے گئے۔ یہ بات تکیہ دار نے آہستہ سے عباس آقا کو بتائی تھی۔ سب کچھ سن کر عباس آقا سوچنے لگے کہ یہ لوگ درحقیقت تھے کون؟ انقلاب کے حامی یا اسلام کے دشمن؟ قانون کو اپنے ہاتھوں میں لے کر یہ لوگ من مانی کرنا چاہتے تھے۔ سچ ہے، گھر کے چور کو پکڑنا کتنا مشکل کام ہے۔

قبرستان سے لوٹ کر عباس نے نہا دھو کر کھانا کھایا اور کمرے میں جا کر لیٹ گئے۔ سوسن بھی قریب آ کر بیٹھ گئی تھی، ہاتھوں میں اون اور تیلیاں لے کر۔

"سوسن! میرا دل اب اس جگہ سے بھر گیا ہے۔ کہیں اور چلتے ہیں۔"

"کہاں؟"

"کسی اور شہر میں۔"

"یعنی ایران میں کسی دوسری جگہ؟"

"ہاں۔"

"میرا دل تو اب ایران سے اوب گیا ہے۔ کہیں باہر چلتے ہیں۔"

"کہاں۔"

"جہاں کا ویزا مل جائے۔" تیلی پر پھندے ڈالتے ہوئے سوسن بولی۔

"پھر بھی کوئی ملک تو ہوگا تمہارے دماغ میں؟" عباس نے چھت کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہندوستان! تمہیں بھی ہندوستان پسند ہے نا؟" سوسن پھندے ڈال چکی تھی۔ دوسری تیلی اٹھاتے ہوئے بولی۔

"ہاں، ہندوستان ہر طرح کی مغربی گندگی سے پاک ہوگا۔ پرسوں تہران جا کر معلومات کروں گا۔" کہہ کر عباس نے اخبار اٹھایا۔ ہفتوں پرانے اخبار اکٹھے شہر سے خرید لاتے تھے، پھر انہیں پڑھتے تھے۔ اس وقت بھی ایک ماہ پہلے کا اخبار پڑھ رہے تھے۔

"یہاں کا کام کون دیکھے گا؟"

"بلقیس اور عبداللہ ہیں۔ منظور سے بھی کہہ دوں گا۔" عباس نے اخبار پر نظریں

گاڑے گاڑے کہا۔

"ہمیشہ کے لیے تھوڑے ہی جانا ہے جو سب کچھ ختم کر کے جائیں!"

"ہاں۔ پھر نئے ملک میں دل لگے یا نہیں، کیا پتہ لوٹنا ہی پڑ جائے! کم از کم یہاں پر سر چھپانے کو تو کچھ رہے گا۔" اخبار طے کرتے ہوئے عباس بولے۔

"یہ تو ہے، پھر یہ گاؤں اپنے آباؤ اجداد کی جگہ ہے، اسے کیسے بھول سکتے ہیں؟" سوسن بولی۔

"جو کچھ تہران سے منگانا ہو اس کی لسٹ دے دینا۔" عباس نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"رات کو بنا لوں گی، صبح دے دوں گی۔" سوسن نے کہا۔ بچہ اٹھ گیا تھا۔ سوسن بچے کی طرف لپکی اور اُدھر کل کے تھکے عباس نیند میں ڈوب گئے۔

"آہ!" طیبہ کے منھ سے درد بھری ننھی سی بوند ٹپکی۔ بجلی کا کیبل ہوا میں لہرایا اور سڑاک سے طیبہ کے تلوؤں پر پڑا۔ تخت پر لیٹی طیبہ پسینے اور آنسوؤں سے تر بتر تھی۔ ہاتھ اور پیر پلاسٹک کی پتلی رسی سے بندھے تھے۔ درد سے جب بھی وہ بلبلاتی، اس کے ہاتھ پیروں پر خون میں ڈوبی ایک لکیر اُبھر آتی۔

"کہاں ہیں تمہارے باقی ساتھی؟" کیبل ہوا میں ہزار بل کھا کر پھر تلوے کے زخم پر پڑتا۔ خون کے چھینٹے اُڑتے۔

"آہ!" جواب میں درد کی دوسری بوند طیبہ کے منھ سے ٹپکی۔

"بے حیا!" دو گھنٹے سے میں ایک ہی سوال پوچھ رہی ہوں، سن نہیں رہی ہے؟" کیبل ہوا میں نچاتی ہوئی وہ لمبی چوڑی چمگادڑ نما عورت چنگاڑھی۔

"بس کرو!" مردانہ آواز اُبھری۔

طیبہ بے ہوش ہو چکی تھی۔ درد کو پیتے پیتے اس کے دانتوں نے نچلے ہونٹ سے خون کے دو گرم سوتے بہا دیے تھے۔ اخروٹ کے رنگ کے بال، جو گندگی سے بھر کر زیادہ گہرے رنگ کے ہو گئے تھے، اس وقت منھ پر پسینے سے چپک گئے تھے۔

"نبض دیکھو، زندہ ہے کیا؟" مردانہ آواز اُبھری۔

"زندہ ہے، صرف بے ہوش ہو گئی ہے۔" کالی چمگادڑ نے ہانپتے ہوئے کہا۔

"تم اب آرام کرو۔" مردانہ آواز اُبھری۔

"بہت اچھا!" عورت نے کہا اور کمرے کا دروازہ بند کرتے ہوئے باہر نکل گئی۔

رات ڈھل رہی تھی۔ آسمان پر کالے کالے بادل چھائے ہوئے تھے۔ ملیحہ کی آنکھوں سے نیند کوسوں دُور تھی۔ اس کی سب سے بڑی پریشانی تھی کہ وہ اب کیا کرے گی؟ گھر کا سارا قیمتی سامان فروخت ہو چکا تھا۔ وہ تنہا نہیں ہے۔ دو معصوم بچوں کا ساتھ ہے۔

باہر بارش ہونے لگی تھی۔ بستر سے اٹھ کر اس نے کھڑکی بند کی۔ بچوں کے پیروں پر چادر ڈالی اور خود منھ ہاتھ دھو کر کچن میں آئی اور سماور روشن کر کے وہ جانماز بچھا کر نماز کے لیے کھڑی ہوئی۔ نماز کے بعد اس نے دُعا مانگی۔ "میرے معبود! مجھے سیدھا راستہ دکھا۔ میرے دل اور دماغ کو اتنی قوت بخش کہ میں سچائی کے راستے پر چلنے سے نہ ڈگمگاؤں!" گرم آنسوؤں کا آبشار آنکھوں سے بہہ کر نماز کی چھینٹ دار چادر میں جذب ہونے لگا۔ "میرے خدا! مجھے سہارا دے، میں تھکتی جا رہی ہوں۔ مجھے طاقت عطا کر!"

دروازے کی گھنٹی بجی۔ منھ کو چادر سے پونچھ کر اس نے جانماز تہہ کی اور پوچھا۔

"کون ہے؟"

"دروازہ کھولو، ملیحہ!" سوسن کی بے چین آواز اُبھری۔
"کون؟" ملیحہ کی آنکھیں پھٹ گئیں۔
"میں سوسن!" سوسن نے نیچے دروازے پر لگے فون میں منہ ڈال کر آہستہ سے کہا۔ ملیحہ نے ریسیور رکھ کر بٹن دبا دیا۔ دروازہ کھل گیا۔ ملیحہ دوڑتی ہوئی نیچے اتری۔ سوسن گود میں بچہ لیے کالی چادر میں لپٹی اوپر چڑھ رہی تھی۔ دونوں نے لمحہ بھر کے لیے ایک دُوسرے کو دیکھا، پھر چیخ مار کر ایک دُوسرے سے بغل گیر ہو کر ہچکیاں بھر بھر کر رونے لگیں۔ گود میں دبا بچہ بلبلا کر رو پڑا۔
"آؤ سوسن اوپر چلو۔" ملیحہ نے روتے ہوئے بچے کو سوسن کی گود سے لے کر کہا۔
"چلو۔" کہہ کر سوسن ملیحہ کے پیچھے پیچھے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔
"چادر بھیگ گئی ہے، اتار کر پھیلا دو سوسن، ورنہ زکام ہو جائے گا۔ بچے کے لیے بھی نقصان دہ ہوگا۔" ملیحہ یہ کہتی ہوئی کچن میں داخل ہوئی اور چائے دم دی۔ فرج کھول کر مربا، مکھن نکال کر دستر خوان پر سجایا، پھر بچوں کو جگانے لگی۔
"اٹھو، دیکھو کون آیا ہے!" ملیحہ نے بچوں کے تلووں کو ہلکے سے گدگدایا۔
"بابا آگئے، ماماں؟" بیٹی آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ بیٹھی۔ اسی کے ساتھ بیٹا بھی اچھل کر بیٹھ گیا۔ ان کے سامنے ایک عورت بیٹھی بچے کو دودھ پلا رہی تھی اور بہتے آنسوؤں کو پونچھتی بھی جا رہی تھی۔ ملیحہ اس اچانک حملے کے لیے تیار نہ تھی۔ اس کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔
"کون ہیں یہ، ماماں؟" بیٹے نے ماں سے چپکتے ہوئے پوچھا۔
"سوسن خالہ ہیں... یاد آیا؟ وہی بھالو والی خالہ؟" ملیحہ نے بڑا سا بھالو، جو سوسن نے دیا تھا، یاد دلایا۔ بیٹے کے چہرے پر کچھ پرچھائیاں اُبھریں، پھر مٹ گئیں۔
"ادھر آؤ!" سوسن نے بلایا۔
دونوں آگے بڑھے۔ سوسن نے بڑی گرمی سے دونوں کو سینے سے چپکایا۔ پیشانی پر پیار کیا۔ سر پر ہاتھ پھیرا، پھر پرس سے نکال کر دو چھوٹے پیکٹ دونوں کے ہاتھوں میں تھما دیے۔

"بہت پیارے بچے ہیں۔ بیٹا پورا باپ پر گیا ہے!" سوسن نے کہا اور اپنے بیٹے کو گود سے اتار کر قالین پر بٹھایا۔

"آؤ، ناشتہ نوشِ جان کرو، سوسن۔" ملیحہ نے کہا۔

ناشتہ کرنے کے بعد دونوں بچے سوسن کے بیٹے سے کھیلنے لگے۔ ملیحہ نے برتن سمیٹے۔ سوسن وہیں کچن میں آکر ملیحہ سے بولی۔ "میں ایک ہفتے کے بعد ہندوستان جا رہی ہوں۔"

"سفر بخیر ہو۔" ملیحہ نے کہا۔

"کل میں تہران پہنچی۔ رات زیادہ ہوگئی تھی، اس لیے آنا مناسب نہیں سمجھا۔ صبح جب عباس کام کے لیے نکلے تو میں ادھر آگئی۔" سوسن نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے کہا۔

"ہندوستان کا پروگرام اچانک کیسے بن گیا؟" ملیحہ نے تولیے سے ہاتھ پونچھتے ہوئے پوچھا۔

"دو سال گاؤں میں بہت اچھی گزری ملیحہ! لیکن اب وہاں رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ بغیر سیاست میں پڑے ہوئے بھی عباس کا جینا حرام ہو رہا تھا اور سیاست میں پڑنے کا مطلب ہے جیتے جی خودکشی کرنا۔ عباس یہ سب چاہتے نہیں تھے اور پھر، ملیحہ میں ہر قیمت پر جینا چاہتی ہوں۔ میں نے موت کا لمس محسوس کیا ہے، بہت بھیانک ٹھنڈا احساس ہوتا ہے۔ دوبارہ وہ تجربہ میں کسی بھی قیمت پر نہیں کر سکتی۔" سوسن نے اپنی آنکھیں ملیحہ پر مرکوز کر دیں۔

"ہمیشہ کے لیے جا رہی ہو؟" ملیحہ نے پوچھا۔

"پتہ نہیں، ابھی تو ارادہ کچھ دنوں کا ہی ہے۔ آگے کے لیے اتنی جلدی کچھ کہنا مشکل ہے۔" سوسن نے کہا۔

"سب کچھ آسانی سے ہوگیا؟" ملیحہ نے کچن سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

"کہاں؟ ہر جگہ رشوت دینی پڑی۔ شناسائی کے باوجود... عباس کا کہنا ہے، حکومت کا خزانہ خالی ہے۔ اسی وجہ سے وزرات میں بیٹھے اعلیٰ افسران رشوت لے رہے ہیں۔" سوسن نے آواز آہستہ کرتے ہوئے کہا۔

''لوگوں کے پاس تو اب بھی بہت پیسہ ہے۔'' ملیحہ نے کہا۔
''عباس کہتے ہیں کہ ایران میں کوئی حکومت نہیں، بلکہ خود رئیس لوگ ہیں جو باگ ڈور سنبھال رہے ہیں۔ فی الحال دو طرح کا نظام ہے ایران میں۔ ایک سرکاری دوسرا مڈل کلاس سرمایہ داروں کا، جن کے پاس دولت ہے ان سے اور عوام سے ٹیکس کے بہانے حکومت روپیہ اینٹھ رہی ہے۔ اس کا تمہیں اندازہ نہیں ہے، ملیحہ!'' سوسن بولی۔
''جیسے؟'' ملیحہ نے قالین پر بیٹھتے ہوئے پوچھا۔
''وہ سلمہ...... سانولے رنگ والی...... یاد آیا؟ ہاں تو سلمہ کو ناجائز تعلق رکھنے کے جرم میں پاسدار پکڑ کر لے گئے تھے۔ ساتھ میں کئی دیگر عورتیں تھیں۔ سنگسار تو کیا کرتے۔ اب تو سیدھے گولی سے اڑاتے ہیں۔ سلمہ چھوٹ کر آ گئی۔ اس کا بھائی اصفہان کا بہت رئیس آدمی ہے۔ پانچ ملین تومان دی ہے بہن کی جان کی قیمت... اس راز کے کھل جانے پر بہت ہنگامہ ہوا تھا۔ کئی مولویوں کے نام بھی ان قصوں سے جڑے ہوئے تھے۔ عباس اس وقت جج تھے۔ بہت کچھ اندر ہی اندر پک رہا ہے۔'' سوسن نے بتایا۔
''پھر انقلاب نے بدلا کیا؟ جب نظام وہی رہا۔ ہاں قتل و غارت گری میں اضافہ ضرور ہوا ہے۔'' ملیحہ نے دکھ سے کہا۔
''تاج کی جگہ عمامہ آ گیا ہے۔ نظام بدلے بھی کیسے؟ سارے کاؤنٹر انقلابی حلیہ بدلے انقلاب کا نعرہ سب سے اونچی آواز میں لگا رہے ہیں!'' سوسن نے بیٹے کی نیپی بدلتے ہوئے کہا۔
''مجھے تو لگتا ہے کہ موجودہ حکومت خود طے نہیں کر پا رہی ہے کہ کون سی جماعت، کون سا ملک ان کا دوست ہے، کون سا دشمن؟''
''ایران کو تباہ کر دیا ہے۔ انقلاب کی شروعات میں لوگ شہید ہونا چاہتے تھے، لیکن آج کوئی بھی مرنا نہیں چاہتا ہے۔ موت سے تھک چکے ہیں لوگ۔'' سوسن نے کہا۔
''موت نے، شہادت نے مسائل سلجھائے کہاں ہیں؟'' ملیحہ نے فریج سے پانی کی بوتل نکالتے ہوئے کہا۔
''تمہارا گھر بڑا خالی خالی سا لگ رہا ہے، ملیحہ؟'' سوسن نے نظریں اِدھر اُدھر

گھماتے ہوئے پوچھا۔ ملیحہ خاموش رہی۔ اس کے جھکے چہرے اور خاموش ہونٹوں کو لحہ بھر کے لیے سوسن نے دیکھا، پھر جیسے وہ سب کچھ سمجھ گئی۔ بات بدلنے کی غرض سے بولی۔ ''صنوبر اور شہناز کا کیا حال ہے؟''

''معلوم نہیں۔ بس، پری کا معلوم ہے کہ وہ ملک سے باہر گئی ہے۔ کہاں؟ اس کا کچھ علم نہیں ہے۔'' ملیحہ نے آہستہ سے کہا۔

''طیبہ سے ملاقات ہوتی ہے؟'' سوسن نے بیٹے کو دودھ پلاتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں! وہ جیل میں ہے۔ کس جیل میں ہے، پتہ نہیں ہے، ورنہ ملتی ضرور جاکر......'' ٹھنڈی سانس بھر کر ملیحہ نے کہا۔

سوسن اس بات سے ایسا چونکی کہ بچہ منہ سے دودھ چھوٹنے کی وجہ سے رو پڑا۔

''کب؟'' سوسن کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔

''چھ ماہ ہونے کو ہیں۔'' ملیحہ نے آہستہ سے کہا۔

''طیبہ کے دوست سعید بھی تو...'' سوسن نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''ہاں... سعید سلطان پور کو تو ان کی شادی کے دن پکڑ کر لے گئے تھے۔''

''پھر؟''

''نکاح ہوا نہیں تھا۔ پاسدار پہنچے، گھر کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا۔ سعید پر الزام تھا کہ وہ ڈالر کی ہیر پھیر کر رہے تھے۔ مہمانوں کے کہنے سے نکاح ہونے کی اجازت دے دی تھی۔ پھر دونوں کو کمیٹی لے گئے۔ پوچھ تاچھ کے بعد لیلیٰ خانم کو چھوڑ دیا اور سعید کو روک لیا گیا۔ اب تو ان پر الزام ہے کہ اٹھارہ ہزار پاسداروں کو انہوں نے مروایا ہے کردستان میں۔ اس جرم میں ۲۲ر جون کو گولی سے اڑا دیے گئے۔'' ملیحہ کی آواز پھنسی پھنسی گلے سے نکل رہی تھی۔

''لیلیٰ خانم کہاں ہیں؟'' سوسن کی آنکھوں میں بھرے آنسو رُخساروں پر لڑھک گئے۔

''معلوم نہیں سوسن۔ ہاں طیبہ نے اتنا بتایا تھا کہ لیلیٰ خانم کے بھائی کزل کو بھی پھانسی دے دی گئی ہے۔ حکومت مخالف تھے۔'' ملیحہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔

''سعید کے ماں... باپ؟'' سوسن نے پوچھا۔

"ماں ہے صرف... ان کا تو بہت بُرا حال ہے۔ ان ہی کی ضد سے شادی ہو رہی تھی۔ بار بار وہ یہی کہتی تھیں۔ شاہ کے دَور میں ہمیشہ جیل میں رہا۔ پوری جوانی تکلیفوں کو سہتے ہوئے کاٹی ہے۔ بڑھاپے سے پہلے گھر تو بس جائے سعید کا... طیبہ کا بہت برا حال تھا۔" ملیحہ کی آنکھیں چھلک پڑی تھیں۔

"سعید کے گھر والوں سے طیبہ ملی تھی؟" سوسن نے پوچھا۔

"بھائی بھی جیل میں تھا۔ ماں اکیلی غم سے دیوانی ہو کر بار بار یہی کہہ رہی تھیں کہ ابھی تو سعید کے جسم کے ساواک کی مار کے زخم بھی بھرے نہیں تھے۔ اس کے جسم پر جدوجہد کی سند موجود تھی، اسے مار کر کیا حاصل ہوا؟ دشمن بھی اپنے دشمن کو شادی کی رات کو نہیں پکڑتا ہے، یہ کیسا قانون ہے؟ کیسا انصاف ہے؟" ملیحہ نے آہستہ آہستہ بیان کیا۔

"سچ ملیحہ، ہم عورتیں کتنا سہہ رہی ہیں!" سوسن نے روتے ہوئے کہا۔

"نہ جانے، سوسن معاشرے کے ہر بدلاؤ کی مار عورت کی ہی پشت پر کیوں پڑتی ہے؟" ملیحہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

"پتہ نہیں ملیحہ! جانے کب تک ہمیں یہ سب کچھ سہنا پڑے گا؟ پتہ نہیں... کچھ بھی صاف نظر نہیں آتا ہے۔" سوسن کے صبر کا باندھ ٹوٹ گیا تھا۔

"پتہ ہے ہمیں سوسن، کہ ہم عورتوں کو کیا کرنا ہے... اس انقلاب کی شروعات میں عورتیں ہی تو اپنی بندھی مٹھی لے کر سڑکوں پر آئی تھیں۔ عورتیں ہی تھیں جنہوں نے اپنے خاندان کو اس بدلاؤ کا گواہ بنایا تھا۔ آج بھی عورتیں ہی آگے بڑھیں گی...... بڑھ رہی ہیں سوسن...... روز شہید ہونے والوں میں آدھی جوان لڑکیاں ہی ہوتی ہیں۔" ملیحہ اٹھی۔ دو گلاس شربت بنا کر لائی۔

"لو پیو سوسن! دل سنبھل جائے گا۔" ملیحہ نے شربت کا گلاس آگے بڑھایا۔

شربت پی کر سوسن نے سوتے ہوئے بیٹے کو بستر پر لٹایا اور غسل خانہ میں جا کر خوب اچھی طرح سے منہ ہاتھ دھوئے۔ ملیحہ نے دوپہر کے کھانے کا انتظام کرنا شروع کر دیا۔

"بچے اسکول نہیں گئے، ملیحہ؟" سوسن نے غسل خانے سے نکل کر پوچھا۔

"مجاہدین باپ کے بیٹے، بیٹیوں کے لیے موجودہ نظام میں کوئی جگہ نہیں ہے

سوسن۔" ملیحہ نے سر جھکائے چاول بینتے ہوئے کہا۔

"تمہارا تہران میں رہنا بہت ضروری ہے؟" سوسن نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

"موجودہ حکومت تو میرا زمین پر رہنا ہی غیر ضروری سمجھتی ہے... ان الزامات کے ساتھ کہاں، کس کے گھر جاؤں؟ یہ زمین ہمارے لیے بھی تنگ کر دی گئی ہے۔ دوسروں کو کیوں تکلیف دوں، اپنے وجود سے!" ملیحہ نے سر جھکائے ہوئے کہا۔

سوسن کسی گہری سوچ میں ڈوب گئی۔ ملیحہ کھانا پکانے میں مشغول رہی۔ گھر میں مردہ خاموشی چھا گئی تھی۔ ملیحہ کے دونوں بچے خاموشی سے کتاب کاپی کھول کر پڑھائی کر رہے تھے۔

"کھانے کے بعد شہناز یا صنوبر کے گھر چلو گی؟ جانے سے پہلے ان سے بھی مل لیتی۔" کچھ سوچتے ہوئے سوسن بولی۔

"میں کہاں جاؤں گی، سوسن!" ملیحہ نے بڑی اداسی سے کہا۔

"تمہارے بغیر جانے سے فائدہ؟ چاروں مل کر بیٹھیں گے۔ جانے یہ بھی کل نصیب ہو یا نہیں۔" سوسن نے بھی رندھے گلے سے کہا۔

"چلوں گی۔" ملیحہ نے ہنڈیا بگھارتے ہوئے کہا۔

اس کے بعد گھر میں پھر ایک مردہ خاموشی چھا گئی۔ سوسن سوچ میں ڈوب گئی۔ دونوں بچے اب بھی خاموشی سے سر جھکائے کتاب پر نظریں گڑائے ہوئے تھے۔

طیبہ کے پیروں میں پس پڑ گیا تھا۔ اٹھنا بیٹھنا مشکل تھا۔ ٹائلیٹ بھی جاتی تو گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی ہزار تکلیفوں کے بعد وہ اس ضرورت کو پورا کرتی تھی۔ ابھی تک نہ اسے کوئی ڈاکٹر دیکھنے آیا تھا اور نہ ہی کوئی دوا اسے دی گئی تھی۔ بس، کمرہ ضرور بدل گیا تھا۔ اب وہ آٹھ دس لوگوں کے ساتھ تھی۔ سب ہی زخمی تھے۔ کسی کا ہاتھ، کسی کا پیر تو کسی کا جبڑا ٹوٹا ہوا تھا۔

کمرے میں پس اور خون کی عجیب سی بو بھری ہوئی تھی۔ کھانے کی جھوٹی رکابیاں

وہیں پڑی رہتی تھیں جس کی وجہ سے مکھیاں زیادہ ہوگئی تھیں اور زخم پر بیٹھ بیٹھ کر اس میں کھجلاہٹ پیدا کرتی تھیں۔

کل صبح کمرے سے دو لوگوں کو باہر لے گئے تھے۔ کچھ دیر بعد دو فائر ہوئے۔ کمرے میں اونگھتے، بخار سے تپتے قیدی چونک اٹھے اور ان کی آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

''ساتھی مارے گئے۔'' سب کے چہرے پر ایک ہی جملہ تھا جو پڑھا جا سکتا تھا۔ لیکن آدھے گھنٹے بعد وہ دونوں گھسٹتے ہوئے اندر کمرے میں آئے۔ سب حیرت میں پڑ گئے۔

ایک نے بے چین ہو کر پوچھ ہی لیا۔ ''تم نے گولی کی آواز سنی تھی نا؟''

''ہاں سنی تھی۔'' دُوسرے نے گردن ہلائی۔

طیبہ اسی کے بعد کمرے میں لائی گئی تھی۔ کل والے سوالات کے حوالہ سے آج اس کی سمجھ میں آیا، جب کمرے سے دو ساتھی لے جائے گئے اور پھر فائر کی آواز گونجی۔ کمرے میں بیٹھے سب قیدی ہوشیاری سے بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر بعد دروازے پر آہٹ ہوئی۔ سب کی نظریں دروازے پر ٹک گئیں۔

دروازے سے داخل ہونے والا صرف ایک ساتھی تھا، بدحواس سا آ کر زمین پر گر پڑا۔ دُوسرے کے انتظار میں تکی آنکھیں دروازے سے ہٹ کر واپس آئے ساتھی پر جم گئیں۔

''گولی چلنے کی آواز سنی تھی نا؟ کسی نے پوچھا۔

''ہاں سنی تھی، لیکن اس بار صرف ایک آواز!'' دُوسرے ساتھی نے اسی بدحواسی سے جواب دیا۔

''جو ساتھی باہر گیا تھا وہ لوٹا کیوں نہیں؟'' ایک نے بے چینی سے پوچھا۔

''ساتھی کہاں ہے دوست؟'' کسی نے اوندھے پڑے قیدی ساتھی کا شانہ ہلایا جو ابھی ابھی باہر سے بدحواس لوٹا تھا۔

''کہاں رہ گیا وہ؟'' دُوسرے نے بے قراری سے پوچھا۔

اوندھے لیٹے قیدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ آنکھیں کھلی سامنے کچھ دیکھ رہی تھیں۔ جھنجھوڑنے پر بھی جواب نہ ملا تو اسی قیدی نے گھبرا کر نبض دیکھی۔ ناک کے

سامنے ہاتھ لگایا۔

''ساتھیو! یہ تو چل بسا......!'' ایک دردناک چیخ ابھری۔

سب کے چہرے دھواں دھواں ہو گئے۔ سمجھتے دیر نہیں لگی کہ جو نہیں آیا وہ شہید ہوا، جو یہاں اوندھا پڑا ہے وہ چل بسا۔ اس کی نظروں میں اس منظر کو جھیلنے کی تاب نہ تھی۔

کھانے کے وقت جب پاسدار آئے تو قیدیوں نے بتایا۔ پاسدار نے اس کے زخمی جسم پر ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''چلو! سب اس کمبخت کی موت کا کھانا کھاؤ۔''

کھانا کسی سے چھوا نہیں گیا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آیا۔ لاش کو سیدھا کر کے معائنہ کیا۔ ڈیتھ سرٹیفکیٹ لکھا۔ اس کے مطابق ہارٹ فیل ہوا تھا۔ دو پاسدار تھوڑی دیر بعد آئے اور لاش گھسیٹ کر کمرے سے باہر لے گئے۔

کھانے کی رکابیاں مکھیوں سے بھری پڑی تھیں، کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ لاش کی جگہ خالی تھی۔ شام کو برتن اٹھانے والے نے جا کر بتایا کہ وارڈ نمبر ایک سو چونتیس میں کسی نے کھانا نہیں کھایا ہے۔

''سوگ منانے دو۔ تین دن تک اس وارڈ میں کھانا نہیں جائے گا۔'' حکم ملا۔

رات ہو گئی تھی۔ کمرے میں تاریکی تھی۔ دل کی آنکھیں بھی کھلی تھیں۔ آپسی ڈر ختم ہو گیا تھا۔ سب متحد ہو گئے تھے۔ سب کے چہروں کے تاثرات نے خاموشی سے ایک دُوسرے کو بتایا تھا کہ ہم ایک ہی کشتی کے سوار ہیں۔

''مرنے والا بہروز تھا، میرا دوست۔'' ہلکی سی آواز اُبھری۔

''بہروز وطن دوست... شاعر...؟'' دُوسرے نے پوچھا۔

''ہاں...!'' جواب بہت بھیگا ہوا تھا۔

''جو شہید ہوا وہ؟'' ایک اور آواز اندھیرے میں اُبھری۔

''وہ بھی میرا جاننے والا تھا۔ اس کا نام شاکر تھا۔'' لہجے کا گیلا پن بڑھ گیا تھا۔

''مصنف تھا یا شاعر؟''

"صحافی تھا... تین سال سے جیل میں تھا..." لہجے کے گیلے پن میں پانی ٹپکنے کی آواز صاف سنائی پڑ رہی تھی۔

"ارے! یہ وہی شاکر تو نہیں، جس نے کیہان میں وہ مضمون... کیا سرخی تھی اس کی......؟" یاد کرتی ہوئی سی آواز اُبھری۔

"ہاں ہاں...... یاد آیا۔" نئی آوازیں اُبھریں۔

"کیا بات ہے، شور کیوں مچا رہے ہو؟" باہر سے پاسدار نے ڈپٹ کر پوچھا۔

"دوست کی قبر پر فاتحہ پڑھ رہے ہیں۔ پڑھنے دو ثواب کا کام ہے۔" ملی کی آواز اُبھری، پھر خاموشی چھا گئی۔

شہناز گھر پر ہی موجود تھی۔ ملیحہ اور سوسن کو دیکھ کر پہلے ٹھگی سی کھڑی رہی، پھر جیسے خواب سے جاگی ہو، دوڑ کر ان سے لپٹ گئی۔ شہناز کی ماں اور خالہ دونوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔

"کیسی ہو شہناز؟" ملیحہ نے پوچھا۔

"کہیں جا رہی ہو یا کوئی آیا ہے؟" سوسن نے اٹیچیاں اور سامان بندھا دیکھ کر کہا۔

"ہم لوگ کل جا رہے ہیں۔" شہناز کی ماں نے کہا۔

"کہاں؟" ملیحہ نے پوچھا۔ اس کے دل میں خیال اُبھرا۔ سب ہی کہیں نا کہیں جا رہے ہیں۔ ایران میں بچے گا کون؟

"جانا کہاں ہے ہمیں! ملاّ کی دوڑ مسجد تک... کردستان اپنے گھر جا رہے ہیں۔" شہناز کی ماں نے کہا۔

"لو، تم لوگ منہ میٹھا کرو... شہناز کی شادی اسی ماہ کی چھبیس تاریخ کو ہے۔" خالہ نے مٹھائیوں سے بھری پلیٹ آگے بڑھائی۔

"تم لوگوں کو بلاتے، دعوت نامہ بھجواتے، لیکن بیٹیو! کردستان تو خود موت کا کنواں بن گیا ہے۔" شہناز کی ماں نے کہا۔

"مبارک ہو آپ کو بیٹی کی شادی۔" دونوں نے ایک ساتھ کہا، پھر شہناز پر شکوہ بھری نظر ڈالی کہ شیطان، شادی ہو رہی ہے ہمیں بتایا بھی نہیں!

"لو، تصویر دیکھو۔" کہہ کر خالہ نے کاک حسن کی تصویر دکھائی۔

"ارے واہ! یہ تو کسی ہیرو سے کم نہیں ہے۔" سوسن نے کہا۔

"جوڑی بہت اچھی ملی ہے، خالہ!" ملیحہ نے خوش ہوتے ہوئے کہا۔

"تایا کا لڑکا ہے۔ بچپن سے بات طے تھی۔" ماں نے اسی بجھے لہجے سے کہا۔ اس بار سوسن اور ملیحہ کو لگا کہ شہناز کی ماں اس شادی سے خوش نہیں ہے۔ جب دونوں اٹھ کر چلی گئیں اور وہ اکیلی رہ گئیں تو ملیحہ نے پوچھا۔" کیا بات ہے خالہ بڑی بجھی بجھی سی ہیں۔ طبیعت تو ٹھیک ہے؟"

"ہاں... انہوں نے ہی تو اس شادی کی جلدی کی ہے، اور اب خود پریشان ہیں... کردستان مجھے بھیجنا نہیں چاہتی ہیں اور حسن تہران آنا نہیں چاہتے ہیں۔" شہناز نے کہا۔

"پھر شادی...؟" سوسن نے بوکھلا کر پوچھا۔

"شادی تو چھبیس کو ہو رہی ہے۔ نوکری سے استعفیٰ تو بہت پہلے دے دیا تھا میں نے۔ کل کردستان میں ہوں گی۔" شہناز نے سوچتے ہوئے کہا۔

"آج ہم نہ آتے تو تمہاری شادی کا پتہ ہی نہ چلتا۔" سوسن نے ہنستے ہوئے کہا۔

"مجھے تو سچ پوچھو شرم آرہی ہے۔ اس مار کاٹ میں شادی کون سمجھدار آدمی کرے گا؟ کوئی تک ہے۔" شہناز نے بجھے دل سے کہا۔

"تک کیوں نہیں ہے! جب زندگی کے معمولات یہی بن گئے تو اس میں شرمانے کی کیا بات ہے؟ قتل بھی ہے، پھانسی بھی، شادی بھی، بچے کی پیدائش بھی ہے... ابھی ایران میں ایسا قحط نہیں پڑا ہے، کہ زمین سے برکت غائب ہو جائے اور لوگ عشق کرنا بھول جائیں۔" ملیحہ نے شہناز کو سمجھایا۔

"صنوبر کیسی ہے؟ چلو، اس سے مل کر آتے ہیں۔ قریب میں ہی تو اس کا گھر ہے۔" سوسن نے کہا۔

''اس کے پیروں میں صبح سے پہیے لگے ہیں۔'' ملیحہ نے کہا۔

''چند روز تو باقی ہیں، پھر آگے جانے کیا ہو؟ سب دوستوں سے مل لیتی ہوں... چلو پھر......!'' سوسن نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

''اس کا گھر بہت دُور بس گیا ہے۔'' شہناز نے عجیب لہجے سے کہا۔

''پہلے والا گھر بدل لیا ہے کیا؟'' ملیحہ نے پوچھا۔

''گھر بھی بدل لیا، جہاں بھی بدل لیا۔'' شہناز نے آہستہ سے کہا۔

''کیا مطلب؟'' سوسن کے ہاتھ چادر ٹھیک کرتے کرتے رک گئے۔

''بہشت زہرا کی آغوش میں سو رہی ہے... برین ہیمرج سے اس کی موت ہوئی... جمیل کی موت کے بعد سے وہ نارمل نہیں تھی۔'' شہناز نے کہا۔

''آہ!'' سوسن کا کھلا منھ بند ہوگیا اور چپ چاپ نڈھال سی بیٹھ گئی۔

''چلو!'' وہیں چلتے ہیں، سوسن۔'' ملیحہ نے کہا۔ اس کی آنکھوں کے ڈورے لال ہو رہے تھے۔ آج صبح سے وہ رو رہی ہے۔ کیسا دن طلوع ہوا ہے؟

''چلو چلتے ہیں۔'' سوسن نے بے حد تھکے لہجے سے کہا۔

''بیٹھو تھوڑی دیر! چائے پی کر چلتے ہیں۔'' کہہ کر شہناز کمرے سے باہر نکل گئی۔ سوسن اور ملیحہ نے ایک دُوسرے کو دیکھا۔ ان کی آنکھیں ناچار بھر آئیں۔

بہشتِ زہرا کے دروازے پر پہنچ کر ٹیکسی رکی اور تینوں نیچے اتریں۔ بھیڑ غضب کی تھی۔ جو لوگ اندر سے باہر آرہے تھے وہ سڑک پار کر کے کچے فٹ پاتھ پر لگی سبزی

کی دُکانوں کی طرف جا رہے تھے اور وہ لوگ جو ابھی سواریوں سے اتر رہے تھے ان کے ہاتھوں میں پھول، پھل، کھانے پینے کی ڈولچی اور بغل میں غالیچے دبے ہوئے تھے۔ گاؤں سے آئی تازہ سبزیوں کا مول بھاؤ کرتی عورتیں ناک اور آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ ملیحہ کا دل بھٹک سا گیا، جیسے وہ اس سوال کا جواب پانا چاہ رہی ہو کہ زندگی حقیقت ہے یا موت؟

سایے دار گھنے درختوں کے نیچے سے وہ تینوں اِدھر اُدھر بنی قبروں پر نظر ڈالتی ہوئی آگے بڑھنے لگیں۔ راستے میں دو تین بسیں کھڑی دکھائی دیں۔ ان پر کالے بینر لگے ہوئے تھے۔ بھیڑ کافی تھی۔ غسل خانہ قریب ہی تھا۔ کسی شہید کی لاش نہلائی جا رہی تھی۔ وہ تینوں تھوڑا رُکیں۔ کسی بڑے افسر کا جنازہ تھا، کیونکہ جب جنازہ پھولوں سے سج کر باہر نکلا تو اسے فوجی بینڈ کے ساتھ سلامی دی گئی۔ ٹی۔وی والے بس کی چھت پر کھڑے فلم بنا رہے تھے۔

''مرتضیٰ، وہ تمہاری آنکھیں... وہ تمہارا مجھے دیکھنا، کیا وہ نگاہیں میں کبھی بھول سکتی ہوں......؟ تم خاک میں ملنے جا رہے ہو اور میں زندہ درگور ہوں....'' پچھاڑ کھا کر وہ جوان بیوہ وہیں بیہوش ہوگئی۔

ملیحہ کا دل چاہا، جا کر اُسے سینے سے لگائے اور دلاسہ دے، لیکن بھیڑ نے پورا منظر اس کی آنکھوں سے چھپا لیا۔ جنازے کے ساتھ لوگ آگے بڑھے۔ وہ تینوں بھی پیچھے چلنے لگیں۔ درختوں سے جیسے دھوپ چھنتی ہے کچھ ایسا ہی احساس ملیحہ کو اس بیوہ کی دُور سے آتی ہوئی سسکیوں کو سن کر ہو رہا تھا۔ تینوں خاموشی سے چلتی ہوئیں آگے بائیں ہاتھ کو مڑ گئیں۔ یہ بہشتِ زہرا قبرستان کا نیا حصہ تھا، جو پچھلے دو تین برسوں میں آباد ہوا تھا۔ درختوں اور پھولوں سے ایسا لدا ہوا تھا جیسے برسوں پرانا ہو۔ نئی قبروں پر پھولوں کے گملے اور لال پھولوں سے بھری شاخیں رکھی ہوئی تھیں۔ قبر کے سرہانے مرنے والوں کی بڑی بڑی تصویریں اور اس کے نیچے ان کے نام لکھے ہوئے تھے۔ قبروں کے بیچ بنی پگڈنڈیوں سے وہ گزرنے لگیں۔ تینوں کی نگاہیں قبروں پر لگی تصویروں میں صنوبر کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ زبان منھ میں قید ہونے کے باوجود قبروں پر لکھے لڑکے، لڑکیوں

کے نام پڑھ رہی تھی۔

'کہکشاں، عمر ۱۶ ر سال شہادت ۱۹۸۲'

'مصطفیٰ، ۱۸ ر سال، شہادت ۱۹۸۲'

'غلام محمد، عمر ۱۸ ر سال شہادت ۱۹۸۲'

'نصرت، عمر ۱۴ ر سال شہادت ۱۹۸۰'

'فرزانہ، عمر ۱۳ ر سال شہادت ۱۹۸۱'

'شاہینہ، عمر ۱۶ ر سال شہادت ۱۹۸۱'

'فاطمہ، عمر ۲۰ ر سال شہادت ۱۹۸۰'

ان پر لکھی عبارتیں پڑھ کر ان تینوں کا دل گھبرانے لگا۔ ہر طرف ہنستے مسکراتے چہروں کی بھرمار... واقعی موت نے کیسی کیسی خوبصورت شکلوں کو مٹادیا... کیسی کیسی حسین آنکھوں کو بے نور کردیا...... کیسے کیسے جوان جسموں کو بے جان کردیا...... موت سب سے عظیم ہے۔ موت سے کسی کو فرار نہیں ہے...... ہٹلر کو بھی نہیں، جس نے کروڑوں کی تعداد میں گردنیں اُڑائی تھیں۔ ایک دن موت کے آگے گھٹنے ٹیک دیے تھے۔

''کتنا پھیل گیا ہے بہشتِ زہرا!'' سوسن نے تعجب سے کہا۔

''بہشتِ زہرا میں آخری مرتبہ، مہناز کے بابا کی قبر پر آئی تھی... وہ بھی کئی سال پہلے... تب اتنی قبریں نہیں تھیں... اب تو ایسی چہل پہل نظر آرہی ہے جیسے کوئی شہر آباد ہوگیا ہو!'' شہناز نے چاروں جانب تعجب سے نگاہ دوڑاتے ہوئے کہا۔

''اُدھر چلو... اُدھر انقلاب کی شروعات میں شہید ہوئے لوگوں کی قبریں ہیں۔ میں ایک مرتبہ آچکی ہوں!'' ملیحہ نے آہستہ سے کہا۔

''آہ...! ہائے خدارا، کیا جواں نسل کی فصل کٹی ہے!'' شہناز نے کہا۔

''! کیا قیامت کا منظر ہے!'' سوسن نے بچے کے منھ میں چسنی دے دی۔ مہناز نے جھک کر قبروں پر لکھی عبارتیں پڑھنی شروع کیں۔

''کاظم زادے، عمر ۲۰ ر سال شہادت ۱۹۷۹''

''محسن، عمر ۱۶ ر سال شہادت ۱۹۷۹''

"شہلا، عمر ۲۰ رسال شہادت ۱۹۷۹"

"صبا پری زادے، عمر ۱۶ رسال شہادت ۱۹۷۹"

"نسیم باغباں، عمر ۱۴ رسال شہادت ۱۹۷۹"

"فروخ، عمر ۱۳ رسال..."

"شہناز! آگے مت پڑھنا... توبہ ہے، میرا دل ڈوب سا رہا ہے۔" ملیحہ نے ناک اور ہونٹوں پر آئے پسینے کو پونچھتے ہوئے کہا۔

"یہیں کہیں پر اختر کی قبر ہوگی۔" سوسن نے کہا۔

کافی طویل راستہ طے کرتی ہوئی قبروں کے نام پڑھتی ہوئی تینوں آگے بڑھ رہی تھیں۔ کونے میں ایک کنارے پر پہنچ کر سوسن اچانک رُک گئی۔ جھک کر کچھ پڑھنے لگی۔ ملیحہ اور شہناز بھی پہنچ گئیں۔

"یہ رہی اختر کی قبر!" سوسن نے سیدھے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

قبر پر تازہ اَدھ کھلے لالہ کے پھول کی ایک شاخ رکھی ہوئی تھی۔ قبر بھی گیلی تھی۔ لگ رہا تھا، کوئی صبح گھر سے آیا تھا اور قبر دھو کر، پھول رکھ کر چلا گیا۔ قبر پر ہنستی ہوئی اختر کی رنگین تصویر تھی۔ چیک کا اسکرٹ اور اسی رنگ کے سادے کپڑے کا کالر والا بلاؤز پہنے تھی۔ سانولے ماتھے پر بال کی ایک لٹ پڑی تھی۔ یہ اسکرٹ اور بلاؤز اس نے اپنی اٹھارویں سالگرہ پر پہنا تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا، 'عمر ۲۳ رسال، شہادت ۱۹۸۰'۔ تینوں وہیں بیٹھ گئیں اور فاتحہ پڑھنے لگیں۔ وہاں سے نکلیں تو سامنے بنے چبوترے کو گھیرے چاروں طرف کچھ دیہاتی مرد اور عورتیں بیٹھے ہوئے تھے۔

"یہ آیت اللہ تالقانی کی قبر ہے جنہیں کچھ صحافی ایران کا گاندھی کہتے ہیں۔" کہہ کر شہناز آگے بڑھی۔ اس کے دوسری طرف کے میدان میں کچی قبریں بنی تھیں۔ ادھر بھیڑ زیادہ تھی۔ پورا ماحول دھول اور غبار سے بھرا ہوا تھا۔ پھول، گھاس اور درخت کا نام و نشان نہ تھا۔

"ادھر جنگ کے شہید ہیں۔" سوسن نے اندازہ لگایا۔

"جمیل کی قبر شاید یہیں ہو!" ملیحہ بولی۔ پھر تینوں پکی سڑک کے کنارے لگے

سایہ دار درختوں کے بیچ چلنے لگیں۔ ان کچی قبروں کے حصے میں جا کر شہناز کی نظر ایک چودہ پندرہ سال کے لڑکے پر پڑی، جو کچی قبروں کے بیچ جانے کیا ڈھونڈ رہا تھا۔ وہ قبروں کے بیچ سے ہوتی ہوئی آگے پہنچی، تاکہ اس لڑکے کو قریب سے دیکھے اور کچھ پوچھے۔ لڑکے نے اسے اپنی طرف آتے دیکھا تو دونوں ہتھیلیوں سے تیزی سے آنسو پونچھے اور بھاگتا ہوا سڑک کے کنارے درخت کی اوٹ میں چھپ گیا۔ اس کا ایک ہاتھ درخت کے تنے سے باہر نکلا ہوا تھا۔ اسے کانپتا دیکھ کر شہناز سمجھ گئی کہ وہ رو رہا ہے، اور پھوٹ پھوٹ کر رو رہا ہے۔ کون ہے وہ؟ اس طرح سے بلک بلک کر کیوں رو رہا ہے؟ شہناز بے چین ہو اُٹھی۔

ادھر کچی قبروں پر ابھی کسی کے نام یا تصویر کی تختی نہیں لگی تھی۔ وہ آگے بڑھتی گئیں۔ دھول کی وجہ سے انہوں نے اپنی چادروں سے ناک اور منہ ڈھک لیے تھے۔ کچھ دُور پر قبروں کے اوپر سے ہو کر لوٹتے لوگ ملے۔ شہناز اپنے تجسس کو نہیں دبا پائی اور آگے بڑھ کر ان سے لڑکے کے بارے میں پوچھنے لگی۔ ''وہ لڑکا کون ہے؟ آپ اسے جانتے ہیں... وہی وہ... جو قبروں کے چاروں طرف چکر کاٹ رہا ہے؟''

''وہ...... نادر...... ارے، وہ تو یہیں قبرستان میں رہتا ہے...... دیوانہ ہے۔'' ایک بزرگ خاتون نے چادر سنبھالتے ہوئے کہا۔

''لو شولے، یہ حلوا اور بسکٹ نادر کو دے کر آؤ... جانے کب سے بھوکا ہوگا؟'' جوان عورت نے آٹھ سال کی اپنی بیٹی کے ہاتھ پر ایک کاغذ میں لپٹا پیکٹ رکھا۔

''اس کا پورا گھر شہید ہو گیا ہے، خانم۔ وہ انہیں کی قبریں ہیں۔ گھر بچا نہ ماں باپ...... بم نے سب کو کھا لیا، اب یہ کہاں جائے، اس لیے اپنے خاندان کے لوگوں کے بیچ پورے دن پھرتا رہتا ہے۔ کبھی روتا ہے، کبھی خاموش بیٹھا رہتا ہے۔ رات کو ماں کی قبر پر سو جاتا ہے۔'' ان میں سے ایک بزرگ نے چھڑی پکڑتے ہوئے کہا۔

''عجیب غیرت مند لڑکا ہے...... ہم تو جب بھی آتے ہیں اسے یوں ہی بھٹکتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ پوچھو تو کچھ بولتا نہیں، بس شولے سے کچھ بات ہو جاتی ہے۔ اسی سے نام معلوم ہوا کہ نادر ہے۔ شولے کچھ کھلا دیتی ہے تو کھا لیتا ہے... ہم بھی کونسا روز

روز یہاں آتے ہیں۔" اسی جوان عورت نے کہا۔
شہناز نے پیچھے مڑ کر دیکھا، لڑکا پھر درخت کی اوٹ سے نکل کر روتا ہوا قبروں کے درمیان گھوم رہا تھا، اور بیچ بیچ میں حلوا اور بسکٹ بھی کھا رہا تھا۔
"کدھر ہوگی صنوبر کی قبر؟" سوسن نے ٹھنڈی سانس بھری۔
"لطیف نے مجھے جو نمبر دیا تھا وہ چودہ یا پندرہویں حصے کا تھا، یہ میں بھول گئی ہوں۔" شہناز نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔
"شام ہونے والی ہے۔ سورج ڈوبنے سے پہلے لوٹ جائیں تو اچھا ہے۔" ملیحہ نے کہا۔ وہ دونوں بچوں کو گھر میں چھوڑ کر آئی تھیں۔
سامنے والے میدان کی قبروں کا عجیب حال تھا۔ جیسے ان قبروں کو کھودا گیا ہو۔ قبر کے اوپر رکھے پتھر بھی چور چور ہو کر گر پڑے تھے۔ دُور سے دیکھنے پر ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی نے پورے میدان میں بلڈوزر چلایا ہو۔
"ان قبروں کو کیا ہوا؟" سوسن نے حیرت سے کہا۔
"مجاہدین خلق کی قبریں تھیں، خانم! اب تو مجاہدین یہاں دفنائے نہیں جاتے ہیں، کیونکہ قانون پزشکی سے لاشیں چھنٹ کر آتی ہیں پہلے تمام لاشیں یہاں آجاتی تھیں۔ اس میں کافر اور منافقین بھی شامل رہتے تھے۔ ایک ماہ قبل ان قبروں پر حزب اللہ والوں نے حملہ کر کے توڑ پھوڑ مچائی تھی کہ یہ ان کا قبرستان نہیں ہے۔" ایک آدمی نے بڑی تفصیل سے سوسن کو بتایا۔
"ادھر سعید سلطان پور کی قبر تھی... جانتی ہیں آپ اسے؟ اس کی قبر کھود کر لاش نکال کر اسے لعنت آباد لے جا کر پھینک آئے تھے... کہتے تھے، کافر کو کافر کے گھاٹ پر دفن ہونا چاہیے۔ اس کا پاک مسلمانوں سے کیا رشتہ؟" اس کے دُوسرے ساتھی نے سگریٹ کے لمبے لمبے کش لیتے ہوئے کہا۔ پہلے نے بڑی نفرت سے مٹی کے ڈھیلے پر ٹھوکر ماری۔ یہ نفرت کس کے تئیں تھی۔ تینوں سمجھ نہ سکیں۔
"لیکن ...ادھر تو شاہ کے تمام مریدین دفن ہیں۔ ان کی قبریں کسی نے نہیں کھودی، جبکہ وہ تو موجودہ حکومت کے پہلے دشمن ہیں؟" شہناز نے تعجب سے پوچھا۔

''شاہی دبدبہ ہے... ہمت ہے دربار میں گھسنے کی؟ یہ تو ٹھہرے بے چارے عام لوگ... یا پھر ان کے حمایتی... !'' پہلے نے تلخی سے کہا، لیکن طنز کس جانب تھا، سمجھ نہ سکیں۔

''سیاست ہے... سیاست تو بغیر ماں باپ کا ناجائز بچہ کی مانند ہے۔ اس کے متعلق کیا کہوں؟'' کہہ کر دُوسرے نے ہوا میں ہاتھ لہرایا۔

''میں تو تھک گئی ملیحہ!'' سوسن نے اداس ہو کر کہا۔

''لاؤ اسے مجھے دے دو!'' کہہ کر ملیحہ نے سوسن کے بیٹے کو گود میں لے لیا، جو ماں کے کندھے سے چپکا گہری نیند سویا ہوا تھا۔ منہ سے رال بہہ کر سوسن کے کندھے کے پاس کی فراک کو گیلا کر چکی تھی۔

سامنے جو حصہ قبرستان کا نظر آ رہا تھا، وہ کافی سجا دھجا تھا۔ بڑے اشتیاق سے وہ تینوں آگے بڑھیں۔ سفید پختہ فرش پر عورتیں، مرد بیٹھے بڑی عقیدت سے قرآن پڑھ رہے تھے۔ تبرک تقسیم کیا جا رہا تھا۔ لمبی چھڑ کے الم کو پکڑے مرد کے چاروں طرف سارے جوان، بوڑھے ایک دُوسرے کی کمر میں ہاتھ ڈالے گول گھیرے میں کھڑے ماتم کر رہے تھے۔ یہاں پر چیف جسٹس اسلامی جمہوریت پارٹی کے چیئرمین ڈاکٹر بہشتی، وزیر اعظم رضائی اور دیگر اہم لوگوں کی قبریں تھیں۔

''کدھر ہے صنوبر کی قبر؟'' سوسن تھکی تھکی سی آواز میں بولی۔

''معلوم کر لیتے ہیں!'' شہناز نے کہا اور آگے بڑھی۔

''قریب ہی ہے، آؤ تم لوگ۔'' شہناز ان دونوں کو کچھ دُور پر کھڑی اشارے سے بلا رہی تھی۔

''بہت بڑھ گیا ہے بہشتِ زہرا... شاہ کے دَور میں صرف دس حصے تھے۔ وہ بھی پُر نہ تھے، اور اب سوا سو حصے... یعنی سو گنا کا اضافہ... اسے کہتے ہیں برکت... ہاتھ ڈالو تو سونا بھی مٹی ہو جاتا ہے۔ کچھ اُلٹا تو نہیں کہہ گیا میں، عارف؟'' ایک جوان لڑکا قریب سے کہتا گزرا۔

''پورا پا رلیا منٹ نیچے سو رہا ہے، مشتاق! میں نے تو سنا ہے کہ بہشتِ زہرا نے

اپنی 'آٹونومی' کا اعلان کردیا ہے۔" عارف نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔
"بالکل صحیح، وزیر اعظم، پورا پارلیامنٹ، پارٹی کا چیرمین سب زمین کے نیچے موجود ہیں، پھر اسے تہران سے کیا لینا دینا؟" مشتاق نے اس سے بھی زیادہ سنجیدگی سے کہا، جسے سن کر تینوں سہیلیاں اپنی ہنسی کو نہیں روک سکیں. وہ لڑکے بھی قہقہوں میں شامل ہوگئے۔

"ایرانی پھانسی پر بھی چڑھا ہو تو اپنے مزاج کا طنز و مزاح نہیں بھول سکتا۔" ملیحہ نے کھلکھلاتے ہوئے کہا۔

"اتنا غم اگر کسی اور قوم پر پڑتا تو جانے وہ کب کی پاگل ہو جاتی۔" سوسن نے کہا۔
"آپ ٹھیک کہتی ہیں، خانم! یہ مسئلہ چونکہ ایرانی قوم کا ہے، اس لیے وہ صرف نیم پاگل ہوئی ہے۔" لڑکے نے کچھ اس انداز سے کہا کہ پھر ملا جلا قہقہہ پڑا۔
تینوں کے پاؤں جواب دے رہے تھے، پھر بھی وہ خود کو آگے گھسیٹ رہی تھیں۔
"وہ جمیل کی قبر ہے کیا؟" ملیحہ نے پلکیں جھپکاتے ہوئے کہا۔
"شاید!" شہناز کہہ کر تیزی سے آگے بڑھی۔
"جمیل جہاں وردی، ائرفورس پائلٹ، عمر ۳۰ سال، شہادت ۱۹۸۲۔" سوسن نے پڑھا۔ تصویر میں دو بڑے بڑے تمغے اس کے سینے پر دمک رہے تھے۔ اونچی پیشانی، ستواں ناک، کتابی چہرہ، مضبوط اونچی گردن۔ تینوں چادریں سمیٹ کر قبر پر بیٹھ کر فاتحہ پڑھنے لگیں۔
"صنوبر کی قبر یہیں کہیں ہوگی!" سوسن نے کہا۔

"ارے، یہ تو فوجی اور ائرفورس والوں کا حصہ ہے، پھر اس کی قبر پر تصویر کیوں ہونے لگی! کوئی شہید تھوڑے ہی ہوئی تھی۔" شہناز نے کہا۔
وہ تھوڑی ہی دور چلی تھیں کہ انہیں صنوبر کی قبر مل گئی۔ قبر کے پاس لمبی لال کینوں کی کیاری تھی۔ اس پر خوب پھول کھلے تھے۔ پیڑ کی سائے دار شاخیں اس کی قبر پر جھکی ہوئی تھیں۔
"کیسی اچھی جگہ نصیب ہوئی ہے صنوبر کو!" ملیحہ نے کہا۔

"یہ بھی تو خوش نصیب، جو ساری تکلیفوں سے اتنی جلدی نجات مل گئی۔" سوسن نے عجیب سے جذبے سے کہا اور فاتحہ پڑھنے نیچے بیٹھ گئی۔ سورج ڈوبنے والا تھا۔ سنہری دھوپ سے قبرستان بھر گیا تھا۔ تینوں قبر کے پاس بیٹھیں تو بیٹھی ہی رہ گئیں۔ یادیں، بہت پرانی یادیں قبروں پر کلکاریاں مارتی گھٹنوں کے بل چلنے لگی تھیں۔ بہتے آنسو ہاتھوں اور چادروں پر گر رہے تھے۔

بھشتی قبروں پر مشک سے پانی ڈال رہا تھا۔ اس کے چھینٹے بچے کی آنکھ پر پڑیں اور وہ درد سے رو پڑا۔ تینوں چونکی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔ لوٹتے ہوئے انہیں محسوس ہوا کہ شام ہونے کے باوجود بھیڑ میں کمی نہیں آئی ہے۔ کچھ لوگ تو قبروں کے بیچ کی پگڈنڈیوں اور قبروں پر بچھے غالیچے پر اس طرح سے بیٹھے باتیں کر رہے تھے جیسے ان کے گھر کا آنگن ہو۔ گھر گرہستی، زندگی سب کچھ وہی قبریں ہوں۔

"بھائی... میں بہت تھک گئی ہوں۔" سوسن نے درخت سے ٹیک لگاتے ہوئے کہا۔

"سامنے ریسٹورینٹ ہے، خانم! وہاں جا کر بیٹھیے... کھانا، چائے سب کچھ ملے گا۔" قبرستان کے پہریدار نے ادھر سے گزرتے ہوئے کہا۔

"یہاں پر ریسٹورینٹ!" ملیحہ چونک پڑی۔

"ریسٹورینٹ کو کھلے تین سال ہو گئے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"اچھا؟" شہناز نے حیرت سے کہا۔

"چلو، چلتے ہیں، دیکھیں وہاں کیا ہو رہا ہے!" سوسن بولی۔

"سچ مچ جنگل میں منگل ہے!" شہناز بولی۔

"قبروں کا میلہ۔" ملیحہ نے ٹوٹے الفاظ میں کہا۔

ریسٹورینٹ جاتے ہوئے انہوں نے قبروں کے درمیان ایک عورت کو بیٹھے دیکھا۔ جھٹپٹے کا وقت تھا۔ کالی چادر سے صرف ہاتھ نکلا ہوا تھا جس میں لال گیڈولا کی ایک شاخ تھی، جسے قبر کے پتھر پر آہستہ آہستہ مار کر وہ بین کر رہی تھی۔ چادر میں ڈھکا جسم ہچکیوں سے ہل رہا تھا، لیکن آواز سنائی نہیں پڑ رہی تھی۔ اتنی خاموش اور درد سے پُر آواز کو اتنے قریب سے سن کر تینوں کا دل بے چین ہو گیا۔

ریسٹورینٹ اچھا تھا۔ سوسن تھکن سے چور تھی۔ ملیحہ خیالات و جذبات سے بری طرح زخمی تھی۔ شہناز بھی گھبرائی اور پریشان تھی۔

''کچھ کھاؤ گی؟'' سوسن نے ان سے پوچھا۔

''میرے حلق سے تو کچھ اترے گا نہیں۔'' ملیحہ نے بھری بھری آنکھوں سے کہا۔

تینوں نے پہلے ٹھنڈا منگوایا پھر چائے کا آڈر دیا۔ سر درد کے مارے پھٹا جارہا تھا۔ سوسن نے بیٹے کو دودھ پلایا۔ وہ بھی مرجھایا سا لگ رہا تھا۔ سورج ڈوب رہا تھا۔ قبروں پر تاریکی پھیلنے لگی تھی۔ تینوں جب ریسٹورینٹ سے باہر نکلیں تو دروازے کے نیلے گنبد لال آسمان پر چمک رہے تھے۔ اذان کی آواز قبرستان میں بل کھاتی قبروں کے اندھیرے میں ڈوبنے لگی تھی۔

ٹرے فیلگر اسکوائر میں کبوتروں کو دانہ ڈالتے ہوئے بچے بہت خوش ہو رہے تھے۔ ملائم پیلی دھوپ بکھری ہوئی تھی اور ہوا میں ایک نرم خنکی بسی ہوئی تھی۔ سامنے بینچ پر بیٹھے ہوئے خالد اور سلیمان چلیئر کی چسکیاں لے رہے تھے۔ پری اور مہناز شاپنگ کے لیے گئی ہوئی تھیں۔

''تمہاری طبیعت گھبراتی نہیں بغیر کام کیے، خالد؟ سلیمان نے پوچھا۔

''بہت زیادہ، دوست..... لیکن کروں بھی کیا؟'' خالد نے اداسی سے کہا۔

''کوئی کام شروع کردو، دل و دماغ مشغول رہے گا اور آمدنی بھی ہوگی۔'' سلیمان نے کہا۔

''کام بھی کیا کروں! میرا کام تو تجارت کرنا تھا، تہران کے تین بڑے اسٹور میرے تھے۔ دو فیکٹریاں، ایک مِل... کئی مکان اور پھلوں کے باغ، سب کچھ چھوڑ کر جان بچا کر یہاں آگیا... فیکٹریاں کچے مال کی وجہ سے دو سال سے بند پڑی ہیں۔ وہی حال مِل کا تھا۔ ایک مکان کو چھوڑ کر باقی حکومت نے چھین لیے۔ اسٹور غیر ملکی سامان نہ آنے کی وجہ سے بند ہوگئے... وہ تمام کام جس کا مجھے تجربہ ہے، یہاں شروع نہیں کر

پاؤں گا... ہزاروں دشواریاں ہیں۔" خالد نے بہت سنجیدگی سے کہا۔
"مرد ہو۔ مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرو۔" سلیمان نے خالد کے شانوں کو تھپتھپایا۔
"سارے جھگڑوں کی جڑ تو میری وہ امید ہے جو مجھے کچھ کرنے نہیں دیتی ہے کہ بہت جلد ہم ایران واپس لوٹ جائیں گے... کچھ دنوں کی تکلیف ہے۔ ہنس کر اسے کاٹ لیں۔" خالد نے آسمان پر بھاگتے بادلوں کے سفید ٹکڑے کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"ہوں۔" اتنا کہہ کر سلیمان خاموش ہوگیا۔
"کبھی کبھی دل کرتا ہے ایک چھوٹی سی بوتیک کھولنے کا... ایرانی دستکاری... پھر..." خالد سوچ میں ڈوبا ہوا بولا۔
"ایک بج رہا ہے۔ وہ دونوں لوٹ رہی ہوں گی... چلو چلتے ہیں۔" سلیمان نے کہا اور بچوں کو بلایا۔
جب وہ طے شدہ جگہ پر پہنچے تو انہوں نے پری اور مہناز کو منتظر پایا۔ آگے بڑھ کر وہ قریب کے ایک ریسٹورینٹ میں بیٹھ گئے۔
"کیا بات ہے، بڑی جلدی شاپنگ سے فارغ ہوگئیں؟" سلیمان نے پوچھا۔
"پری کو پیرس کے مقابلے میں چیزیں زیادہ مہنگی اور کوالٹی میں چیپ لگ رہی تھیں، اس لیے کوئی خاص خریداری نہیں ہوئی۔" مہناز نے کہا۔
"تم نے کیا لیا؟" سلیمان نے پوچھا۔
"سیف اور مہوش کے کپڑے اور آپ کے لیے شرٹ۔" مہناز نے کہا۔ کھانا کھا کر سب ہائڈ پارک کی طرف چلے گئے، پھر پورے دن بچوں کو میوزیم گھماتے پکاڈلی لوٹ آئے۔ رات کا کھانا وہیں کھایا۔ کھانا کھا کر باہر نکلے۔ پیدل ہی چل پڑے۔
سڑکیں روشنی میں نہائی ہوئی تھیں۔ ویک اینڈ کی وجہ سے نشے میں ڈوبے جوان لڑکے، لڑکیاں گانا گاتے گھوم رہے تھے۔ سڑکوں پر شراب کے خالی کین بکھرے ہوئے تھے، جنہیں پیروں سے ٹھوکر مارتے ہوئے تنہا افسردہ سا کوئی آتا جاتا سڑک پر دکھائی دے جاتا تھا۔ اسی بھیڑ میں ایک انگریز بوڑھا خالد سے ٹکرایا۔ "ترا پینس پلیز!"
"دے دو تین پینس، خالد، موقع اچھا ہے انگریز کو بھیک دینے کا۔"

سلیمان نے کہا۔

وہ سب ہنستے، باتیں کرتے ہوئے فوارے کے قریب جاکر بیٹھ گئے۔ کچھ لڑکے، لڑکیاں بھی وہیں بیٹھے ہوئے تھے۔

پاس جاکر انہیں معلوم ہوا کہ وہ سب ایرانی تھے اور کورس میں انقلابی ایرانی نغمے کا ریاض کررہے تھے۔

''پرسوں انقلاب اسلامی کی پانچویں سالگرہ ہے۔'' خالد نے کہا۔

''اسی کے لیے یہ تیاری ہورہی ہوگی۔'' سلیمان نے کہا۔

سب لڑکے، لڑکیاں معمولی کپڑوں میں تھے۔ ان کی باتوں سے لگ رہا تھا کہ وہ خمینی مخالف ہیں۔ ان سے کچھ دوری پر بچے دوڑنے بھاگنے لگے۔ پھر ان کی لڑکے، لڑکیوں سے دوستی ہوگئی اور گھل مل کر باتیں ہوتی رہیں۔

بچوں کے بتانے پر ان لڑکوں نے مڑ کر ان لوگوں کی طرف دیکھا اور ایک کے منہ سے نکلا۔

''طاغوتی ہیں یہ لوگ!'' ایک لڑکی چیخی۔

''کیا معلوم؟'' دُوسرے لڑکے نے کہا۔

''حلیہ دیکھو، وہی شاہی دور کا پہناوا اور انداز۔'' پہلی لڑکی بولی۔

یہ تمام آوازیں ان چاروں کے کانوں میں پہنچ رہی تھیں۔ یہ بات انہیں بہت بُری لگی تھی کہ انہیں طاغوتی یعنی شاہ کا حمایتی کہا جارہا ہے جو ظالم اور شیطانی خصلت کا مالک تھا۔ کیونکہ ان کا انداز اور لباس ایک خاص سلیقہ کا ہے، لیکن بولتے کیا، بس خاموش بیٹھے رہے۔ تبھی ان میں سے ایک لڑکی اٹھی اور ان کی طرف آتی دکھائی دی۔ قریب آکر بولی۔ ''پری، آپ یہاں؟''

''کون؟'' پری نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے پہچانا نہیں؟''

''نہیں...تم ... یاسمین تو نہیں ہو؟'' پری نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''ہاں! میں یاسمین ہوں۔'' یاسمین نے کہا۔

''کتنی بدل گئی ہو تم!'' کہہ کر پری اس سے بغل گیر ہوگئی۔ اس کے رخساروں پر پیار کر کے بولی۔ ''کیا ہوا تمہیں؟''

''مجھ سے ہی کیا پورے ایران سے پوچھو، اسے کیا ہوا؟'' یاسمین نے کہا۔

''خالد، یاسمین کو پہچانا؟ کتنی دُبلی اور کالی ہوگئی ہے!'' پری نے دکھ سے کہا۔

''جمشید!'' یاسمین نے آواز دی۔ جمشید جیسے اس آواز کے انتظار میں ہی تھا۔ فوراً کھڑا ہو کر آگے بڑھا۔

''ان سے ملو... میری بہن، بہنوئی۔ یہ میرے شوہر جمشید ہیں۔'' یاسمین نے تعارف کرایا۔

''تجھے ہوا کیا ہے یاسمین؟'' پری کے بار بار پوچھنے سے یاسمین کے ہونٹ کانپ کر رہ گئے۔ کیا بتاتی کہ اس غریبی میں وہ حاملہ بھی ہے اور کھانے کا بندوبست صرف ایک وقت ہی کر پاتی ہے۔ بیکاری، بے سروسامانی کی الجھنوں نے اسے جوان سے بوڑھا بنا دیا ہے۔

''معاف کرنا، میں نے تعارف نہیں کرایا۔ یہ مہناز اور اس کے شوہر ہیں۔ جرمنی میں رہتے ہیں۔ مہناز میری دوست ہے۔ ہم ساتھ ساتھ پڑھے ہیں۔'' پری نے جمشید سے تعارف کراتے ہوئے کہا۔

''یہاں کیا کر رہے ہو؟ پڑھ رہے ہو یا پھر صرف...؟'' خالد نے پوچھا۔

''کرنا کیا ہے یہاں! جدوجہد کو زندہ رکھنے کے لیے تیل کی آخری بوند چراغ کی نظر کر دیں گے۔'' جمشید نے کہا۔

''چلو، میرے ساتھ ہوٹل چلو۔'' پری نے یاسمین کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

''ابھی نہیں، کل صبح آئیں گے۔ ابھی سب ساتھ ہیں، پرسوں کی تیاری کرنی ہے، ہم آٹھ لوگ پیرس سے آئے ہیں۔'' یاسمین نے کہا۔

''تم پیرس میں ہو! یا خدا، کب سے؟'' پری صرف اتنا ہی کہہ پائی۔

''ایک سال سے زیادہ ہوگیا ہے۔'' یاسمین نے کہا۔

''کل صبح ہی ہم لوگ پیرس لوٹ رہے ہیں۔ پتہ دے دیتا ہوں، پیرس میں

ملاقات ہوگی۔'' خالد نے پتہ لکھ کر آگے بڑھایا۔

''گھر میں سب ٹھیک ہے؟ وہیں تہران میں ہیں عمو اور...'' پری نے دیکھا، یاسمین کا چہرہ اس کے سوال سن کر سفید پڑ گیا ہے۔

''کیا ہوا، یاسمین؟ سب خیریت تو ہے؟'' پری نے اس کا بازو ہلاتے ہوئے پوچھا۔

''میرے علاوہ گھر میں کوئی نہیں بچا...... میں بھی جان بچا کر بھاگی ہوں۔'' یاسمین نے اتنا کہہ کر ہونٹ دانتوں سے دبا لیے۔ جمشید کو احساس تھا کہ دو بہنیں اتنے دنوں بعد ملی ہیں تو جذباتی ہو جانا یقینی ہے۔ لیکن وہ نہیں چاہتا تھا کہ کچھ خاص اور نجی دوستوں کے سامنے بیان کیا جائے۔

''یاسمین! ہمارے ساتھی انتظار کر رہے ہیں۔'' جمشید نے کہا۔

''اچھا! مجھے اجازت دیں۔ جمعہ کو گھر آؤں گی۔ جمعرات کو پیرس جانے کا ارادہ ہے۔'' یاسمین نے کہا اور سلام کیا۔ خدا حافظ کہنے کے بعد وہ مختلف سمت مڑ گئے۔ انقلابی ترانہ گاتے گاتے یاسمین کا دل بھٹک جاتا تھا۔ ادھر ہوٹل کے کمرے میں جا کر پری کھوئی کھوئی سی رہی۔ تمام رات وہ نرم گدے پر کروٹیں بدلتی رہی۔

کار میں کچھ گڑبڑی ہو جانے کی وجہ سے وہ پیرس لوٹ نہیں پائے۔ دوسرے دن جانے کا طے کر کے وہ گھومنے نکل گئے۔ کرنا بھی انہیں کیا تھا۔

آکسفورڈ اسٹریٹ پر ایک دوکان سے دوسری دوکان میں گھومتے کوٹ سوٹ کے کپڑے دیکھتے، سینٹ۔ لپسٹک خریدتے چاروں گھوم رہے تھے۔ سیلفریزیز سے نکلے تو کونے میں ایک ایرانی لڑکا اخبار بیچ رہا تھا۔ اس سے ایک انگریز عورت الجھی ہوئی تھی۔

''یو آل آر فینے ٹکس ناٹ آن لی امام خمینی۔''

''ہی از گرویل، میڈم! بگ مرڈرر۔'' لڑکے نے اخبار بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آل ایرانینس آر وائلڈ اینڈ اَن کلچرڈ پیپل۔'' قریب سے گزرتی ایک عورت نے کہا۔

''دی اسپائلڈ ورلڈ ایٹوس فیئر، دیئر از نو رول ریگولیشن فار دیم، دے آر کریزی فینے ٹکس، دے میڈ اپ ایوری تھنگ ان ایران۔'' اس کے ساتھ چلتی

دوسری بوڑھی نے کہا۔
''آفٹر تھرونگ شاہ، ناؤ دے آر کرائنگ... واٹ اے شیم؟'' ایک تیسری عورت نے بھاری تھیلے اُٹھاتے ہوئے کہا۔
''وی ڈونٹ ہیو منی پوور چائلڈ! فار دیز اسٹوپڈ تھنکس!'' پہلی عورت نے ہاتھ میں پکڑا اخبار ایرانی لڑکے کو لوٹاتے ہوئے کہا اور آگے بڑھ گئی۔ لڑکے کا چہرہ دھوئیں کی طرح سیاہ اور ہونٹ ذلت کی وجہ سے کالے پڑ گئے تھے۔
خالد، سلیمان، پری اور مہناز پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ وہ خاموش بچوں کی انگلی پکڑے سڑک پار کرنے لگے۔ لڑکا بھی بھاری قدموں سے آگے جاتا دکھائی دیا۔ خالد نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے سوچا۔ ''پری ٹھیک ہی کہتی ہے، تمام ملک ایک سے ہوتے ہیں۔ غریب الوطنی بہت بری چیز ہوتی ہے۔''

شام کو پب میں بیٹھے خالد اور سلیمان سامنے بیٹھی ہوئی عورتوں کو حیرانی سے دیکھ رہے تھے، جن کے سر کے بال چڑیلوں کی طرح اوپر کی طرف کھڑے تھے اور ہر لٹ الگ رنگ کی رنگی ہوئی تھی۔ عجیب ڈراؤنے چہرے لگ رہے تھے۔ ان کے ساتھ بیٹھے ان کے بوائے فرینڈ بھی عجیب وغریب بالوں کا اسٹائل بنائے ہوئے تھے۔ کانوں اور گالوں میں طرح طرح کے زیور پہنے تھے۔
''قومیں ترقی کرنے کے بعد یوں بھٹکتی ہیں۔'' خالد نے کہا۔
''ہاں، ایک قوم منزل تک پہنچنے کے لیے جدوجہد کر رہی ہے اور دوسری ہر قسم کے آرام سے اُکتا کر اندر کی تنہائی خالی کرنے کے لیے راستہ بھٹک گئی ہے۔'' سلیمان نے کہا۔
''بس، اب چلتے ہیں، وہ دونوں بھی انتظار کر رہی ہوں گی۔'' خالد نے کہا۔
''ایک جام ایران کی آزادی کے نام پر... پھر چلتے ہیں۔'' سلیمان نے کہا۔
دونوں خاموشی سے کسی سوچ میں ڈوبے تیسرا جام خالی کرتے رہے۔

طیبہ کا پورا جسم بخار سے ٹوٹ رہا تھا۔ اسے صرف اتنا احساس تھا کہ وہ اسٹریچر پر لاد کر کہیں لے جائی جا رہی ہے۔ پھر وہ بے ہوش ہو گئی۔

''اس کے مرنے سے ہمیں فائدہ نہیں، نقصان ہوگا۔'' پیپر ویٹ نچاتے ہوئے طاہر نے کہا۔

''وہ کیسے؟'' ناظم نے اپنی داڑھی کھجاتے ہوئے کہا۔

''اس سے بہت سی چیزوں کا علم ہمیں ہو سکتا ہے۔ اس لیے اس کے علاج میں کمی نہیں برتنی چاہیے، بلکہ دُوسرے ڈاکٹروں کو بھی بلا لو۔'' کہہ کر طاہر کمرے سے باہر نکل گیا۔

ڈاکٹروں نے طیبہ کا معائنہ کیا۔ پیر میں سیپٹک ہو گیا تھا، اسی کی وجہ سے بخار تھا۔ انجکشن لگا کر انہوں نے زخم دھویا اور ان کی اچھی طرح سے مرہم پٹی کی۔ طیبہ کو ایک نرس کے حوالے کر کے ڈاکٹر اور کمپانڈروں کی بھیڑ باہر نکل گئی۔

''اب خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ مرض قابو میں آ گیا ہے۔'' طاہر کے پوچھنے پر ڈاکٹروں نے کہا۔

کئی گھنٹوں کے بعد طیبہ کو ہوش آیا۔ نرس نے گرم دودھ کا پیالہ اس کے ہونٹوں سے لگایا۔

''کیسی طبیعت ہے تمہاری؟'' ٹیبلیٹ دیتے ہوئے نرس نے بڑے نرم لہجے میں طیبہ سے پوچھا۔ طیبہ کو بہت حیرت ہوئی۔ گردن ہلا کر اس نے جواب دیا کہ پہلے سے بہتر ہے۔ ٹیبلٹ کھا کر اس نے آنکھیں بند کر لیں۔ کان میں عجیب آوازیں آنے لگیں۔ گھبرا کر اس نے آنکھیں کھولیں۔

''کیا بات ہے؟'' نرس نے پوچھا۔

"کچھ نہیں۔" کہہ کر طیبہ نے آنکھیں بند کرلیں۔ کانوں میں اب بھی تیز آوازیں گونج رہی تھیں۔ پلکیں بھاری ہو رہی تھیں۔ خوزستان کا وہ حصہ، جہاں پر عراقی حملہ ہوا تھا، اس کی آنکھوں کے سامنے کوند گیا۔ ٹینک کی آوازیں، بموں کا دھماکہ، دھوؤں کے بادل اور چیختی عورتیں... سب کچھ جب چھٹتا تو زمین پر میلوں دُور تک صرف عورتوں کی چپلیں، سینڈلیں پڑی تھیں۔ الٹی سیدھی آڑھی ترچھی۔ کسی چپل کا ایک جوڑا یہاں پڑا تھا تو دوسرا کوسوں دور پر... کیا ہوئیں ان کی پہننے والیاں؟ کون لے گیا انہیں...؟ نیند میں ڈوبتے طیبہ کے دماغ میں صرف چپلیں ہی چپلیں بکھری تھیں۔ کالی، لال، کتھئی، سفید، پیلی، سرمئی، سنہری، روپہلی، اونچی ہیل کی، فلیٹ ہیل کی...ایسا لگ رہا تھا کہ چپلوں کی ندی ہے جو افق تک پھیلی ہوئی ہے، مگر... انہیں پہننے والے وہ نازک پیر کہاں ہیں؟ کہاں ہیں وہ تمام عورتیں؟ افق کس کے خون سے لال ہو رہا ہے؟

یہ لالی تو سورج ڈوبنے کی ہے... سورج ڈوبنے کی... تو کیا... کل پھر سورج نکلے گا...؟ واقعی سورج طلوع ہوگا...؟ طیبہ کا دماغ انہی سوالات سے بے چین کہیں کسی تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔

اس کی چھٹپٹاہٹ دیکھ کر نرس گھبرا گئی۔ ڈاکٹروں کو بلانے دوڑی۔ تکیے پر طیبہ کو چھٹپٹاتا سا دیکھ کر ڈاکٹر نے سیرنج ٹھیک کی اور نرس کو اشارہ کیا۔ نرس نے طیبہ کا ٹھنڈا ہوتا ہاتھ زور سے پکڑا۔ سوئی اس کے سفید ہاتھ پر ننھا سا خون کا قطرہ چھوڑ گئی۔

طیبہ کا نیا کمرہ قیدیوں سے اُبل رہا تھا۔ اس میں مختلف عمر کی عورتیں بھری ہوئی تھیں۔ چودہ سال کی لڑکی سے لے کر چالیس سال کی ادھیڑ عورتیں تک۔ طیبہ کو کل رات یہاں لایا گیا تھا۔ اس کے پیروں کی حالت تقریباً ٹھیک ہوگئی تھی۔

"ھنگامہ خانم۔" عورت نے اندر آکر آواز دی۔ اس کی آواز پر جو لڑکی کھڑی ہوئی تھی وہ بے حد حسین تھی۔ یقیناً وہ ہنگامہ تھی۔ کالی چادر میں لپٹا اس کا چہرہ سنگِ مرمر کا تراشا ہوا سفید آبدار موتی لگ رہا تھا۔

''چلو۔'' عورت نے حکم دیا۔ لڑکی خاموش کھڑی رہی، جگہ سے ہلی بھی نہیں۔
''چلو! تمہیں بلایا گیا ہے...... سن نہیں رہی ہو۔'' عورت چیخ پڑی۔ لڑکی خاموش کھڑی رہی۔ اپنی جگہ سے نہیں ہلی۔
''چلو۔'' کہہ کر اس عورت نے اسے پیچھے سے دھکا دیا۔ دروازے کے قریب دو پاسدار کھڑے تھے۔ اس کو بازوؤں سے جکڑ کر باہر لے گئے۔ راہداری میں اس کی آوازیں گونجتی رہیں۔
''میں نہیں جاؤں گی...... نہیں جاؤں گی۔''
اس کے جانے کے بعد عورتوں کی بھیڑ میں بیٹھی ایک لڑکی خوفزدہ سی بڑبڑائی۔'' وہ اسے چھوڑے گا نہیں... وہ اس کو...'' لڑکی کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ پورا جسم جیسے کسی گزری ہوئی شدید تکلیف کو یاد کر کے کانپ جاتا ہے۔
اس کا تھرتھراتا جملہ تجربے کار عورت کی سمجھ میں آ گیا۔ ان کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں، پھر ٹھنڈی خاموشی چھا گئی۔
شام ڈھل رہی تھی۔ کمرے میں تاریکی چھا گئی تھی۔ طیبہ کو کسی نئی سزا کا انتظار تھا کہ اب آگے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا جاتا ہے۔ بھیڑ میں کئی عورتیں حاملہ بھی تھیں۔ اٹھنے بیٹھنے میں انہیں کافی دقت ہو رہی تھی۔ کھانا آ گیا تھا۔ خاموشی سے سب نے کھایا اور تھوڑی دیر بعد وہیں فرش پر پسر گئیں۔
رات کو سسکیوں کی آواز سے طیبہ کی آنکھیں کھل گئیں۔
''کون رو رہا ہے؟'' وہ اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس کے اٹھتے ہی کئی اور عورتیں بھی اُٹھ کر بیٹھ گئیں۔
''کیا ہوا؟'' کسی نے پوچھا اور لائٹ جلا دی۔ گھٹنوں میں سر رکھے کوئی لڑکی رو رہی تھی۔ طیبہ اُٹھ کر لڑکھڑاتی ہوئی اس کے قریب جا کر بیٹھی۔ اس کا سر اُوپر اُٹھایا۔ وہ ہنگامہ تھی۔ آنکھیں سوج کر لال انگارہ بنی ہوئی تھیں۔ بال بکھرے تھے۔ طیبہ نے کچھ نہیں کہا، صرف پیٹھ پر پیار سے ہاتھ پھیرتی رہی۔ کسی کے منہ سے کچھ نہیں نکلا۔ بس وہی گھبرائی پیلے منہ والی لڑکی پھٹی آنکھوں سے چھت کو دیکھے جا رہی تھی۔

''طیبہ کے ذریعہ ہمیں پورے گروہ کا پتہ چل سکتا ہے۔'' طاہر نے کہا۔
''کیسے؟'' ناظم نے پوچھا۔
''ہمارے پاس کتنے دانشور اور انقلابی قید ہیں؟'' طاہر نے پوچھا۔
''ہزاروں!'' ناظم نے کچھ نہ سمجھتے ہوئے کہا۔
''میرا مطلب ان تمام لوگوں سے نہیں ہے، بلکہ انگلیوں پر شمار کیے جانے والے... جیسے طیبہ، براہنی وغیرہ۔'' طاہر نے کمرے میں ٹہلتے ہوئے کہا۔
''ان کے کرتوتوں کی فائل ہے... دیکھ کر بتاتا ہوں۔'' ناظم نے سامنے الماری سے فائلیں نکالیں۔
کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔ صرف کاغذ پلٹنے کی آواز خاموشی کو توڑ رہی تھی۔ آدھے گھنٹے بعد ناظم نے فائلیں الماری میں رکھیں اور ہاتھ کا کاغذ اٹھائے طاہر کے پاس لوٹا۔
''یہ کچھ اہم نام ہیں، پڑھ کر دیکھیں!'' ناظم نے فہرست آگے بڑھا دی۔
''حسین میہن دوست...... مجاہد......! اعتمادزادہ...... مجاہد...... کورش، پاک دامن... فدائی...... قریشی میخ چی... فدائی۔ اور... ہاں... ہاں ان کا جرم اور کچا چٹھا بھی لکھ دیا... ٹھیک ہے۔'' کچھ سوچتا ہوا طاہر بیٹھا رہا۔
''کیا سوچا؟'' ناظم نے اسے اپنی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر پوچھا۔
''حسین اور کورش کو ایک کمرے میں کردو، ان کے ساتھ طیبہ کو... ٹیپ وغیرہ فٹ کردینا... دیکھو یہ کیا باتیں کرتے ہیں،'' طاہر نے کہا۔
''ٹھیک ہے۔'' ناظم نے کہا اور باہر نکل گیا۔
طیبہ باتھ روم میں تھی کہ فائر کی آوازیں اس کے کانوں سے ٹکرائیں۔ گھبرا کر باتھ روم کی جھری سے جھانکا۔ سامنے کا منظر دلدوز تھا۔ دیوار سے لگی وہ تینوں حاملہ عورتیں کھڑی تھیں اور ان کے سینے خون اگل رہے تھے۔ طیبہ کا سر چکرانے لگا۔ بیچ والی

عورت کا جسم تڑپا، درد سے اینٹھا اور کچھ دیر بعد اس نے ایک بچے کو جنم دے دیا۔ مرنے سے پہلے، پھیلتی آنکھوں سے اس نے نیچے دیکھا...

ایک گولی سنسناتی ہوئی نوزائیدہ بچے کے سر کو چھیدتی ہوئی ماں کے پیروں میں پیوست ہوگئی۔ اس کے منھ سے 'آہ' کی بھیانک آواز نکلی اور سر ایک طرف کو لڑھک گیا۔ پھٹی، کھلی آنکھیں زمین کی طرف اٹک گئی تھیں۔

باتھ روم سے نکل کر طیبہ باہر آئی۔ پہریدار عورت نے لپک کر اسے پکڑا۔ وہ بے ہوش ہوکر اس کی بانہوں میں جھول گئی۔

اسے جب ہوش آیا تو دن نکل آیا تھا۔ کمرے میں وہ تنہا تھی۔ دھوپ کے دھبے چھت کے سوراخوں سے کمرے میں پھیلے ہوئے تھے۔ اس نے غور سے اپنے آس پاس دیکھا، یہ پہلے والا کمرہ نہ تھا۔ کہاں ہے وہ؟ اس نے تعجب سے ادھر ادھر دیکھا، پھر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ دیوار سے اس نے پیٹھ لگائی۔ صبح کا دیکھا وہ منظر اس کی آنکھوں کے سامنے اُبھرا۔

''تم اُٹھ گئیں؟'' لمبی چوڑی چمگادڑ نے پوچھا۔

طیبہ نے چہرہ اوپر اٹھایا؛ لیکن کچھ بولی نہیں۔

''کھانا آرہا ہے، کھالو۔'' اتنا کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔ کھانا اس کے جاتے ہی آگیا۔ کافی دیر تک وہ کھانے کو خاموشی سے تاکتی رہی، پھر ایک لقمہ اٹھایا۔ جیسے ہی منھ کی طرف لے گئی، بچے کا گرنا اور سر پر گولی سے اُبلا خون کا فوارہ اسے یاد آگیا۔ ایک تیز اُبکائی آئی۔

متلی ہونے کے بعد طیبہ پر رونے کا دورہ پڑا۔ دل پگھل پگھل کر جیسے آج بہہ جانا چاہتا تھا۔ وہ وہیں فرش پر اوندھی پڑی کافی دیر تک سسکتے سسکتے بے دم ہوگئی۔ کمزوری کی وجہ سے اسے نیند آگئی۔

بقرعید کا دن ہے۔ سب بہن بھائی نئے کپڑے پہنے اچھل کود کر رہے ہیں۔ خالہ زاد بھائی نے آکر بتایا۔ ''قربانی شروع ہونے والی ہے۔''

سب دوڑ کر گھر کے سامنے کھلے میدان میں جا کر بیٹھ گئے۔ بابا ہاتھ میں چھری

لیے دُعائیں پڑھتے قبلے کی طرف منہ کیے کھڑے تھے۔ گائے زمین پر لیٹی تھی، اس کے پیر قصاب نے پکڑ رکھے تھے۔ دُوسرے قصاب نے اس کی گردن کھدے ہوئے گڑھے پر جما رکھی تھی۔

بابا آگے بڑھے اور تیز چھری کو انہوں نے گائے کی گردن پر چلا دیا۔ گائے حلال ہو کر تڑپی۔ گردن سے بہتا خون گڑھے میں جمع ہونے لگا۔ گائے جب ٹھنڈی پڑ گئی اور خون گردن سے بہنا بند ہو گیا تو دونوں قصابوں نے اس کا بے دم جسم اپنی طرف گھسیٹا اور خون سے بھرے گڑھے پر مٹی ڈال دی۔

کھال اُتارنی شروع کی۔ ہاتھ پیر کاٹنے کے بعد پیٹ کاٹا گیا۔ اس میں سے ننھا سا بچھڑا نکلا۔ سب بچوں کو بہت حیرت ہوئی۔ وہ اور آگے بڑھ آئے۔ سب سے آگے طیبہ تھی، پھر اس کا خالہ زاد بھائی سمیر... دونوں تعجب سے دیکھ رہے تھے۔ بچھڑے کی گردن پر چھری چلا کر اسے ذبح کیا اور ایک کنارے ڈال دیا۔ گوشت بننا شروع ہو گیا۔ بچھڑے کا منہ دیکھ کر طیبہ کو بہت تکلیف ہو رہی تھی۔

اچانک بچھڑے کا منہ انسانی بچے میں بدل گیا اور کہیں سے سنسناتی گولی لگی اور خون کا فوارہ پھوٹ پڑا...

''نہیں... نہیں...'' چیختی ہوئی طیبہ خواب سے بیدار ہو گئی۔

''کیا ہوا؟'' باہر پہرہ دیتا ہوا پاسدار اندر آیا۔

''کچھ نہیں۔'' کہہ کر بدحواس طیبہ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔

''چلو! تمہارا کمرہ بدلا جائے گا... یہاں تنہا تم ڈر رہی ہو۔'' اس لمبی چوڑی عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔ طیبہ نے بڑی حیرت سے اس کرخت عورت کی جانب دیکھا اور سوچا۔ ''کیا پتھر بھی مسکرا سکتا ہے؟''

''چلو اُٹھو...... اُٹھاؤں کیا تمہیں؟'' نرم لہجے میں پوچھا گیا تھا، لیکن ہنگامہ کی یاد نے اسے اچھل کر کھڑے ہونے پر مجبور کر دیا۔

آنکھوں پر پٹی باندھی گئی اور طیبہ کا ہاتھ پکڑ کر کمرے سے باہر لائی۔ طیبہ کو اس بدلے برتاؤ پر بڑی حیرت ہو رہی تھی۔ کافی دور چل کر وہ ایک کمرے میں داخل ہوئیں

اور طیبہ کی آنکھوں سے پٹی کھول دی گئی۔ طیبہ پلکیں جھپکاتی ہوئی دیوار سے لگ کر بیٹھ گئی۔ اُسے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے تارے ٹوٹ رہے تھے۔

''طیبہ!'' ایک جانی پہچانی سی سرگوشی طیبہ کے کانوں میں ٹکرائی۔ طیبہ اپنا وہم سمجھ کر خاموش بیٹھی رہی۔

''طیبہ!'' یادوں کی نقرئی گھنٹیاں میلوں دور سے بج اٹھیں۔ کیسا عجیب اتفاق ہے۔ یہ آواز برسوں بعد مجھے کتنے قریب سے سننے کو مل رہی ہے۔ طیبہ سوچ رہی تھی۔ یادوں کا قافلہ، جس سے میں کب کی بچھڑ چکی ہوں، آج ساربان پھر کیوں آواز دے رہا ہے؟

''طیبہ!'' کسی نے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ طیبہ نے آنکھیں اٹھائیں۔ سامنے صرف دھبے تھے۔ اس کی آنکھیں اب بھی زخمی تھیں۔ پٹی باندھنے سے پتلیوں پر زور پڑا تھا۔

''مجھے پہچانا نہیں؟'' آواز نے پوچھا۔

''کورش!؟!'' طیبہ کی آواز میں زمانوں کا کرب تھا۔

''ہاں! کورش ہوں میں۔''

''کیسے ہو تم؟''

''کیا تم دیکھ نہیں پاتی ہو؟''

''دیکھ پاتی ہوں۔ لیکن ابھی میری آنکھوں کے سامنے دھبے ہی دھبے ناچ رہے ہیں۔'' طیبہ نے پریشان ہوتے ہوئے کہا۔

''کتنا طویل عرصہ گزر گیا... ملاقات بھی ہوئی تو کہاں؟'' کورش نے جذباتی ہو کر کہا۔

''مجھے تو اب بھی یقین ہی نہیں ہو رہا ہے۔ پچھلے دس برسوں سے تم یہیں ہو؟'' طیبہ نے پوچھا۔ اس کی آنکھوں کی سوزش ٹھیک ہو رہی تھیں۔

''نہیں! کئی جیل خانوں میں گھوما ہوں۔ دو سال سے ایون میں ہوں۔'' کورش نے طیبہ کے ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''ان ہاتھوں میں کیا دیکھو گے، کورش!'' طیبہ پرانی یادوں میں کھوئی ہوئی بولی۔

''ایران کا نقشہ، پہاڑ، پیڑ، گھر اور ان گھروں کے بیچ...... اتنا کہہ کر

کورش خاموش ہوگیا۔
''اس ہاتھ میں صرف بہشتِ زہرا کی تصویر ہے۔ ہمارا ایران، پہاڑ، پیڑ، گھر نہیں، صرف قبر... قبروں میں ڈھل گیا ہے۔ ان گھروں کے درمیان ہمارا ایک گھر تھا... وہ بھی قبر میں تبدیل ہوگیا ہے۔'' کہہ کر طیبہ درد میں ڈوبی پھیکی ہنسی ہنس پڑی۔
''تم کب سے ہو یہاں؟'' کورش نے اداسی سے پوچھا۔
''تقریباً آٹھ ماہ ہوگئے ہیں۔'' طیبہ نے غور سے کورش کے چہرے کو دیکھا... کتنا بدل گیا ہے کورش۔ چہرے پر بڑھی داڑھی، کٹا ہونٹ، ماتھے پر متعدد نشان دس سالہ اذیتوں کی کہانی بیان کررہے تھے۔
''کیا دیکھ رہی ہو؟'' کورش نے پوچھا۔
''گزرے کل کو جو اپنا نہ ہوا۔'' اتنا کہہ کر طیبہ نے اپنی سرخ آنکھیں کورش کے چہرے پر مرکوز کردیں۔ کورش کتنا حسین تھا۔ چوڑا سینہ پگھل کر لکڑی کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ رنگ کالا اور چہرہ بیمار۔
''اگر تمہیں باہر دیکھتی تو ہرگز پہچان نہ پاتی۔'' طیبہ نے رندھے گلے سے کہا۔
''گزرے وقت کی دھول بہت سی چیزوں کو دھندلا بنا دیتی ہے۔'' کورش نے دھیرے سے کہا۔
''یہ کونے میں کون سو رہا ہے؟'' طیبہ نے پوچھا۔
''میری طرح کا دوسرا قیدی... میں نے آج ہی پہلی بار اسے دیکھا ہے۔ آتے ہی سوگیا!'' کورش نے کہا۔
''تم سے ملنا... موت سے پہلے منھ میں ٹپکائے پانی کی بوندوں کی طرح زندگی بخش بن گیا ہے۔ اب سکون سے مرسکوں گی۔'' طیبہ نے کہا اور خاموش ہوگئی۔ کتابوں کے بیچ سوکھے پھول صرف یادیں ہی رہتے ہیں، حقیقت نہیں۔
کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ یادوں کی آہٹوں نے دونوں کو برسوں پہلے کی زندگی میں گھسیٹ لیا تھا۔

"سنیے! ملیحہ بہت تکلیف میں ہے۔ اگر ہم اُسے گاؤں والے گھر میں رہنے کو کہیں تو اس کو کچھ آرام مل جائے گا۔" سوسن نے رات کو عباس سے کہا۔

"مجھے تو خوشی ہوگی۔ تم ملیحہ خانم سے کہہ کر دیکھو، مانتی بھی ہے تمہاری بات یا نہیں۔" عباس نے اپنے خدشے کا اظہار کیا۔

"ہاں یہی مشکل ہوگی۔ کل جا کر پوچھوں گی؛ بلکہ اصرار کروں گی۔" اتنا کہہ کر سوسن لیٹ گئی۔

"کاغذات سب ٹھیک ہوگئے ہیں۔ لیکن سوسن، بہت بری حالت ہے ایران کی۔ وزیرِ اعظم کے دفتر کے باہر سے کتنے لوگ میرے پیچھے لگ گئے کہ آپ ہندوستان جا رہے ہیں، جتنے تومان چاہیں گے آپ کو ہم یہاں دے دیں گے آپ ہمارے بیٹوں کو روپیہ دے دیں۔ ایک ہزار روپے کے بدلے میں تین ہزار تومان دینے کو راضی ہیں۔ کیا ہونے والا ہے میرے خدا؟" عباس نے کروٹ بدلتے ہوئے کہا۔

"میں خود حیران ہوں کہ یہ سب ہو کیا رہا ہے؟" سوسن نے کہا۔

کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ دونوں تھکے ہوئے تھے۔ گہری نیند میں ڈوب گئے۔

دُوسرے دن جب سوسن ملیحہ کے گھر پہنچی تو اِدھر اُدھر کی باتیں کر کے اس نے ہمت جمع کی اور وہ بات زبان پر لائی، جسے سن کر ملیحہ کے چہرے پر اطمینان ابھرا، لیکن جلدی ہی غائب ہوگیا۔

"نہیں، سوسن!"

"کیوں؟"

"کل حسین لوٹے تو مجھے کہاں ڈھونڈیں گے۔ میں دوبارہ انہیں کھونا نہیں چاہوں گی۔ پھر... طیبہ کا ایک ہی گھر تو بچا ہے۔ کل وہ بھی لوٹے گی تو اسی گھر کو ڈھونڈے

گی... پری، مہناز، شہناز میرے تمام جاننے والے...'' ملیحہ نے خیالات میں ڈوبے ہوئے کہا۔

''بچوں کا خیال کرو...!'' سوسن آہستہ سے بولی۔

''ابھی چند ماہ میں رہ سکتی ہوں۔ پھر...'' تفکرات کے سائے ملیحہ کے چہرے کو افسردہ کر گئے۔

''میں تمہارا سب انتظام کردیتی ہوں، جب دل چاہے چلی جانا... کسی غیر کا گھر نہیں ہے وہ۔ ہم بھی مطمئن رہیں گے کہ کوئی اپنا ہے وہاں پر... یہ خط رکھو۔ بلقیس اور عبداللہ کے نام عباس نے لکھا ہے۔ جب جانا، یہ ساتھ لے جانا؛ تاکہ تمہیں پریشانی نہ ہو۔'' سوسن نے خط پرس سے نکالتے ہوئے کہا۔

''تمہارا خلوص اور محبت...... کبھی نہیں بھولوں گی۔ تم نے میرے بارے میں اتنا سوچا تو...... وقت پڑا تو ضرور جاؤں گی...... جانا پڑے گا......!'' ملیحہ نے خط رکھتے ہوئے کہا۔

''تم ہمت سے کام لو، ملیحہ!'' سوسن نے اس کے شانوں کو سہلایا۔

''کب جارہی ہو؟'' ملیحہ نے پوچھا۔

''تین دن بعد، کل ،کرمان شاہ جارہی ہوں۔ ان کی بہنیں اور ماں وہاں رہتے ہیں۔ جانے سے پہلے یہ ملنا چاہتے ہیں۔'' سوسن نے بچے کو گود سے اتارتے ہوئے کہا۔

''جہاں رہو، خوش رہو۔'' ملیحہ نے کہا اور چائے بنانے اٹھی۔

''زیادہ تکلف مت کرو۔ بس، اب میں جاؤں گی۔'' سوسن نے بچہ کا سامان سمیٹتے ہوئے کہا۔

''چائے تو ساتھ پی لو، پھر جانے کل کیا ہو۔ میں مل پاؤں تم سے یا نہیں۔'' ملیحہ نے کہا اور چائے کا فنجان آگے بڑھایا۔

جب سوسن جانے لگی تو ملیحہ کو لگا، اس کا پھر کوئی اپنا اس سے جدا ہورہا ہے۔ آنکھیں بھر آئیں۔ سوسن بھی رو رہی تھی۔ ملیحہ نے بچوں کو خوب پیار کیا۔ سینے سے لگایا اور ملیحہ سے لپٹ گئی۔

"وقت نے کیا کیا رنگ دکھائے ہیں ملیحہ!"
"قسمت کا لکھا پورا ہوتا ہے۔"
"خط ضرور لکھنا۔"
"ضرور...... تم بھی لکھنا۔"
"اپنا خیال رکھنا۔"
"تم بھی اپنی طرف سے غافل نہ ہونا۔"
"گریہ کی شدت نے انہیں آگے باتیں کرنے سے روک دیا۔ وہ بار بار ایک دُوسرے سے لپٹ رہی تھیں۔ نیچے آ کر سوسن ٹیکسی میں بیٹھی۔ ملیحہ نے ہاتھ ہلایا۔ سوسن کی سرخ آنکھیں کھڑکی میں سے اب بھی برستی نظر آ رہی تھیں۔

۲۷

شام بہت سہاؤنی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے۔ پری اور مہناز دریائے سین کے پل پر کھڑی اندھیرے میں دریا کے پیچھے پھیلے شہر کا نظارہ دیکھ رہی تھیں۔ ٹھنڈی ہوا ان کے بالوں کو گدگدا رہی تھی۔

کل صبح مہناز جرمنی لوٹ رہی ہے۔ پری قصداً اسے تنہا اپنے ساتھ نکال لائی ہے، تاکہ باتیں کر سکے۔ ایسی باتیں گھر میں بیٹھ کر نہیں ہو سکتی تھیں۔ تھوڑی دیر وہ چہل قدمی کرتی رہیں، پھر پری نے کہا۔ "چلو سگریکر گرجا گھر چلتے ہیں۔ وہاں پر سکون سے گھومتے ہیں۔"

"چلو۔" مہناز نے کہا۔ دونوں کار میں آ کر بیٹھ گئیں۔ سڑک پر بھیڑ غضب کی

تھی۔ چارلس ڈگالس کے قریب پہنچ کر ٹریفک جام ہو گیا۔
''اب کب آؤ گی، مہناز؟'' پری نے پوچھا۔
''اب تم لوگ آؤ۔ بچوں کی چھٹیاں تو دو ماہ بعد ہونے ہی والی ہیں۔'' مہناز نے کہا۔
''ضرور آؤں گی مہناز! تمہارا وجود بہت بڑا سہارا بن گیا ہے میرے لیے۔''
پری نے کہا۔
''مجھے بھی ایسا ہی احساس ہوا جیسے خواب... یعنی وہی بچپن دوبارہ مل گیا۔'' مہناز نے آہستہ سے کہا۔
''ذرا سامنے دیکھو۔'' پری نے اشارہ کیا۔ ریڈ لائٹ پر کاریں کھڑی ہو گئی تھیں۔
سامنے زیبرا کراسنگ سے ایک جوان جوڑا گزر رہا تھا۔ لڑکے کے گال کے اوپر لال ہونٹ بنے ہوئے تھے۔ مونچھیں بھی مصنوعی بنی ہوئی تھیں۔ دوسرے گال پر بڑا سا کالا تل تھا۔ لڑکی نے چہرہ مختلف رنگوں سے رنگ رکھا تھا۔ جسم پر اُلٹے سیدھے کپڑے تھے۔
''ان کی دُنیا بھی عجیب ہے پری۔ تمام عیش و آرام کے بعد یہ ایب نارمل ہو رہے ہیں۔'' مہناز نے کہا۔
اب کار فراٹے بھرتی بھاگ رہی تھی۔ پگال سے ہوتی، خم دار راستوں سے گزرتی وہ سکر یکر کی سیڑھیوں کے پاس جا کر رک گئی۔ دونوں سہیلیاں نیچے اتریں اور سڑک پار کر کے سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔ اوپر جا کر انہوں نے نیچے شہر کو دیکھا۔ روشنی کے قمقمے افق تک بکھرے ہوئے تھے۔ کافی دیر تک وہ دونوں اس کی خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتی رہیں، پھر اندر چرچ میں گئیں اور وہاں بچھی بینچ پر خاموش بیٹھ گئیں۔ شمع کی روشنی پھیل رہی تھی۔ سامنے کی دھندلی پینٹنگ کو مہناز دیکھنے میں منہمک تھی۔
''پُرانی چیزیں ماضی کی یادوں کی طرح مقناطیسی ہوتی ہیں۔'' پری نے کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔
''لیکن کتنی انمول ہوتی ہیں!'' مہناز نے چرچ کے دروازے سے باہر نکلتے ہوئے کہا۔ سیڑھی اُتر کر وہ دونوں پیچھے کی طرف ہو لیں۔
ہمیشہ کی طرح مصوروں کا میلہ لگا تھا۔ مختلف انداز میں بیٹھے لوگ اپنی تصویر

بنوا رہے تھے۔ چاروں طرف کے ریسٹورینٹ میں ٹورسٹ بیٹھے تھے۔ ریسٹورنٹ کے سامنے ان کے دل بہلانے اور پیسہ کمانے کے لیے جوان لڑکے لڑکیاں کہیں ڈانس، کہیں جادو، تو کہیں جوکر بن کر کرتب دِکھا کر ہنسا رہے تھے۔

خالی میز دیکھ کر وہ باہر ہی بیٹھ گئیں۔ سافٹ ڈرنک کا آرڈر دے کر پری نے مہناز کی طرف دیکھا اور کچھ کہنا چاہا، تبھی ایک لڑکی کاغذ پینسل لے کر اُن کے قریب آ کر کھڑی ہوگئی۔

''میڈم، اسکیچ!''

''نو، تھینک یو۔'' پری نے کہا۔ ابھی وہ گئی ہی تھی کہ بال بکھیرے ایک دوسرا مصور آ گیا۔ ''میڈم، ایک اسکیچ!''

''تھینک یو!''

''کام تو دیکھئے! ایک دم فرسٹ کلاس۔'' اس نے یہ کہہ کر تصویر بنانی شروع کر دی۔

''گھر سے زیادہ تو یہاں ہنگامہ ہے۔'' مہناز نے ہنس کر کہا۔

''قسمت کی بات ہے۔'' پری نے کہا اور شربت کا گھونٹ بھرا۔

''یہاں سے چلتے ہیں۔'' مہناز نے دُوسرے مصور کو اپنے قریب آتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''چلو۔ وہ پُل ہی ہمارے لیے اچھا تھا۔'' کہہ کر پری کھڑی ہوگئی۔

پُل کے کنارے کار پارک کی اور دونوں پیدل چل پڑیں۔ سیڑھیاں اتر کر سین کے کنارے جا کر بیٹھ گئیں۔ سین کے گندے پانی پر بڑی سی کشتی مسافروں سے بھری سیر کراتی آگے جا رہی تھی۔

''اسلم سے پھر ملاقات ہوگی تمہاری؟'' اچانک ہی پری نے پوچھا۔

''کہہ نہیں سکتی۔'' مہناز نے کہا۔

''میں خط لکھوں گی! اب بھی وہ تمہیں بہت یاد آتا ہے؟'' پری کے یہ کہنے پر مہناز خاموش رہی۔

''کچھ بولو تو؟''

''تم تو میری خاموش زبان سمجھتی ہو۔''

''یہ تو پرانی بات ہے۔ بہت کچھ بدلا ہے اس بیچ... محسوس کرنے کی شدت کم ہوگئی ہے مجھ میں۔'' ہنستے ہوئے پری نے کہا۔

''تم اسے بس وہ تمام باتیں لکھ دو تا کہ اسلم سچائی سے آگاہ ہوجائے۔'' مہناز نے کہا۔

''بس اتنا ہی؟'' پری نے چھیڑتے ہوئے کہا۔

''یہ دریائے سین ہے پری۔ اس کے دونوں طرف تاریخی عمارتیں ہیں۔ دونوں کناروں پر بسا طویل و عریض شہر، جسے ہٹلر جیسے ظالم نے بھی تباہ نہیں کیا۔ اس کی خوبصورتی سے وہ بھی متاثر تھا۔ میں بس دریائے سین ہوں، خاموش، بغیر آواز کیے بہتی جاؤں گی۔ میرے لیے میرے دونوں کنارے اہم ہیں۔ ان تمام تاریخی واقعات کی تم شاہد ہو۔'' مہناز اتنا کہہ کر خاموش ہوگئی۔

پری کی شرارت غائب ہوگئی تھی۔ بہتے پانی پر اس نے نظریں گڑا دیں۔ لہریں آگے بڑھ رہی تھیں۔ واقعی پانی کے بہاؤ کی کوئی آواز پری کو سنائی نہیں پڑ رہی تھی۔

شہیاد کی وہ شاندار عمارت جو، اب میدانِ شہدا کے نام سے جانی جاتی ہے، دھند میں پریوں کے کسی محل کی طرح لگ رہی تھی۔ صبح کا وقت تھا اور سڑکیں سنسان تھیں۔ سوسن اور عباس ہوائی اڈے کی طرف ٹیکسی میں بیٹھے جا رہے تھے۔ سوسن کو اپنا بچپن، جوانی، پھر انقلاب کا وقت، اس کے اہم واقعات نظروں کے سامنے سے گزرتے محسوس ہو رہے تھے۔

شہیاد کے سامنے کبھی شاہی جشن منائے جاتے تھے۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ اس عمارت کو دیکھنے آتے تھے۔ پھر یہ عمارت اپنا نام کھو بیٹھی۔ انقلابی تقریریں ہونے لگیں۔ اس کی دیواروں پر لکھ دیا گیا۔ 'مرگ بر شاہ'۔ اس کا نام بدل کر ''میدانِ شہدا'' رکھ دیا گیا۔ نیچے کا ہرا بھرا باغ سوکھ گیا۔ اس پر کالے جھنڈے لہرانے لگے۔ ایران کی

دیواروں پر نعرے لکھے جانے لگے۔جلوس، تقریریں، گولیاں ان تمام آوازوں سے ایران بھرتا گیا اور...

ٹیکسی ہوائی اڈے پر جاکر رُک گئی۔سوسن چونک پڑی۔ دل پر ایک خوف سا چھا گیا جیسے کچھ وقوع پذیر ہونے والا ہو۔ عباس کا چہرہ بھی اترا ہوا تھا۔ سامان اتروا کر وہ آگے بڑھے۔ کسٹم سے فارغ ہوکر جب وہ ہوائی جہاز پر بیٹھے تو آنسو کا پہلا قطرہ عباس کی آنکھوں سے ٹپکا۔

جہاز نے اڑان بھری۔ مکانوں کے بیچ سے شہیاد کی عمارت ہنس کی طرح سر اٹھائے زمین پر تیر رہی تھی۔ جب شہر کا عکس دھندلا پڑنے لگا تو دونوں نے آہستہ سے کہا۔ ''الوداع میرے وطن!''

''تمہاری ترکیب کام نہیں آئی۔'' ناظم نے ٹیپ سنتے ہوئے کہا۔

''ایک، دو دِن اور انتظار کر لیتے ہیں۔'' طاہر نے کہا۔

''جیسی تمہاری مرضی۔'' ناظم نے کہا۔

''تم کچھ بد دل ہو رہے ہو؟'' طاہر نے کہا۔

''چار کوڑے مار کر جو بات اگلوائی جا سکتی ہے، اس میں تم اتنی ڈھیل برت رہے ہو۔'' ناظم نے کہا۔

''خیر! دو دن رُک جاؤ۔ پھر جو تمہارا دل چاہے کر لینا۔'' طاہر نے کہا اور ٹیپ سننے لگا۔

''ٹھیک ہے۔'' ناظم نے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

صبح جب حسین اٹھا تو اس نے سوئی ہوئی طیبہ کو پہچان لیا۔ چار سال بعد اس نے کسی شناسا کا چہرہ دیکھا تھا۔ بیقراری سے وہ طیبہ کے اٹھنے کا انتظار کرنے لگا۔

''چائے لو۔'' بھاری آواز نے طیبہ کو جگا دیا۔ دروازے میں زور سے دھکا مار کر ایک پاسدار اندر داخل ہوا۔ طیبہ ہڑ بڑا کر اٹھ بیٹھی۔ کورش اب بھی سویا ہوا تھا۔ اس نے اسے

جگانا چاہا، تبھی سامنے والے قیدی نے کہا۔ ''طیبہ! مجھے پہچانا نہیں؟ میں حسین ہوں۔''

''حسین تم!'' طیبہ خوشی سے چیخ پڑی۔

''ملیحہ کیسی ہے؟'' حسین نے بے قراری سے پوچھا۔

''ملیحہ اور بچے ٹھیک ہیں۔ تینوں تمہارے لوٹنے کی راہ تک رہے ہیں۔'' طیبہ نے کہا۔

''شہر کا کیا حال ہے؟''

''تم جیسا چھوڑ کر آئے تھے ویسا ہی ہے۔ کیا تبدیلی آئے گی؟ مہنگائی، بیکاری، جنگ کی لعنت سر پر موجود ہے۔'' طیبہ نے کہا۔

''تم کیسی ہو؟ کب آئیں یہاں؟''

''تقریباً آٹھ ماہ ہوگئے ہیں۔''

''مجھے آج چار سال اٹھارہ دن ہوئے ہیں!''

''آزاد کب ہو رہے ہو؟''

''معلوم نہیں!''

''کہتے کیا ہیں؟''

''کچھ بھی نہیں۔''

''سلام! صبح بخیر!'' کہتا ہوا کورش آنکھ ملتا اٹھ بیٹھا۔

''کورش، یہ حسین ہیں، ملیحہ کے شوہر۔'' طیبہ نے کہا۔

''سلام!'' دونوں طرف سے ہوا اور حال چال پوچھا گیا۔

''چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔'' طیبہ نے کہا۔

حسین کے باتھ روم سے آنے کے بعد ناشتہ شروع ہوا۔ چائے اور روٹی کے بچے ٹکڑوں کے ساتھ۔ ناشتے کے بعد حسین تھوڑی دیر باتوں میں مشغول رہا، پھر معافی مانگتا ہوا زمین پر لیٹ گیا اور گہری نیند میں ڈوب گیا۔

''حسین کو اتنی نیند کیوں آتی ہے؟'' طیبہ نے تعجب سے پوچھا۔

''اس کی صحت بہت خراب ہوگئی ہے۔ پپوٹوں کے نیچے پھولا حصہ دیکھا؟ آنکھیں بھی پیلی پیلی ہو رہی ہیں۔'' کہہ کر کورش نے حسین کے چہرے کو دیکھا۔ سوکھا پتلا چہرہ۔

گالوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ہونٹوں پر پپڑی جم گئی تھی۔ فرش پر گھٹنے پیٹ کی طرف مڑے، دونوں ہاتھوں کا تکیہ بنائے داہنی کروٹ سو رہا تھا۔

''ماں نے کتنے پیار سے پال کر حسین کو بڑا کیا ہوگا۔ کیا کیا ارمان ہوں گے اس ممتا کی ماری کے دل میں۔ لیکن آج ان تمام جذبات سے عاری یہ اذیتوں کی زنجیروں سے بندھا پڑا ہے۔ کل کے انتظار میں....'' طیبہ نے کہا۔

''مجھے تو اب طیبہ...... سونے اور جاگنے دونوں سے ڈر لگتا ہے... سوتا ہوں تو خواب دیکھتا ہوں، ڈراؤنے اور افسردہ۔ سوکر اٹھتا ہوں تو وہی بھیانک زندگی سامنے رہتی ہے جسے پچھلے دس سالوں سے بغیر کسی جدوجہد کے ڈھو رہا ہوں... دس سال... زندگی کے بہترین سال میں نے ان جیلوں کی چار دیواری میں گزار دیے.... کل کس سے حساب مانگوں گا... کس سے...؟ سوچا تھا۔ ڈاکٹر بن کر... اف! سب کچھ مٹی میں مل گیا... خواب، قوت، جوش، ولولہ، معذور کی زندگی تکلیف دہ ہوتی ہے۔ لیکن ہاتھ پیر والوں کو جب معذور بنا دیا جائے تو وہ تکلیف بیان سے باہر ہے، طیبہ....'' کورش نے ہاتھوں پر پڑے نشانوں کو انگلی سے چھوتے ہوئے کہا۔

''تمہارے غم کا احساس ہے مجھے، انہیں الفاظ کا جامہ پہنا کر میرے زخموں کو مت کریدو۔'' طیبہ نے بھرے گلے اور بھیگی آنکھوں سے کہا۔

''مرد کے لیے، وہ بھی جوان مرد کے لیے اس کی محبوبہ کی اہمیت... تمہاری دوری... تمہاری خوشبو اور لمس... تمہاری باتیں اور خواہشات پچھلے دس برسوں کے میری اس خاموش زندگی کے سناٹے میں عجیب شور مچاتے تھے... کتنا برداشت کیا ہے میں نے!'' کورش نے کہا۔

''مگر کہیں نہیں پہنچے ہم.... ہمیں غلط فہمی تھی کہ ہمارے مضامین، ہمارا قلم، ہمارے الفاظ سہیل ستارہ کی مانند ہے، جس کی روشنی کی تاثیر سے کچے چمڑے کے کیڑے مرجاتے ہیں۔ اسی طرح معاشرہ کی برائیوں کو دور کرکے اُس کو نئی سمت نئی حس دیں گے، وقت کی لہریں موڑیں گے لیکن... نہ کتابیں بچیں، نہ مضامین... سب تباہ و برباد ہوگئے۔'' طیبہ نے بے حد تھکے لہجے سے کہا۔

''افسوس تو سمجھ میں آتا ہے، لیکن یہ ناامیدی تم پر زیب نہیں دیتی ہے!'' کورش نے حیرت سے کہا۔

''ناامید نہیں ہوں کورش! لیکن تھک گئی ہوں... بہت تھک گئی ہوں... کیا حاصل ہوا ہمیں؟ خالی دامن، خالی ہاتھ... انقلاب کا حال دیکھ رہے ہو، جو پاسباں تھے وہ قید میں ہیں اور ظالم مجرم ان کے نگہبان بن بیٹھے ہیں۔ اس مذاق پر تم ہنس سکو تو ہنس لو، مگر میں مسکرا بھی نہیں سکتی۔ میں تو پست ہوگئی ہوں۔'' کہہ کر طیبہ نے اپنی بھری آنکھیں دیوار پر مرکوز کردیں۔

''ہمارے افسانے کل بڑھتی ہوئی جدوجہد دہرائے گی... ہمارے بہے خون سے ہزار طیبہ... ہزار کورش... ہزار حسین... ہزار مصنف، شاعر، انقلابی پیدا ہوں گے... ہم خالی ہاتھ جا ضرور رہے ہیں... لیکن کچھ دے کر جارہے ہیں اس جہاد کو... بہت کچھ دے کر جارہے ہیں... اس چراغ کی ٹمٹماتی لو کی روشنی کو دیکھنے... بہت آئیں گے... کیا معلوم نئی نسل اس چراغ کو مشعل میں تبدیل کردے۔'' کورش نے کانپتے لہجے سے کہا۔

''ان باتوں سے دل بہل جائے گا۔ خون میں دوبارہ گرمی آجائے گی اور بس....'' طیبہ نے کہا۔

''ایک ادیب اور انقلابی کا آخر تو یہی ہے طیبہ۔ سہنا اور لکھنا۔ کیا وہ تاجر بن جائے؟ نظریات، اصولوں اور مضامین کو ہر نئے گراہک کے ہاتھ فروخت کرنے لگے؟ مصنف لکھ ہی تو سکتا ہے نا؟ انقلابی لڑے گا ہی نا؟ یا کچھ اور ہے اس کا فرض؟ ہتھیار ڈال کر، گھٹنے ٹیک کر صرف ذاتی راحت کے تئیں مطمئن ہو جائے گا کہ اپنی منزل اور مقصد زندگی پر پہنچ گیا ہے؟'' کورش کا پورا جسم بید کی طرح کانپنے لگا۔

''ہمارے ساتھ کتنے آئے؟ کون تاجر نہیں بنا؟ کس نے بیچ راستے میں ہمیں دھوکہ نہیں دیا؟ کیا وہ مصنف، شاعر انقلابی نہیں تھے؟ وہ ہمارے ہی گروہ کے موقع پرست دانشوران تھے۔ دنیاوی آرام و آسائش کی تلاش میں سیدھے راستے سے مڑ کر پگڈنڈیوں پر ہو لیے۔ آج انہیں مختلف پگڈنڈیوں نے مقاصد کی سڑک کے پرخچے اڑا دیے ہیں۔ مٹھی بھر ایماندار لوگ، جو شاید کل باقی بھی نہ رہیں کیا وہ نظام بدل پائیں

گے؟ کب تک جدو جہد کر پائیں گے؟'' اشتعال سے طیبہ کا لہجہ کانپ رہا تھا۔
''تم شاید ایک سچ بھول رہی ہو... کاؤنٹر ریوولوشنری... یہ لوگ کل نہیں رہیں گے اور موقع پرست بہہ جائیں گے... ہم بھی نہیں ہوں گے کل... لیکن مت بھولو ہماری طرح کے بہت لوگ ہیں جن کا ہمیں پتہ نہیں ہے... کل کا دوسرا انقلاب وہ لوگ لائیں گے اور پھر جدو جہد، لڑائی، میدان جنگ، تیسرے مرحلہ پر جا کر کہیں ہم کامیاب ہو پائیں گے۔ راستہ بہت طویل ہے۔ منزل دور ہے۔ راستہ پیچ دار بھی ہے۔ تم اپنی جدو جہد کا پھل کھانا چاہتی ہو نا؟ درخت نے کبھی اپنے پھل کھائے ہیں؟'' کورش نے طیبہ سے کہا۔
''کھانا کھالو۔'' ٹھوکر سے دروازہ کھلا اور تین سینی اندر کھسکا دی گئیں۔
''حسین اب بھی سو رہا ہے۔'' طیبہ نے پریشانی سے کہا۔
''میں جگاتا ہوں۔'' کورش نے اُٹھتے ہوئے کہا۔
''کمزوری سے نیند آتی ہے شاید!'' طیبہ نے کہا۔
''حسین! حسین!'' کورش نے حسین کا شانہ ہلایا۔
''بڑی گہری نیند ہے۔'' طیبہ نے کھانے کی سینی اٹھاتے ہوئے کہا۔
''عجیب بات ہے!'' کہہ کر حسین پر کورش نے پانی کے چھینٹے مارے۔ کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ کورش نے اندر سے گھبرا کر کمرے کا دروازہ پیٹا۔
''پاسدار جناب، پاسدار....''
''کیا ہے؟ کیوں شور مچا رہے ہو؟''
''ہمارا ساتھی... اس کی طبیعت بہت خراب ہے۔''
''کل دیکھا جائے گا۔''
''دروازہ کھولیے، جناب... ایک بار معائنہ تو کریں۔''
''کان مت کھاؤ... مر نہیں گیا ہے کہ نماز جنازہ کی تمہیں جلدی ہو رہی ہے۔''
''کیا بات ہے؟'' کالی چمگادڑ چنگھاڑی۔
''معلوم نہیں خانم۔ اندر شور کر رہے ہیں۔''

''دروازہ کھولو!''

قفل کھلتے ہی وہ لمبی چوڑی عورت اندر داخل ہوئی۔ طیبہ کو حسین پر جھکے دیکھ کر پوچھنے لگی۔ ''کیا بات ہے؟''

''اُٹھ نہیں رہے ہیں، حسین۔'' کورش نے گھبراتے ہوئے کہا۔

وہ عورت باہر نکل گئی۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر لیے ساتھ آئی۔ ڈاکٹر نے دولحہ معائنہ کیا، پھر آہستہ سے کہا۔ ''ہارٹ فیل ہوا ہے۔''

''نہیں!''

گپھاؤں کی گہرائیوں سے گونجتی طیبہ کی آواز اُبھری اور وہ منہ ڈھک کر رو پڑی۔ کورش بھی خود کو سنبھال نہ پایا۔ ملیحہ کا معصوم چہرہ آنکھوں کے سامنے گھومنے لگا۔

''کون تھا وہ تمہارا؟'' دونوں کو یوں پریشان دیکھ کر اس عورت نے پوچھا۔ دونوں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ طیبہ کو لگ رہا تھا کہ آج اس کا دل پھٹ جائے گا۔ یہ صدمہ وہ برداشت نہیں کر پائے گی۔ دل کی رگوں کو چیرتا اتنا بڑا غم اس کے وجود کو نگل جائے گا... ملیحہ کو وہ کیا جواب دے گی... کیا بتائے گی... ملیحہ، جسے حسین کا انتظار ہے۔

لاش کو دو پاسدار اٹھا کر لے گئے۔ کورش اور طیبہ خاموش، سر جھکائے آنسو بہاتے رہے۔

پری کا خط مہناز کو ملا......

''مہناز جان! چھٹیوں میں ہم لوگ نہیں نکل پائیں گے۔ خالد پوری طرح سے کام میں مشغول ہو گئے ہیں۔ سیاسی نہ ہونے پر بھی انہوں نے ایک فیصلہ کر لیا ہے۔ ایران لوٹنے کے لیے کچھ نہ کچھ تو کرنا پڑے گا۔ ڈوبتا تیراک منجھدار میں پہنچ کر بھی ہاتھ پیر چلاتا ہے، تاکہ اسے زندگی مل جائے۔ یاسمین اسی جدوجہد کے بھنور میں ہمیں گھسیٹ لے گئی ہے۔ خط کا جواب دینا۔ اسلم کا جواب آیا ہے۔ اچھا ہے! پھر خط ڈالوں گی۔ جواب جلد دینا۔ سلیمان کو سلام، بچوں کو پیار۔ تمہاری۔ پری۔''

خط پڑھ کر مہناز سوچ میں ڈوب گئی۔

''کس کا خط تھا؟'' سلیمان نے پوچھا۔

''پری کا۔'' مہناز نے خط سلیمان کی جانب بڑھا دیا۔ لندن میں دیوار پر چسپاں فارسی میں لکھا ایک پوسٹر مہناز کے دماغ میں کوندھا۔ 'ایرانی! اپنے گھر لوٹ جا، غیر ملک میں رہنا تیرے شایانِ شان نہیں ہے۔' واقعی ہمارے لیے باعث فخر نہیں بلکہ شرم کی بات ہے۔ ایرانیوں کا گھر ایران ہے... غیر ملک نہیں... غیر ملک نہیں۔

''کیا سوچ رہی ہو، مہناز؟''

''کچھ نہیں۔'' مہناز نے چونکتے ہوئے کہا۔

''کافی پیو گی؟'' سلیمان نے اسے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں بنا کر لاتی ہوں۔'' کھوئی کھوئی سی مہناز کھڑی ہوئی اور کافی بنانے کچن کی طرف چل پڑی۔ کافی بنا کر جب لائی تو بھی چہرے پر شادابی نہیں تھی۔ آنکھیں سوچ میں ڈوبی ہوئی تھیں۔

''کیا بات ہے، مہناز؟ کچھ پریشان سی ہو؟ میں کوئی مدد کر سکتا ہوں جس سے تمہاری اداسی دور ہو؟'' سلیمان نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''سلیمان، ہمیں بھی کچھ کرنا چاہیے... یہ زندگی... یہ عام سی زندگی تو کوئی بھی گزار سکتا ہے۔''

''تمہیں منع کس نے کیا ہے؟ جو کرنا ہے، آج ہی سے شروع کر دو۔'' سلیمان نے مہناز کے رخساروں کا بوسہ لیتے ہوئے کہا۔ مہناز کی آنکھوں میں رقص کرتے سوچ کے نقشوں کو جیسے راستہ مل گیا۔ اب بات صاف تھی۔ وطن لوٹنے کا راستہ دراصل جدوجہد کی راہ سے ہو کر گزرتا ہے۔

ہندوستان کے ہوائی اڈے پر جب سوسن اتری تو گرم لو کے تھپیڑوں نے اس کے کپڑے اور بالوں کو درہم برہم کر دیا تھا۔ پسینہ پانی کی دھار کی طرح بالوں کی لٹوں، گردن اور بدن سے بہنے لگا۔ اس نے پریشان ہوکر عباس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی پسینہ سے تر بتر ہانپ رہے تھے۔ ہاتھ میں پکڑے تھیلے جیسے اتنے بھاری نہیں تھے جتنا گرمی انہیں پریشان کیے ہوئے تھی۔ اوپر سے دھوپ کی شدت کی وجہ سے چھینک پر چھینک آ رہی تھی۔

ہوٹل میں پہنچ کر دونوں نہائے، آرام کیا۔ شام تک وہ اپنے ہوش و حواس میں آئے۔ بچہ پھول کی طرح مرجھا گیا تھا۔ ہونٹوں پر پپڑی جم گئی تھی جسے بار بار سوسن چوم رہی تھی۔ کھلے سر اور اتنی آزادی کے ساتھ سڑکوں پر گھومنا سوسن کو عجیب سا لگ رہا تھا۔ ایک عجیب آزاد پرندہ اس کے دل میں پھڑ پھڑا رہا تھا۔ بمبئی کی رات اپنے پورے شباب پر تھی اور سوسن کا تجسس اپنی آخری حد پر۔

ایک ماہ بمبئی میں رہ کر سوسن کو بہت سے تجربات ہوئے کہ حقیقت میں آزادی کیا ہے؟ سیاسی آزادی کسے کہتے ہیں؟ غریبی اور امیری کا فرق کیا ہے؟ قوت برداشت کس چڑیا کا نام ہے اور مل جل کر رہنا کسے کہتے ہیں، وغیرہ وغیرہ۔

''کہاں رہنا پسند کرو گی؟ دلی، بمبئی، یا پھر بنگلور میں؟'' دو مہینے تمام بڑے شہر گھما کر عباس نے سوسن سے پوچھا۔

''بڑا مشکل ہے جواب دینا۔ مجھے تو پورا ہندوستان اچھا لگ رہا ہے۔ تمام شہر ہی دل کو بھا رہے ہیں۔'' ہنستے ہوئے شاداب چہرے سے سوسن نے کہا۔

''دلی کیسا رہے گا؟''

''بہت اچھا ہے! وہاں سے ہر شہر آسانی سے آجا سکتے ہیں!'' سوسن نے چہک کر کہا۔

"یہاں بڑی خوش ہو۔ اتنا زیادہ خوش تو میں نے تمہیں پچھلے تین برسوں میں ایک بار بھی نہیں دیکھا۔" عباس نے ہنستی آنکھوں سے سوسن کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"یہاں پر تقریباً دس ہزار ایرانی ہیں، جیسا کہ ہماری ایمبیسی نے بتایا ہے۔ لڑتے جھگڑتے ہیں۔ یہاں تک کہ ایک دُوسرے کے نظریہ سے ناراض ہوکر قتل بھی کر دیتے ہیں، لیکن ان لوگوں سے نہیں بھڑتے ہیں جو خاموشی سے غیر سیاسی زندگی جیتے ہیں۔ ان کا جھگڑا نظریاتی سطح پر ہے اور ہم کسی پارٹی، کسی گروہ کے نہیں ہیں... مجھے تو صرف تین چیزیں چاہیے۔ میرا شوہر، میرا بیٹا اور میرا وطن ایران۔ میری زندگی کا محور یہی ہے۔ ان کے علاوہ میرے نزدیک کسی چیز کی اہمیت ہے نہ قیمت۔" سوسن نے صاف الفاظ میں، سب کچھ عباس سے کہہ دیا۔

"تم خوش رہو، یہی میری زندگی ہے...... اور یہ زندگی خواہ ایران کی زمین پر ملے یا دُنیا کے کسی کونے میں۔ میرے لیے اہم اور بیش قیمت ہے!" عباس نے جذباتی ہوکر کہا۔

"مجھے ہندوستان اتنا بھایا ہے کہ پوچھو مت۔ اس سرزمین کے علاوہ دو دِلوں کے دھڑکتے جذبات کی یادگار کسی بھی ملک میں نہیں ہے۔ لوٹ مار، غارت گری، جاہ و جلال، دولت و حشمت، سفاکی سب کی تاریخی نشانیاں عمارتوں اور کھنڈروں کی شکل میں نظر آئیں گی، لیکن تاج محل جیسی محبت کی نشانی کہیں بھی نہیں ہے۔ احساس کا سچا موتی...!" سوسن نے بچے کی بوتل بناتے ہوئے کہا۔

"ارے، ہندوستان تو ہمیشہ سے ہی عاشقوں کا ملک رہا ہے۔ حافظؔ جیسا شاعر بھی سمرقند اور بخارا جیسے شہر صرف ایک کالے تل کے بدلے میں بخشنے کو تیار تھا۔" عباس نے کہا۔ پھر ہنستے ہوئے بولے۔ "یقیناً...... وہ تل کسی ہندوستانی حسینہ کے رُخسار پر ہوگا۔"

"اس میں کیا شک، ایسا نمک ہمارے ایرانی چہروں میں کہاں؟"

"نوشیروانِ عادل نے جب سنا تھا کہ ہندوستان کے جنگلوں میں آبِ حیات ملتی ہے تو اس نے اپنے حکیم کو بھیجا۔ وہ بھٹکتا رہا، بالآخر اس کی رسائی آبِ حیات تک ہوگئی۔ جانتی ہو وہ کیا تھا؟ 'پنچ تنتر' نامی کتاب۔ سنسکرت سے پہلوی زبان، پھر عربی

زبان اور اس کے بعد فارسی زبان میں اس کا ترجمہ ہوتا رہا۔ سچ پوچھو تو یہ ملک آب حیات کی کھان ہے۔'' عباس نے کہا۔

''ٹھیک کہتے ہو۔ یہ زمین درحقیقت جینے کے لیے بنائی گئی ہے، تبھی اتنی آبادی، اتنی طرح کے لوگ، اتنی ہی طرح کے پرندے اور جانور... حیرت انگیز ہے یہ ملک بھی!'' سوسن نے بیٹے کو گود میں اٹھایا۔

''ارے، دس بج گئے... بی۔ بی۔ سی کی خبریں سننا ہی بھول گئے؟'' کہہ کر عباس اُٹھے اور ریڈیو کھولا۔

خبریں سن کر عباس کسی گہری سوچ میں ڈوب گئے۔

آزادی ملی تازہ ہوا میں سانس لینے کی مگر منزل مقصود ہی دھندلا گئی ہے۔ اب یہ بھی طے کرنا پڑے گا کہ اس بڑے ملک میں آکر رہنے کا ہمارا مقصد کیا ہے؟ رات دن کیسے گزریں گے؟ آخر یہاں تو ہم ایرانیوں کو غیر ملکی ہی مانا جائے گا۔ یہ وقتی خوشی بھی اب کھوکھلی لگنے لگی ہے۔ وطن تو کہیں دور چلا گیا ہے۔

''آپ ابھی جاگ رہے ہیں؟'' سوسن بچے کے کنمنانے سے اٹھی تو عباس کو جاگتے پایا۔

''گرمی کی وجہ سے پیاس لگی تھی، اس لیے آنکھیں کھل گئیں۔'' عباس نے آہستہ سے کہا اور کروٹ بدل لی۔ وہ سوسن کی خوشی پر اپنے تفکرات کے سائے نہیں دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ خوش ہے جب تک، تب تک انہیں بھی اس کا ساتھ دینا ہے۔

''سو گئے کیا آپ؟'' سوسن نے عباس کے بازو پر اپنا ہاتھ رکھا۔

''نہیں۔'' عباس نے آہستہ سے کہا۔

''پڑوس کے گھر میں جانتے ہیں کون لوگ رہتے ہیں؟''

''نہیں۔''

''ایرانی ہیں۔ کل میں چھت پر جب کپڑے پھیلا رہی تھی تو انہیں وہاں سے نکلتے دیکھا تھا۔ معلوم ہوا ہے کہ وہ مکان چھوڑ کر کسی اور ملک میں جا رہے ہیں۔'' سوسن نے کہا۔

''اچھا!'' عباس نے آہستہ سے کہا۔ وہ جانتے تھے کہ روز ہی دُکان، سڑک، اور

بازار میں ایرانیوں سے ملاقات ہوتی ہے۔ سلام دُعا اور حال چال بھی پوچھتے ہیں، لیکن ان باتوں کا ذکر سوسن سے کیا کرنا؟ جب تک دانا پانی ہے یہاں رہنا ہے، پھر جانے کہاں جانا ہو؟ عباس نے گہری سانس لی اور اٹھ کر چھت پر نکل آئے۔ رات کی خاموشی میں نیچے سے آتی آوازیں ان کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔

''مہاجرت کا مطلب آج کے حوالہ سے کتنا بدل گیا ہے! جب حضرت محمد نے مکہ سے مدینہ مہاجرت کی تھی وہ ایک مذہبی ضرورت تھی اور آج ایک سیاسی مجبوری ہے۔ ایران میں ایک شہر سے دُوسرے شہر کے لوگ اپنی جان بچا کر بھاگ رہے ہیں۔ دنیا میں ایک ملک سے دُوسرے ملک کے ویزا کے لیے مارے مارے پھر رہے ہیں۔ ایرانی قوم ایک بنجارہ قوم میں بدل گئی ہے، جہاں بھی رہنے کی اجازت ملی، وہیں پر ڈیرا خیمہ ڈال کر بیٹھ گئی۔ دو تین سال بعد پھر انجانے ملک کی طرف.....'' مصطفیٰ کی آواز بہت بھاری ہو رہی تھی۔

''جب اپنا گھر چھوٹا تو سمجھو بے گھر بار انسان اور آوارہ کتا برابر ہیں....'' جعفر نے سامان بکس میں جماتے ہوئے کہا۔

''تین سال پہلے ایران سے آئے تھے...... کیا کرنے؟'' مصطفیٰ جھنجھلاتے ہوئے بولا۔

''جان بچانے کے لیے، سمجھو! ابھی ایران میں ہوتے تو کب کے ختم ہو گئے ہوتے۔'' عزت نے کہا۔

''پیسہ نہیں، گھر نہیں، وطن نہیں؛ ہم ایرانی برسوں سے اس غم کا بوجھ اٹھا رہے ہیں۔ کب جا کر ہمارا وطن ہم سب کا ہوگا؟'' جعفر نے کہا۔

''اب کناڈا جا کر رچو بسو...دل بہت الجھ رہا ہے۔'' مصطفیٰ نے کہا۔

''اب یہ باتیں کرنی فضول ہیں، صبح ہندوستان سے کناڈا جانا ہے یہی حقیقت ہے۔ اس مہاجرت کے موقع پر ایک ترانہ ہو جائے۔'' عزت نے کہا۔

''چلو ہو جائے۔'' مصطفیٰ نے ہنستے ہوئے کہا......

سمجھتے تھے ہم کو بہار کا پھول
نکلے ہم آتش کا پھول

ترانہ ختم ہوا۔ دل ہلکا ہوا۔ وہ سب یہیں رہنا چاہتے ہیں، لیکن پولس نے انہیں نوٹس دے دیا ہے۔ وہ دی گئی تاریخ سے ایک دن بھی زیادہ رک نہیں سکتے۔ پڑھائی ختم ہوگئی۔ نیا داخلہ سفارت خانے کے اجازت نامہ کے بغیر ملے گا نہیں۔ سب کا دل بھاری ہے۔ پانی سے بھرے بادل جیسا، لیکن برسے کہاں؟ بادلوں کی طرح بغیر برسے میلوں لمبا سفر طے کرنا ہے۔ کس سمت کی جانب، کس منزل کی اور کچھ معلوم نہیں ہے۔ ہوا جس طرف ان کے آوارہ وجود کو لے جائے چلے جائیں گے، لیکن برسیں گے صرف اپنی زمین پر، اپنے وطن ایران پر......!

''سگریٹ پینا بھی جانتی ہو یا صرف بلیک کرنے کے لیے خریدنا ہے؟'' پاسدار نے پوچھ تاچھ شروع کی۔

''پچیس سال گزر گئے سگریٹ پیتے ہوئے۔ اب بات کرتی ہوں تو سانس کی جگہ دھواں ہی نکلتا ہے۔'' یہ کہہ کر اس ادھیڑ عورت نے اپنی کلمہ والی انگلی دکھائی، جس پر پیلا دھبا پڑا تھا۔

''پی کر دکھاؤ!'' اسی پاسدار نے ایک سگریٹ اس عورت کی طرف بڑھائی۔ عورت نے سگریٹ بڑی مشاقی سے ہونٹوں میں دبائی اور پرس سے لائٹر نکال کر کھٹ سے سگریٹ جلائی۔ لمبا کش بھرا اور ناک سے دھواں نکالا۔

''صوفیہ لارینس!'' پاسداروں کے جھنڈ سے آواز اُبھری، پھر دبی ہنسی۔

''ٹھیک ہے۔ ایک پیکٹ چاہیے یا پورا بستہ؟'' پاسدار نے پوچھا۔

''پورا بستہ۔'' عورت نے جھینپے انداز سے پیسہ نکالتے ہوئے کہا۔ مسجد کے آنگن میں سگریٹ خریدنے والی عورتوں کی بھیڑ تھی۔ سب کو امتحان سے گزرنا پڑ رہا تھا۔ وہ ادھیڑ عورت تھیلا اٹھائے مسجد سے نکلی اور سامنے گلی میں مڑ گئی۔ اسی گلی میں ایک بیوٹیشن

کا مکان تھا۔ بیوٹی پارلر کب کے بند ہو چکے تھے۔ عورتوں نے سنگار کرنا تو دور، ہونٹوں کو رنگنا بھی بند کر دیا تھا، کچھ عورتوں کے لپسٹک لگے ہونٹوں پر شیشے کے ٹکڑے سزا کے طور پر ملے گئے تھے کہ اور لگاؤ لالی ہونٹوں پر۔ یہ بیوٹیشن بھی چھپ کر کام کرتی تھی، ورنہ شاہ رضا سڑک پر سب سے بڑی دوکان اسی شبنم خانم کی ہی تو تھی، لیکن چار سال پہلے یہ کہہ کر اس میں آگ لگا دی گئی تھی یہ پیشہ حرام ہے۔ کھلا گناہ ہے۔ عورتوں کو خوبصورت بنانا مردوں کی خواہشات نفسانی کو ہوا دینا ہے۔ بالوں سے لپکتی روشنی مرد کی شہوت کو آگ لگاتی ہے۔ شریف عورتیں ڈھکی چھپی اچھی لگتی ہیں۔ شبنم خانم کی مصیبت یہ تھی کہ خدا نے انہیں پیٹ کے نام پر ایسا دوزخ دیا تھا جس کی آگ روٹی سے بجھتی ہے اور روٹیاں آسمان سے نہیں گرتیں، بلکہ خون پسینے کی کمائی سے خریدی جاتی ہیں۔ یہ مسائل پیٹ بھرے لوگوں کی سمجھ سے باہر تھے، کیونکہ ان کی بندوقیں پیاسی تھیں اور چلو بھر بھر کر خون پی رہی تھیں۔

وہ ادھیڑ عورت ایک چھوٹے سے گھر میں داخل ہوئی۔ سامنے پالتھی مارے بیٹھی عورت نے بے چینی سے کہا۔ ''بڑی دیر کردی صابرہ؟''

''ہاں ،لیٹ آئی... وہ بھی خالی ہاتھ نہیں، سگریٹ کے پورے بستے کے ساتھ...اب تو نشہ بھی ذلیل کرانے لگا ہے... لیکن کیسے چھوٹے یہ نامراد!'' قالین پر بیٹھتے ہوئے اس نے نئے بستے کی تیزی سے پنی پھاڑی، ایک پیکٹ نکالا اور سگریٹ جلا کر لمبے لمبے کش بھرے۔ ناک سے دھواں نکالتے ہوئے اس کے چہرے پر ایک عجیب اطمینان بھری چمک تھی۔

''بال رنگوائے گی یا صرف...؟''

''بس تھوڑا سا میرا حلیہ درست کر دو۔ اب وقت کہاں ہے، فوراً لوٹنا پڑے گا۔'' لمبے لمبے کش بھر کر اس نے سگریٹ بجھائی۔

''پھر ادھر بیٹھو،'' بیوٹیشن نے کہا اور بالوں پر قینچی چلانا شروع کردی۔ تبھی دروازے پر لگی گھنٹی بج اٹھی۔ بیوٹیشن کے ہاتھ رک گئے۔ چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔ اس کے گاہک گھنٹی تو نہیں بجاتے ہیں، پھر یہ کون آیا ہے؟ آگے بڑھ کر دروازہ

کھولا اور گھبرا سی گئی۔

''یہاں کیا ہو رہا ہے؟'' چار پانچ پاسدار کھٹ کھٹ کرتے ہوئے اندر داخل ہو گئے۔

''کچھ بھی نہیں! بھلا یہاں کیا ہونے والا ہے!''

''دیکھتے ہیں!''

''یہ میری سہیلیاں ہیں!''

''صبح سے عورتوں کی لائن لگی ہوئی ہے... کسی بچہ کا منڈن تھا کیا آج؟ یہ بال...؟'' ایک پاسدار نے کرسی کے نیچے گرے بالوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

صابرہ خانم نے گھبرا کر سر کی چادر ٹھیک کی۔ ان کے ایک طرف کے بال کٹ چکے تھے، دوسری طرف کے بال لمبے جھالر کی طرح کندھے پر لٹک رہے تھے۔

''کچھ کھائیے تو آپ لوگ...! بڑا تکلف کر رہے ہیں؟'' بیوٹیشن نے گھبرا کر میز سے بسکٹ کی پلیٹ اُٹھائی اور پاسداروں کی جانب بڑھائی۔

''کچھ گڑ بڑ کی تو سیدھے کمیٹی لے کر جائیں گے۔'' ایک پاسدار نے کہا اور شیشے کا ایک خوبصورت لیمپ اٹھایا۔

''گڑ بڑ کیا ہوگی یہاں!'' بیوٹیشن نے صفائی دینے والے انداز سے ہاتھ پھیلایا، لیکن نظریں لیمپ کی جانب ہی لگی تھیں۔

''خیر دھیان سے رہنا۔'' سب پاسدار مڑے۔

''یہ لیمپ اچھا ہے۔'' کہہ کر ایک پاسدار نے دوبارہ لیمپ اٹھایا۔

''میرے دادا کی آخری نشانی ہے۔ مجھے بہت عزیز ہے۔'' بیوٹیشن نے گھبرا کر کہا۔

''دُنیاوی چیزوں سے کیا دل لگانا؟ یہ تو کسی پاک جگہ پر اچھا لگے گا۔'' کہہ کر اس پاسدار نے بلوری لیمپ اٹھایا اور باہر کی طرف بڑھا۔

شبنم خانم نے دروازہ بند کرتے ہوئے لمبی سانس کھینچی اور صابرہ خانم کی طرف مڑیں۔ قینچی چلاتے وقت ان کے ہونٹ کسی اندرونی جذبے سے کانپ رہے تھے۔ مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اسی کے ساتھ دوکانوں اور گھروں میں ہوتی چہل پہل اور گلی کا شور وغل ختم گیا۔

آسمان پر اڑتے غبارے کا تذکرہ کئی ماہ تک بچے کی زبان پر تھا۔ اس غبارے پر 'خمینی کو موت آئے' لکھا تھا۔ مشین گن کی گولیوں نے جب اسے چھلنی کیا تو اس کی کوکھ سے شہزادہ پہلوی کی تصویریں گری تھیں۔

''کیا واقعی شاہ کا بیٹا لوٹے گا؟''

''کبھی نہیں، شاہ کا بیٹا یعنی نیم پہلوی وہیں مصر میں پڑا رہے گا۔''

''پھر وہ غبارہ اور تصویریں؟''

''جھوٹ ہے۔''

''تمہارے سر کی قسم۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔''

''تم تو دن میں بھی خواب دیکھنے لگے ہو۔''

''مذاق مت کرو۔ میں سچ کہہ رہا ہوں۔ وہ تصویریں جانے کس کپڑے اور کاغذ کی تھیں جو نہ پھٹتی تھیں نہ جلتی تھیں۔''

''مولویوں کے چمڑے کی ہوں گی!''

دبے دبے قہقہے غباروں کی طرح پھٹ گئے۔ ایک نے ساتھی کو کہنی مار کر دیوار کی طرف اشارہ کیا۔

''امریکہ ہیچ غلطی نمی تواند بے کند۔' امام خمینی''

(امریکہ ہمارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ بقول امام خمینی)

اس لائن کے نیچے کسی نے دُوسرے رنگ سے لکھ دیا تھا۔

''امام خمینی ہیچ غلطی نمی تواند بے کند''۔ بتول

(امام خمینی کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ بتول یعنی امام خمینی کی زوجہ کے بقول)

ہنسی کے مارے ان کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں۔ سامنے کی دوکان میں داخل ہوئے تو ان کے پیچھے پیچھے ایک پاسدار بھی دوکان میں داخل ہوا۔

''کیا بات ہے، رحیم آقا، امام کی ایک بھی تصویر تمہارے دروازے پر نہیں ہے؟''

''شیشہ دھویا تھا صبح، برادر، یہ لو تم مٹھا پیو، تب تک میں تصویر لگاتا ہوں۔'' کہہ کر دوکان دار نے میٹھے کی بوتل جوان پاسدار کی طرف بڑھائی اور خود تصویر لے کر دوکان کے شیشے کے قریب پہنچ گیا۔

''ایک دروازہ ہے، اس پر بھی رہبر کی تصویر نہ ہو تو برا لگتا ہے۔'' پاسدار نے خالی بوتل کریٹ میں رکھی اور دوکان سے باہر نکل گیا۔

''ہم نے تو امام کی تصویر اپنے دونوں دروازوں پر لگا دی ہے۔'' ایک نے قہقہہ مارا۔ اس کی معنی خیز باتیں سن کر دوسرا بولا۔

''میں نے بھی، جب خدا نے دو دو دروازے دیے ہوں تو جھجکنا کیا؟'' وہ بڑے بھدے انداز سے اشارہ کر کے ہنس پڑا۔

دوکان کے سامنے لڑکوں کا اسکول تھا۔ وہاں سے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

''خدایا! خدایا! امام خمینی را نگہدار تا انقلاب مہدی۔''

(خدایا! خدایا! امام خمینی کو بارھویں امام کے ظہور تک زندہ رکھنا)

اسکول کا میدان نعروں سے گونج رہا تھا۔ ان نعروں کے بیچ بیچ میں کئی آوازیں اس اظہار کو نئے معنی دے رہی تھیں، جس میں کینہ اور نفرت کی جھلک تھی۔

''خدایا! خدایا! امام خمینی را نگہدار تا انقلاب بادی۔''

(خدایا! خدایا! امام خمینی کو دُوسرے انقلاب تک زندہ رکھنا)

تمام دوکاندار ہنستی ہوئی آنکھوں سے اپنی اپنی دوکان کے دروازے پر کھڑے ہو کر ایک دُوسرے کو خاموش اشارے کر رہے تھے۔ جس کا مطلب بآسانی لگایا جاسکتا تھا کہ وہ مستقبل میں ہونے والے نئے انقلاب میں عوام کی عدالت میں امام خمینی کو پھانسی پر چڑھانے کا اشارہ کر رہے ہیں۔

چھ سال کا طویل عرصہ گزر گیا۔ آباد زمین برباد ہوتی چلی گئی۔ جس کی مخالفت میں جدو جہد آج گھوم پھر کر اسی محور پر لوٹ رہی تھی، پھر اس مارکاٹ کی ضرورت کیا تھی؟ شہادت کے کیا معنی تھے؟ کئی جگہ سے آوازیں اُٹھیں۔ ''مرگ بر ما کہ گفتیم مرگ بر شاہ۔'' (ہمیں موت آئے، جو ہم نے کہا تھا کہ شاہ کا ناس ہو!) ایران کی سڑکوں پر لال

کالے الفاظ سے تحریر تھا۔ ''اسلام ایک سیاسی مذہب ہے۔'' اس کے نیچے لکھا تھا، ''مذہب کو بچانے کے لیے جاسوسی ضروری ہے۔''

سڑک پر چلتے لوگ خاموش زبان میں ایک دُوسرے سے پوچھ رہے تھے۔'' انسانیت کو بچانے کے لیے زمین پر انسان کا رہنا ضروری ہے یا نہیں؟'' عوام پوری طرح سے چکرائی ہوئی تھی کہ کیا حقیقت ہے اور کیا جھوٹ؟ اس کا جواب کون دیتا؟ دنیا خاموش تھی۔

۲۹

جماران کی کچی گلیاں نوجوان پاسداروں کی پاٹ دار آوازوں سے گونج رہی تھیں، گاؤں سے آئی نئی نسل، نیا خون کسی سیلاب کی طرح اُمڈتا ہوا امام خمینی کو یقین دلانے آیا تھا۔

''امام خمینی عزیزم بگو کہ خونِ بیریزم۔''

(عزیزم خمینی، تم کہو تو ہم اپنا خون بہادیں)

کل امام خمینی نے اپنے رندھے گلے سے یہ بات کہی تھی۔ ''میں بوڑھا ہورہا ہوں، کب تک انتظار کروں؟'' اس التجا میں کتنی بے بسی تھی، کتنی للک تھی۔ علم اور دین کی شمع خود اپنے پگھلنے کی بات کررہی تھی۔ پچاسی سال کی یہ روشن شمع کبھی بھی موت کی طوفانی ہوا سے بجھ سکتی ہے۔ موت کے بعد امام خمینی نجف میں دفن ہونا چاہتے ہیں۔ لیکن نجف تو عراقی سرحد میں ہے۔ پھر......؟ جتنی جلدی ہوسکے بغداد پر قبضہ کرکے نجف کو ایران کا حصہ بنا لیں۔ انسانی موجیں، طوفان کے تھپیڑوں کے ساتھ بصرہ کی طرف چل

پڑیں۔ان کے دل میں آگ تھی۔ بصرہ سے بغداد اور پھر نجف میں حضرت علی کی چوکھٹ پر سر ٹکا کر زیارت کرنے کی۔اس عشق کی آگ کو فنا کی راکھ میں بدلنے کی۔

مولویوں کے جھنڈ کے جھنڈ تہران اور قُم سے گاؤں کی جانب چل پڑے اور ہاتھ پھیلا کر سروں کے تحفے مانگنے لگے۔

"ہر حالت میں ہمیں نجف پر قابض ہونا ہے۔ نجف شیعوں کی پاک وعزیز جگہ ہے، جہاں پر حضرت علی کی آخری آرام گاہ ہے۔کربلا۔ جہاں مظلوم حسین کا بے گناہ خون بہا تھا....مت بھولو کہ وہ کون لوگ تھے جنھوں نے دھوکہ سے حسین کو بلا کر شہید کیا تھا...آج اسی پاک زمین پر ایک کافر حکومت کر رہا ہے...وہ ہم سے ہماری شہادت کا حق چھیننا چاہتا ہے...کیمیائی گیس چھوڑ کر ہمیں 'خون شہادت' کی لذت سے محروم کرنا چاہتا ہے۔ وہ خوفزدہ ہے کہ شہید کے ٹپکے خون سے کہیں ہزار شہید نا اُگ آئیں...لالے کے پھول کیا ایران کی زمین پر کھلنا بند ہو جائیں گے؟ ہم میں بھی جان ہے۔ میں آپ سب سے پوچھتا ہوں، اگر ایرانی عوام، جس نے یہ انقلاب کیا ہے جو درحقیقت مستضعفین ہے یہ اسی غریب طبقہ کا انقلاب ہے۔اگر عوام اسلامی حکومت نہ چاہتی تو کیا وہ اس حکومت کو بچانے کے لیے پچھلے پانچ سال سے تن، من دھن سے لڑ رہی ہوتی؟ یہ آپ سب ہیں جو یہ جنگ چاہتے ہیں۔حق کی فتح چاہتے ہیں.... ہمارا نعرہ روٹی نہیں... ہمارا نعرہ اسلام ہے...اسلام بچانے کے لیے...اس جنگ کو فتح میں بدلنے کے لیے...آپ سب ہتھیار اٹھالیں اور دشمن کا کلیجہ چیر کر رکھ دیں...آپ سب کو خون حسین کا واسطہ ہے..."

امام خمینی زندہ باد

صدام کافر پر لعنت

جوش سے اُبلتے، منھ سے خوبصورت الفاظ کے پھول گراتے مولوی بھوکے ننگے دیہاتیوں کے دل و دماغ پر افیم کے نشے کی طرح چڑھ رہے تھے۔گھروں میں کھلبلی مچ گئی۔ سر پر کفن باندھے بچوں، لڑکوں اور بوڑھوں کی قطار سج گئی۔ کھڑی بسوں میں روتی ماں بہنوں کو چھوڑ کر غازی سوار ہونے لگے۔

عراق کے وزیر خارجہ طارق عزیز اور مجاہدین جلا وطن لیڈر مسعود رضوی میں معاہدہ ہوا تھا کہ اگر عراق واقعی جنگ کا خاتمہ چاہتا ہے، تو خود ایران پر حملہ نہ کرے۔ ہاں۔ اپنے بچاؤ کے لیے ضرور ہتھیار اٹھائے۔ اس کے بعد ایران کی جانب سے مسلسل حملے بڑھتے گئے۔ عراق کی حالت تباہ ہوتی گئی۔ جنگ کو ختم کرنے کی تمام کوششیں بے کار ہوتی نظر آنے لگیں۔

رفت سنجانی نے نماز جمع کے خطبے میں کہا۔ ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہمارے پاس انسانی طاقت بہت ہے۔ اگر وہ کیمیائی گیس کا استعمال کررہے ہیں تو ہم کون سے چوڑیاں پہنے بیٹھے ہیں؟ ہم اینٹ کا جواب، پتھر سے دیں گے اور کیمیائی گیس کا استعمال کر کے دکھائیں گے۔''

مستقبل کے امام آیت اللہ مونتجری کو یقین تھا کہ عراق کی شکست کے ساتھ تمام تیل پیدا کرنے والے ممالک انگور کے دانوں کی طرح ایران کے دامن میں گریں گے۔ اس وقت ایران تمام غریب مسلم ملکوں کو پیٹرول مفت دے گا۔

عراق کے جوابی حملے شروع ہوئے۔ مجنون آئلینڈ پر خون کی ندیاں بہہ نکلیں۔ لیلا اور مجنوں کی محبت کی داستان خونی لباس پہن کر ٹہلنے لگی۔ دو مست ہاتھی اپنے ہی خون میں ڈوبنے لگے۔

''ارے، ہم جنگ نہیں چاہتے ہیں... ہم جنگ نہیں چاہتے ہیں بابا، کوئی جا کر کہہ دو امام سے... ہم جنگ نہیں چاہتے ہیں!'' نوے سال کی بڑھیا بڑ بڑائے جا رہی تھی، جس کو اس کا جوان پوتا اپنی طاقتور بانہوں میں سنبھالے بھاگ رہا تھا۔

بچوں کے بلکنے، لڑکے لڑکیوں کے رونے اور عورتوں کی خوفزدہ چیخوں کے درمیان جانوروں کی بدحواس مختلف آوازیں رگوں کو ایک ایسا تناؤ بخش رہی تھیں کہ محسوس ہوتا تھا کہ جلد اب پھٹی تب پھٹی۔ اسی درمیان دردناک بڑبڑاہٹ پھر گونجی۔

''کہہ دو کوئی جا کر، ہم جنگ نہیں چاہتے... کہہ...''

''دادی، کیسی باتیں کرتی ہو......؟ ایسا سوچنا اور زبان سے کہنا گناہ ہے ہم ایرانیوں کے لیے... دشمن نے ہم پر حملہ کیا ہے... کیا ہم چپ چاپ اپنے ہتھیار ڈال دیں؟''

''اب کچھ بھی بولنا اس زمین پر گناہ ہوگیا ہے۔'' بڑھیا پوپلے منہ سے بولے چلی جارہی تھی۔
تیز دھماکہ ہوا۔ دھواں پھیلا۔ بم پھٹنے سے آگ کی چنگاریوں کا طوفان اٹھا۔ بڑھیا اور اس کا پوتا اس آگ کی زبان کا نوالہ بن گئے۔
''ہفتے بھر بعد آیا ہوں اور تم....''
''چھوڑو، تھک گئی ہوں۔ پورے دن کولہو کے بیل کی طرح جتی رہی ہوں۔''
''میں کل صبح جارہا ہوں... کچھ تو رحم کرو۔''
''رک نہیں سکتے ہو کیا؟''
''بتایا نا، مجبور ہوں....''
''کب تک میں....''
''روؤ مت، ادھر آؤ... روٹھ گئیں... مان جاؤ....''
پھر کئی دھماکے ہوئے۔ عراقی ہوائی جہازوں کے گزر جانے کے بعد آسمان دھوئیں اور دھول سے بھر گیا۔ ہنستا کھیلتا گاؤں اینٹ مٹی کا ڈھیر بن گیا۔ ملبے کے نیچے صرف انسانی گوشت کے ٹکڑے تھے، جو بغیر کھدی قبروں میں بکھرے پڑے تھے۔ مشرق وسطی جل رہا ہے۔ اپنی ہی آگ میں سلگ رہا ہے۔ اپنا ایندھن، اپنا تیل اور اپنی راکھ!
اُوپر پہاڑی پر بیٹھا اکیلا شکور نیچے اجڑی بستی دیکھ رہا ہے۔ وہ کیسے بچ گیا؟ اس کی گود میں معصومہ ہے۔ اس کی سب سے چھوٹی بیٹی... باقی سب آگ کا نوالہ بن گئے ہیں۔ اس نے بیٹی کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''ابھی زندہ ہے... یا خدا... دل دھڑک رہا ہے۔''
سورج کا گولہ شہتوت کے پیڑوں کے پیچھے ڈوبنے لگا۔ شکور کی گود میں ڈبکی بچی بھوک سے رو پڑی۔ کہاں سے کیا لائے؟ پانی کے تالاب میں مرے لوگوں اور جانوروں کے ٹکڑے، اوندھے دبے گھر، جہاں پر دودھ کی تلاش بے کار تھی۔ پیڑ پھلوں سے خالی... کیا کرے، گھاس کا رس نکال کر اس کے حلق میں ٹپکا دے؟ گھاس بھی بارود سے بھری ہوگی... پیڑوں کی پتیاں... وہ بھی کیا جھلسنے سے بچی ہوں گی؟

رات گزرتی جارہی تھی۔ شکور بیٹی کو تھپتھپاتا ہوا آگے بڑھنے لگا۔ ہونٹ، ناک میں بارود کا ذائقہ اور مہک بس گئی تھی۔ راحت کمک جانے کب پہنچے گی؟ اگر نہ پہنچی تو؟ صبح تک جانے اس بچی کا کیا حال ہو؟ اوپر آسمان پر پھر جہازوں کی گڑگڑاہٹ سنائی پڑی۔ شکور ڈر کر وہیں پتھر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اس کی زبان تالو سے چپک گئی تھی۔ دونوں ہاتھوں سے وہ بچی کو دبائے ہوئے تھا، جیسے اس کے یہ خوفزدہ ہاتھ اس کی بیٹی کی جان بچالیں گے۔

ہوائی جہاز گزر گئے۔ شکور نے آنکھیں کھولیں۔ اس کا دل اب بھی اس کے کانوں میں دھڑک رہا تھا۔ دل سنبھلا تو اسے محسوس ہوا، رات بڑی خاموش اور ڈراؤنی ہے۔ چاروں طرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے۔ بیٹی کے سر پر ہاتھ پھیرا، وہ خاموش تھی، شاید سوگئی تھی۔ ماتھے کا بوسہ لیا۔

رات کو جب بھی اس کی پلکیں جھپکتیں، ایک سوال سے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھتا، 'یہ جنگ کیوں ہورہی ہے؟ ہمارے دشمن کون ہیں؟ اگر کوئی بم حضرت علی کے حرم پر گرا تو...؟ کتنا بڑا گناہ ہوگا! عراق کی زمین پر سب امام کیوں پیدا ہوئے...؟ اگر وہاں پیدا ہوئے تو پھر وہاں کے لوگ کافر کیسے ہوئے؟'

آسمان پر ہیلی کاپٹر کا شور ہوا۔ صبح ہونے کو تھی۔ سرمئی افق پر اس نے پانچ ہیلی کاپٹر دیکھے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور آگے بھاگا۔

"میں زندہ ہوں... میں زندہ ہوں...!" شکور کی آواز پنکھوں کی تیز آواز میں ڈوب گئی۔

ہیلی کاپٹر سے اترے لوگ ادھر ادھر معائنے میں لگ گئے۔ شکور ہانپتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور چلایا۔ "ارے، ادھر دیکھو، میں زندہ ہوں... میں...!"

"بہت خوشی ہوئی برادر، یہ جان کر کہ تم زندہ ہو۔" ایک پاسدار نے ہنستے ہوئے کہا۔

"میری بیٹی بھی زندہ ہے... دیکھو تو!" شکور مختلف جذبات کی مار سے کبھی رو رہا تھا، کبھی ہنس رہا تھا۔

"سنبھالو اسے!" ڈاکٹر نے کہا اور اپنا بکس کھولا۔ اس کے ہاتھوں سے بچی کو

لے کر پاسدار نے گدے پر لٹایا۔
''ڈاکٹر صاحب، دودھ ملے گا...؟ میری بیٹی بھوکی ہے۔کل دوپہر سے اسے ماں کا دودھ نہیں ملا ہے۔'' شکور نے ہانپتے ہوئے کہا۔
''ملے گا، سب کچھ ملے گا۔ میں تمہاری بیٹی کا معائنہ کر رہا ہوں۔ تم آرام سے اس سیٹ پر ٹیک لگا کر بیٹھ جاؤ۔'' کہہ کر ڈاکٹر نے بچی کے سینے پر آلہ رکھا۔ بچی کا دل ساکت تھا۔ کوئی دھڑکن کوئی حرکت نہیں تھی وہاں پر۔ ڈاکٹر نے ادھر ادھر الٹ پلٹ کر دیکھا۔
''موت دم گھٹنے سے ہوئی ہے۔'' کہہ کر ڈاکٹر نے اسے چھوڑا اور شکور کو نیند کا انجکشن دیا۔
''کوئی زندہ نہیں بچا ہے ڈاکٹر!'' ایک پاسدار نے کہا۔
''ہوں!'' ڈاکٹر خاموشی سے آگے بڑھا۔ کچھ دوری پر دو برہنہ جسم ایک دوسرے کی آغوش میں جکڑے بستر پر پڑے تھے۔ دونوں کا سر جسم کے اوپر سے غائب تھا۔ ڈاکٹر نے پلکیں جھپکائیں۔ تھوڑی دیر تک ان جسموں کو تاکتے رہے جیسے پوچھ رہے ہوں۔ زندگی تخلیق کا نام ہے۔ کچھ دینے کا یا...
ہیلی کاپٹر اڑا۔ نیچے سات آٹھ گاؤں ویران پڑے تھے۔ ڈاکٹر نوید کی بھنویں تن گئیں۔ سوچ کا دائرہ پھر سمٹنے لگا۔
'ایک ہی نقطہ پر جا کر میں ٹھہر جاتا ہوں۔ آخر یہ جنگ کیوں ہو رہی ہے؟ فیصلہ کب ہوگا، کون کرے گا؟ کب تک میں... کوئی تو مسیحا بن کر آئے۔' نیچے دوسرے گاؤں میں لڑکوں اور جوانوں کی بسیز تیار ہو رہی تھیں۔ نئے حملے کے لیے۔ ڈاکٹر نوید نے آنکھیں بند کرلیں۔ بند آنکھوں کے سامنے ایران کا نقشہ ابھرا جس میں صرف لاشوں کا انبار تھا۔ کٹے پھٹے جسموں کے ڈھیر تھے۔ خون کی ندیاں تھیں اور کھوکھلے نعروں کا شور تھا... ان کے ہاتھوں میں ان تمام مشکلات سے نپٹنے کے لیے صرف ایک سرنج تھی۔
بیگ سے ایک ٹرنک گلائزر کی ٹکیہ نکال کر منھ میں رکھ کر آنکھیں بند کرلیں۔
جانے کتنے ماہ، جانے کتنے سال یہ جنگ چلے اور جانے کتنی راتیں گھائلوں کے زخموں پر مرہم اور مردوں کے چہروں پر چادر ڈالنی پڑے... جانے کتنے سال...!

احسان کا دل و دماغ طرح طرح کے سوالات پوچھتا تھا، لیکن جواب کون دے؟ بہن تھی وہ اللہ کو پیاری ہوگئی تھی۔ اس گھر میں اس کا ہم عمر کون بچا ہے! کوئی بھی نہیں۔دادی، نانی، ماں، چچی انہیں کے بیچ صبح سے شام تک وہ رہتا تھا۔ باہر ملنے جلنے پر سخت پابندی ہے کہ کہیں مجاہد یا فدائن نہ بن جائے۔ خالد بھائی کا پیرس سے خط آیا ہے۔ جانے کیا کیا لکھا ہے اس میں، اشاروں کی بات سمجھنا مشکل ہے۔ کہیں کہیں پر آگ، طوفان، جدو جہد جیسے الفاظ ہیں۔ ہر طرح کی سرکوبی، قابو اور مظالم کے بعد... کون سی تصویر اُبھرتی ہے کہ جدو جہد کرنے والے اپنی زندگی کی قربانی دیتے ہی جارہے ہیں۔ کہیں پہنچے تو ہیں نہیں؟... جدو جہد کو کہاں پہنچنا ہوتا ہے؟ لگتا ہے، بس جدو جہد کرنے والے اپنی ناقص جدو جہد دوسروں کے سپرد کر کے آنکھیں بند کر لیتے ہیں... خیر اور شر کی باہمی جنگ، ظالم اور مظلوم کے درمیان نہ ختم ہونے والی لڑائی... کبھی نہ ختم ہو نے والی آواز ہے... کبھی بند نہ ہونے والی دھڑکن ہے... اسی آواز، اسی دھڑکن کی ندا مجھے بے چین کیے ہوئے ہے... مجھے بار بار آواز دیتی ہے... مجھے اس کے بلاوے پر جانا ہوگا... جانا ہوگا۔ احسان نے اپنا سر دیوار پر پٹکنا شروع کر دیا۔

ماں گھبرا کر چیخی۔ ''لو، اس کو پھر کچھ ہوگیا... ذرا بابا کو باہر سے بلاؤ۔'' گھر کی عورتوں نے چاروں طرف سے احسان کو گھیر لیا۔

''یا مشکل کشا...'' جیسے الفاظ گونج رہے تھے۔

''یا امیر المومنین...'' کچھ پھونک کر احسان پر چچی نے دم کیا۔

''موت کی ہوائیں کتنی خاموشی سے بغیر نشان چھوڑے ایران میں بہہ رہی ہیں۔ خون کی بارش ہو رہی ہے۔ زمین فصل اُگانے کی جگہ کٹی فصلوں کو اپنی آغوش میں سمیٹنے لگی ہیں اور میں... مجھے کیا ہو رہا ہے؟ یہ سب میں کیوں سوچ رہا ہوں؟'' بے دم ہوتے احسان کے دماغ نے سوال کیا۔

''تم آگئے! دیکھو اسے کیا ہو رہا ہے؟'' ماں نے لپک کر شوہر کا بازو پکڑا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد گھر میں خاموشی چھا گئی۔ احسان کی عمر جنگ میں جانے والوں کی ہے۔ پیسہ کھلا کر گھر والوں نے کمیٹی کا منھ بند کر دیا ہے، جبکہ پاس پڑوس کے تمام لڑکے، جن کی عمر اٹھارہ سے بیس سال تک تھی، جنگ میں شہید ہو چکے ہیں۔ اکلوتے لڑکے کی ممتا بہت بُری ہوتی ہے، لیکن یہ ممتا کب تک بظاہر بند کا کام کرے گی۔ پورا ایران چھوت کی بیماری سے متاثر ہے۔ اس بخار سے لڑنے کے لیے تازہ خون چاہیے... طاقتور روحیں... ان روحوں کو گھر کے پنجرے میں کب تک کون قید رکھ سکتا ہے؟ پرندے اُڑیں گے... بازو کٹیں گے... لیکن آسمان پرواز سے بھرے گا۔
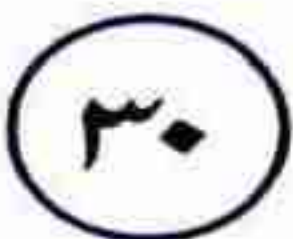
کچے کھجور گھنگرو کی طرح درخت کی شاخوں سے بندھے ہوئے تھے۔ ان کی خوشبو سے ماحول مہک رہا تھا۔ لو کے تیز جھونکے پھلوں سے لدی شاخوں کو ہلا رہے تھے۔ تیز دھوپ کی تپش سے دور دور تک ایک دودھیا نیلا پن پھیلا ہوا تھا، جس کو چیرتی کالی کالی ڈامر کی چوڑی چمکیلی سڑک دور سے ایسی جھلملا رہی تھی جیسے ریگستان میں سراب پیاسے کو چھلتی ہے۔

مہدی نے بس میں بیٹھے ہوئے باہر دیکھا۔ سامنے بورڈ لگا تھا 'البغداد'۔ اس نے بے چینی سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پھر گردن میں پڑی کنجی کو آہستہ سے چھوا۔ ''شہادت نہ ملی نہ سہی، زیارت تو نصیب ہوگئی۔ جنت تو علی کی چوکھٹ ہے۔''

یہ بس بغداد شہر کا چکر لگاتی رمادی کیمپ کی طرف جا رہی تھی۔ ایران، عراق جنگ میں قیدی بنائے گئے ننھے سپاہیوں کو لے کر، جن کے منھ سے ابھی دودھ کی خوشبو بھی

نہیں گئی تھی۔ کچھ لڑکے اونگ رہے تھے۔ کچھ خوفزدہ تھے، کچھ بڑے آرام سے کھڑکی سے باہر جھانک رہے تھے۔ جس وقت بس رمادی کیمپ پہنچی، کھانا اتارا جارہا تھا۔ قورمہ، سبزی اور چاول... ایرانی کھانا...! بہت سے ایرانی قیدیوں کو کیمپ میں دیکھ کر بھی مہدی کا دل اکیلے پن سے گھر گیا تھا۔ بڑی زور سے رونے کا دل چاہنے لگا۔

''کھانا کھاتے کیوں نہیں؟'' رسوئی کے انچارج علی کریمی نے مہدی سے کہا۔

''بچہ ہے، گھر کی یاد آرہی ہوگی۔'' ایک عراقی افسر نے اپنی ٹوٹی پھوٹی فارسی میں کہا۔ مہدی کو اس کی یہ ہمدردی بہت بُری لگی۔ ''کون ہوتا ہے مجھ پر ترس کھانے والا یہ کافر!'' اس کا ننھا سا دل اشتعال کے سبب دھڑکنے لگا۔ غصہ کی وجہ سے سانس دھونکنی کی طرح چلنے لگی اور دماغ میں بندوق کی گولیاں سنسنانے لگی۔ 'ایران ہوتا تو بتا دیتا، سینہ چھلنی کر دیتا!'

''کھالو... رہنا تو یہیں ہیں نا!'' علی کریمی نے سمجھایا۔ وہ خود تین سال سے قیدی بنا ہوا تھا۔

''نہیں۔'' مہدی نے بڑے ہٹیلے انداز سے کہا۔ اس کے پیروں میں ٹیس اٹھنے لگی۔

لڑکے کھا پی کر اُٹھنے لگے تھے۔ مہدی نے دیکھا، اس کے باقی ساتھی بھی تیزی سے کھانا کھا رہے ہیں۔ اس نے نفرت سے منھ پھیر لیا۔ ''دشمن کا نمک کھا کر اپنا نمک دان توڑ رہے ہیں... چھی!'' کھانے کے بعد کھجوریں ملیں۔ اس نے کھجوریں بھی نہیں کھائیں۔ پرانے قیدی لڑکے بڑے آرام سے کھجور کھا کر ان کے بیج دانتوں کے نیچے دبا رہے تھے۔ کچھ نے ان بیجوں کو پتھر پر گھسنا شروع کر دیا۔ مہدی خاموشی سے سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ ایک دم گھستے بیج کو دیکھ کر اس کے دماغ میں امام خمینی کے الفاظ گونجے۔ 'ہم نے امریکہ کا چہرہ زمین پر رگڑ دیا ہے۔'

''دیکھو، کیسی بنی ہے میری تسبیح!'' ایک لڑکے نے مہدی کو اداس اور خاموش بیٹھا دیکھ کر اپنے ہاتھ میں پکڑی تسبیح دکھائی۔

''اچھی ہے نا؟'' بارہ سال کا لڑکا پوچھ رہا تھا۔ اس کے گدگدے ہاتھ پر کھجور کے دانوں سے بنی تسبیح کو مہدی نے لمحہ بھر غور سے دیکھا۔

''ہاں، بہت اچھی ہے... کیسے بناتے ہو اِسے؟'' دس سال کا مہدی سب کچھ بھول کر ایک دم سے بول پڑا۔

''پہلے اپنے حصے کے کھجور کھاؤ تو بتاؤں۔'' لڑکے نے مہدی کی مٹھی کی طرف اشارہ کیا۔

''اچھا......!'' کہہ کر مہدی نے کھجور سے اپنا فاقہ توڑا۔

''اب؟'' مہدی نے تینوں بیج ہتھیلی میں پکڑ کر پوچھا۔

''بتاتا ہوں۔'' کہہ کر اس لڑکے نے، تسبیح کیسے بنتی ہے، بتانا شروع کیا۔

شام ڈھلنے لگی تھی۔ گرمی میں کمی آگئی تھی۔ مہدی کے پیر کے زخم میں پھر ٹیس اُٹھنے لگی تھی۔

خواب میں اس کے گھر کا آنگن ہے۔ ماں تندور پر روٹیاں سینک رہی ہے۔ انجیر کے پیڑ کے نیچے وہ لڑکوں سے گھرا بیٹھا ہے اور وہ سب اٹل مٹل تو تلے کا کھیل کھیل رہے ہیں۔

اٹل۔مٹل تو تو لے

گاؤ حسن چہ جورے

نہ شیر دار نہ پستون

شیر اش را بردن ہندوستون

یک زن ہندی بہ سون

اسمش را بیزار امکیری

دور کلاہ اش کرمزی

آچینو واچین یا پاتو درچین!

(حسن کی گائے کیسی ہے؟ نہ تھن ہیں اس کے، نہ وہ دودھ دیتی ہے۔ اس کے دودھ کو ہندوستان لے گئے ہیں۔ ایک ہندوستانی عورت کو لو اور اس کا نام رکھ دو، بوا کی

بیٹی۔اس کی ٹوپی کا کنارہ لال ہے...آچین...واچین ایک پیر اٹھالو اپنا!)
سوئے ہوئے مہدی کے چہرے پر ہلکی سی مسکان پھیل گئی۔رخساروں پر آنسوؤں کے خشک نشان اب بھی نظر آرہے تھے، مگر ایرانی زمین نے اسے اپنی آغوش میں بھینچ لیا تھا۔اس کی سسکیاں اب ایک آرام دہ سانس میں تبدیل ہورہی تھیں اور مسکان اب ہلکی ہلکی ہنسی میں بدل گئی تھی۔

جس کے پیر پر ہاتھ کے ساتھ ورچین (اٹھالو) لفظ ختم ہوتا ہے وہ اپنا پھیلا پیر سمیٹ لیتا ہے۔ اس کے کافی ساتھی آؤٹ ہوچکے تھے اور اب وہ دونوں پیر سمیٹے اُکڑوں بیٹھے تھے۔اس مرتبہ قاسم کا ہاتھ ورچین کے ساتھ اس کے پیر پر پڑا...مگر قاسم کا ہاتھ وہیں جڑ ہوگیا۔

یہ کیا؟ اس نے دیکھا، اس کا ایک پیر جانگھ کے نیچے سے غائب ہے۔کہاں گیا؟
پورا منظر بدل گیا۔اب بسیز کی لمبی قطار ہے جو کے کھیت کے سامنے۔ ماں کا روتا چہرہ، باپ کے کانپتے ہونٹ...اس کا ہنس کر کہنا۔''میں شہید ہوگیا تو میری قبر پر پھول لے کر آنا، مامان! آؤ گی نا؟''...پھر میدان جنگ میں سنسناتی گولیاں...بے ہوشی جب ٹوٹی اور اسے پوری طرح سے ہوش آیا تو اس نے دیکھا، وہ قیدی ہے اور اس کے پیروں سے گولی نکالی جارہی ہے، پھر پیر کاٹ دیا گیا۔ درد کی ایک تیز لہر... اس کے منہ سے چیخ نکل گئی...آنکھوں کے سامنے صرف لال ٹوپیاں تھیں اور ہرے لباس...پھر وہ چیختا چلا گیا۔

''کیا ہوا؟'' کئی لڑکے اٹھ بیٹھے۔ کچھ نیند سے جاگے۔پسینے سے تر مہدی پھٹی آنکھوں سے پیر کو تک رہا تھا۔ جواد نے اسے پانی کا گلاس تھمایا اور محبت سے اس کا شانہ تھپتھپایا۔گرمی غضب کی تھی۔ کھڑکیاں کھلی تھیں۔باہر میدان میں کانٹے دار باڑھ کے اس پار تک پھیکی چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔

تھوڑی دیر بعد سب لڑکے سو گئے۔ دس سے سولہ سال تک کے لڑکے جنگی قیدی بنے ہوئے تھے۔ جواد یہاں پر سب سے پہلے قیدی بن کر آیا تھا۔پچھلے تین برسوں سے میں یہاں ہوں... میں بارہ سال کا تھا، اب پندرہ سال کا ہوگیا ہوں۔ کتنا طویل وقت

گزر گیا... اس نے کھڑکی سے باہر آسمان پر نکلے چاند کو دیکھتے ہوئے ہونٹوں کے اوپر ہاتھ پھیرا... کتنے ملائم بال نکل آئے ہیں... ماماں مجھے دیکھ کر کتنا خوش ہوں گی، جب میں ایران لوٹوں گا... اس کی آنکھوں میں خواب تیرنے لگے۔ گاؤں کے کھیت، باغ، گھر اور اس کا پیارا کتا... گرگی بھی تو بڑا ہو گیا ہوگا۔ نیند کے خمار میں ڈوبی ہوئی آنکھوں کے سامنے گھر ابھرنے لگا۔ ماماں ... بابا اور فاطمہ... گرگی بھی تو اس چاند کو دیکھ رہے ہوں گے نا۔ ہنسی کی آوازیں اور گھوڑے کی ہنہناہٹ...

گیہوں کے کھیتوں کے بیچ سے وہ بھاگ رہا ہے۔ پیچھے 'گرگی' اس کا کتا بڑی سی زبان نکالے دوڑ رہا ہے۔ اچانک آسمان لڑاکو جہاز کی آواز سے گونج اٹھا اور ایک تیز ترانہ گونجا... وہ وردی پہنے بسیز میں کھڑا ہے... منڈلی کے قریب قیدی بنالیا گیا۔ اس کے ساتھ اس کے تقریباً پچاس ساتھی لڑکے اور پکڑے گئے ہیں.... بغداد میں سب کو نجف جانے کا انتظار ہے... تمام لڑکے مست ہیں۔ وہ بھی مست ہے۔ کسی نے اسے زور سے آواز دی۔

''جواد... سنا ہے کہ ہم ایران لوٹ رہے ہیں!''

''کیسے؟''

''ریڈ کراس سے صدام حسین نے کہا ہے۔ وہ امام سے بات کرے گی... مزہ آئے گا!''

''میں تو بہت ساری ناشپاتیاں کھاؤں گا... گھر کے پیڑ پر اب پک رہی ہوں گی...''

''جواد، میں تو جاتے ہی اصطبل کی دیوار سے وہ رنگین شیشہ نکالوں گا جسے آتے وقت میں وہاں چھپا آیا تھا... بڑا...''

''چھوڑو بھی... شیشہ کیا ہوتا ہے۔ میرے گاؤں آنا، گرگی سے ملواؤں گا...''

سامان بندھ گیا۔ تبھی ....بم کا گولہ پھٹا... امام نے قیدیوں کو واپس لینے سے انکار کردیا، یہ کہہ کر کہ یہ الزام ہے ایران پر۔ دراصل یہ لڑکے ایرانی نہیں ہیں۔

''جھوٹ... جھوٹ...'' ہنستے کھلکھلاتے لڑکے آنسو بھری آنکھیں لیے چیخ پڑے۔

بچھو نے درد سے تڑپنا شروع کر دیا... پورا کیمپ دردناک آوازوں سے گونجنے لگا...جواد خواب میں ہی اپنا گھٹنا پکڑ کر زور زور سے رونے لگا۔

''کیا ہوا جواد؟'' قریب لیٹے سلیم نے اس سے لپٹتے ہوئے پوچھا۔

''میرا گھٹنا... بہت اینٹھن ہو رہی ہے...!'' جواد نے بلکتے ہوئے کہا۔

رونے کی آواز اور شور سے پہریدار اندر آیا۔ سب کو خاموش کرایا۔ تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر آ گیا۔ گولی کھلائی۔ مالش کی۔ جواد کے پپوٹے بھاری ہو کر بند ہونے لگے۔ ڈاکٹر بشیر گہری سانس لے کر کھڑے ہوئے...... تین سال سے زیادہ ہو گئے ان کی دیکھ بھال کرتے ہوئے...... یہ درد تو اس دن سے لاعلاج ہو گیا تھا جس دن سے امام خمینی سرکار نے لڑکوں کو واپس لینے سے انکار کر دیا تھا...... کیسے تڑپے تھے سب کے سب... جیسے حلال ہوئے ڈھیروں مرغے ایک ساتھ زمین پر لوٹ رہے ہوں... چیخوں سے رات کا کلیجہ خون خون ہو گیا تھا...وہ صرف ڈاکٹر ہیں، دوائی دے سکتے ہیں، لیکن ....امام خمینی کو منا نہیں سکتے، نہ بتا سکتے ہیں کہ آؤ دیکھو، تمہارے معصوم پھول، بوڑھے ہوتے، سوکھتے گلابوں کی ہم کیسی دیکھ بھال کر رہے ہیں... انہیں مرجھانے سے بچا رہے ہیں... مگر انہیں ماؤں کی گود، ان کے وطن کی آغوش نہیں دے سکتے! ڈاکٹر نے گہری سانس لی۔... رات کے دو بجے ہیں، جانے صبح تک کتنے لڑکے خواب میں رو پڑیں گے! خاموشی سے ڈاکٹر باہر نکلے اور اپنے کمرے میں جا کر انہوں نے کتاب کھولی، پائپ بھرا اور کرسی پر ٹیک لگا کر بیٹھ گئے... باقی رات کسی نئی چیخ کے انتظار میں کٹ جائے گی۔

کردستان میں ہنگامے اپنی انتہا پر پہنچ گئے تھے۔ شہناز اور کاک حسن مکمل طور پر گھر چھوڑ کر پہاڑیوں اور گپھاؤں میں رہنے لگے تھے۔ پورا ایران مذہبی اثرات سے متاثر تھا اور کردستان میں مذہب اور مذہبی لوگ روٹی اور انسانیت کو اہمیت دے رہے تھے۔ وہاں پر کوملے اور ڈیموکریٹک پارٹی پوری طرح سے سوشلسٹ اور مارکسی نظریات کو لے کر چل رہی تھی۔ وقت پڑنے پر انہیں پیش مرگوں کے لیے مسجدیں تک خالی ہو

جاتی تھیں۔ رات کو وہ وہاں چھپتے اور نماز کے وقت مسجدیں خالی کردی جاتی تھیں۔ یعنی خدا کا نام لینے والے اور بائیں بازو کی جماعتیں دونوں ایک سطح پر انسان کی اصل ضروریات کے لیے لڑ رہے تھے۔ اسلام کو دوبارہ لانے کی کوئی جدو جہد وہاں نہیں تھی۔

''آج کا دن کیسا خونی دن ہے!'' کاک حسن نے تھکن سے چور آواز میں کہا۔ اس کے دونوں بازوؤں میں گولی لگی تھی۔ کاک حسین گولی نکالنے کا انتظام کررہا تھا۔

''میرے پیر کہیں...'' شہناز کی متفکر آواز ابھری۔ اس کے گھٹنوں میں گولی لگی تھی۔

''گھبرانا کیا! آگ کا دریا ہے، پار جانا ہے۔ ہاتھ، پیر، سر، سب کچھ قربان کرنا پڑے گا...... کسی بھی قسم کا ڈر دل سے نکال پھینکو، شہناز!'' کاک حسن نے کہا۔

''ڈر موت کا نہیں، معذور ہو جانے کا ہے۔'' شہناز نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تمہارا نشانہ خطا نہیں ہوتا۔ بیٹھے بیٹھے دشمنوں کے سینے چھلنی کرنا۔'' کاک حسن نے کہا۔ اس کی بات میں پوشیدہ اشارہ شہناز سمجھ گئی۔ کاک حسن کے دونوں بازوؤں میں کئی گولیاں پیوست ہوگئی تھیں۔ جانے کل...

''کاک حسن ٹھیک کہتا ہے۔ سب سے بلند چوٹی پر مشین گن کے ساتھ تمہیں بٹھا دوں گا۔ فکر مت کرو۔'' کاک حسین نے بھابی کی ہمت بڑھائی اور اس کے پیروں کو پکڑ کر زخم سے گولی نکالنے کے لیے نشتر لگایا۔ درد میں ڈوبی سسکی سے ڈرا گونج اٹھا۔

ملک پر انقلاب کے آغاز میں چھایا طلسم ٹوٹ چکا تھا۔ عوام کا یقین ہر سطح پر درکار تھا، جس نے معاشرے کے تانے بانے کو بری طرح الجھا کر رکھ دیا تھا۔ اتحاد کا سرا کہیں کھو گیا تھا۔ دشمن کا بول بالا تھا۔ ہر انسان دُوسرے کو اپنا دشمن سمجھتا تھا۔ اپنوں کے تئیں بھی شکایتوں کا تومار بندھ گیا تھا۔ سیاسی سطح پر تو شروع سے ہی کبیدگی کے حالات تھے۔ لیکن عام لوگوں کے درمیان بڑھتی نفرت کوئی اچھی علامت نہیں تھی۔ خصوصاً شیعہ اور سنی کے درمیان درار بڑھ رہی تھی، جو دردناک تھی۔ ان کی آپسی لڑائی امام خمینی حکومت کی چولیں ہلا سکتی تھی۔ مٹھی بھر ایران کے شیعوں پر حکومت کرنا ہی امام کا خواب

نہیں تھا، بلکہ وہ مشرق وسطی کے تمام ممالک پر اپنا سکہ چلتا دیکھنا چاہتے تھے اور یہ تبھی ممکن تھا جب وہ سنیوں کا دل جیت کر ان کو ان کے ہی ملک میں اپنے اقتدار کے خلاف ہتھیار بند کروا کر اپنا اثر وہاں جما سکیں۔ انہیں شہنشاہیت کے فرسودہ نظام سے آزاد کرا دیں۔ اس لیے ریڈیو، ٹی۔وی پر بار بار سنی شیعہ اتحاد پر تقریریں نشر کی جانے لگیں اور دیکھتے ہی دیکھتے یہ سیاسی تحریک ہر جگہ پر موضوع بحث بن گئی۔ سنیوں نے امام خمینی کے ان خیالات کا استقبال کیا اور ایران میں یہ پھوٹ خندق نہ بن سکی۔

جہاں سیاسی سطح پر تعلقات کے بنانے اور بگاڑنے کی جدوجہد جاری تھی، وہیں پر مولویوں کی جماعت میں تیزی سے انتشار پھیلنے لگا۔ کچھ اس بات پر معترض تھے کہ اسلامی فلسفہ اور قانون کا ذرا بھی خیال موجودہ حکومت نہیں رکھ رہی ہے، تو کوئی اس بات پر مشتعل تھا کہ اقتدار پر قابض لوگ اپنی کرسی کے چلتے اسلام کے نام پر غیر قانونی قدم اٹھا رہے ہیں، جو شریعت کے نظریہ سے غیر مناسب ہے۔ خود حکومت طرح طرح کی تنقید کے بیچ تال میل بٹھانے کی کوشش کر رہی تھی در حقیقت اس کے ہاتھ سے بھی نظام کا سرا کہیں چھوٹ گیا تھا۔

ثمینہ اور نادرہ کی برہنہ پشت پر برستے کوڑوں کو طیبہ اپنی پشت پر محسوس کر رہی تھی۔ نیم بیہوشی میں بھی وہ 'سڑاک' کی ہر آواز پر چونک پڑتی تھی۔ دونوں پاسدار عورتیں کالی چادروں میں لپٹی چمگادڑیں لگ رہی تھیں اور انہیں کی طرح ثمینہ اور نادرہ کے زخم خوردہ جسم سے چپکی ہوئی خون پی رہی تھیں۔ کمرے میں کراہنے اور سسکنے کی جگہ

صرف چمگادڑوں کے ہانپتے بازوؤں کی پھڑ پھڑاہٹ گونج رہی تھی۔

نادرہ پچاس سال کی مضبوط قد کاٹھی کی تُرک ایرانی عورت تھی۔ ان کی بیٹی ثمینہ ان کی واحد اولاد تھی۔ دونوں ماں بیٹی کا گھر یہ لوگ کبھی کبھی میٹنگ کے لیے استعمال کر لیتے تھے۔ اس بات کا علم طیبہ کو نہیں تھا۔ لیکن اپنے ساتھیوں کے ساتھ انہیں دیکھ کر اسے اندازہ ہو گیا تھا۔ نادرہ خانم بیوہ تھیں۔ ان کے شوہر رسول سپہری شاہ عاشق تھے، لیکن اسی شاہ کے اقتدار میں شاہی پولس نے انہیں گولی کا نشانہ بنایا تھا۔ تب سے ان کے دل میں دکھ کا ایسا بیج پیوست ہوا کہ اس نے ایک تناور درخت کی شکل اختیار کر لی اور جب وہ پیڑ پھل دینے لگا تو اس میں صرف بغض و عناد کے پھل لگے۔ ان پھلوں کے بیج سیاسی تلخی لیے ہوئے تھے۔ بھلے ہی وہ سیاست کے داؤں پیچ سے واقف نہ ہوں لیکن اتنا ضرور سمجھ گئی تھیں کہ سیاست بے گناہوں کے شکار کا نام ہے۔ ایک ایسے زہر کا نام ہے جو زندگی کی لذت نہیں، بلکہ اسے موت کی نیند سلا دیتا ہے۔ اس لیے انہوں نے اپنی بیٹی کو اس زہر کے سائے سے بھی دور رکھا تھا، لیکن خود کو روک نہیں پائی تھیں اور آگ کے دریا میں کود پڑی تھیں۔ صرف مدد کرنے کی حد تک انہوں نے اپنا دامن جلایا تھا اور آج اسی چھوٹی سی مدد کے عوض دونوں پھانسی کے پھندے میں جھول رہی تھیں۔

''اب تمہارا ارادہ کیا ہے؟'' چمگادڑیں ہانپتی ہوئی کالے بازو پھڑ پھڑاتی ثمینہ اور نادرہ کے جسم سے اُڑیں اور چھت سے سر کے بل لٹکی طیبہ کی طرف لپکیں۔

''کیوں ان دونوں کے خون کی پیاسی ہو رہی ہو؟ کچھ بولتی کیوں نہیں ہو؟'' ایک چمگادڑ نے جھپٹا مارا۔ کوڑے کی مار سے طیبہ کا کمزور جسم کسی ٹوٹی شاخ کی طرح طوفانی ہواؤں میں ڈول گیا۔

''آٹھ ماہ ہو گئے ہیں گونگی بنے ہوئے... ہم سب کو خون کے آنسو رلا دیا...... وہی سوال صبح، وہی سوال شام... کب تک کوئی دہرائے... بہری، گونگی، اندھی سب کچھ بنی ہوئی ہے یہ بد بخت۔'' دوسری چمگادڑ اپنی کالی چادر میں بازو سنبھالتی ہوئی دانت کٹ کٹا کر آگے بڑھی۔

"اس کی زبان...اسے ہی کھینچ لیتے ہیں! گونگی بننے کا ڈرامہ ہی ختم ہو۔" کہہ کر ایک نے طیبہ کا چہرہ کسی کچی لکڑی کی کھپچی کی طرح چیرا اور دوسری نے اس کی خشک زبان کو پکڑنا چاہا۔ طیبہ کا پورا جسم پسینہ اور خون سے تر تھا۔ اس نئے حملے سے عجیب طرح سے اینٹھنے لگا۔

"یہ کون سی دیوانگی تم لوگوں پر طاری ہوگئی ہے! پیچھے ہٹو۔" ناظم کی تیز آواز کمرے میں گونجی۔

"اجناب عالی...! آپ...!" دونوں خوفزدہ کالی بلیوں کی طرح سمٹنے لگیں۔

"فوراً کھولو اسے!" ناظم نے پھٹکارا۔

"جی جناب!" کہہ کر دوسری پاسدار عورت ویل کی طرف لپکی۔

"جتنا تم سے کہا جائے اتنا ہی کیا کرو، سمجھیں!" دھمکی کی آواز کمرے میں گونجی۔

"جی۔"

دونوں کالی بلیاں تھر تھر کانپ رہی تھیں۔

"آخری سفر سے قبل والی خاطر کرو ان کی۔" کہہ کر آواز خاموش ہوگئی۔

ناظم کمرے میں بیٹھا سامنے اسکرین پر کمرہ نمبر دس کو دیکھ رہا تھا۔ طیبہ کو دونوں پاسدار عورتیں چھت سے اتار کر فرش پر لٹا رہی تھیں۔ تینوں زخموں سے چور تھیں۔

"ان کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ میں ان پر بھی نظر رکھتا ہوں... جہاں سازش اور خدشات سے فضا گھٹ رہی ہو وہاں اپنے سائے پر بھی کڑی نظر رکھنی پڑتی ہے۔" ناظم نے سوئچ آف کرتے ہوئے کہا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ سامنے میدان میں لیٹے ہوئے قیدیوں کے سینے پر وزنی بوریاں رکھی ہوئی تھیں۔ کمرے میں واپس آکر اس نے چائے کے لیے گھنٹی بجائی اور اخبار کھول کر اس میں ڈوب گیا۔

دونوں پاسدار عورتیں ایوان جیل سے باہر نکلیں۔ کل سے دو دن کی چھٹی ہے۔ شام کے پانچ بج رہے ہیں۔ شہر جانے والی بس پندرہ منٹ بعد آنے والی تھی۔ دونوں باتیں کرتی ہوئی بس اسٹاپ پر جا کر کھڑی ہوگئیں۔

"جواب دیا رحمت کو؟"

''نہیں، فیصلہ نہیں کر پا رہی ہوں۔''

''فیصلہ کیا کرنا ہے، جو کام دین ایمان کے اندر ہو، حرام نہیں، اس میں خدا کی خوشی شامل ہے۔ صیغہ کرنے میں کیا فیصلہ کرنا، پھر بہن، عورت مرد کے سہارے کے بغیر جی نہیں سکتی۔''

''وہ تو میں بھی سمجھتی ہوں، لیکن...''

''کتنے دنوں کا صیغہ ہوگا؟''

''چھ ماہ کی بات کر رہے ہیں۔''

''اچھا ہے! بسم اللہ کر ڈالو۔''

''تمہارے شوہر کا کیا حال ہے؟''

''وہی پرانا، مالش سے کچھ فرق پڑا ہے، لیکن ایک دم اچھا ہونا تو ناممکن ہے بہن، اب......!''

''چلو، خدا پر بھروسہ رکھو۔ یہی کیا کم ہے کہ گھر میں ساس ان کی دیکھ بھال میں تمہارا ہاتھ بٹاتی ہے۔''

''جب پڑتی ہے تو سب کچھ سہنا پڑتا ہے۔ یہی ساس تھیں، بیٹھ کر کھاتی تھیں، لیکن جب سے یہ بیمار پڑے، سب کچھ بدل گیا۔ تمام بوجھ مجھ بے کس کے کندھوں پر آ پڑا ہے۔ ان چار پیسوں سے بھی پورا نہیں پڑتا ہے۔''

''ہاں یہ دو روٹیاں بھی کیسی محنت کے بعد ملتی ہیں، وہ بھی اپنے کو ذلیل و خوار کر کے؟''

''وقت بدلے گا...ہمارا وقت بھی آئے گا۔''

''امام تو یہی کہتے ہیں کہ غریبوں کا خون رنگ لائے گا۔''

''خدا انہیں قیامت تک زندہ رکھے۔''

''آمین!''

بس آگئی تھی۔ دونوں پاسدار عورتیں اپنی پوٹلی سنبھالتی ہوئی اس پر چڑھیں۔ بھیڑ کافی تھی، پھر بھی ڈرائیور نے ہنس کر اونچی آواز میں پوچھا۔ ''کتنی پکڑیں، کتنی ماریں؟''

"جتنی پائیں، اتنی کچلیں۔" ایک پاسدار عورت نے جل کر کہا۔ باقی سواریوں نے ہونٹ پچکائے اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگیں۔

تین دن حسین کی موت کو گزر چکے تھے۔ طیبہ اور کورش کے منہ پر جیسے کسی نے تالا ڈال دیا تھا۔ خاموشی سے ایک دوسرے کو دیکھتے اور پھر دیوار پر نظریں مرکوز کر دیتے تھے۔ کھانے کے بعد کورش کو پاسدار بلا کر لے گئے۔ اس کے جانے کے بعد طیبہ سے پوچھ تاچھ کا سلسلہ شروع ہوا۔

"سیاوش کو جانتی ہو؟" ناظم کی ٹھنڈی، مگر تیز نظریں طیبہ پر جمی تھیں۔

"نہیں۔"

"مگر، اس تصویر میں تم اس کے اتنا... دیکھو، پاس میں کون کھڑا ہے، تمہیں تو ہوتا؟"

طیبہ خالی آنکھوں سے دیوار کو دیکھتی رہی۔

"فرید کو بھی نہیں پہچانتی؟"

"نہیں۔"

"اصغر کو تو ضرور پہچانتی ہوں گی؟"

"کتنی بار کہوں کہ میں ان میں سے کسی کو نہیں پہچانتی۔"

"تمہاری طرح یہ بھی مصنف، شاعر، مصور، ڈرامہ نگار ہیں...... چہ...... چہ...... چہ، بہت افسوس ہوا کہ تم انہیں نہیں پہچانتی ہو۔ عاقلوں اور عالموں کے ساتھ مل کر ذہنی پرواز کرنے والی عورت اور طبقوں کی غیر یکسانیت کی جدو جہد پر یقین رکھنے والی سپاہی کو اپنے طبقے کی بھی پہچان نہیں ہے۔ کیا انداز ہے۔"

طیبہ کے پیلے چہرے پر خشم اور نفرت کی لپٹیں لپکیں۔

"مردوں کو پہچاننے میں آپ شرما رہی ہیں... چلئے، انہیں چھوڑتے ہیں۔ یہ نادرہ کون ہے؟ نادرہ...! جی ہاں، نادرہ رحیمی... اسے تو ضرور جانتی ہوں گی۔ آپ ہی کی

طرح یہ بھی ایک عورت ہے۔ دوسری لڑکی ہے، کمسن اور بھولی، نام ہے ثمینہ افتخار... اس کا نام سنا ہے؟"

"جی نہیں، میں کسی نادرہ، کسی ثمینہ کو نہیں جانتی ہوں۔"

"نام بھول گئی ہوں گی آپ، شکل تو پہچانتی ہوں گی؟"

"میں جس کو جانتی نہیں، اس کی شکل پہچاننے پر کیا اصرار؟"

"ذرا ان سب کو بلاؤ، ان کی شکلیں دیکھ کر، انہیں اپنی پرانی کالی کرتوت کے ساتھ ساتھ سب کی شکلیں بھی یاد آ جائیں گی۔" ناظم کے اشارہ پر دو پاسدار بائیں طرف مڑ گئے۔ جب وہ لوٹے تو ان کے ساتھ سیاوش، اصغر، فرید، کامران، نادرہ، شہرام، ثمینہ اور قاسم تھے۔

"پہچانا؟"

"نہیں۔"

"ذرا قریب آنے دو.... اب کیا خیال ہے، کچھ یاد آیا؟"

"جی نہیں! نہ میں انہیں جانتی ہوں نہ پہچانتی ہوں، کتنی بار یہ بات آپ سے کہوں؟"

"میں یاد دلاتا ہوں... یہ سب اس موجودہ نظام کے زبردست ناقد ہیں اور آپ کے عزیز دوست۔ انہی لوگوں کے پتے ہم آپ سے گزشتہ دس ماہ سے مانگ رہے تھے لیکن آپ تامل سے کام لیتی رہیں۔ مجبوراً ہمیں انہیں کل اٹھوانا پڑا...... میٹنگ کے درمیان سے، جس کا مجھے افسوس ہے۔ مسائل بڑے ہی دقیق تھے جسے آپس میں یہ سب بیٹھے سلجھا رہے تھے، جیسے موجودہ حکومت جنگ بندی نہیں چاہتی، کیونکہ جس دن یہ جنگ بند ہو گئی حکومت کا تختہ پلٹ جائے گا۔ یہ جنگ درحقیقت امام خمینی نے مختلف مسائل سے فرار کے لیے خود شروع کرائی تھی وغیرہ وغیرہ۔ خیر چھوڑیے اس بات کو... ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ اگر آپ ہماری مدد کرتیں تو آپ کی سزا میں چھوٹ اور آپ کے ساتھیوں کے ساتھ رعایت برتی جاتی، لیکن...!" ناظم نے شانے اُچکاتے ہوئے اور اپنی فتح پر اتراتے ہوئے کہا۔

"آپ کی عنایتوں کا شکریہ...!" طیبہ تلخی سے ہنسی۔

"اب دیکھیے نا۔ آپ نے خود ہمارے ہاتھ کاٹ دیے ہیں۔ عنایت چاہ کر بھی ہم نہیں کر پائیں گے۔ ہماری مجبوری کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ سب ہماری مدد کریں تو بات کچھ بنے... کریں گے نا آپ سب ہماری مدد؟" ناظم نے بڑی انکساری سے کہا۔

"کبھی نہیں۔ قیامت تک نہیں۔" طیبہ کی فیصلہ کن آواز گونجی۔

"عورتیں بہت ضدی ہوتی ہیں...اور یہ ضد ہی انہیں لے ڈوبتی ہے۔ تمام ساتھی آپ کی ایک 'ہاں' کے منتظر ہیں اور ہم...آپ ان کی جان بخشیں اور ہمیں..." ناظم کے لہجے میں مکاری اور نفرت کی تیز چھریاں تھیں جو آپس میں ٹکرا کر طیبہ کے دل و دماغ پر حملہ کر رہی تھیں۔

"جو نظام انسانیت کا دشمن ہو، اس سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مدد دوستوں کی جاتی ہے۔" طیبہ کے لہجہ میں تلوار کی جھنکار تھی۔

"آپ کی نظر میں موجودہ حکومت کیا ہے؟"

"فاسشٹ۔"

"بہت خوب!" ناظم نے جبڑے دبا کر کہا۔ تھوڑی دیر تک طیبہ کو خونی نظروں سے گھورتا رہا، پھر چیخ کر پلٹا۔

"ان سب کا منھ کالا کرو۔ خیال رہے کہ ان کے آرام میں، کھانے پینے میں کسی قسم کی کمی نہ رہے۔" کہہ کر ناظم دروازے سے باہر نکل گیا۔ طیبہ نے نفرت کی انتہا پر پہنچ کر زمین پر تھوک دیا۔

ناظم میز پر گھونسے مار رہا تھا۔ اسے اپنی شکست کا احساس بڑا تڑپا رہا تھا۔ تمام ہتھکنڈے اس طیبہ پر آزما لیے...نہ جانے کون سی دھات سے بنی ہے یہ عورت؟ اسے دیکھتے ہی ایک عجیب کیفیت طاری ہو جاتی ہے کہ اسے کچل ڈالوں... میں اتنی جلدی چھوڑوں گا نہیں.... اسے اپنے گروہ کا راز مجھے بتانا ہی پڑے گا... میرے تمام سوالات کے جواب ایک ایک کر کے دینے ہی پڑیں گے۔ آخر اس عورت نے مجھے سمجھ کیا رکھا ہے؟ میں اسے تڑپا تڑپا کر ماروں گا۔ دیکھتا ہوں کب تک، آخر کب تک خاموش رہتی

ہے؟ اسے اپنی زبان سے اُگلنا پڑے گا... سب کچھ مجھے بتانا پڑے گا۔"

"ناظم آغا! جماران سے فون آیا ہے۔ امام نے آپ کو یاد فرمایا ہے۔" پاسدار نے اندر داخل ہو کر کہا۔

"اچھا!" ناظم نے بندھی مٹھی کھولتے ہوئے کہا۔ تھوڑا رُکا پھر محتاط ہو کر بولا۔

"کار نکالو، میں ابھی جماران جاتا ہوں۔ دو بجے تک لوٹوں گا۔"

کورش کی طبیعت کئی روز سے خراب چل رہی تھی۔ اس کو الگ کوٹھری میں پڑے آج دو دن گزر گئے تھے۔ کورش کو ان چار دیواروں کی اب عادت سی پڑ گئی تھی۔ ٹھیک اس پرندہ کی طرح جو اُڑنا تو نہیں بھولتا، لیکن کٹے پروں کے ساتھ اُڑنے کی حسرت دل میں دبائے پنجرے کی ہر چیز سے مانوس ہو جاتا ہے۔ لاچار ہو کر وہ اپنے موجودہ حالات سے سمجھوتہ کر لیتا ہے۔

کورش ادھر کئی روز سے طیبہ سے ملنے کو بے قرار تھا۔ یہ دیواریں، یہ تاریکی بھلے ہی اسے اپنی سی لگنے لگی تھیں۔ لیکن جب سے طیبہ سے ملا تھا، تاریک غار کے دروازے پر رکھا پتھر ہٹ گیا تھا۔ ماضی پھر حال میں روشنی کی ہلکی شعاؤں کی طرح چمکنے لگا تھا۔ اس وقت وہ بیٹھا ہوا سوچ رہا تھا کہ کتنے گھنٹے، کتنے دن، کتنے سال گزر گئے۔ اب تو کچھ بھی یاد نہیں اور اس کی بھی کیا امید کہ اسے اس قید خانے سے کبھی رہائی نصیب ہوگی بھی یا نہیں؟ جو یہاں ایک بار آ گیا وہ کبھی لوٹا بھی ہے؟ کورش نے ایک لمبی سانس کھینچی اور بے چینی سے کروٹ بدلی۔ بدن بخار میں تپ رہا تھا۔

بخار کی شدت میں کورش اپنے بابا کی انگلی پکڑے خشک ندی کی نچلی سطح پر دوڑ رہا تھا۔ دوڑتا ہی جا رہا تھا، اچانک ایک پتھر سے ٹھوکر کھا کر وہ گر پڑا اور بابا کا ہاتھ اس سے چھوٹ گیا۔

ثمینہ نے آنکھیں کھولیں۔ درد سے پورا جسم اینٹھ رہا تھا۔ سینے اور پیٹ کے نیچے کے زخموں پر پپڑی جم رہی تھی، جس سے ایک بدبو سی پھوٹتی رہتی تھی۔ اس نے سامنے دیکھا۔ نادرہ بالکل برہنہ پڑی تھی... اس نے پلکیں جھپکائیں... کیا واقعی... اس نے نظریں دوسری جانب گھمائیں، طیبہ بھی اوپر سے نیچے تک برہنہ پڑی تھی۔ کپڑوں کی جگہ پر سگریٹ اور استری سے جلانے کے نشان تھے جو نظر آرہے تھے۔ ثمینہ نے گھبرا کر اپنے جسم پر نظر ڈالی اور چونک پڑی۔ تینوں کے جسموں پر کپڑوں کی جگہ زخموں اور خون کی لکیروں کا لباس تھا... کیا ہوئے ان کے کپڑے؟ ماں کے جسم کو اس نے چھوا، مگر وہ ٹھنڈا اور ساکت تھا۔ شاید وہ بیہوش تھیں۔ طیبہ بھی عجیب طرح سے اوندھی پڑی ہوئی تھی۔

ثمینہ نے کراہ کر پہلو بدلا۔ برہنہ جسم گیلے خون پر پڑا زمین سے چپک گیا تھا۔ جلد پر کچھ رینگنے کے ساتھ ہی وہ کراہ اٹھی۔ کسی طرح کمر کھسکانے میں کامیاب ہوگئی۔ کروٹ بدل کر جو اس نے نظریں اٹھائیں تو اس کے منہ سے چیخ نکلتے نکلتے رہ گئی۔ اسے لگا کہ وہ شرم سے مرجائے گی۔

سامنے دیوار سے ٹیک لگائے کامران بیٹھا تھا۔ اسی کے قریب سیاوش، شہرام، قاسم، اصغر اور فرید... سب بغیر لباس... کوئی گھٹنے پر سر رکھے بیٹھا تھا تو کوئی آنکھیں بند کیے تھا۔

کمرے میں تاریکی پھیل گئی۔ کسی نے اٹھ کر بٹن نہیں دبایا، نہ آپس میں کوئی بات چیت ہی کی۔ خاموشی نے کمرے کی تاریکی میں مزید اضافہ کر دیا۔ دل کہیں گہری سرنگوں اور بھول بھلیوں میں بھٹکتا روشنی کو تلاش کر رہا تھا۔

''تمام رات ٹیپ چلتا رہا اور کچھ بھی ہاتھ نہ لگا۔'' ناظم نے خالی کیسٹ کا ربن غصے میں نوچتے ہوئے کہا۔

''اس سلسلے میں کوئی کیا کر سکتا ہے؟ جب وہ آپس میں بولے ہی نہیں، تو باتیں کہاں سے ریکارڈ ہوتیں؟'' کریم نے کہا۔

''میں انہیں پر لعنت بھیج رہا ہوں، کمبخت پتھر کے ہیں۔'' ناظم نے دانت پیستے ہوئے کہا۔

''انہیں... قصہ پاک کرو...!'' کریم نے ہاتھ کے اشارہ سے ناظم کو رائے دی۔

''مارا تو انہیں کبھی بھی جا سکتا ہے۔ سوال ہے جڑ کا، شاخیں توڑتے رہو، زمین میں جڑ ہے تو پیڑ پھر نکلے گا، نئی کونپلیں پھوٹیں گی، شاخ بنے گی....'' ناظم نے دھیمی آواز میں کہا۔

''خود کو سنبھالو، طاہر کا حال دیکھا ہے؟ چار ماہ سے ہسپتال میں پڑا ہے۔ کیا فائدہ ہے اپنے اعضا سے کھلواڑ کرنے میں؟ آیت اللہ خلخالی جب تھے ہمارا کام زیادہ آسان تھا۔ آتے ہی پوچھتے تھے، ''کتنی ٹرکیں آئی ہیں؟''

''تین آئی ہیں۔''

''کب پہنچی؟''

''رات کو دو بجے۔''

''سب امام مخالف اور غدار وطن ہیں۔''

''جی!''

''ٹھیک! پہلے ٹرک والوں کو پھانسی، دُوسرے ٹرک والوں کو گولی اور تیسرے ٹرک والوں کی ہنٹر سے دُھنائی... اور کوئی بات؟''

''نہیں۔''

''پھر کار نکلواؤ، میں جماران ہو کر آتا ہوں!'' اس طرح سے سیاسی قیدیوں کے فیصلے کرتے تھے، لیکن تم اور طاہر نفسیاتی جنگ کے فیصلے کرتے ہو... اسی باعث آج تمام جیلیں قیدیوں سے ابل رہی ہیں... کھانے اور جگہ کی کتنی قلت ہے... یہ نہ مار پیٹ سے سدھریں گے نہ بدلیں گے... یہ بہت ڈھیٹ ہیں، بہت ہی زیادہ۔''

''تب کام آسان تھا۔ آج مخالف گروہ زیادہ منظم اور خطرناک حد تک چالاک

ہو گئے ہیں۔ ان کی بنیاد کا پتہ لگانا ہے۔ آیت اللہ خلخالی کا زمانہ لد گیا، جب وہ کہتے تھے کہ 'بے قصور مرا تو جنت میں گیا۔ اگر قصوروار تھا اور ہمارے ہاتھوں مارا گیا تو خوش ہو کہ دوزخ کے بجائے وہ جنت میں گیا۔ اس میں قانون اور رحم کی دُہائی دینے سے کیا فائدہ۔' اب حالات بہت سنجیدہ ہیں، کریم! ایک بار ان کے گروہ کے کسی اہم شخص کو ٹی۔وی پر لا کر معافی منگوا دو یا توبہ کرا دو، سمجھو پورا گروہ منتشر ہو گیا... مجھے اس دن کا انتظار ہے۔" ناظم نے گہری نظروں سے کریم کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"بہر حال، اب پتھر کی ان سب مورتیوں کا کرنا کیا ہے؟ ثمینہ اور نادرہ بغیر زبان کھولے مر گئیں۔" کریم نے کہا۔

"جہنم میں گئیں دونوں... روز یہاں ہزاروں ایسی بے کار کی موتیں ہو رہی ہیں۔ ایک ہزار دو سہی... زبان کھولتی بھی تو کیا کہتیں؟ انہیں کچھ پتہ بھی نہیں تھا۔ ہمارے لیے طیبہ کا زندہ رہنا ابھی کچھ دنوں تک اہم ہے۔ اسی کے پاس ہے کنجی۔ وہ ہے ریڑھ کی ہڈی.... یہ تمام موتیں تو فضا بنانے کے لیے ہیں... پھر کریم... مارا تو انہیں کسی بھی لحہ جا سکتا ہے... اپنی مٹھی میں ہیں سب کے سب ... ذرا دباؤ ڈالا مٹھی پر، دم گھٹنے سے سب مر جائیں گے۔"

"اتنا وقت کسی ایک شخص پر خرچ کرنا بہت...."

"سوال ایک شخص کا نہیں، بلکہ پورے گروہ کا ہے... میری بات سمجھنے کی کوشش کرو... مجھے قُم جانا ہے۔ آیت اللہ منتظری کے پاس، ایک ہفتہ لگ جائے گا۔ اس درمیان ان سب کو سزا سے نجات دے دو۔ لوٹ کر کچھ فیصلہ کروں گا...... اس زمینی بلا کو بھی آرام کرنے دو!"

"جیسی تمہاری مرضی۔"

دوپہر کے وقت قید خانہ کی کوٹھری کا دروازہ کھلا۔ ایک جیم و شحیم مولوی اندر داخل ہوا، پھر خاموشی سے باہر نکل گیا۔ سہ پہر کے قریب طیبہ کو بلانے وہی عورت آئی۔ طیبہ

کی آنکھوں پر پٹی باندھ کر اسے اپنے ساتھ لے گئی۔ پٹی کھولنے کے بعد پھر طیبہ کی آنکھوں کے سامنے تارے ٹوٹنے لگے۔ لال لال دھبے گھومنے لگے۔

''آپ کے دُوسرے ساتھی کہاں ہیں؟'' مردانہ آواز اُبھری۔

''مجھے معلوم نہیں ہے۔'' طیبہ نے گرمی سے جواب دیا۔

''ان کے گھر بھی تو یاد ہوں گے؟'' مردانہ آواز میں تیزی تھی۔

''جی نہیں۔'' طیبہ نے فیصلہ کن لہجہ میں کہا۔

''انہیں لے جاؤ، کمرہ نمبر چار میں۔'' حکم ملا۔

طیبہ کے جانے کے بعد ناظم نے طاہر کی طرف دیکھا۔ طاہر نے گردن ہلائی اور خاموشی سے اُٹھ گیا۔ کمرے سے باہر نکلتا ہوا بولا۔ ''تم آزاد ہو۔''

''پورا ٹیپ سنا! جانے کس زبان میں کیا اوٹ پٹانگ باتیں کرتے ہیں۔ فلسفے کی کلاس نہیں، ہمیں اس گروہ کے ممبران کے پتے چاہیے۔ ان کی ریڑھ کی ہڈی توڑے بغیر...... یہ توڑ پھوڑ سے باز نہیں آئیں گے، انہیں سبق پڑھانا ضروری ہے۔'' اتنا کہہ کر ناظم کمرہ نمبر چار کی طرف چل پڑا۔

طیبہ کے ریشمی اخروٹی بالوں کو وہ عورت اپنی مٹھی میں پکڑے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ہزار مرتبہ دہرایا جا چکا وہی سوال پوچھا جا رہا تھا۔ بالوں کی لٹیں کی لٹیں اس عورت کے ہاتھ میں ٹوٹ کر لپٹ گئی تھیں۔ طیبہ درد کے زہر کو پی رہی تھی۔ تھپڑوں سے جبڑے دکھنے لگے تھے۔ مار مار کر جب وہ عورت تھک گئی تو طیبہ کو وہیں فرش پر اوندھا، ہانپتا چھوڑ کر چلی گئی۔ غصہ اور اہانت سے طیبہ دیوانی ہو رہی تھی۔ اچھل کر فرش سے کھڑی ہوئی، اور جانے کس جوش میں کمرے کے کونے میں رکھی میز کے قریب پہنچی۔ کچھ تلاش کیا۔ کاغذ اِدھر اُدھر کیے۔ بلیڈ قلمدان میں رکھا مل گیا۔ اُسے اُٹھا کر اس نے چھپالیا۔

کمرے کا دروازہ کھلا۔ عورت کے ساتھ ایک مرد داخل ہوا۔ آگے آ کر دہاڑا۔

''کل تک اس نے نہیں بتایا تو برقی کرسی پر بٹھا دوں گا۔'' کہہ کر وہ باہر چلا گیا۔

عورت نے طیبہ کو کمرے سے باہر ہانکا۔

طیبہ کو دُوسرے کمرے میں دھکیل کر اس نے دروازہ بند کرلیا۔ طیبہ نے بلیڈ نکالا۔

بلیڈ نیا تھا۔ دھار تیز تھی۔ 'میں ان کا ہر وار خالی کروں گی۔' سوچ کر اس نے بلیڈ سے سارے بال کاٹ دیے۔

'دیکھتی ہوں اب کیا پکڑتی ہیں۔' طیبہ نے دل ہی دل میں کہا۔ کمرے میں تاریکی پھیل گئی تھی۔ کورش ابھی تک نہیں لوٹا تھا۔ اسی کے انتظار میں وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔

تہران میں خوب اخبار فروخت ہو رہے تھے۔ بم رکھنے سے آیت اللہ تبریزی اڑ گئے تھے۔ اس خبر کو سن کر جیل والے چراغ پا ہو گئے تھے۔ ناظم کے جبڑے کی ہڈی بہت تیزی سے اندر باہر ہو رہی تھی۔ اسی وقت اس عورت نے طیبہ کے بال کاٹنے کی خبر دی۔ ناظم غصہ سے دیوانہ ہو گیا۔

''آخری ترکیب آزماؤ۔'' کہہ کر اس نے پیپر ویٹ سامنے دیوار پر زور سے دے مارا۔

اندھیری رات تھی۔ باہر بالکل خاموشی تھی۔ طیبہ کی آنکھیں کھلیں۔ کورش کو کمرے میں نہ پا کر وہ پھر سو گئی۔

آدھی رات کو کمرے کا دروازہ کھلا۔

''کون؟ کورش؟'' طیبہ نے نیند میں ہی پوچھا، لیکن اسے جواب نہیں ملا۔

''کون ہے؟'' طیبہ نے اونچی آواز میں پوچھا۔

''تمہارا عاشق!'' بھدی سی آواز آئی۔

''خاموش رہو! آخر کون ہے یہ بدتمیز!'' جھنجھلائی سی طیبہ اپنی جگہ سے اٹھی کہ لائٹ جلائے، لیکن درمیان میں ہی بھاری ہاتھوں نے اسے پکڑ لیا۔

''چھوڑو، میں کہتی ہوں چھوڑو مجھے۔''

''تم ہوتی کون ہو کہنے والی؟''

''میں چیختی ہوں۔ بلاتی ہوں پاسدار کو۔''

''بلا کر دیکھو، اسے بھی جھیلنا پڑے گا۔''

خود کو چھڑانے کی کوشش میں کئی جگہ طیبہ کو ہاتھا پائی میں کھروچیں لگیں۔ خون نکلا، لیکن وہ جوجھتی رہی۔

''یہ لے، ارے بد ذات عورت! تو نے سمجھ کیا رکھا ہے؟'' کہہ کر اس نے طیبہ کو کسی چادر کی طرح اٹھا کر فرش پر ڈال دیا۔

اتنی ذلت! طیبہ کا رُواں رُواں چیخ اُٹھا۔ اس کے سب ہتھیار ٹوٹ گئے۔ وہ بے دم ہوگئی۔ اس کی تمام کوششیں رائیگاں ہوگئی تھیں۔ اس کا بدن بے حس ہوگیا تھا۔

جانے سے پہلے اس نے کپڑے ڈھونڈے اور پہننے کے لیے لائٹ جلائی۔ طیبہ بغیر کسی حرکت کے ویسے ہی پڑی رہی۔ آنکھیں چھت میں جانے کیا تلاش کر رہی تھیں۔

''ہار کا سوگ منا رہی ہو؟'' اس آدمی نے کپڑے پہنتے ہوئے کہا۔

''نہیں! میں تمہاری شکست کا سوگ کیوں مناؤں گی بھلا؟'' طیبہ چونکی، پھر اسی طرح لیٹے لیٹے بڑے تحمل لیکن حقارت سے بولی۔

''میرا جسم......!'' قہقہہ کمرے کی چھت پھاڑنے والا تھا۔

''میری روح کو تم داغدار نہیں کر پائے۔ یہ جسم تو پہلے ہی سے تم لوگوں کی دی ہوئی اذیتوں کی سند بنا رہا ہے؛ فانی ہے، لیکن روح فانی نہیں۔ روح کا لمس تم کو حاصل ہوا، ایسا تم صرف وہم پال سکتے ہو۔'' کہہ کر طیبہ بڑے اطمینان سے کھڑی ہوئی اور اس کے منھ پر تھوک دیا۔

''بزدل!'' کہہ کر دیوار سے چپک کر وہ ایسی شعلہ برساتی نظروں سے اس آدمی کو گھور رہی تھی جیسے وہ اسے کچا چبا جائے گی۔ اس آدمی کا ہاتھ اٹھا، پھر جانے کیوں آگے بڑھتے قدم رُک گئے...... کندھے اُچکا کر اس آدمی نے آہستہ سے آستین سے تھوک پونچھا اور بغیر پیچھے مڑے دروازہ کھول کر سیدھا باہر چلا گیا۔

خود کو کمرے میں تنہا پا کر طیبہ کو جیسے ہوش آگیا۔ برہنہ جسم برقی روشنی میں چمک رہا تھا۔ اسے اپنے جسم سے نفرت محسوس ہوئی۔ بڑی شدید نفرت! یہ عورت کا جسم بھی صرف استعمال کے لیے بنا ہے، خواہ محبت سے یا ذلالت سے۔ آگے بڑھ کر اس نے کپڑے اُٹھائے۔ فرش پر پڑی خون کی بوندوں پر اس کی نظریں جم گئیں۔

چنار کے درختوں کے نیچے بیٹھے پاسدار تربوز کے نمکین بیج توڑ توڑ کر کھا رہے تھے اور باتیں کر رہے تھے۔ آسمان پر پورا چاند چمک رہا تھا، جیل کے احاطے میں چاندنی بکھری ہوئی تھی۔

''بہت عجیب تھی وہ۔'' اپنے ساتھی پاسدار دوستوں کو بتانے کے بعد وہ آہستہ سے بولا۔ ''عورت نہیں، لڑکی تھی۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ کنواری تھی؟'' ایک پاسدار نے چونک کر تیز آواز میں سوال کیا۔

''ہاں کنواری تھی۔'' کہہ کر اس نے کمر کی بیلٹ کو فوجی جوتے پر مارا۔

''منیر...... ناظم آقا یاد کر رہے ہیں تمہیں۔'' راہداری سے کسی نے آواز دے کر کہا۔

• ناظم نے پورا قصہ سن کر منیر کو گھورا، پھر آہستہ سے کہا۔ ''تم جاؤ!'' غصہ میں پیچ وتاب کھاتا ناظم کمرے میں ٹہلنے لگا۔ ''آخری ہتھیار بھی خالی گیا۔'' غصہ میں ہتھیلی پر دُوسرے ہاتھ کی مٹھی مار کر بولا۔ ''ہر وار کو میں آخری ہتھیار کہتا ہوں، لیکن اس کے بدن پر جا کر وہ پہلا وار بن کر ہتھیار کو کند کر دیتا ہے۔''

کمرے کے باہر شور سنائی دیا۔ ناظم نے غصے سے دروازہ کھولا۔ سامنے پاسداروں کی بھیڑ کھڑی تھی۔

''کمرہ نمبر آٹھ کے چار لوگوں نے زہر کی گولیاں نگل کر خودکشی کر لی ہے!''

''کب آئے تھے؟''

''تقریباً شام چھ بجے۔''

''کس گروہ کے تھے؟''

''یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا، لیکن حرکات سے ایسا لگتا ہے کہ فدائین تھے۔''

''فدائی...... فدائی...... اس چریکِ فدائے خلق نے دیوانہ کر رکھا ہے...... ان کو جڑ سے اکھاڑنا ہے...... ایران میں ان کا وجود باقی نہیں رہنے دوں گا...... مجاہدین ٹھیک ہو گئے نا...... ان مادر قحبوں کی نسل کو نیست و نابود کرنا ہے......!'' ناظم غصہ سے دانت پیس رہا تھا۔

''میں نے ڈیتھ سرٹیفکٹ لکھ دیا ہے۔'' ڈاکٹر نے پاسداروں کو ہٹا کر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

''ہوں......!'' ناظم نے کہا اور ڈاکٹر کے ساتھ کمرے سے نکل کر راہداری کی طرف چل پڑا۔

''عجیب بخار چڑھا ہے اُن نوجوانوں کو، مفت میں زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھتے ہیں۔'' ڈاکٹر نے چڑچڑے انداز سے کہا۔

''بخار نہیں، دماغی بیماری ہے؛ چھوت کی بیماری ہے، مگر اس کا علاج میں جانتا ہوں، ڈاکٹر...... چھوت کی اس بیماری کو جڑ سے اکھاڑوں گا...... ایک بھی کیڑا اس زمین پر زندہ نہیں چھوڑوں گا، سب کو مسل دوں گا......'' ناظم نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔

دُور سے ایک پاسدار دوڑتا ہوا آیا۔ ہانپتے ہوئے اس نے کہا۔ ''ناظم آقا، خبر ملی ہے، امام خمینی کے دشمنوں کی طبیعت خراب ہے۔''

ناظم نے اسے سرد نظروں سے دیکھا اور آہستہ سے کہا۔ ''ہوں......''

طیبہ کے دل و دماغ پر اس حادثہ کا بہت گہرا صدمہ پہنچا تھا۔ اس وقت اسے کسی اپنے کی کمی شدت سے محسوس ہو رہی تھی، مگر کسی اپنے کے بجائے یہاں صرف بے رحم دیواریں تھیں، جو کسی سنگدل کی طرح بے رحم اور سرد تھیں۔ کورش بھی جانے کہاں جا کر کھو گیا تھا، جو ابھی تک نہیں آیا تھا۔

کورش سے اس کی ملاقات ہوئے پندرہ سال گزر گئے، دس سال سے کورش جیل میں ہے۔ صرف ایک کتاب لکھنے کے جرم میں۔ انقلاب کی شروعات میں

چھوڑے گئے قیدیوں میں بھی جب وہ نہیں ملا تو طیبہ کا دل خدشات سے بھر گیا تھا لیکن اسے انتظار کرنا تھا۔ اپنے انتظار کو اس نے دل کے تہہ خانہ میں چھپا رکھا تھا۔ اس کی بھنک تک کسی کو لگنے نہیں دی تھی۔ ہمیشہ کے لیے زندہ مسکراہٹ کی مہر چہرے پر چپکا رکھی تھی۔ لیکن ان گزشتہ دس برسوں میں اس نے صرف اپنا ہی نہیں بلکہ کورش کی جدوجہد کا فرض بھی انجام دیا تھا۔ اسی لیے کورش اسے جذباتی ہوکر 'ہمزاد' کہتا تھا۔ طیبہ نے ہمزاد کا فرض بخوبی نبھایا تھا۔

کورش شادی کے خلاف تھا، لیکن وہ شادی کرنا چاہتی تھی۔ گھر والے بھی سماجی بندھن کو ہی منظوری دیتے ہیں۔ سیمون دبوا اور جان پال سارتر کی جوڑی پیرس میں بغیر شادی کیے زندگی بھر ساتھ رہ سکتی تھی، لیکن ایران جیسے ملک میں کورش اور طیبہ کا صرف گھل مل کر یوں اُٹھنا بیٹھنا معاشرہ ہی نہیں بلکہ خاندان والوں کی نظروں میں بھی کھٹکے گا۔ ایک روز گھر والوں کے ٹوکنے پر اس نے کھل کر کورش سے باتیں کی تھیں۔

''تم نے میرے بارے میں کیا سوچا ہے؟''

''میں سمجھا نہیں۔''

''میں شادی کرنا چاہتی ہوں۔''

''میں ابھی شادی نہیں کرسکتا۔''

''پھر کب کرو گے؟''

''جب یہ ناقص نظام ٹوٹ کر بکھر جائے گا۔''

''میں بوڑھی ہوجاؤں گی تب تک۔ مجھے بچے چاہئیں، گھر چاہیے!''

''میں اس سڑی شاہی حکومت میں بچے پیدا نہیں کروں گا۔ ہم تو غلام ہیں ہی، وہ بھی اس جہاں میں آکر ہماری طرح درد کو سہیں، خون کے گھونٹ پئیں...... افسوس، یہ خواہش بھی میں تمہاری تب تک پوری نہیں کرپاؤں گا جب تک یہ حکومت ہے۔''

''جدوجہد خاندان کو ساتھ لے کر بھی تو کی جاسکتی ہے۔ جتنے ہاتھ ہوں گے، اتنے ہتھیار اُٹھیں گے۔''

''نہیں طیبہ...... خاندان پیروں میں بیڑی ڈال دیتا ہے...... جدوجہد کی

دھارا کو مسدود کر دیتا ہے۔"
دو سال گزر گئے۔ طیبہ کے دل کی عورت نے پھر گھر کی خواہش کی۔ اس پر کورش نے یہ کہہ دیا۔ "تن من کی دنیا سے باہر آؤ، طیبہ..... انہیں دیکھو، یہ ہمارے بچے ہیں۔ ان غریب، بے سہارا لوگوں کے لیے ہم کچھ کریں، نہ کہ اپنے مطلب کی سوچیں۔"
چند روز بعد کورش اپنے گھر سے غائب تھا۔ کچھ ماہ بعد پتہ چلا کہ جیل میں ہے۔ پوری جوانی جیل میں کٹ گئی۔ آج زندگی کے موڑ پر اس طرح کورش ملا ہے جیسے کوئی خواب میں ملتا ہو، یا پھر برسوں کے پیاسے کو ایک بوند اوس کی دے کر کوئی کہے لو، اپنی پیاس بجھالو۔
طیبہ فرش پر اوندھی لیٹی اپنی پچھلی زندگی کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ یہاں پر سوچنے کے علاوہ کرنے کو رہ بھی کیا گیا تھا۔ 'میں نے اپنے تمام نازک جذبوں کو آگ میں تپا کر کندن بنا ڈالا ہے۔ آج سزا کے آخری امتحان سے بھی گزر گئی ہوں۔'
دروازے پر آہٹ ہوئی۔ دروازہ کھلا اور کالی چادر میں لپٹی پاسدار عورت اندر داخل ہوئی۔ لائٹ جلائی۔ طیبہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ عورت کو ایسی نظروں سے دیکھا جیسے پوچھ رہی ہو، اب کون سا قہر توڑنا باقی رہ گیا ہے؟
"چلو، تیار ہو جاؤ۔" کہہ کر عورت نے اسے چلنے کا اشارہ کیا۔

صبح صادق میں ابھی دیر تھی۔ طیبہ کو پاسداروں نے دیوار کے سامنے والے کھمبے سے باندھ دیا۔
تین جوتے منہ پر کپڑا باندھے، ہاتھوں میں بندوقیں تھامے طیبہ سے کچھ دوری پر آ کر سامنے زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے۔ ناظم داڑھی پر ہاتھ پھیرتا ہوا آیا اور ساتھ آئے پاسدار سے منہ گھما کر آہستہ سے کچھ کہا۔
"مزاج کیسا ہے آپ کا؟" ناظم نے طیبہ کے قریب جا کر پوچھا۔ طیبہ نے جلتی نگاہیں ناظم پر ڈالیں۔

"سامنے دیکھیے! آپ کے ساتھی تشریف لا رہے ہیں۔"

طیبہ نے نظریں گھمائیں۔ چند سائے اسے اپنی طرف بڑھتے دکھائی دیے۔ سیاوش، کامران، اصغر، شہرام، فرید اور قاسم آ رہے تھے۔ اس کی بے چین پیاسی آنکھیں کورش کو دیکھنے کے لیے بیتاب ہو اٹھیں، پھر اسے ثمینہ اور نادرہ کا خیال آیا، وہ ان کے ساتھ کیوں نہیں ہے؟

"آپ لوگ ان کے انجام سے کچھ سبق لیں۔ زندگی کھوٹا سکہ نہیں ہے کہ اسے اچھال کر دور پھینک دیں۔ جوش بغیر حقیقت لایعنی ہی نہیں بلکہ سطحی رہتا ہے۔" ناظم نے داڑھی کے بال ہاتھ سے نوچتے ہوئے کہا۔

وہ سب خاموش کھڑے رہے۔ بجلی کے جھٹکے، کیبل کی مار، حقارت و تذلیل نے ان کو دو ماہ میں کہیں کا نہیں رکھا تھا۔ اس وقت بھی جسم کمزور اور دماغ میں ایک سنسناہٹ تھی، جو بار بار ایک بات یاد دلا رہی تھی کہ جب ہاتھ میں ہتھیار نہ ہو اور دشمن پر حملہ کرنا ہو تو زبان بند رکھو، خواہ جسم کے پرخچے ہی کیوں نہ اُڑ جائیں۔

"آپ کا کیا خیال ہے خانم، اس بارے میں؟ اب بھی موقع ہے، ہم سے سمجھوتہ کرلیں۔ آپ ہماری مدد کریں اور ہم ......"

"مدد اور آپ کی ......؟ کبھی نہیں۔" طیبہ نے نفرت آمیز ہنسی سے کہا۔

"سوچ لیجیے ...... ہمیں کوئی جلدی نہیں۔"

"سوچ لیا۔" کہہ کر طیبہ نے زمین پر تھوکا۔

"گستاخ!" ناظم غصہ سے پاگل ہو اٹھا اور چیخ پڑا۔ "فائر!"

جوخوں نے انگلی پر دباؤ ڈالا۔ آگ اگلتی گولیاں ٹھک ...... ٹھک ...... کرتی ہوئی طیبہ کے جسم کی طرف لپکیں۔ پورا جسم گولیوں سے بندھ گیا۔ زخم خون کے آبشار بن گئے۔

تمام ساتھیوں کی آنکھوں میں غصہ تھا، نفرت تھی۔ ایک نئی جنگ کا عزم تھا۔ ان کے وجود میں جدو جہد کے شعلے دُگنی رفتار سے بھڑک اُٹھے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ اگلا نشانہ وہ سب بھی ہو سکتے ہیں۔ ادھر تنہا کمرے میں بیٹھے کروش کی آنکھوں سے آنسو

کی لڑیاں گر رہی تھیں یا اِشتعال کے انگارے تھے، جو غصہ کی تپش سے پگھل کر آنسوؤں کی شکل میں ٹپک رہے تھے۔ آہستہ سے اس کے ہونٹوں سے نکلا...... ''خدا حافظ ہمزاد...... خدا حافظ!'' طیبہ کے رسی سے بندھے تڑپتے جسم پر جاگتی آنکھیں آسمان پر ٹکی تھیں۔ جہاں صبح صادق ہو چکی تھی۔ اس کے منہ سے آخری الفاظ نکلے۔

''الوداع! میرے پیارے وطن، الوداع......!''

گولی سے چھلنی جسم ساکت ہوگیا۔ روح کا بے چین پرندہ بازو پھیلا کر آسمان کی جانب اُڑ گیا۔

آسمان سرخ ہو رہا تھا۔ سورج کا سنہرا گولہ نکلنے کے لیے بے چین تھا۔

OO

تمام شد

مصنفہ کی دیگر تصانیف

۱۔ زندہ محاورے (ناول)

۲۔ شالملی (ناول)

۳۔ ماہ رُخ (ناول)

۴۔ بہشت زہرا (ناول)

۵۔ زیرو روڈ (ناول، اردو میں زیر طبع)

۶۔ شامی کاغذ (افسانوی مجموعہ)

۷۔ چار بہنیں شیش محل کی (افسانوی مجموعہ)

۸۔ اپنی اپنی دُنیا (بچوں کے لیے طویل کہانی)

قرۃ العین حیدر اور راہل سانسکر تیاین کے بعد اگر ہندوستانی زبانوں میں کسی ادیب نے ایران اور خاور میانے (مشرق وسطیٰ) پر اپنا قلم خاصی تفصیل اور عمیق مشاہدے کے بعد اُٹھایا ہے تو اُن ادیبہ کا نام ناصرہ شرما ہے۔

ایران کے انقلاب پر اُن کی لکھی کہانیوں کا مجموعہ ''شامی کاغذ'' کے نام سے منظرعام پر پہلے ہی آچکا ہے، اب انقلاب ایران کے شروعاتی دور پر لکھا اُن کا ناول ''بہشت زہرا'' قارئین کے سامنے ہے۔ ہمارے وقت کا اہم انقلاب جو قلم اور بیان کی آزادی کے لیے کیا گیا اور جس میں مذہبی دیانتداری اور غریبوں کی ضرورتوں کے ساتھ ایران کے امام خمینی سے لے کر ایران کا بچہ بچہ شریک ہوا تھا، ایسے عظیم انقلاب پر لکھا یہ دنیا کا پہلا ناول ہے۔ یہ ناول لکھنا آسان نہیں تھا، مگر قلمکار چونکہ فارسی میں مکالمہ کر لیتی ہیں اور ماڈرن فارسی زبان میں ایم۔اے کی ڈگری یافتہ ہیں، لہٰذا اُنہوں نے ایران کے معاشی، ثقافتی اور اقتصادی حالات پر وہاں کے ادیبوں، سیاستدانوں اور عوام سے کھل کر باتیں کی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ دنیا کی پہلی ادیبہ اور جرنلسٹ ہیں جنہیں اقتدار میں آنے کے بعد امام خمینی نے ملاقات کا نہ صرف وقت دیا، بلکہ اُسے تاریخی بات چیت میں بدل دیا۔ ایران کی چار بار کی مسافت میں جو اُن کا مشاہدہ اُبھرا، یہ ناول اس کا اہم دستاویز بنا ہے، جس میں دل کو پگھلانے اور ہلا دینے والے کردار اپنی فکر اور ولولے کے ساتھ موجود ہیں۔

اس ناول کا پڑھنا ماضی میں گزرے انقلاب کا چشم دید گواہ بننے جیسا ہے۔

— مرغوب علی

TAKHLEEQKAR PUBLISHERS

54-C / 5, J - Extension, Laxmi Nagar, Delhi - 110092

011-22442572, 9811612373 qissey@rediffmail.com